بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
فروری 2013
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	800 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

مستقل سلسلے

فروری 2013
جلد 27 شمارہ 6
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 1-91، بی ٹی ای سی ایچ ایس، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع کا فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

ربیع الاول کے مہینے کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ وہ ماہ مبارک ہے جب محبوب رب العالمین، فخر کونین، ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہان میں قدم رکھا اور انسانیت کی ایک نئی صبح سعادت کا آغاز ہوا۔

دنیا جو ظلم و جہالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آپ کی آمد نے اسے روشنی بخشی۔ ایک ایسا انقلاب رونما ہوا جس نے انسان کو شرف انسانیت سے روشناس کیا۔ عرب جو قبیلوں میں بٹے ہوئے قرنوں سے آپس میں برسرپیکار تھے۔ طبقاتی، نسلی منافرت میں جکڑے ہوئے تھے۔ اسلام کی تعلیمات نے ان کی کایا پلٹ دی۔ اسلام نے رنگ، نسل، زبان، امیر، غریب کی تفریق مٹا کر ایک عالمگیر اخوت کا پیغام دیا۔ تمام انسان برابر ہیں۔ مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ جن کی پہچان اور شناخت اسلام اور مسلمان ہونا ہے۔

آج ہم بھی صوبائی، لسانی تعصبات میں گرفتار ہیں۔ اسلام انہیں مٹانے کے لیے ہی آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کریں۔ دین و دنیا میں کامیابی اور سربلندی حاصل کرنے کا یہی راستہ ہے۔

روبرو،

اس شمارے میں آمنہ ریاض کے ناول ستارۂ شام کی آخری قسط شائع کی جا رہی ہے۔ آپ کے ذہن میں اس ناول کے کرداروں کے بارے میں، کہانی کے بارے میں کئی سوالات ہوں گے۔ اس کے علاوہ بھی آپ آمنہ سے کوئی سوالات کرنا چاہتی ہیں تو ہمیں بھجوا دیں۔ آمنہ آپ کے سوالات کے جواب دیں گی۔ سوالات اس طرح بھجوائیں کہ 25 جنوری تک ہمیں موصول ہو جائیں۔ پتا ہے۔

روبرو، شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔

ایک عمدہ مثال،

رخسانہ نگار عدنان کی تحریروں کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا نام ہی اچھی تحریروں کی ضمانت ہے۔ ان کے طویل ناول "زندگی اک روشنی" اور "محبت خواب سفر" قارئین میں بے حد پسند کیے گئے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے متعدد ناول، مکمل ناول، ناولٹ اور افسانے بھی لکھے۔ زیادہ لکھنے کے باوجود رخسانہ نے اپنا معیار برقرار رکھا، جو ان کی بہت بڑی خوبی اور کامیابی ہے۔

پچھلے کچھ عرصے سے رخسانہ اپنی مصروفیات کی بنا پر لکھ نہ پائیں۔ اب انہوں نے قارئین کے لیے ناول لکھا ہے۔ رخسانہ کے ناول عموماً بہت طویل ہوتے ہیں۔ یہ ناول اس لحاظ سے مختلف ہے کہ یہ زیادہ طویل نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی دیگر تحریروں کی طرح یہ ناول بھی آپ کو پسند آئے گا۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول ۔ جنت کے پتے،
- ام مریم کا مکمل ناول ۔ واپسی،
- عائشہ نفیر احمد کا مکمل ناول ۔ اس راہِ طلب میں،
- ام طیفور کا ناولٹ ۔ ہرجائی قصائی،
- سعدیہ عزیز آفریدی، مصباح خادم، صباحت یاسمین اور ایلیا یقین کے افسانے،
- عالیہ بخاری، آمنہ ریاض اور رخسانہ نگار عدنان کے ناول،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- بیٹھ کر بسر دو جہاں کرنا ۔ کرنل اشفاق حسین کی کتاب پر تبصرہ،
- کنور ارسلان اور فاطمہ آفندی کا بندھن،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا۔
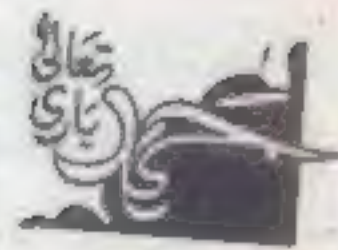
راہی ہیں سب، منزل تُو
اکمل تُو ہے، کامل تُو

سو خوشیاں اس پر قرباں
ہو جس غم کا، حاصل تُو

ہر کشتی کا تُو نگراں
سب موجوں کا ساحل تُو

سب آنکھیں تیری محتاج
ہر منظر میں شامل تُو

سب دروازے کھلتے جائیں
جس جانب ہو مائل تُو

جو بھی جس رستے سے آئے
سب رستوں کی منزل تُو

ہم ہی تجھ سے غافل ہیں
کب ہے ہم سے غافل تُو

امجد اسلام امجد
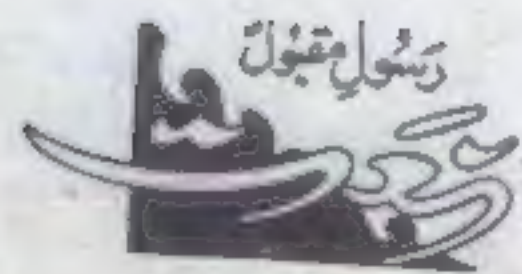
اُن کے دامن کی بات کی جائے
کوئی مشکل نجات کی جائے

آپ کے سایۂ عطا میں بسر
زندگی کی یہ رات کی جائے

کر کے دھڑکن کا آئینہ روشن
کملی والے کی بات کی جائے

منہ میں جب تک زباں ہے باقی
آپ ہی کی صفات کی جائے

ذکرِ احمد کی ایک اک ساعت
حاصلِ کائنات کی جائے

آپ سے آگہی کی شرط ہے یہ
پہلے تسخیرِ ذات کی جائے

سائے جس سمت بھی بڑھیں امجد
روشنی ساتھ ساتھ کی جائے

امجد اسلام امجد

سودا کرنا

حضرت ابو خالد حکیم بن حزام سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"دونوں سودا کرنے والوں کو اس وقت تک اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں۔ چنانچہ اگر وہ دونوں سچ بولیں اور چیز کی حقیقت صحیح صحیح بیان کر دیں (یعنی کوئی عیب وغیرہ ہو تو بتلا دیں) تو ان کے اس سودے میں برکت ڈال دی جاتی ہے اور اگر وہ چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان کے سودے سے برکت مٹا دی جاتی ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ دو سودا کرنے والوں سے مراد بیچنے اور خریدنے والے ہیں۔ اختیار کا مطلب ہے کہ جب تک دونوں مجلس میں موجود رہیں، انہیں سودا فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ لوگ بالعموم بات چیت کے اختتام کے بعد سودا فسخ کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ گو فریقین مجلس میں موجود رہیں بلکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ حدیث سے ایسا سمجھنے والوں کی تردید ہوتی ہے۔

2۔ سودے میں سچائی، برکت کا اور جھوٹ اور اخفا (عیب کا چھپانا) بے برکتی کا باعث ہے۔

3۔ مال کے حصول میں انسان نہایت حریص اور کثرت کی طلب میں ہلکان رہتا ہے۔ اس کے لیے وہ جھوٹ بھی بولتا ہے، اور دوسروں کو دھوکا دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس کے لینے اور دینے کے پیمانے جدا جدا ہوتے ہیں۔ مسلمان کو یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ اس طرح مال مقدار میں تو زیادہ ہو سکتا ہے بلکہ اس کی خیر و برکت اٹھ جاتی ہے۔ اور برکت اضافے سے بہت بہتر ہے۔

اللہ کی طرف دھیان دینے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وہ جو تجھے دیکھتا ہے جب تو (اکیلا نماز میں) کھڑا ہوتا ہے اور سجدہ کرنے والوں کے ساتھ تیری نقل و حرکت بھی (دیکھتا ہے)۔" (الشعراء 218، 219)

اور فرمایا "وہ تمہارے ساتھ ہے (اپنے علم کے لحاظ سے) جہاں بھی تم ہو۔" (الحدید)

نیز فرمایا "بے شک اللہ پر آسمان اور زمین کی کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔" (آل عمران 5)

اور فرمایا "بے شک تیرا رب البتہ گھات میں ہے۔" (الفجر)

اور فرمایا "وہ خیانت کرنے والی آنکھوں کو اور سینوں میں مخفی باتوں کو جانتا ہے۔" (غافر 19)

اس موضوع پر اور بھی بہت سی آیات ہیں جو کہ معلوم ہیں۔

فائدہ آیات:

ان تمام آیات سے واضح ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی ہے نہ مخفی رہ سکتی ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی اس صفت علم و بصر اور صفت سمع کو ہر وقت سامنے رکھے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچ سکے۔ اللہ کی یہ صفات جس حد تک اس کے سامنے رہیں گی، اسی قدر وہ اللہ کی نافرمانیوں سے کنارہ کش رہے گا۔

اور جو احادیث ہیں، وہ ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

دین

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اس دوران میں اچانک ایک آدمی ہمارے پاس آ دھمکا، انتہائی سفید کپڑوں میں ملبوس اور سخت سیاہ بالوں والا۔ اس پر سفر کا نام و نشان نظر آتا تھا نہ ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنوں کے ساتھ ملا دیے اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اپنی رانوں پر رکھ لیا (یعنی نہایت مودب ہو کر بیٹھ گیا) اور کہا۔

"اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے اسلام کے بارے میں بتلائیے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر تمہیں راستے (سفر حج) کی طاقت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔"

اس نے کہا۔ "آپ نے سچ کہا۔"

ہم نے اس کی بات پر تعجب کیا کہ یہ آپ سے سوال بھی کرتا ہے اور آپ کی تصدیق بھی کرتا ہے۔

اس نے (پھر) کہا "مجھے ایمان کے متعلق بتلائیے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی (نازل کردہ) کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر اور اچھی بری تقدیر پر ایمان رکھو۔"

اس نے (پھر) کہا "آپ نے سچ کہا۔"

اس نے کہا "مجھے احسان کی بابت بتلائیے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی ایسے عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

اس نے کہا۔ "مجھے قیامت کے بارے میں خبر دیجیے (کہ وہ کب آئے گی)؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس کے بارے میں، جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ علم رکھنے والا نہیں (یعنی مجھے تم سے زیادہ علم نہیں)۔"

اس نے کہا۔ "(اچھا) اس کی (بڑی بڑی) نشانیاں بیان فرمائیے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی۔ اور یہ کہ تم ایسے لوگوں کو دیکھو گے کہ جن کے جسم پر کپڑے، پیروں میں جوتیاں اور کھانے کو خوراک نہیں ہوگی (لیکن پھر ان فقیروں کے پاس اتنی دولت آ جائے گی کہ) وہ عمارتوں میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔"

پھر وہ (نووارد سائل) چلا گیا۔

راوی حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں کافی دیر تک (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں) ٹھہرا رہا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا۔ "عمر! جانتے ہو یہ سائل کون تھا؟"

میں نے کہا۔ "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ یہ حدیث، حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں اساسیات اسلام کا بیان ہے جن کی تفصیلات ہر مسلمان جانتا ہے۔

2۔ تقدیر کا مطلب ہے، ہر چیز جو ابد تک ہوگی اس کا علم پہلے ہی سے اللہ کو ہے اور اس نے اس کو لکھ دیا ہے۔ اب جو کچھ ہوتا ہے اس کے اسی علم کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے لکھ رکھا ہے۔ اس کے اچھے برے ہونے کا مطلب ہے کہ مثلاً فراغت، خوش حالی، پیداوار کی کثرت اور فراوانی، یہ خیر ہے اور قحط سالی آلام و مصائب وغیرہ، یہ شر ہے اور یہ خیر اور شر

ہمارے اختیار سے ہے، ورنہ اللہ کے تو ہر کام میں ہی کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت ہوتی ہے جس کو صرف وہی جانتا ہے۔

3۔ اس میں استاد اور شاگرد کے آداب کا بھی تذکرہ ہے۔

4۔ عبادات میں خشوع و خضوع مطلوب ہے۔ کوئی بھی عبادت اس وقت تک ثمر آور نہیں ہو سکتی جب تک اس میں خشوع و خضوع نہ ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کا یہ یقین پختہ ہو کہ اس کا خالق ہر وقت اور ہر جگہ اسے دیکھ رہا ہے اور وہ ایسے عبادت کرے جیسے خالق حقیقی سے ہم کلام ہو۔

5۔ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ انبیاء نے مستقبل کے بارے میں جو خبریں دی ہیں، وہ وحی الٰہی کی بنیاد پر دی ہیں اور اسے علم غیب نہیں کہا جاتا۔

اچھے اخلاق

حضرت ابوذر جندب بن جنادہ اور حضرت ابوعبدالرحمٰن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تو جہاں کہیں بھی ہو، اللہ سے ڈر! اور برائی کے پیچھے نیکی کر۔ نیکی برائی کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آ۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ "نیکی برائی کو مٹا دے گی" کا مطلب ہے کہ نیکی، برائی کا کفارہ بن جاتی ہے، یعنی انسان کو چاہیے کہ گناہ سرزد ہو جانے کے بعد فوراً ہی کوئی نیکی کرے تاکہ گناہ کے جسمانی اور روحانی مضر اثرات زائل ہو جائیں کیونکہ بندہ مومن کو گناہ بے کل کیے رکھتے ہیں تاوقتیکہ توبہ کر لے یا کوئی نیکی کر لے۔ مومن کے شایان شان یہی ہے کہ گناہ کے فوراً بعد توبہ کر لے، اس طرح اس کا گناہ لکھا بھی نہیں جائے گا۔

2۔ جلوت و خلوت میں اللہ کا تقویٰ ضروری ہے اور یہی حقیقی تقویٰ ہے کہ انسان تنہا ہو یا لوگوں میں، کوئی اسے دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو، ہر حال میں وہ اللہ سے ڈرے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اللہ کی عظمت اور اس ذات عالی کا وقار انسان کے دل میں جاگزیں ہو۔ جلوت میں تقویٰ کا اظہار اور خلوت میں اللہ کی حرمتوں کو پامال کرنا اتنا گھناؤنا جرم ہے کہ اس سے انسان کے سارے اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔

3۔ حسن اخلاق بھی ان اعمال میں سے ہے، جن سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"بنی اسرائیل میں تین آدمی تھے۔ ایک برص (سفید داغوں) کے مرض میں مبتلا، دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا تھا۔ اللہ نے ان کو آزمانے کا ارادہ فرمایا۔ چنانچہ ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا۔ فرشتہ (پہلے) برص والے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا۔ "تجھے کون سی چیز سب سے زیادہ محبوب ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "اچھا رنگ، خوب صورت جسم، نیز یہ کہ مجھ سے یہ (برص کی بیماری) دور ہو جائے جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کھاتے ہیں۔"

فرشتے نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو (اللہ کے حکم سے) اس کی گھن کھانے والی بیماری دور ہو گئی اور اسے خوب صورت رنگ دے دیا گیا۔

فرشتے نے اس سے پھر پوچھا "تجھے کون سا مال زیادہ پسند ہے؟"

اس نے کہا۔ "اونٹ یا کہا گائے" (اس کے بارے میں) راوی کو شک ہے۔

چنانچہ اسے (آٹھ دس مہینے کی) گابھن اونٹنی دے دی گئی اور فرشتے نے اسے دعا دی۔

"اللہ تعالیٰ تیرے لیے اس میں برکت عطا فرمائے۔"

پھر وہ فرشتہ گنجے کے پاس آیا۔ اس نے اس سے پوچھا۔ "تجھے کون سی چیز سب سے زیادہ پسند ہے؟"

اس نے کہا۔ "اچھے بال، نیز یہ کہ میرا یہ (گنجاپن) ختم ہو جائے جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔"

فرشتے نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو اس سے اس کا گنجاپن دور ہو گیا اور اسے (اللہ کی طرف سے) خوب صورت بال عطا کر دیے گئے۔

فرشتے نے اس سے پوچھا "تجھے کون سا مال زیادہ پسند ہے؟"

اس نے کہا۔ "گائے۔"

چنانچہ اسے ایک حاملہ گائے دے دی گئی۔ اور (فرشتے نے اسے) دعا دی۔

"اللہ تعالیٰ تیرے لیے اس میں برکت عطا فرمائے۔"

اس کے بعد فرشتہ اندھے کے پاس آیا۔ اس سے پوچھا۔

"تجھے کون سی چیز سب سے زیادہ پسند ہے۔"

اس نے کہا۔ "یہ کہ اللہ مجھے میری بینائی لوٹا دے پس میں لوگوں کو دیکھوں۔"

فرشتے نے اس پر ہاتھ پھیرا تو اللہ نے اس کی بینائی بحال کر دی۔ فرشتے نے اس سے پوچھا۔

"تجھے کون سا مال زیادہ پسند ہے؟"

اس نے کہا "بکریاں۔"

تو اسے ایک بچہ جننے والی بکری دے دی گئی۔

چنانچہ سابقہ دونوں (برص والے اور گنجے) کے ہاں بھی دونوں جانوروں (اونٹنی اور گائے) کی نسل خوب بڑھی اور اس نابینا کے ہاں بھی بکری نے بچے دیے۔ برص والے کے ہاں ایک وادی اونٹوں کی، گنجے کے ہاں ایک وادی گایوں کی اور اس اندھے کے ہاں ایک وادی بکریوں کی ہو گئی۔

پھر وہی فرشتہ برص والے کے پاس اس کی صورت و ہیئت میں آیا اور کہا۔

"میں مسکین آدمی ہوں، سفر میں میرے وسائل ختم ہو گئے ہیں، آج میرے وطن پہنچنے کا وسیلہ اللہ کے اور پھر تیرے علاوہ کوئی نہیں، اس لیے میں تجھ سے اس ذات کے نام سے، جس نے تجھے اچھا رنگ، خوب صورت جسم اور مال عطا کیا ہے، ایک اونٹ کا سوال کرتا ہوں جس کے ذریعے سے میں اپنے سفر میں منزل مقصود تک پہنچ جاؤں۔"

اس نے جواب دیا "(میرے ذمے پہلے ہی) بہت سے حقوق ہیں۔"

یہ سن کر فرشتے نے اس سے کہا۔ "گویا کہ میں تجھے پہچانتا ہوں۔ کیا تو وہی نہیں ہے جس کے جسم پر سفید داغ تھے، لوگ تجھ سے گھن (نفرت) کھاتے تھے، تو فقیر تھا اللہ نے تجھے مال سے نوازا؟"

اس نے کہا۔ "یہ مال تو مجھے باپ دادا سے ورثے میں ملا ہے۔"

فرشتے نے کہا۔ "اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تجھے ویسا ہی کر دے، جیسا کہ پہلے تھا۔"

اب فرشتہ گنجے کے پاس اس کی پہلی شکل و صورت میں آیا اور اس سے بھی وہی کچھ کہا جو برص والے کو کہا تھا اور اس گنجے نے بھی وہی جواب دیا جو اس نے دیا تھا جس پر فرشتے نے اسے بھی بددعا دی۔
اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تجھے ویسا ہی کر دے، جیسا کہ تو پہلے تھا۔"

فرشتہ (پھر) اندھے کے پاس آیا کہ "میں مسکین اور مسافر آدمی ہوں، میرے وسائل سفر میں ختم ہو گئے ہیں، اب آج میرے لیے وطن پہنچنا، اللہ کی مدد، پھر تیری مالی اعانت کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے مجھے تجھ سے اس ذات کے نام سے جس نے تیری بینائی تجھ پر لوٹا دی، ایک بکری کا سوال کرتا ہوں، تاکہ اس کے ذریعے سے میں اپنے سفر میں منزل مقصود تک پہنچ جاؤں۔"

اندھے نے کہا۔

"بلاشبہ میں اندھا تھا، اللہ نے میری بینائی بحال کر

دی (تیرے سامنے بکریوں کا ریوڑ ہے ان میں سے) جو چاہے لے لے اور جو چاہے چھوڑ دے' اللہ کی قسم! آج میں' جو تو اللہ کے لیے لے گا' اس میں تجھ سے جھگڑا نہیں کروں گا۔"

یہ سن کر فرشتے نے اسے کہا۔

"اپنا مال اپنے پاس ہی رکھ! بے شک تجھے آزمایا گیا تھا (جس میں تو کامیاب رہا) اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہو گیا اور تیرے دونوں ساتھیوں پر تیرا رب ناراض ہو گیا (کیونکہ وہ ناکام رہے)۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مال و دولت کی فراوانی بھی ایک آزمائش ہے۔ اس آزمائش میں کامیاب وہی ہوتا ہے' جو مال کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر' اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہیں بھولتا۔ بلکہ وہ اس دولت کو اللہ کی ضرورت مند مخلوق پر خرچ کر کے خوش ہوتا اور اللہ کی نعمت کا عملی شکر ادا کرتا ہے اور اس کے برعکس رویہ اختیار کرنے والے ناکام قرار پاتے ہیں کیونکہ اس رویے کی وجہ سے وہ جھوٹ' بخل اور تکبر کا ارتکاب کرتے ہیں' جو اللہ کی ناراضی کا باعث ہیں۔

2۔ اس حدیث سے یہ دلیل پکڑنا کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء اور فرشتے وغیرہ صحت اور رزق دینے پر قادر ہیں' سراسر جہالت ہے' کیونکہ یہ تو ایک آزمائش تھی' جو اللہ نے فرشتے کے ذریعے سے ان لوگوں پر ڈالی اور اللہ کے حکم سے وہ صحت یاب ہو گئے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادر زاد اندھے کو درست کر دیتے تھے تو اس کی یہ صراحت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایسا میں اپنے اختیار سے نہیں' بلکہ اللہ کے حکم سے کرتا ہوں۔ اور اسے شرعی اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں اور نبی کے علاوہ کسی کے ہاتھ پر ہو تو اسے کرامت کہتے ہیں' لہٰذا معجزہ یا کرامت اور اختیار کا باہمی فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ لوگ اس میں فرق نہ کر کے راہ مستقیم سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔

3۔ اللہ کے نام پر سوال کرنے والے کو ضرور کچھ نہ کچھ دینا چاہیے۔

4۔ حدیث میں ہے کہ فرشتے نے اسے دعا دی کہ اللہ تیرے مال میں برکت کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاشی تنگی کی صورت میں کسی نیک صالح سے دعا کروانی چاہیے۔ اس طرح یہ بھی پتا چلتا ہے کہ فرشتوں کی دعائیں بھی لینی چاہئیں۔ احادیث میں کئی ایسے اعمال کا ذکر ہے جن کے کرنے والوں کے لیے اللہ کے فرشتے رحمت کی دعائیں کرتے ہیں' مثلاً "نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا' نماز کا انتظار کرنا' کسی مسلمان کے لیے اس کی عدم موجودگی میں دعا کرنا وغیرہ۔

5۔ اللہ تعالیٰ مال و دولت عطا کرے تو اسے اپنی ذہانت اور محنت کا شاخسانہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انسان مخلوق کی مدد کرنے سے انکار کر دے کہ میں نے محنت سے کمایا ہے۔ اس طرح نعمتیں چھن جاتی ہیں کیونکہ مال و دولت کی بنیاد اگر ذہانت اور محنت ہوتی تو جانور وغیرہ بھوکے مر جاتے۔

حسن اسلام

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"انسان کا بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دینا اس کے حسن اسلام کی علامت (یعنی اچھے مسلمان ہونے کی دلیل) میں سے ہے۔" (یہ حدیث حسن ہے۔ اسے ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ :

اس میں انسان کے لیے ایک نہایت اہم اصول بیان کیا گیا ہے کہ بے فائدہ اور لایعنی باتوں اور کاموں سے اجتناب کیا جائے۔ انسان اگر اس اصول کو اپنا لے تو بہت سے گناہوں اور قباحتوں سے بچ جائے' اسی لیے بعض علماء نے اسے اسلام کا چوتھا' بعض نے نصف حصہ اور بعض نے کل اسلام قرار دیا ہے۔

☆

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا

جنٹلمین استغفراللہ

مصنف: کرنل اشفاق حسین

تبصرہ: آمنہ زریں

زیر نظر کتاب۔۔۔ کارگل کے برف زاروں میں برپا کی جانے والی حماقت' ناقص حکمت عملی اور دشمن کو کمزور سمجھ لینے کی تاریخی خوش فہمی کے اسباب۔۔۔ اس کے نتیجے میں تباہ ہونے والی بین الاقوامی ساکھ' برف کی چوٹیوں پر جھونک دی گئی جوانوں کی زندگی اور رائیگاں جانے والے خون کا تذکرہ ہے۔۔۔ بے جگری سے لڑنا جن کا وصف سہی۔۔۔ شوق شہادت جن کا فخر سہی مگر اس طرح ملک و قوم کے جانی و مالی وسائل کو دشمن کا آسان ہدف بنا دینا اور مکمل تباہی و بربادی کے بعد بھی جھوٹی کہانیاں گھڑ کے حقائق کو مسخ کرنے پہ ہنر آزمانا یہ ہمارے ہی ہاں ممکن ہوا۔۔۔ دوسری طرف تو اعلا سطح کی انکوائریاں کروا کر برطرفیاں عمل میں لائی گئیں۔

اور ادھر؟

"ذمہ داران صاحبان" نے محاسبہ کا خطرہ لاحق ہوتے ہی اقتدار پر غاصبانہ قبضہ جمایا اور منہ بند رکھنے اور کھولنے کی قیمت لگانے۔۔۔ سرزمین اور باشندوں کی قیمت طے کرنے اور وصول کرنے۔۔۔ روشن خیالی کا پرچم گاڑنے۔۔۔ رقص و سرور کی محفلوں میں جھومنے اور رنگ رلیاں منانے کے زمانے کی داغ بیل ڈال دی گئی۔

چلیے۔۔۔ کتاب میں شامل کچھ معتبر لوگوں کی مستند رائے کی طرف۔۔۔ جو کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اسے سمجھنے میں بھی مدد کرتی ہے۔

"کارگل آپریشن جس کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ یہ ایک سو بیس کلو میٹر سے بھی بڑے محاذ پر پھیلا ہوا تھا' وزیر اعظم نواز شریف اور دفاعی کمیٹی کے علم میں لائے بغیر شروع کیا گیا تھا۔ بھارت نے نہ صرف محاذ جنگ پر اس کا بھرپور جواب دیا' بلکہ سفارتی سطح پر بھی وہ زبردست مہم چلائی کہ اس وقت کے چیف آف آرمی اسٹاف کے ماتحت کام کرنے والے "چار کے ٹولے" کو اس کا جواب نامشکل ہو گیا۔

اس آپریشن کے منصوبہ سازوں کا یہ مفروضہ کہ سویلین محب وطن نہیں ہوتے اور یہ کہ وہ اس آپریشن کی خبریں افشا کر دیں گے' درحقیقت انتہائی غلط تھا۔"

"جنرل مشرف کا یہ موقف کہ ہر شخص باخبر تھا' حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ وزیر اعظم بھی اس کارروائی میں فریق نہیں بن سکتے تھے' جو ان مثبت نتائج پر پانی پھیر دے' جو انہوں نے بھارت سے امن مذاکرات کے ذریعے حاصل کیے تھے۔"

سید مطیع الرحمن۔ سابق مشیر سائیکولوجیکل آپریشنز جی ایچ کیو راولپنڈی۔

"اس منصوبے کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ بین الاقوامی صورت حال کو قطعاً پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بین الاقوامی اصولوں سے روگردانی کی گئی اور پھر بین الاقوامی ردعمل نے اس

بارے میں کوئی شک رہنے بھی نہیں دیا۔ اس صورت حال میں کوئی سیاسی قیادت یا سفارتی مدبر بین الاقوامی رائے کو تبدیل نہیں کر سکتی تھی اور نہ بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنبھالا دے سکتی تھی۔

پرویز مشرف کا یہ دعوا کہ "فوجی فتوحات" کو "سفارتی شکست" میں بدل دیا گیا' بالکل غلط اور حقائق سے انحراف ہے اور اس ذہنیت کا عکاس ہے جو تدبیراتی سوچ سے عاری اور اپنی غلطیوں کے الزام دوسروں کے سر تھوپنے کی متلاشی ہو۔"

"کارگل کو کسی بھی نکتہ نظر سے دیکھیں' یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پاکستان کے لیے ایک عظیم سانحہ تھا اور اس سے پاک بھارت تعلقات پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اس وقت پاکستان کے امور خارجہ کے سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے اتنا ہی کہوں گا کہ دنیا کے کسی فارن آفس کو اتنے بحرانی حالات میں اتنے ناممکن کام کا تجربہ نہ ہوا ہوگا۔"

شمشاد احمد خان' سابق سیکریٹری امور خارجہ پاکستان۔

"جہاں اس آپریشن کی تباہ کن ناکامی اور فوجی قیادت کی نااہلی اور بے رحمی سے گہری تشویش ہوتی ہے' وہاں ان افسروں اور جوانوں کی شجاعت' استقلال' اور پیشہ ورانہ مہارت کو دیکھ کر امید کی کرن پیدا ہوتی ہے اور حوصلہ بحال ہوتا ہے' جنہوں نے اپنے اللہ اور قوم سے کیا ہوا عہد نبھاتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

یہ بات ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ اصل قوت و مقاومت ان ہی افسروں اور جوانوں کی خود سپردگی' ایثار پسندی' حب الوطنی' جذبہ جہاد سے سرشاری اور شہادت کی تمنا تھی۔ اسی میں ہماری مسلح افواج اور قوم کی اصل قوت پنہاں ہے۔"

"کارگل جیسے سانحے اس وقت تک ختم نہیں ہوں گے' جب تک قوم مہم جو افراد اور غاصبوں سے' جو کسی بھی رنگ یا نسل کے ہوں' خود کو بچانے اور اپنے اداروں کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑی نہیں ہوتی۔ آئندہ کارگل جیسے واقعات سے بچنے کا واحد راستہ' قانون کی حکمرانی' اداروں کے ہاتھوں میں فیصلوں کا اختیار اور شفاف احتساب ہی ہے۔ اس سے زیادہ تباہ کن بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اتنے وسیع پیمانے کی قومی تباہی کے ذمہ دار افراد کو معاف کر دیا جائے۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ جو تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتے' انہیں تاریخ کے رحم و کرم پر سسکنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور پھر وہ ان سزاؤں کے منتظر رہتے ہیں' جو عبرت حاصل نہ کرنے والوں کا مقدر رہیں۔"

سینیٹر پروفیسر خورشید احمد۔

"یہ کتاب دو جمع دو چار کی طرح' جو بات بالکل واضح کرتی ہے' یہ ہے کہ اگرچہ اس آپریشن کی اس وقت بھی کوئی تک نہیں بنتی تھی' جب یہ روبہ عمل لایا گیا تاہم اب یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ ایک مجرمانہ فعل تھا۔ بڑی حد تک کارگل کی منصوبہ بندی اس پختہ یقین پر کی گئی تھی کہ جب بھارتی فوج کو در اندازی کی خبر ہوگی تو وہ اس بارے میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوگی۔

بہت جلد یہ ثابت ہو گیا کہ یہ کس قدر احمقانہ مفروضہ تھا۔ جب بھارتی فوج نے جوابی کارروائی شروع کی تو یہ شدید بھی تھی' خشم ناک بھی۔ ایک ایک چوکی پر بھاری بمباری کی گئی۔ پیدل فوج نے لہر در لہر حملے کیے۔ بھارتی فوج کا سخت جانی نقصان ہوا' لیکن حملوں میں کمی نہ آئی۔

"اہم ترین بات جو یہ کتاب واضح کرتی ہے' وہ کارگل آپریشن اور بارہ اکتوبر 1999ء کے فوجی انقلاب کے درمیان تعلق ہے۔ اس حماقت کے مرتکب افراد کو بہت سے سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ان افراد کو جنہوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بعید از قیاس قربانیاں دیں' شرمسار کر دیا گیا۔ فوج بدنام ہوئی۔ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی سبکی ہوئی۔ اس کے بعد تسلسل کے ساتھ پاکستان پر سرحد پار "دہشت گردی" کا الزام لگتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ اصطلاح پوری دنیا میں عام ہو گئی۔ کشمیر پر ہمارا موقف' مستحکم ہونے کی بجائے تشویش ناک حد تک کمزور ہو گیا۔"

ایاز امیر صحافی

کتاب جزئیات سے تفصیلات تک ہر چیز کو واضح کرتی چلی جاتی ہے۔۔۔ جس کا آغاز اس مہم جوئی کے بنت کار میجر جنرل جاوید حسن کے دماغ میں پلنے والے کیڑے کی دریافت اور توجیہات سے ہوتا ہے۔۔۔ جن کے خیال میں "بھارت مغرب سے آنے والے پرعزم حملہ آوروں کے خلاف کبھی اپنا دفاع نہیں کر سکا" اگرچہ اس کی فوجوں کو عددی برتری بھی حاصل تھی۔ میجر جنرل جاوید حسن بھارت کے شمال مغرب میں فورس کمانڈ ناردرن ایریا کے کمانڈر تھے۔ انہوں نے خود کو پرعزم کمانڈر سمجھا اور سوچا کہ وہ تاریخ کو دہرا سکتے ہیں اور اپنے مقدر کو جو پہلے ہی بڑا روشن تھا' مزید چمکا سکتے ہیں۔

اپنے خیال میں راسخ "گفتگو کے فن کے ماہر ذہن نے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی ٹھان کر چیف تک رسائی حاصل کر کے اسے بھی قائل کر لیا اور منصوبے کی جامعیت کا اندازہ کیجیے کہ خود فوج کے سرکردہ سربراہان کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی گئی۔

"منصوبے کو شروع کرنے سے پہلے ایک اہم ترین ضرورت یہ تھی کہ زائد راشن' سردی سے بچاؤ کے ملبوسات اور گولہ بارود اگلے علاقوں میں ذخیرہ کیا جائے۔ اس کام کے لیے سول ٹھیکہ داروں کی خدمات حاصل کی جاتیں تو راز آشکار ہونے کا خدشہ تھا کہ معمول کی ذخیرہ اندوزی کی نسبت' دہری بلکہ تہری خدمات کی ضرورت تھی۔ سب سے مشکل کام توپوں کو آگے پہنچانے کا تھا۔

اس کا حل بھی ایم آئی 17 کی مدد سے نکالا گیا۔ توپوں کو کھول دیا گیا اور ان کے مختلف حصے لوہے کے رسوں سے ہیلی کاپٹر سے لٹکا کر آگے کے علاقوں تک پہنچائے گئے۔ 130 ملی میٹر کی توپیں بہت بھاری تھیں۔ ایک توپ کی ایک بیرل ہی دو ہزار کلو گرام وزن رکھتی تھی۔ ایک ٹائر کا وزن ساڑھے چار سو کلو تھا۔ ایک توپ ہیلی کاپٹر کے آٹھ پھیروں میں آگے پہنچتی تھی۔ اس طرح ہیلی کاپٹر اسکواڈرن کے پرواز کے وہ گھنٹے جو عام حالات میں دو سال کے لیے کافی ہوتے' تین ماہ میں استعمال کر لیے گئے۔"

"مارچ کے وسط تک بالا کمانڈروں کی تسلی کے مطابق ضروری اشیا اگلے علاقوں میں ذخیرہ کی جا چکی تھیں۔ اس کے فوراً بعد فوجی دستوں کو لشتم پشتم لائن آف کنٹرول کے پار بھیج دیا گیا تھا۔ شروع شروع میں انہیں بلند علاقوں میں استعمال ہونے والے خصوصی جوتے بھی فراہم نہیں کیے گئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کئی فوجی برف زدگی کا شکار ہو گئے۔ کتنے ہی سپاہیوں کو اپنے ہاتھوں' پیروں یا انگلیوں سے محروم ہونا پڑا کہ شدید سردی میں برف سب سے پہلے انہی اعضا کو سن کرتی ہے اور بروقت علاج میسر نہ آئے تو انہیں کاٹے بنا چارہ نہیں۔ 19 فروری کو برفشار کی زد میں آنے والے فوجیوں کی نعشیں 6 دن بعد برآمد کی جا سکیں۔ سینئر کمانڈر مطمئن تھے۔ انہوں نے جو جمع تفریق کر رکھی تھی' اس میں ایسے حادثے قابل قبول تھے۔"

ملک و قوم کی خاطر جذبہ اطاعت و شہادت سے سرشار جوانوں کو کیا ہم اسی خاطر فوج میں بھرتی کرواتے ہیں کہ انہیں ذاتی فتوحات کے شوق کی بھینٹ چڑھا دیا جائے؟ للہ العجب! کہ حرص و ہوس کسی بھی مقام پر دامن سے چپک کر اسے تار تار کروا سکتی ہے۔ اگر کوئی دیکھنا چاہے۔

"لائن آف کنٹرول کے پار جانے والے فوجی دستوں کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جون سے پہلے دشمن کو ان کی موجودگی کا بالکل پتا نہیں چلے گا۔ اس وقت تک برف پگھلنے لگے گی' درجہ حرارت بہتر ہو جائے گا اور دشمن کے اکا دکا فوجی بتدریج واپس آئیں گے۔ ان سے نمٹنا آسان ہوگا کیونکہ جب تک پورے علاقے

میں ہم اتنے مستحکم ہو چکے ہوں گے کہ دشمن ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔“ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد نے ایک مرتبہ کمانڈروں سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔

”دشمن ہماری موجودگی کو برداشت کرنا سیکھ جائے گا۔“

مصنف نے بھارت کے ایٹمی دھماکے اور ان کے بعد دشمن کے لب و لہجے کی تبدیلی کو صراحت سے بیان کیا ہے۔ جس کے بعد علاقے میں طاقت کے توازن کو درست رکھنے کی خاطر پاکستان نے کسی بھی دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے خود بھی ایٹمی دھماکے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پاکستان کے کامیاب ایٹمی دھماکوں کے بعد دشمن کے رویے میں نمایاں لچک کا عنصر سامنے آیا اور باہمی مذاکرات کی اہمیت کو تسلیم کر کے باقاعدہ سفارت کاری کا عمل شروع کر دیا گیا۔

واجپائی نے پاکستان کا کامیاب دورہ کیا اور پاکستان نے اہم سفارتی کامیابیاں حاصل کیں۔

22 مارچ کو بھارتی وزیر اعظم نے پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف کو ایک خط لکھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ ان کا ملک پاکستان سے امن اور دوستی کے تعلقات کا خواہاں ہے اور تمام متنازعہ معاملات کو خوش اسلوبی سے حل کرنا چاہتا ہے۔

11 اپریل کو وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ اعلامیہ لاہور کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان بہت سے امور پر مناسب پیش رفت ہوئی ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ یہ معاملات اور آگے بڑھیں گے۔

”جو بات پاکستانی وزیر اعظم کو نہیں معلوم تھی وہ یہ کہ پاک فوج کے کچھ مہم جو جرنلوں کا اپنا ایک ایجنڈا تھا اور وہ ملک کے انتظامی سربراہ اور سپریم سول اتھارٹی سے اجازت حاصل کیے بغیر اس ایجنڈے پر خاموشی سے عمل پیرا تھے۔“

”مئی 1999ء کے پہلے ہفتے میں بھارت کو پاکستانی فوجیوں کے لائف آف کنٹرول پار کرنے کی خبر ہو گئی۔“

اب جانیے بھارتی فوجی کمانڈروں کا رد عمل ۔۔۔ ہر فوجی اپنے ملک کی خاطر لڑنے، جان دینے کے جذبے سے سرشار ہوتا ہے اور عملی موقع آنے پر دشمن کو ہدف بنا کر فتح کا آرزومند ہوتا ہے۔ اور اسی کو میدان میں اترنا کہتے ہیں ۔۔۔۔ جنگ اور کھیل کے میدان کے علاوہ، ہمارے لوگ بھی انہیں دشمن کی حیثیت سے یاد نہیں رکھتے ۔۔۔ مگر چشم پوشی سے حقیقتیں بدلنا شروع ہوں ۔۔۔ تو یہ دنیا واقعی احمقوں کی جنت بن جائے۔

”جب بھارت کے فوجی کمانڈروں کو در اندازی کی خبر ہوئی تو وہ سخت مشتعل، برہم اور برافروختہ ہوئے۔ ان کے غضب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ان کا رد عمل تیز اور شدید بھی تھا، خشم ناک بھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنی بہترین بوفور توپیں پہاڑوں پر چڑھا لائے، بلکہ مقبوضہ کشمیر میں موجود فضائیہ کی تعداد میں بھی چار گنا اضافہ کر دیا۔ اس کے برعکس پاکستان میں پاک فضائیہ کو ابھی تک اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔“

دشمن سے دلداری کی توقع ۔۔۔؟ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہماری حیثیت ان کے لیے دائمی دشمن کی سی ہے۔

اب چلیے مختلف محاذوں پر ۔۔۔ میدان جنگ کی صورت حال دیکھیں ۔۔۔ ”دوسرے دن 13 مئی کو گولہ باری کا آغاز پو پھٹتے ہی شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ سارا دن جاری رہا۔

کیپٹن افتخار اور ان کے ساتھیوں نے اپنی چوکیوں سے ہٹ کر بڑے بڑے تودوں کے پیچھے پناہ لے رکھی تھی۔ اس لیے وہ محفوظ رہے۔ کارگل دراس روڈ پر انہوں نے چھ توپیں اور دو سو کے قریب گاڑیاں کھڑی دیکھیں۔ جن میں ڈھائی ٹن ٹرک اور سات ٹن کی توپیں کھینچنے والی گاڑیاں شامل تھیں۔ ان کے پاس ہلکے ہلکے ہتھیار تھے۔ جن کی مار کا فاصلہ ویسے بھی زیادہ نہ تھا۔ وہ ان توپوں اور گاڑیوں کا کچھ نہیں کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر سے درخواست کی کہ وہ اپنے توپ خانے سے ان پر گولہ باری کروائے۔ جواب ملا کہ پندرہ دنوں کے اندر اندر اس سے بڑا ٹارگٹ سامنے آئے گا اس کے خلاف یقیناً“ کارروائی کی جائے گی۔

وہ ٹارگٹ تو کبھی نظر نہیں آیا البتہ یونٹ کو دشمن کی زبردست یلغار کا سامنا کرنا پڑا۔

سارا دن دشمن کا توپ خانہ ان پر آگ برساتا تھا اور رات کو پیدل فوج کے دستے چاروں طرف سے لہر در لہر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ یونٹ کے افراد کو ستانے کا کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ جنگ کے اختتام تک یونٹ کے 43 افراد شہید اور 115 زخمی ہو چکے تھے۔“

”14 جون کو دشمن نے ان کے ٹھکانوں پر بمباری شروع کر دی۔ شدید فائرنگ کے بعد پیدل دستوں نے مختلف سمتوں سے ان کی طرف بڑھنا شروع کیا، لیکن ان کی پیش قدمی ناکام بنا دی گئی۔ ان کے پاس جو آٹا اور دال موجود تھی، اسے پکانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ کسی قسم کی کمک آنے کی امید نہ تھی۔ وہ تین دن تک بھوکے پیاسے لڑتے رہے، لیکن ہمت نہیں ہاری۔ سپاہی طارق کو توپ خانے کے ایک بم کا ٹکڑا آ لگا جس سے اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے لیے مرہم پٹی کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ لیکن آفرین ہے اس نوجوان پر کہ وہ کوئی گلہ شکوہ زبان پر لائے بغیر ایک لائٹ مشین گن سنبھالے لیٹا رہا۔ راتیں ہولناک ہو گئی تھیں۔ ہر آہٹ پر دشمن کے سپاہیوں کی پیش قدمی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ اندھیرے میں فائر کھول دیتے تھے۔ 17 جون کی شام تک ان کے پاس 12.7 بور مشین گن کی صرف 300 گولیاں اور سب مشین گن کا صرف ایک میگزین باقی بچا تھا۔ دو لائٹ مشین گنوں کے لیے ایک گولی بھی باقی نہ تھی۔“

”راشن میں ان کے پاس صرف تین کلو آٹا اور ڈیڑھ کلو دال تھی۔ کھانا بنانے یا سردی سے محفوظ رہنے کو چولہے جلانے کے لیے مٹی کا تیل ندارد۔ میجر ارشد نے اسکردو سے گزرتے ہوئے کچھ خشک میوہ جات خرید لیے تھے، جو ابھی تک ان کے پاس محفوظ تھے۔ جوانوں کے پاس ٹافیاں اور کچھ مٹھائی تھی۔ اس سب کچھ کو اکٹھا کر لیا گیا اور بڑی کفایت سے سب مل کر کھاتے تھے کہ جسم و جاں کا رشتہ باقی رہے۔“

فوج کے پیشے کا انتخاب کرنے والے ذہن مضبوط، بلند ارادے تو ہوتے ہی ہیں ۔۔۔ تربیت انہیں کندن کر دیتی ہے۔ سرحدوں کی حفاظت اور مضبوط دفاع کے لیے ہمارے سپاہی اللہ کا انعام ہیں۔

”16 جون کو دشمن کے ایک جہاز نے 5 این ایل آئی کے انتظامی مستقر ”بدر بیس“ پر بمباری کی۔ یہ مستقر، لائن آف کنٹرول سے ایک کلو میٹر آگے واقع تھا۔ اس بمباری نے سخت تباہی پھیلائی۔ پانچ افسر، چھ جوان شہید اور کئی زخمی ہوئے۔ سارا ساز و سامان، اسلحہ بارود اور خوراک کے ذخائر تباہ ہو گئے۔ اس سے پہلے بھی اگلی چوکیوں میں ایمونیشن اور خوراک کی سخت قلت تھی۔ لیکن اس کے بعد تو رسد کا سلسلہ بالکل ہی منقطع ہو گیا۔ افسروں اور جوانوں کو کئی کئی دن کے فاقے کاٹنے پڑے۔ لیکن آفرین ہے ان پر کہ اس کے باوجود انہوں نے دشمن کے حملوں کے دوران کسی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ اور جوانمردی اور استقلال کے ساتھ اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے اور جب تک حکم نہیں ملا، اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔“

آخری سانس تک لڑتے رہنے کا جذبہ ہی فوج کا سرمایہ ہوتا ہے۔ حالات موافق ہوں یا ناموافق ۔۔۔ حوصلہ ہارنا یا بھاگنا فوج کو گوارا ہی نہیں ۔۔۔ یہ ہی دراصل ملک و قوم کی قوت ہے، اصل سرمایہ ہے ۔۔۔ اور مقام افسوس تو یہی ہے کہ راہبر ہی راہزن بن جائیں تو کوئی کیا کرے ؟؟؟

”16 جون کو رات بھر کی خون آشام جنگ کے بعد دشمن نے تولنگ کی چوٹیاں خالی کروائیں۔ بھارتی رسالے انڈیا ٹوڈے کے 5 جولائی 1999ء کے شمارے میں ان کے جنگی وقائع نگار کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی۔ تولنگ کی جھڑپ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بھارتی کمانڈروں نے دراندازوں کی قوت اور مزاحمت کی صلاحیت کا کتنا غلط اندازہ لگایا تھا۔“

"یہ ہمارے ہی سپاہی تھے جن کے متعلق بھارتی کمانڈر نے بالکل آغاز کی ایک بریفنگ کے دوران کہا تھا "اوپر جاؤ اور انہیں گردنوں سے پکڑ کر نیچے لاؤ۔"
فتح کس کو ملی، شکست کس کو۔ ہمارے سپاہی دشمن کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوئے۔ انہوں نے گردنیں ماریں بھی۔۔۔ مروائیں بھی۔۔۔ صد شکر۔۔۔ پکڑوائی نہیں۔۔۔ یہ کھیل کا میدان تھوڑی تھا۔۔۔!
سانحہ کارگل کے برپا کرنے کے حق میں ایک ہی بودی دلیل گھڑی گئی کہ مسئلہ کشمیر کو اجاگر کیا جاسکے گا جو نہایت ہی بھونڈی ثابت ہوئی۔۔۔ کیونکہ کتاب میں حکومتی کوششوں اور ان کے ثمر آور ہونے کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔
"یہ کارگل کے سانحے کے بعد کی بات ہے کہ بھارت نے کشمیر کی سرحدیں سیل کرنے کے لیے وہاں لوہے کی خاردار تاروں کی باڑ کھڑی کر دی۔ یہ اقوام متحدہ کی اس پالیسی کی صریح خلاف ورزی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ متنازعہ علاقوں کی سرحدیں کسی دیوار، خاردار تاروں یا باڑ کے ذریعے سیل نہیں کی جاسکتیں۔ ہم اس معاملے میں کچھ نہ کر سکے۔ جمہوری طور پر منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر جن کاسہ لیسوں اور حاشیہ برداروں کی حکومت قائم کی گئی تھی، وہ مسئلہ کشمیر کو جرات مندانہ طریقے سے حل نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کشمیر میں رائے شماری کے اس اصولی موقف سے دست برداری اختیار کی جس پر ہم شروع سے قائم تھے اور جسے اقوام متحدہ کی تائید بھی حاصل تھی۔ اس کے بجائے انہوں نے بھارت کو نئے موقف پیش کیے۔
بھارت کو سرحدیں سیل کرنے میں امریکیوں کی تائید حاصل تھی اور اس کی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ تاریخ میں پہلی بار امریکا کے فوجی دستوں نے بھارتی فوج کے ساتھ مل کر مقبوضہ کشمیر میں مشترکہ فوجی مشقیں کیں۔"
کتاب کا ہدف قاری ہے اور قاری کا ہدف ادراک ۔۔۔ اگر شعور کو جلا بخش فہم کی آرزو۔۔۔ جستجو ہو۔۔۔
اس کی تائید میں حرف آخر کے طور پر ایاز امیر کے قلم سے نکلے کچھ الفاظ شامل کرتی ہوں۔۔۔ جو صورت حال کو روشنی بخش وضاحت عطا کرنے کی قوت خداداد رکھتے ہیں۔
"یہ بات کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس بلا ضرورت حماقت اور قومی سانحے کے مرتکب افراد کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈرامے میکبتھ کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے سارے سمندر مل کر بھی خون کے ان دھبوں کو صاف نہیں کر سکتے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ خون کو چھپانا ضروری تھا اور اس کی یادیں محو کرنا لازم۔ یہ وہ ضرورت تھی جس نے کارگل کے منصوبہ سازوں کے ہاتھوں 12 اکتوبر کے سانحے کو جنم دیا۔
نواز شریف واشنگٹن اس لیے گئے تھے کہ وہ فوجی دستوں کی واپسی کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈنے میں صدر کلنٹن کی مدد حاصل کر سکیں تاکہ پاک فوج کو ذلت سے بچایا جاسکے۔
لیکن جب جرم، ہوس اقتدار کے ساتھ اشتراک کرتا ہے تو اپنے راستے خود تراشتا ہے۔
جنرل مشرف اور ان کے کارگل کے ساتھیوں نے اقتدار پر قبضہ کر کے جرنیلوں کے زیر سایہ، ملک پر ایک طویل رات مسلط کر دی۔ جس کے بد نتائج آج بھی پاکستان بھگت رہا ہے۔"
پاکستان میں دوسری وجوہات کی بنیاد پر تو کر دنیں ماری جاتی ہیں، لیکن ماضی میں کردہ گناہوں کی کوئی سزا نہیں۔ چنانچہ ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ کارگل پر کبھی کوئی تحقیقاتی کمیشن تشکیل نہیں دیا جائے گا۔ لیکن اور کچھ نہیں تو قوم کا اتنا حق تو ہے کہ اسے یہ پتا چلے کہ ہوا کیا تھا۔ یہ کتاب بطریق احسن اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔
تیری آواز کے اور مدینے۔۔۔ قوم جاننے کی جستجو کرے۔۔۔ تو کم از کم اپنے تماشاگروں کی صورت پہچان سکے۔۔۔!

دستک دستک دستک

شاہین رشید

راشد فاروقی

"کیسے ہیں راشد فاروقی؟"

"الحمد للہ"

"آج کل آپ ہر ڈرامے میں بہت خوب خوب صورت رول کر رہے ہیں۔ ڈرامہ سیریل "مائے نی" میں آپ کا رول پوزیٹو بھی تھا اور بہترین بھی تھا۔"

"بہت شکریہ۔ شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ کا کہ جس نے اتنی عزت دی ہوئی ہے۔"

"اب تو ماشاء اللہ اداکاری میں نکھار ہی نکھار آتا جارہا ہے۔"

بے ساختہ ہنستے ہوئے۔ "ایک ہی کام بہت دیر تک کرنے سے بہتری آہی جاتی ہے۔ اب تو کافی سال ہوگئے ہیں اس فیلڈ میں اور کافی کام بھی کرچکا ہوں تو بس بہتری آگئی۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ آپ واقعی بہترین پرفارمر ہیں۔ بیگم اور بچی کیا کہتی ہیں آپ کے بارے میں؟"

"کچھ بھی نہیں... جیسے سب پسند کرتے ہیں وہ بھی پسند کرتی ہیں۔"

"انسان کے بارے میں دوسرے تو جانتے ہیں، لیکن اندر کی بات تو بندہ خود ہی جانتا ہے۔ آپ اپنے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"ویسے تو دوسرے ہی بہتر بتا سکتے ہیں کہ میں کیسا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں بہت زیادہ صاف گو ہوں۔ جو بات دل میں ہوتی ہے کہہ دیتا ہوں اور یہ کہ مجھ میں حس مزاح بہت ہے۔ میری یہ عادت سب کو بہت پسند ہے اور ایک عادت جو مجھے خود بھی بری لگتی ہے کہ میں سگریٹ بہت پیتا ہوں۔"

"جب سمجھتے ہیں کہ یہ بری عادت ہے تو پھر اس عادت کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"اتنا آسان ہوتا تو کب کا چھوڑ چکا ہوتا مگر میں باوجود کوشش کے ایسا نہیں کرسکا۔"

"غصہ کب آتا ہے اور جھوٹ کب بولتے ہیں۔"

"دیکھیں جی... میں ہر ممکن کوشش کرتا ہوں کہ وقت کی پابندی کروں، لیکن پھر بھی اگر کوئی مجھے کہے کہ آپ وقت کی پابندی نہیں کرتے تو مجھے بہت برا بھی لگتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے اور جھوٹ تو میں اکثر بولتا ہوں اور کبھی کبھی خواتین کی جھوٹی تعریف بھی کردیتا ہوں۔" قہقہہ

"آپ ماشاء اللہ اتنا کام کررہے ہیں۔ کبھی دل چاہا کہ ملک سے باہر بھی کام کروں۔"

"بالکل چاہا اور چاہتا ہوں کہ ملک سے باہر جاکر کام کروں۔ مثال کے طور پر ہمارے برابر میں ہی انڈیا کی فلم انڈسٹری ہے۔ ٹی وی کی انڈسٹری ہے تو خواہش ہے کہ ان کی انڈسٹری میں کام کروں اور ہالی ووڈ کے لیے بھی کام کرنے کی بہت خواہش ہے۔"

"شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان ویسے ہی ہوجائیں جیسے لوگ ہیں اور جیسا اس جگہ کا ماحول ہے۔ کیونکہ اپنے آپ کو ماحول میں ڈھال لینا انسان کی بڑی خوبی ہے۔ پھر اپنی طبیعت کو خوش مزاج رکھیں۔ کیونکہ خوش مزاجی لوگوں کو بہت پسند ہوتی ہے۔"

"کام کے دوران خواتین آرٹسٹوں سے واسطہ رہتا ہوگا۔ ان کی کیا بات اچھی لگتی ہے۔ کیا بری لگتی ہے۔"

"کام کے دوران وہ بھی اپنے کاموں میں مصروف ہوتی ہیں اور میں بھی۔ چنانچہ کام کے دوران خواتین یا لڑکیوں سے بہت زیادہ بات چیت نہیں ہوتی اور جہاں تک اچھی اور بری بات کا تعلق ہے تو مجھے ساری لڑکیاں اچھی لگتی ہیں پھر ان کی ناپسندیدہ عادتیں بھی پسندیدہ ہوجاتی ہیں۔"

"کیا شوبز کو آپ پروفیشن سمجھتے ہیں؟"

"بالکل سمجھتا ہوں۔ میری نظر میں شوبز ایک فل ٹائم جاب ہے۔ جب آپ فیلڈ میں ہوتے ہیں تو آپ کو پوری توجہ کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اداکاری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے، کیمروں کے سامنے اپنے آپ کو اس کردار میں ظاہر کرنا جو وہ خود نہیں ہے۔ بڑا مشکل کام ہے۔"

"یوں تو آپ نے بے شمار سیریلز اور سیریز کیے ہیں۔ پھر بھی بہترین کس کو کہیں گے؟"

"بہت سارے ڈرامے ہیں جو میں کبھی بھولتا نہیں ہوں۔ ان میں ایک ڈراما تھا "گلو استاد" اور دوسری ایک فلم کی تھی "رام چند پاکستانی"۔ "گلو استاد" پہ بھی مجھے ایوارڈ ملا تھا اور "رام چند پاکستانی" پہ بھی مجھے ایوارڈ ملا تھا۔"

"اور کوئی کردار جو آپ کو کرنے کی خواہش ہو؟"

قہقہہ... "کیا سوال کردیا آپ نے۔ میں تو پانچ کروڑ کردار کرنا چاہتا ہوں۔ کرنے کو بہت کردار ہیں۔ لیکن میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔"

"تو کیا ہر کردار قبول کرلیتے ہیں؟"

"نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔ کردار تو دیکھ کر ہی لیتا ہوں مگر جب کردار ملتا ہے، مجھے پسند آتا ہے تو اسے ایک پروسس کے تحت تیار کرتا ہوں اور پھر پرفارم کرتا ہوں۔"

"کوئی دیرینہ خواہش؟"

"بہت عرصے سے دو خواہشات کو اپنے سینے میں پال رہا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں گاڑی خریدنا چاہتا ہوں۔ مگر خرید نہیں پارہا اور دوسری خواہش یہ ہے کہ میں اپنا ایک گھر لوں۔ اب دیکھیں کہ یہ خواہشات کب پوری ہوتی ہیں۔"

"کس کے غصے سے ڈرتے ہیں؟"

ہنستے ہوئے۔ "یہ بھی عجیب سوال ہے... مجھے اپنی بیوی اور ماں کے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

ڈاکٹر اعجاز وارثہ آر جے FM.103

"کیسے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ اور آپ کون سے ڈاکٹر ہیں۔ ایم بی بی ایس یا پی ایچ ڈی؟"

"الحمد للہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور جناب میں ایم بی بی ایس اور ایف سی پی ایس ڈاکٹر ہوں اور میں نے Histopathology میں اسپیشلائز کیا ہے۔"

"یہ Histopathology کیا ہوتا ہے؟"

"اس کے تحت ہم بیماریوں کو ڈائیگنوس کرتے ہیں۔ کون سی بیماری ہے۔ کون سا کینسر ہے، وغیرہ وغیرہ۔"

"اور شوبز ہنگامہ کیا ہے؟"

"میں شوبز ہنگامہ کا لونر ہوں یہ ہم نے 2007ء میں شروع کیا تھا اور اس میں ہم ان لوگوں کے انٹرویو کرتے ہیں جو اپنی فیلڈ میں نامور ہوتے ہیں۔ اس میں انڈیا کے شوبز کا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ ایک خالصتاً" پاکستانی ویب سائٹ ہے اور بہت کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔"

"شوبز کا شوق ہے اور ڈاکٹری آپ کا پروفیشن... زیادہ کیا پسند ہے۔"

"دونوں بہت پسند ہیں۔ اس لیے دونوں کو ساتھ لے کر چل رہا ہوں اور میری نظر میں دونوں ہی پروفیشن ہیں۔ کیونکہ دونوں میں ہی بہت توجہ کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔"

"پہلے کون سے ایف ایم کو جوائن کیا؟"

"سب سے پہلے 2005ء میں ایف ایم 92 "آپ کی آواز" کو جوائن کیا لاہور میں۔ دو سال کام کیا۔ بہت اچھے اچھے پروگرام پیش کیے پھر 2007ء میں ایف ایم 103 لاہور جوائن کیا اور ابھی تک اس سے وابستہ ہوں۔"

"پیسہ کس میں ہے ڈاکٹری میں یا ریڈیو میں؟"

"پیسہ دونوں فیلڈ میں ہے۔ اگرچہ ریڈیو میں بہت زیادہ نہیں ہے۔ البتہ ٹی وی میں بہت پیسہ ملتا ہے اور ہماری جو فیلڈ ہے اس میں کافی پیسہ ہے۔"

"ٹی وی چینلز کی وجہ سے ریڈیو سننے والوں کی تعداد کم ہوئی ہے یا زیادہ۔"

"میرے خیال میں زیادہ ہوئی ہے۔ کیونکہ ٹی وی تو باقاعدہ بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ جبکہ ریڈیو تو آپ جہاں پہ بھی جیسے بھی سن کر انجوائے کرلیتے ہیں۔"

"کالرز عموماً" کس قسم کی گفتگو کرتے ہیں؟"

"جس زمانے میں ہم تھے بہت تمیزدار اور شریف کالرز ہوا کرتے تھے۔ آج کل کے کالرز ایسے نہیں ہیں۔ جو ٹاپک دو اس پر بات نہیں کرتے۔ ویسے بھی کوئی متاثر کرنے والی باتیں نہیں کرتے۔ بس ہماری تعریف کردی۔ ہماری آواز کی تعریف کردی۔ ایک حد تک تو ان باتوں سے خوشی ہوتی ہے مگر ہر وقت نہیں۔"

"لڑکیوں کی زیادہ کالز آتی ہوں گی؟"

قہقہہ۔ "جی لڑکیوں کی بہت کالز آتی ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ آپ کا المیہ ہے کہ آپ کے پاس لڑکیوں کی بہت کالز آتی ہیں اور لڑکے کہتے ہیں کہ آپ جان بوجھ کر لڑکیوں کی کالز زیادہ لیتے ہیں۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ ان کی کالز ہی بہت آتی ہیں۔"

"وائس اوور کی آپ نے؟"

"نہیں جی... ٹائم ہی نہیں ملتا۔ ریڈیو، ٹی وی اور میری پروفیشن لائف نے مجھے بہت مصروف رکھا ہوا ہے۔"

"سیاست پسند ہے؟"

"ایک حد تک۔ مگر سیاست میں آنے کا شوق نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک کی سیاست بہت بدنام ہے۔ اس لیے یہاں آنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"چھٹی کے دن بیگم کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"نہیں... اور وہ کہتی بھی نہیں ہیں۔ کبھی موڈ ہو تو ہاتھ بٹا بھی دیتا ہوں مگر وہ کہتی ہیں کہ آپ آرام کریں تو اچھا لگتا ہے کہ بیگم کو میری تھکن کا احساس ہے۔"

"ملک سے باہر کہاں کہاں گئے؟"

"میں دبئی میں چار سال رہا ہوں۔ ترکی بھی جاچکا ہوں۔ سعودی عرب بھی جاچکا ہوں۔ کبھی کبھی مستقل باہر رہنے کو دل چاہتا بھی ہے۔ مگر جب یہاں کی زندگی دیکھتا ہوں تو یہی کہتا ہوں کہ پاکستان سے بہتر کوئی ملک نہیں۔"

"اللہ کرے کہ واقعی ہمارا ملک ایک مثالی ملک بن جائے" "آمین۔"

مایا علی

مایا علی کا تعارف یہ ہے کہ یہ فائزہ افتخار کے سیریل "اک نئی سنڈریلا" میں نئی سنڈریلا کا رول کررہی ہیں اور بہت ہی اچھا کررہی ہیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی ان کا تفصیلی انٹرویو کریں گے۔ ڈرامے میں ان کا نام "مینا" ہے۔

"نئی سنڈریلا میں بہت اچھا رول نبھا رہی ہیں۔ انتخاب کیسے ہوا؟"

"میڈیا سے میری دوستی پرانی ہے۔ ڈاکٹر ہاشم حسین کے ساتھ میں پہلے بھی کام کرچکی ہوں۔ ان کے ایک سیریل میں میں نے ایک مختصر رول کیا تھا۔ شاید اس میں ان کو میری پرفارمنس پسند آئی اور انہوں نے "اک نئی سنڈریلا" کا رول مجھے دے دیا۔"

"رول کافی اہم اور مرکزی ہے۔ کیا احساسات تھے اس رول کے ملنے پر؟"

"بہت خوشی ہوئی تھی اور بہت ڈر رہی تھی کہ پتا نہیں یہ کرسکوں گی بھی یا نہیں مگر ڈائریکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے پوری امید ہے کہ آپ یہ رول کرلیں گی اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ذرا بھی مشکل نہیں ہوئی۔ جہاں مشکل ہوئی ڈائریکٹر نے مجھے اتنے اچھے طریقے سے سمجھایا کہ پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوا۔"

"پہلی سیریل سے ہی شہرت مل گئی۔ امید تھی؟"
"نہیں کوئی امید نہیں تھی۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ اللہ نے مجھے کامیاب کیا اور لوگ مجھے میرے اصلی نام سے کم اور "میشا" کے نام سے زیادہ جانتے ہیں اور جب مجھے دیکھ کر کہتے ہیں کہ آپ میشا ہیں نا... تو بہت اچھا لگتا ہے۔"
"آپ کہہ رہی تھیں کہ میڈیا سے پرانی دوستی ہے تو کب سے ہیں اس فیلڈ میں؟"
"میں ماس کمیونیکیشن کی طالبہ ہوں اور میں نے ایک نیوز چینل میں انٹرن شپ بھی کی۔ انٹرن شپ کے دوران ہی مجھے ایک پروگرام کی میزبانی کی آفر آئی جو کہ بظاہر بہت بڑی بات تھی اور میں اپنے آپ کو میزبانی تک ہی محدود رکھنا چاہ رہی تھی لیکن جب ڈرامے میں کام کرنے کی آفر آئی تو انکار نہ کرسکی۔"
"ماس کمیونیکیشن والوں کا زیادہ رجحان حالات حاضرہ کی طرف ہوتا ہے۔ آپ کا رجحان ہے اس طرف؟"
"جی میرا بھی رجحان ہے اس طرف۔ میں نے نیوز چینل کے لیے کچھ پروگرام کیے۔ آؤٹ ڈور پروگرامز بھی۔ لوگ اپنے مسائل بتاتے ہیں اور جب میں انہیں بنیادی سہولتوں سے محروم اور پریشان دیکھتی ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے مگر ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہوتا۔"
"جو مسائل ہمارے ملک میں ہیں اس کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ آپ نے ان کے نمائندوں سے بات کی؟"
"بالکل کی۔ مگر وہ کب مثبت جواب دیتے ہیں۔ عوام کو احتجاج کا حق ہے مگر اس انداز میں کریں کہ حکومت پر اثر تو ہو۔"
"فیوچر پلاننگ کیا ہے؟"
"کوئی خاص نہیں... اگر آپ اداکاری کے بارے میں پوچھیں تو مجھے بس ایسا کردار چاہیے جو بہت ہی مشکل ہو اور میں اسے کامیابی سے کرلوں۔"
"کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"
"نام تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ماہا علی ہے۔ 27 جولائی میری ڈیٹ آف برتھ ہے۔ کوئن میری کالج سے ماس کمیونیکیشن میں ایم اے کیا۔ والد صاحب بزنس مین ہیں اور امی گھریلو خاتون ہیں۔"
"سارا دن کی روٹین کیا ہے؟"
"صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے۔ روٹین کوئی خاص نہیں ہے۔ روز کا شیڈول روزمرہ کے کاموں کے تحت تیار کرتی ہوں۔"
"فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"
"فارغ اوقات میں گھومنا پھرنا اور والدین کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے' شاپنگ کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔"
"گھریلو امور؟"
"جی بالکل... گھریلو لڑکی ہوں۔ اس لیے سب کچھ آتا ہے۔ پکانے کا شوق ہے' پکاتی ہوں' مگر زیادہ نہیں کیونکہ ٹائم ہی نہیں ملتا۔"
"چلو ان شاء اللہ پھر تفصیلی بات کریں گے۔"
"جی ضرور۔"

☼

بندھن

فاطمہ آفندی ہمراہ کنور ارسلان

شاہین رشید

بندھن کے سلسلے میں اس مرتبہ ہم بہت ہی نئے جوڑے سے آپ کی ملاقات کروائیں گے۔ دونوں شوبز کے معروف نام ہیں اور کافی ڈراموں میں ایک ساتھ بھی کام کرچکے ہیں۔ جی! ذکر ہے فاطمہ آفندی اور کنور ارسلان کا۔ فاطمہ نے ڈراما سیریل "ماسی اور ملکہ" اور "کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" سے شہرت حاصل کی۔ جبکہ کنور ارسلان نے "لڑکیاں محلے کی' بہو رانی اور میرے سنوریا" سے شہرت حاصل کی۔

تو پھر دیکھتے ہیں کہ شوبز کے دو ستارے "ایک" کیسے ہوئے۔

کنور ارسلان

کنور ارسلان اردو اسپیکنگ راجپوت ہیں۔ یہ 27 اکتوبر 1985ء کو اسلام آباد میں پیدا ہوئے۔ چھ بہن بھائیوں میں ان کا نمبر تیسرا ہے۔ ان کے والد کا نام ظفر اقبال ہے اور وہ بینکر ہیں جبکہ والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ جب 2011ء میں ہم نے ان کا انٹرویو کیا تھا تو انہوں نے شادی کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ ان شاء اللہ چار' پانچ سال بعد کروں گا اور اپنی پسند سے کروں گا۔ پسند والی بات تو سچ ثابت ہوئی۔ البتہ چار' پانچ سال والی بات غلط ثابت ہوئی۔

"کیسے ہیں کنور ارسلان اور بہت بہت مبارک باد قبول کریں شادی کی۔ کتنا ٹائم ہوگیا ہے؟"

"جی بہت شکریہ۔ یہی کوئی دو مہینے تقریباً"۔ آپ کے انٹرویو تک تین ماہ ہوجائیں گے۔"

"کیسی گزر رہی ہے؟"

"الحمد اللہ بہت اچھی۔"

"پہلے تو سنا تھا کہ صرف نکاح ہوگا اور رخصتی ایک سال بعد۔ پھر اچانک کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ ارادہ تو یہی تھا لیکن نکاح کے بعد سوچا کہ دیر کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لیے نکاح تو ہو ہی گیا ہے۔ رخصتی بھی ہوجانی چاہیے۔ بس تو پھر رخصتی بھی کروالی۔"

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ صبر نہیں ہوا ہوگا۔ کیوں ایسا ہی ہے نا۔"

قہقہہ۔ "بس جی بڑوں کا فیصلہ تھا۔ ہم کیا کرسکتے تھے۔"

"فاطمہ سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟"

"آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اس کا تعلق اسی فیلڈ سے ہے اور میرا بھی۔ تو میرا خیال ہے کہ کسی ڈرامے کے سیٹ ہی ملاقات ہوئی ہوگی۔"

"تو پھر کب فاطمہ اچھی لگنے لگی اور کس بات نے بہت متاثر کیا؟"

"سچ بتاؤں تو پہلی ملاقات میں ہی فاطمہ بہت اچھی لگی اور اس کی خوش اخلاقی' اس کی نیچر اور بہت سی باتوں نے پہلی ہی ملاقات میں میرے دل میں اس کے لیے ایک جگہ بنالی تھی۔ اس وقت ایسا کوئی احساس نہیں تھا کہ اس کو شریک سفر بنانا ہے اور میرے خیال میں پہلی ملاقات میں ایسا کوئی سوچتا بھی نہیں ہے۔"

"پھر کب احساس ہوا کہ فاطمہ کو شریک سفر بنالینا چاہیے؟"

"یہ تو ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ کب ایسا ہوا۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ چند ملاقاتوں کے بعد ہی ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس لڑکی میں ضرور ایسی کوئی بات ہے کہ جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے اور بس پھر مجھے یہ اتنی اچھی لگنے لگی کہ میرے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے اپنی زندگی میں شامل کرلینا چاہیے۔"

"پھر مایوسی تو نہیں ہوئی؟"

"ارے نہیں۔ اور ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے۔ اللہ کرے ایسا کبھی نہیں ہو۔ ان شاء اللہ۔"

"کنور! آپ چاہیں گے کہ فاطمہ ایک روایتی بیوی کی طرح آپ کے سارے کام کرے۔ جیسے کھانا پکانا' کھانے پر انتظار کرنا' کپڑے استری کرنا' وغیرہ وغیرہ؟"

"میں صرف یہ چاہوں گا کہ فاطمہ جو بھی میرا کام کرے وہ دل سے کرے اور مجھے صرف وہ اچھا لگے گا جو فاطمہ میرے لیے خود سے اور دل کے ساتھ کرے گی۔"

"فاطمہ سب سے اچھا کیا پکاتی ہے آپ کے لیے۔"

"ویسے تو سب ہی کچھ اچھا پکالیتی ہے۔ مگر مجھے اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا کیک بہت پسند ہے۔"

"ماشاء اللہ دو سال سے آپ ایک دوسرے کو پسند کررہے تھے تو ان دو سالوں میں تحفے تحائف کا تبادلہ بھی ہوا ہوگا۔ گفٹ میں کیا لینا دینا پسند ہے؟"

"جی بالکل ہوا تحفے تحائف کا تبادلہ۔ لیکن مجھے گفٹ دینا زیادہ اچھا لگتا ہے اور میں زیادہ تر پرفیوم' ڈریس وغیرہ ہی دیتا ہوں اور جب فاطمہ میرے ساتھ ہو تو جو بھی اسے پسند ہو میں لے کردے دیتا ہوں۔"

"فاطمہ کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں۔"

"نیچر کے حساب سے فاطمہ بہت اچھی اور صاف گو ہے۔ تھوڑی ضدی ہے اور یہ اس کی عمر کا تقاضا ہے اور زیادہ فضول خرچ نہیں ہے' تھوڑی سی ہے۔"

فاطمہ آفندی

فاطمہ آفندی کا تعلق سندھی فیملی سے ہے۔ ان کی والدہ فوزیہ مشتاق بھی اسی فیلڈ سے وابستہ ہیں اور ان کی خالہ فرح ندیم بھی۔ فاطمہ 17 دسمبر 1990ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ان کی دو بہنیں

اور ایک بھائی ہے اور یہ گھر میں سب سے چھوٹی ہیں۔"

"کیسی ہو فاطمہ اور شادی مبارک ہو۔ لگتا ہے سب کچھ بہت اچانک ہوا۔ اچانک منگنی ہوئی۔ پھر پتا چلا نکاح ہوگیا۔ نکاح کے بعد کہا گیا کہ سال تک رخصت ہوگی۔ پھر چند دن بعد پتا چلا کہ رخصتی بھی ہونے والی ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟"

"جی میں ٹھیک ہوں شکریہ اور جی بالکل سب کام ایک کے بعد ایک ہوتے چلے گئے۔ نکاح کے بعد سسرال والوں کا زور تھا کہ رخصتی بھی دے دیں تو بس پھر رخصتی بھی ہوگئی۔"

"تمہاری پسند کو کتنا عمل دخل تھا یا والدین کی پسند سے شادی ہوئی؟"

"جی ہم دونوں کی ہی پسند سے شادی ہوئی اور ہم دونوں ایک دوسرے کو دو سال سے پسند کرتے تھے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ کچھ سیریلز میں کام بھی کیا تھا اور جب دو سال قبل "لڑکیاں محلے کی" کیا تو تب ہی سے ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے اور پھر جب ایک دن انہوں نے مجھے پروپوز کیا تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ اپنے گھر والوں کو بھیج دیں۔"

"آپ سندھی فیملی سے، کنور ارسلان راجپوت فیملی سے تعلق رکھتے ہیں تو آج کل جو حالات چل رہے ہیں اس کی وجہ سے کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگ خراب نہیں ہیں۔ ہمارے حکمرانوں نے سب کچھ خراب کیا ہوا ہے۔ لوگ تو آپس میں بہت محبت کرتے ہیں۔ تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔"

"تم دونوں کے درمیان عمروں کا کتنا فرق ہے اور کیا فرق ضروری ہے؟"

"میرے اور ان کے درمیان پانچ سال کا فرق ہے اور فرق ہونا بہت ضروری ہے اور کم سے کم پانچ، چھ سال کا فرق تو ضرور ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر ہم عمر ہوں گے تو انڈر اسٹینڈنگ کا مسئلہ ہوگا۔ لڑائی، جھگڑے ہوں تو کوئی کسی کا احترام نہیں ہوسکے گا اور بہت زیادہ فرق ہو تو پھر دونوں ایک دوسرے سے بور ہوجاتے ہیں۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی؟"

"منگنی کوئی لمبی چوڑی رسم کے ساتھ نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ نکاح سے کچھ عرصہ پہلے بات پکی ہوئی تھی۔ اسے آپ منگنی کا نام دے سکتی ہیں۔ جو منگنی کی رسم ہونی تھی وہ نکاح میں تبدیل ہوگئی اور جب نکاح ہوگیا تو رخصتی پر زور پڑ گیا تو پھر رخصتی بھی ہوگئی۔ رخصتی کے لیے کنور اور ان کی فیملی کو جلدی تھی اور ان کا کہنا تھا کہ اگر سال کا وقفہ ڈالیں گے تو پھر سے شادی کی تیاریاں۔ پھر سب کو بلانا اور اہتمام کرنا تو اس سے بہتر ہے کہ اب سب اکٹھے بھی ہیں تو رخصتی کا فریضہ بھی ادا ہو ہی جانا چاہیے تو 17 نومبر کو نکاح ہوا اور 29 نومبر کو رخصتی ہوگئی تھی۔ فرسٹ دسمبر کو ولیمہ ہوگیا تھا۔"

"ڈراموں میں تو بہت بار دلہن بنیں۔ سچ مچ کی دلہن بنیں تو کیا احساسات تھے؟"

"سچ مچ کی دلہن بننے میں یہ احساسات تھے کہ میں اپنی مرضی کی دلہن بنی تھی۔ کیونکہ ڈرامے کی دلہن کو تو کوئی عجیب سا جوڑا پکڑا دیتے ہیں۔ نہ اس کی فٹنگ ہوتی ہے اور نہ ہماری مرضی ہوتی ہے۔ اصل میں جب یہ موقع آتا ہے تو سب کچھ اپنے ہاتھ میں اور اپنی مرضی سے ہوتا ہے اور آپ کو دیکھنے والے بھی آپ کے اپنے رشتے دار اور سب سے بڑھ کر میاں صاحب ہوتے ہیں۔"

"اپنا روپ کیسا لگا تھا اور رخصتی کے وقت کیا تاثرات تھے؟"

"اپنا روپ بہت اچھا لگ رہا تھا اور رخصتی کے وقت کافی رونا آیا تھا مگر میرے کزن وغیرہ مجھے چھیڑ رہے تھے کہ یہ تو ایکٹنگ کررہی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ مجھے والدین کا گھر چھوڑنے پر سچ مچ رونا آرہا تھا۔"

"سسرال کا ماحول کیسا لگا اور شادی سے پہلے ان کے گھر آنا جانا تھا؟"

"جی شادی سے پہلے میں کنور کے گھر والوں سے ملی ہوئی تھی۔ سسرال کا ماحول اچھا ہے۔ جوائنٹ فیملی ہے۔ کنور کی چار بہنیں ہیں جو شادی شدہ ہیں اور باقی گھر میں والدین کے علاوہ ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ سب بہت پیار محبت کرنے والے لوگ ہیں۔"

"ہنی مون کے لیے کہیں نہیں گئیں اور شادی کی رسموں میں کون سی اچھی لگی کون سی بور لگی۔"

"مارچ، اپریل کے لیے ہم نے پلان کیا ہوا ہے اور ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا کہ کہاں جانا ہے۔ رسمیں تو ساری ہی اچھی لگتی ہیں۔ بری یا بور تو کوئی بھی نہیں لگی اور زیادہ رسمیں ہماری طرف سے ہی ہوئی تھیں اور میرے خیال میں سب رسمیں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔"

"تم بھی کام پہ جاتی ہو، کنور بھی۔ دونوں کی فیلڈ بھی ایک ہے۔ تو گھر والے یعنی سسرال والے کچھ نہیں کہتے کیا؟"

"نہیں نہیں۔ کچھ نہیں کہتے۔ کیونکہ انہیں پہلے سے پتا ہے کہ میں کام کرتی ہوں اور مجھے کام کرنا ہے اور کوئی مسئلہ ہوتا تو پھر شادی ہی کیوں ہوتی۔"

"شادی میں بے حد اسراف ہوتا ہے۔ تو ایسا ہونا چاہیے یا سادگی کو اپنانا چاہیے؟"

"ہم دونوں کی شادی بالکل ٹھیک ہوئی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں فیملیز نے کوئی بے جا اسراف نہیں کیا تھا اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملا کہ دیکھو کتنا خرچ کیا یا یہ کہ کتنی سادگی سے کیا اور جو جہیز کی بات ہے تو لڑکی کو اس کے والدین جو کچھ بھی دیتے ہیں وہ اس کے استعمال کے لیے ہی ہوتا ہے۔ تو جب ہماری شادی ہوئی تو ہم نے فنکشن پہ زیادہ خرچ کرنے کے بجائے اپنے کمرے کے فرنیچر اور دیگر چیزوں پہ خرچہ کیا جو یقیناً "ہم ہی دونوں استعمال کریں گے۔"

"دو سال کی دوستی کے بعد شادی کے بعد کنور میں کیا تبدیلیاں دیکھیں۔ عادت و اطوار میں اور مزاج میں۔"

"کوئی فرق نہیں آیا۔ جیسے شادی سے پہلے تھے، ویسے ہی اب بھی ہیں اور کنور میں اچھی عادتیں بہت ہیں۔ البتہ ایک بری عادت ہے کہ ان کو غصہ جلدی آجاتا ہے اور اس وقت بہت آتا ہے جب مجھے تیار ہونے میں ذرا دیر ہوجائے۔"

"کھانے کے معاملے میں کیسے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ تم ہی پکاؤ، تم ہی سب کچھ کرو، ایک روایتی بیوی کی طرح سارے کام تم کرو؟"

"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں کہتے، بلکہ کہتے ہیں کہ جو تمہارا دل چاہے تم کرو۔ انہوں نے کوئی رول بک نہیں بنائی کہ یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے۔ اور جہاں تک کھانا پکانے کی بات ہے تو ابھی کچھ ہی دن پہلے میں نے میٹھے میں ہاتھ ڈالا ہے اور کسی پلاننگ کے تحت میٹھے میں ہاتھ نہیں ڈالا۔ بلکہ بس میں کچن میں گئی اور میٹھا پکا لیا۔ کیک بنایا کیونکہ کیک ہی مجھے سب سے اچھا بنانا آتا ہے اور ابھی تک موقع نہیں ملا کنور کو اپنے ہاتھ سے کچھ پکا کر کھلانے کا اور میں وائٹ چکن کڑاہی اور کباب بہترین بناتی ہوں۔"

"لڑائی ہوئی ابھی تک۔ اور کس بات پر کنور کا موڈ آف ہوجاتا ہے؟"

"نہیں لڑائی تو ابھی تک نہیں ہوئی۔ بس ہلکی پھلکی نوک جھونک ہوئی ہے۔ وہ بھی دیر سے تیار ہونے پر اور میرا موڈ تو بہت سی باتوں پر خراب ہوجاتا ہے۔ میں بہت حساس ہوں اس معاملے میں۔ یعنی مزاج کے معاملے پر اور کنور کا موڈ تو بس وہی بات کہ کسی بھی جگہ جانے میں دیر نہ ہو۔"

"فضول خرچ کون ہے۔ شادی کے بعد پہلی شاپنگ کس چیز کی کی؟"

"فضول خرچ کنور ہیں۔ اور اپنے کپڑوں پہ زیادہ خرچ کرتے ہیں اور شاپنگ نہیں کی۔ کیونکہ ابھی اتنا بہت کچھ تو مل گیا ہے۔ پہلے انہیں تو استعمال کرلوں، پھر جاؤں گی شاپنگ کرنے۔"

"کمرے میں آکر پہلا جملہ کنور نے کیا کہا تھا؟"

"ہنستے ہوئے کہا تھا کہ مجھے یقین نہیں آرہا کہ آخر کار ہماری شادی ہو ہی گئی۔"

"کیوں، کیا کوئی تگ و دو کرنی پڑی تھی گھر والوں کو منانے میں؟"

”تھوڑا بہت پرابلم تھا کنور کی فیملی کی طرف سے۔ بس کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں تھا کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ ہماری طرف سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سب کام خیر خیریت سے ہو گئے۔“

”اگر کبھی کنور کہیں کہ یہ فیلڈ کو چھوڑ دو تو کیا چھوڑ دو گی؟“

”شادی سے پہلے ہی میں نے کنور کو کہہ دیا تھا کہ اگر آپ چاہیں گے تو میں کام نہیں کروں گی تو کنور نے کہا تھا کہ میں منع نہیں کروں گا۔ تم کرو۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری صلاحیتوں کو زنگ لگے۔ تمہیں عادت ہے کام کرنے کی تو تم ضرور کام کرو۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”تو پھر سوچا کچھ؟ کیونکہ اس فیلڈ میں شہرت اور پیسے کی بہت کشش ہوتی ہے؟“

”نہیں ابھی کچھ نہیں سوچا اور بے شک اس فیلڈ میں شہرت اور پیسہ بہت ہے۔ مگر شوہر کا حکم اور گھر کا سکون تمام چیزوں پر بھاری ہے۔“

”واؤ۔“

”میں تو پہلے بھی زیادہ کام نہیں کرتی تھی اور میں اس بات کو تسلیم کرتی ہوں کہ میں کام کے معاملے میں بہت سست ہوں۔ ایک تو مجھے زیادہ کام کرنے کا شوق نہیں ہے۔ پھر میں ایک وقت میں ایک ہی ڈراما کرتی ہوں۔“

”کیوں؟“

”میری عادت نہیں ہے، ہر ڈرامے میں نظر آنے کی۔ میں گھر بیٹھنے کی بہت زیادہ شوقین ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے میں گھر بیٹھوں، آرام کروں اور کم کام کروں۔ میں نے اپنے آپ پر کبھی بھی کام کا زیادہ بوجھ نہیں ڈالا۔ میں ”کاش میری تیری بیٹی نہ ہوتی“ کر رہی تھی تو میں صرف وہی کر رہی تھی۔ میں نے کوئی اور ڈراما سائن نہیں کیا اور آئندہ بھی کروں گی تو ایک وقت میں ایک ہی ڈراما کروں گی۔ اس لیے مجھے اس بات کا کوئی ایشو نہیں ہے کہ میں گھر پر ٹائم دے سکوں گی یا نہیں۔“

”آج کل کر رہی ہو۔ یا چھٹیاں لی ہوئی ہیں؟“

”چھٹیاں لی ہوئی تھیں اور جب کنور لاہور گئے تب میں نے اپنی شوٹس میں حصہ لیا اور زیادہ سے زیادہ کام مکمل کرالیا۔“

”آپ دونوں ایک دوسرے کو کس نام سے بلاتے ہیں اور تمہیں سادگی میں پسند کرتے ہیں یا فیشن میں۔“

”ہم دونوں ایک دوسرے کو نام سے ہی بلاتے ہیں اور چونکہ ابھی کچھ ہی ماہ ہوئے ہیں تو کہتے ہیں کہ جب میں گھر آؤں تو تم اچھی طرح سے تیار رہا کرو۔“

”میاں، بیوی کو اپنے مسائل خود حل کرنے چاہئیں یا تیسرے بندے کو بھی انوالو کرنا چاہیے۔“

”تیسرا بندہ کبھی کسی کے مسائل حل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ وہ حل کرنے کے بجائے معاملے کو بگاڑتا ہی ہے۔ اس لیے اپنے مسائل خود ہی حل کرنے چاہئیں۔“

”کوئی ایسی بات جو تم شادی کے بعد کنور سے کہنا چاہ رہی ہو اور کہہ نہ پا رہی ہو؟“

ہنستے ہوئے۔ ”مجھے کنور سے جو کہنا ہوتا ہے، میں منہ پر ہی کہہ دیتی ہوں اور مزے کی بات یہ ہے کہ میں تو منہ پھٹ ہوں ہی۔ کنور مجھ سے زیادہ منہ پھٹ ہیں۔“

”کس عمر میں لڑکیوں کو شادی کرنی چاہیے؟“

”میرے خیال میں عمر کی کوئی قید نہیں ہونی چاہیے۔ جب آپ کے گھر والوں کو لگے کہ جو رشتہ آیا ہے وہ آپ کے لیے پرفیکٹ ہے اور آپ خوش رہ سکتی ہیں تو پھر فوراً شادی کرلینی چاہیے۔ بس بیس سال سے پہلے نہیں کرنی چاہیے۔ کافی چھوٹی ہوتی ہے یہ عمر۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فاطمہ اور کنور سے اجازت چاہی۔

رضیہ جمیل

خط بھیجنے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع-37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔ رب کریم سے سب کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

پہلا خط واہ کینٹ سے نوشین ثاقب کا ہے، لکھتی ہیں

شعاع سے رشتہ تو اتنا پرانا ہے تب سے جب لفظوں کے مطلب و مفہوم سے رشتہ داری نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن اس رشتے میں مضبوطی 2003-04ء میں پیپر کالج پڑھنے کے بعد آئی۔ بلاشبہ میری شخصیت و کردار کی تکمیل میں شعاع کا بڑا حصہ ہے۔ اس بار رمشا خالد کو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ وہ واقعی ایک باصلاحیت اضافہ ہے ہماری فیملی کا۔ اسی طرح سمیرا حمید نے بھی ممتا کے جذبے کو بہت خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا اور واقعی ماں صرف محبت ہی لکھنا جانتی ہے۔ کیونکہ ہر عورت کا اصل عشق اس کی اولاد ہوتی ہے۔ چاہے وہ بے اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ بقیہ افسانے اور ناولٹ بھی اچھے لگے۔ لیکن آج مجھے خط لکھنے پر کسی مصنفہ کی تحریر نے مجبور نہیں کیا۔ بلکہ ثمینہ اکرم۔ کراچی کے ”کیا کھویا کیا پایا“ کے جواب نے مجھے مجبور کیا۔ ہر ماہ کی طرح میں معمول کی طرح شعاع بے تابی سے پڑھ رہی تھی کہ میں نے ثمینہ اکرم جی کو پڑھا اور یقین کریں انہیں پڑھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر روئی ہوں۔ مجھے اپنے بیٹے ”رایان“ میں معیز کا گمان ہوا۔ پھر واقعی مجھے پتا چلا کہ کیسے سانسیں نوحہ کناں ہوتی ہیں اور دل کی دھڑکن کب بین کرتی ہے اور پھر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں یہ چند ٹوٹے پھوٹے فقرے صرف اس لیے لکھ رہی ہوں کہ میں ثمینہ اکرم صاحبہ کو بتا سکوں کہ آپ اکیلی نہیں ہیں۔ آپ کی پوری بات پڑھ کر اطمینان ہوا کہ اس دل خراش کیفیت میں بھی آپ نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ آپ نہ صرف ایک شہید کی ماں ہیں، بلکہ آپ ایک بہادر مسلمان بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بیٹے کے درجات بلند کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (اور بھی زیادہ) آمین۔ آپ کے سجائے سب سلسلے مجھے بہت پسند ہیں اور عمیرہ احمد میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہے۔ جن کی وجہ سے میں ایک ایسی فیملی کا حصہ بنی ہوں جو ہر غم اور خوشی میں ہمارے ساتھ ہے۔

ج۔ پیاری نوشین! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ اب یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

دیا امید چوہدری کوٹ متہ ضلع گجرات سے لکھتی ہیں

میں عمیرہ احمد کے بعد نمرہ احمد کے پاکستان کی بیٹی ہونے پر فخر کرتی ہوں۔ نمرہ کی تحاریر کی میں حد سے زیادہ مداح ہوں۔ مصحف سے ایمان تازہ کرنے کے بعد اب ”جنت کے پتے“ میری قدم قدم پر اصلاح کر رہی ہے۔ عائشے گل میرا پسندیدہ کردار ہے۔ بہارے گل جیسی بچی اللہ پاک ہر ماں کو دے۔ ہر نصیحت پر بلا چوں و چرا عمل کرتی ہے اور شرارتیں بھی مزے کی کرتی ہے۔ مجر احمد کا وہ پیغام جس میں اس نے حدیث پاک بیان کی تھی اور پردے سے متعلق حیا کو ڈھارس ملی۔ وہ پیغام زبردست تھا۔ نہ صرف میں بلکہ اور بھی جانے کتنی لڑکیاں خود کو بدل چکی ہوں گی۔

نمرو جی! اللہ پاک آپ کو صدقہ جاریہ کا اجر عطا فرمائیں۔ (آمین)

ج ۔ دیا جی! اچھی باتوں کو سن کر یا پڑھ کر عمل کرنے کی توفیق بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے' خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اس پر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ثابت قدم رکھے۔ (آمین)

نمرہ نے انٹرویو دیا تو ضرور شائع کریں گے۔

صائمہ فیاض نے ہنڈال قصور سے لکھا ہے

اس ماہ کا رسالہ بیسٹ تھا۔ "جنت کے پتے" کی تو کیا ہی بات ہے۔ عالیہ بخاری اب جویا اور معاذ کی بھی شادی کروادیں۔

ج ۔ پیاری صائمہ! شعاع آپ کو پسند آیا' بہت شکریہ۔ آپ نے اپنی دوستوں اور کزنز کو پرچے کے ذریعے مبارک باد دی ہے۔ ان سب کو آپ کی طرف سے مبارک باد پہنچا رہے ہیں۔ لیکن ان کے نام لکھنے سے قاصر ہیں۔ یہ سلسلہ پیغامات کے لیے نہیں ہے۔

سائرہ عبید نے ڈنگہ سے لکھا ہے

شعاع کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ خوب صورت الفاظ' پختہ اور دل کو چھو جانے والی تحریریں پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہم بھی اسی دنیا میں ہیں جہاں کہیں تو حیا اور جہان کے ساتھ ترکی کی سیر' تو کہیں ہیشا کے ساتھ اک نئی دنیا کی سیر کرتے ہوئے اور کہیں ہادی کے ساتھ پر اعتماد انداز کے ساتھ ایک شان دار حویلی کی سیر کرتے ہوئے ایک عجیب سے لطف کا احساس ہوتا ہے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ فائزہ افتخار ہنساتے ہوئے اور کنیز نبوی رلاتے ہوئے دل کا عجیب حال کردیتی ہی اور پھر ایک نیا گدگداتا ہوا احساس جب سامنے آتا ہے تو ہونٹوں پہ بے اختیار مسکان بکھیر دیتا ہے اور یہ خوب صورت احساس محبت ہے جو دلوں کو رونق بخشتا ہے۔ دوسری بات میں شعاع کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں؟

ج ۔ پیاری سائرہ! بہت خوب صورت انداز میں آپ نے شعاع کی تعریف کی' بہت شکریہ۔ سالانہ خریدار بننے کے لیے 600 روپے اس ایڈریس پر منی آرڈر کردیں۔
شعاع 37 ۔ اردو بازار کراچی۔

اپنا ایڈریس صاف صاف لکھیں۔ تاکہ پرچا آپ تک پہنچ سکے۔

ثمرین ارشد نے میرپور خاص سندھ سے لکھا ہے

اس بار ٹائٹل بہت ہی زبردست تھا۔ پکوان تو بہت مزے مزے کے ہوتے ہیں ور ... میں بس اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ میری پوری شخصیت کو سنوارنے میں ان پرچوں کا ہاتھ ہے۔ میری فیورٹ رائٹرز میں نمرہ احمد' فرحت اشتیاق' عمیرہ احمد' آسیہ رزاقی اور سائرہ رضا شامل ہیں۔ آپ سے ایک ریکویسٹ ہے۔ پلیز جیو کے نیوز اینکر منصور علی خان کا انٹرویو شائع کیجیے گا۔

ج ۔ ثمرین! آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی' ہم آپ سے ہی نہیں اپنی سب قارئین سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں اہمیت دیتے ہیں۔

آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ اپنے شوہر صاحب کو دکھادیں۔ تاکہ وہ آپ کو آئندہ خط لکھنے سے منع نہ کریں۔

انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچارہے ہیں۔

زکعیم احمد نے جھنگ صدر سے لکھا ہے

کراچی کے حالات سن سن کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اللہ کراچی کے حالات کو ٹھیک کردے۔ (آمین)

ہم کو "جنت کے پتے" کہانی بہت اچھی لگتی ہے۔ جہان پاشا اور حیا بہت ہی مضبوط کردار ہیں۔ "ستارہ شام" بھی اچھی چل رہی ہے۔ "حیات ممکن ہے" میرا احمد نے بھی بہت اچھی کہانی لکھی۔ "آشنا ہیں تیرے قدموں میں" شفق بالکل ہماری دوست انجم کی طرح ہے۔ ساری کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔

ج ۔ زکعیم! کراچی کے حالات دیکھ کر ہمارے دل پر جو گزرتی ہے بتا نہیں سکتے۔ یہاں ہر شخص خوف کے سائے میں زندہ ہے۔ کاروبار زندگی معطل ہوکر رہ گیا ہے۔ کسی بھی وقت شہر بند کرادیا جاتا ہے۔ سچ تو ہے کہ اس وقت کراچی کے لیے اجتماعی دعا کی ضرورت ہے۔ جو لوگ کراچی کا امن تباہ کررہے ہیں' بے گناہ لوگوں کو شہید کررہے ہیں ان کو اور ان کی پشت پناہی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نیست و نابود کردے۔ (آمین)

شیبا گل' ریما خان اور ندا گل لکھتی ہیں

سرورق نئے سال کے لحاظ سے اچھا نہیں۔ جنوری کا ... ہو، جیسے ماتھے میں ... سب سے پہلے "جنت کے پتے" کی طرف دوڑ ۔ ۔ ۔ باقی شمارہ بھی اچھا تھا پر بہترین نہیں لگا۔ "ستارہ شام" کہاں آگے بڑھ نہیں رہا تھا اور اب دو سطروں میں ہی ہائی جمپ لگا کر بڑھ گیا۔ شبیہہ کو مرنا نہیں چاہیے۔ "آشنا ہیں تیرے قدموں سے" اچھی کہانی تھی پر ناول کی کمی ... رابعہ کی کہانی بھی اچھا ناول تھا۔ باتوں سے خوشبو آئے۔ میں بہت اچھی باتیں تھیں۔ واقعی خوشبو کی طرح مہکتی ہوئی باتیں ہی تھیں۔ انٹرویوز بہت اچھے تھے پر اگر ان میں شاہد آفریدی کا تڑکا لگ جائے تو مزا آجائے۔

ج ۔ شیبا اور ریما! ہم شعاع کو بہترین بنانے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ آپ مطمئن ہوسکیں۔ نمرہ احمد تک آپ کا پیغام پہنچارہے ہیں۔ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہوسکا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

حنا کنول بیگ نے سیالکوٹ سے لکھا ہے

نمرہ احمد کے ناول کی تعریف میں کیا کہیں۔ اکثر سوچتی ناول کا عنوان "جنت کے پتے" کیوں ہے۔ نمرہ جی نے میری الجھن اب سلجھ دی اور پردے کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں اتنے مدلل اور پر اثر جامع دلائل.... دل ودماغ عش عش کر اٹھے۔ آپی یہ پوچھنا ہے "بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا" میں کیا ہم قارئین شرکت کرسکتے ہیں؟

ستمبر میں حنا اور مقدس نے جس ناول کا پوچھا اس کا نام "بدلتی رت کی ہوا" اور مصنفہ ثمرہ بخاری ہیں۔ یہ ناول 1999ء میں چھپا تھا۔ اکتوبر میں انیلا گل نے "حبساط دل" ناول کے اینڈ کے بارے میں پوچھا ہے۔ اس کے بارے میں مختصراً عرض ہے کہ انتقام اور پیار کے نشے میں چور تیمور اپنی منگیتر کی بہن سے شادی کرلیتا ہے۔

ج ۔ پیاری حنا! آپ نے چودہ سال پرانی ثمرہ بخاری کی تحریر کو یاد رکھا اور ہماری قارئین حنا اور مقدس کے لیے خط لکھا' بہت شکریہ شعاع سے اتنی محبت اور آپ کی یادداشت بھی قابل تعریف ہے۔

"سیر دو جہاں کرنا" میں قارئین بھی شرکت کرسکتی ہیں۔ جس کتاب پر آپ تبصرہ کرنا چاہتی ہیں۔ اس کے بارے میں آپ پہلے فون کرکے پوچھ لیں۔ نمبر یہ ہے۔
0345-2852056 ۔

رابعہ اور ایمان نے فاروق آباد گاؤں ملا کے سے لکھا ہے

اس بار کوئی بھی کہانی اتنی دل کو نہیں بھائی۔ مجھے "ستارہ شام" اور "دیوار شب" کچھ خاص پسند نہیں۔ یہ سوپ کی طرز کے ناول پڑھنے کے لیے بندے کو کافی مستقل مزاج ہونا چاہیے۔ البتہ اس بار "ستارہ شام" پڑھ کر لگا جیسے اس کا اینڈ اب جلدی ہوجائے گا۔ "جنت کے پتے" اچھا جارہا ہے۔ اف جہان کی اذیت تو حیا سے بھی بڑھ کر تھی۔ نمرہ جی حیا اور جہان کے ساتھ کچھ بھی برا مت کیجیے گا۔ "آشنا ہیں تیرے قدموں سے" ثوبیہ کی اچھی کاوش تھی۔ البتہ کوئی بھی ماں اتنی آسانی سے اپنا بچہ کسی اور کو نہیں دیتی۔ شفق کا بہت حوصلہ تھا جو اس نے ایسا کیا۔ حیات ممکن ہے میں نادر پہ بہت غصہ آیا۔ ویسے کہانی اچھی تھی۔ افسانوں میں اس بار کوئی بھی اچھا نہیں لگا۔ سوائے دوہرا رشتہ کے (معذرت کے ساتھ) اگر میں آپ کو کوئی اسکیچ بھجواؤں تو کیا آپ اسے کسی کہانی کی زینت بنائیں گی؟ آپی اگر ہوسکے تو شاہد آفریدی کا انٹرویو ضرور شائع کیجیے' پلیز۔

ج ۔ رابعہ اور ایمان! ہمیں بے حد افسوس ہے۔ شعاع آپ کو زیادہ پسند نہیں آیا۔ آپ کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ "ستارہ شام" کی آخری قسط اس ماہ شامل ہے۔

شفق نے اپنے بچے کو اس لیے حوالے کیا کہ اس کی بہترین جگہ اس کے باپ کا گھر تھی۔ جہاں زیب نے اسے قبول کرلیا تھا۔ لیکن بچے کو وہ باپ کا پیار نہیں دے سکتا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب اس کے اپنے بچے بھی ہوجاتے۔

انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ ویسے شاہد آفریدی کا انٹرویو شائع ہوچکا ہے۔
اسکیچ اگر اچھے ہوئے تو ضرور شائع ہوں گے۔

حوریہ کبیر نے ڈیرہ غازی خان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

میں شعاع اور خواتین ڈائجسٹ 92ء سے پڑھ رہی ہوں۔ یعنی تقریباً 20 سال سے اس کی باقاعدہ قاری ہوں۔ میرے ابو 73ء میں پاکستان نیوی میں آئے اور کراچی آکر یہیں کے ہوگئے۔ یہیں جاب' پھر شادی اور پھر ہم پانچ

بہن' بھائی جو کہ کراچی کی پیداوار ہیں۔ اب کراچی میں نہیں ہیں۔ وجہ یہاں کے حالات ہیں' میرے دونوں بھائیوں سے کتنی مرتبہ گن پوائنٹ پر موبائل اور والٹ چھینے اور ایک مرتبہ تو بس میں ایک آدمی نے بھائی کی سائیڈ پر پسٹل لگایا اور سارے پیسے اور موبائل لے کر اپنے ساتھ ہی اسٹاپ پر اتروایا اور کہا کہ سیدھے چلے جاؤ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا' ورنہ ہم شوٹ کردیں گے۔ میرے دونوں بھائی حالات سے اتنے خوف زدہ ہوئے کہ لاہور شفٹ ہوگئے۔ حالانکہ میری شادی کو چار سال ہوگئے ہیں اور ڈیرہ غازی خان میں میری شادی ہوئی ہے۔ لیکن اس جنوری 2012ء میں کراچی سے ہمیشہ کے لیے ناتا ٹوٹ گیا۔

کاش! کراچی کے حالات اتنے خراب نہ ہوتے اور ہم سے ہمارا شہر نہ چھنتا۔ کیسا لگتا ہے کہ جہاں آپ پیدا ہوئے' پھر تعلیم' جاب' شادی ہوئی' ہر جگہ سے کوئی نہ کوئی یاد وابستہ ہو اور پھر آپ کے پاس کچھ نہ رہے۔ ہمارا گھر اب بھی کراچی میں ہے' ہم نے فروخت نہیں کیا' لیکن کیا یہ کراچی پھر سے روشنیوں کا شہر بن جائے گا؟ سب کی جان' مال' عزت محفوظ ہوگی؟ ہم آزادی سے سفر کرسکیں گے؟ لوٹ مار' قتل و غارت گری ختم ہوجائے گی؟ بم دھماکے اور گروہ بندی ختم ہوجائے گی؟

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور سروے پڑھا۔ لیکن صنم بلوچ کا انٹرویو نہیں پڑھا۔ کیونکہ میرے سسرال میں ٹی وی نہیں ہے اور چار سال سے یعنی شادی کے بعد سے میرا ان فنکاروں سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ کون کس چینل پہ کس ڈرامے میں آرہا ہے۔

خط آپ کے میں شامل رمشا' کراچی میں بالکل سردی نہیں ہوتی' لیکن آپ کے پنجاب نے تو سردی کی وجہ سے میری جان نکال دی ہے۔ اتنی سردی اور بچوں کی مصروفیت' توبہ' تو یہ سردی جب اچھی لگتی ہے جب ہاتھ میں کافی ہو' اور کوئی بکھیڑا سر پہ نہ ہو۔ چلیں جی اس کے بعد افسانوں میں حوا اور دو ہزار رشتہ پسند آئے اور باقی دو افسانے کچھ خاص نہیں لگے۔ حیات ممکن ہے' سمیرا حمید کا ناولٹ زبردست تھا۔ لیکن فریال پر غصہ آیا کہ مشرقی لڑکی ہونے کی بنا پر شوہر کو سر پر چڑھالیا۔ حالانکہ کچھ مرد ایسے ہوتے ہیں جو شوہر تو کیا انسان کہلانے کے حق دار بھی نہیں ہوتے۔ قسط وار ناول میں نے پڑھے نہیں' بہت کم پڑھتی ہوں' اس لیے مکمل ناول میں رابعہ کی کہانی اور "ستارہ شام تیرے قدموں سے" دونوں اچھی لگیں۔ میرا سب سے پسندیدہ سلسلہ "آپ کا باورچی خانہ" اور "موسم کے پکوان" ہیں۔

ج ۔ پیاری جویریہ! کراچی کے بارے میں کیا کہیں۔ یہ شہر بھی ایک ماں کی طرح مہربان تھا۔ جہاں پورے ملک سے لوگ روزگار کی تلاش میں آتے تھے۔ اسے روشنیوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ جہاں راتیں جاگتی تھیں۔ وہاں اب دن کے اجالے میں بھی تاریکیوں کے سائے ہیں۔ کراچی کا شاید ہی کوئی باسی ہو جو موبائل چھننے کے تجربے سے نہ گزرا ہو۔ بہت سے لوگ تو ایک سے زیادہ بار اس تجربے سے دوچار ہوئے ہیں۔ کراچی کے حالات کوئی نہیں بدل سکتا صرف کراچی کے شہری بدل سکتے ہیں' جس دن انہوں نے اس بات کا عزم کیا حالات بھی بدل جائیں گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ بیس سال بعد خط کیوں لکھا۔ آپ تو بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

زوباریہ خالد نے لاہور سے لکھا ہے

ٹائٹل اچھا لگا۔ نمرہ احمد کا ناول "جنت کے پتے" ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جہان' ڈولی' میجر احمد اور عبدالرحمان پاشا ایک ہی شخص نکلے گا۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ شاپنگ مال میں حماد نے میجر احمد بن کر حیا کو کیا بتانا تھا؟ اس بار افسانے کچھ خاص پسند نہیں آئے۔

ج ۔ پیاری زوباریہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو افسانے اچھے نہیں لگے۔ شعاع کی دیگر تحریریں آپ کو کیسی لگیں۔ آپ نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس شمارے میں نعیمہ ناز اور ثوبیہ جبیں کے مکمل ناول' سمیرا حمید کا ناولٹ بھی تو شامل تھا۔ اتنے مختصر خط میں مزا نہیں آیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

کائنات اشرف نے یوسال سکھا سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

ٹائٹل اچھا لگا۔ اس کے بعد حمد و نعت سے دل کو منور کیا۔ یہ بہت ہی اچھا سلسلہ ہے۔ ناول بہت ہی اچھے ہیں۔ سائرہ رضا آپ بہت ہی اچھا لکھتی ہیں' میرا نام کائنات اشرف ہے' پیار سے سب تمن زہرہ کہتے ہیں۔

ج ۔ تمن زہرہ! ہم بھی آپ کو پیار سے تمن زہرہ ہی کہیں گے۔ شعاع کے لیے خط لکھنے کی ہمت کرلی' بہت اچھی بات ہے۔ اب یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔

کنزہ نقوی شہداد پور سندھ سے لکھتی ہیں

اس بار کہانیوں میں "ستارہ شام" کافی دلچسپ رہا۔ اس ساری کہانی کا مرکزی کردار "جنت بی بی" ہی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ نمرہ احمد کا ناول بھی بہترین جارہا ہے۔ ثوبیہ جبیں گل کے ناول "آشنا ہیں تیرے قدموں سے" زبردست رہا۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ کس طرح شعاع بہترین طریقے سے ہماری تربیت کررہا ہے۔ رمشا خالد کی تحریر بھی زبردست رہی۔ تمام سلسلے بہترین رہے۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" میرا موسٹ فیورٹ سلسلہ ہے۔

ج ۔ پیاری کنزہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان سے حیا بخاری لکھتی ہیں

مجھے دنیا کا مشکل ترین کام خط لکھنا لگتا ہے اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ پسندیدہ ترین کام خطوط کا مطالعہ ہے۔ ہے نا امیزنگ۔ مگر اب میں ــــ باقاعدگی سے خط لکھنے کی مشق کررہی ہوں۔ جو امید ہے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے لیے قابل برداشت ہوگا۔ (اگر نہیں ہے تو معذرت) اس بار میں نے صرف نمرہ کے "جنت کے پتے" اور سمیرا حمید کے "حیات ممکن ہے" کے لیے قلم اٹھایا ہے۔

اور سب سے بڑھ کر مجھے اس ناول نے اب مزا دیا۔ اس کی پچھلی قسط سے۔ جب جہان کی پہیلی سلجھنے لگی۔ اگرچہ عبدالرحمان پاشا' ڈولی اور میجر احمد کا جہان ہونا مجھ سے بالکل بھی ہضم نہیں ہو پارہا۔ مگر تمہاری ہیروئن کا نام سب سے زیادہ پسند ہے۔ ہیروئن سے بھی زیادہ۔

اور اب آتی ہوں سمیرا کی طرف۔ سمیرا آپ سے زیادہ جان پہچان تو نہیں ہے۔ مگر یقین مانیں آپ کی ہر اسٹوری بہت غور سے پڑھتی ہوں۔ "حیات ممکن ہے" کے نام نے ہی چونکا دیا اور اسٹوری پڑھ کے تو واہ' واہ نکل گئی منہ سے' ویری ویل ڈن یار۔ باقی سارا شعاع زبردست تھا۔ بس سمیرا گل سے ایک شکایت کہ اپنے پہلے ناولٹ کے بعد وہ گمنامی کی تنہائیوں میں کھو رہی ہیں۔

ج ۔ پیاری حیا! آپ کی طرح ہمیں بھی خطوط کا مطالعہ بے حد پسند ہے۔ ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں آسیہ رزاقی۔ وہ جب بھی ناول' ناولٹ بھجواتی ہیں۔ ساتھ خط بھی لکھتی ہیں۔ جو ان کی تحریروں کی طرح بے حد دلچسپ ہوتے ہیں اور انہیں پڑھ کر ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے۔ آپ اس لیے اطمینان سے ہمیں باقاعدگی کے ساتھ خط لکھیں' آپ کے خط ہمارے لیے خوشی کا باعث ہوں گے۔

سمیرا حمید کو لکھتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان کی پہلی تحریر نے ہی ہمیں چونکا دیا تھا اور ہمیں اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔ اور سمیرا نے ہمیں مایوس نہیں کیا۔

نمرہ نے اس بار پوری وضاحت کردی ہے کہ یہ چار کردار کس طرح ایک ہی شخص کے تھے۔ ایک جاسوس کی زندگی عام لوگوں سے بہت مختلف اور بہت مشکل ہوتی ہے۔

شعاع کی صرف دو تحریروں پر تبصرہ۔ باقی شعاع کے بارے میں کیا خیال ہے؟

مسرت الطاف نے کراچی سے لکھا ہے

میں نے اس بار شمارے میں ایک انٹرسٹنگ چیز پوائنٹ آؤٹ کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس بار ہر سلسلے وار ناولز کا اینڈ ٹریجڈی پر ہی ہوا ہے۔

"رابعہ کی کہانی"۔

یہ ناول حقیقت کے قریب تر محسوس ہوا۔ موضوع بھی زبردست تھا اور خاص طور پر اس پیراگراف نے دل جیت لیا۔

"پیاری بیٹیوں میں نے کبھی تم سے نفرت نہیں کی۔ بس میں ڈر گیا تھا' بچپن سے ہی بیٹیوں کے لیے بوجھ کا لفظ سنتا چلا آیا تھا۔ خود کو اس بوجھ تلے محسوس کرکے اور بھی کمزور ہوگیا۔" "ہم پانچ بہنیں ہیں' بھائی نہیں ہے' لیکن آج بھی لوگ میری امی پر طنز ضرور کرتے ہیں۔" "آپ کا بیٹا نہیں ہے۔ بیٹے تو بازو ہوتے ہیں۔" یہ سن کر بہت غصہ آتا ہے۔ جبکہ ہمارے والدین نے ہمیں بہت بہت پیار دیا۔ ہمیں دینی و دنیاوی تعلیم دی اور اس پیراگراف نے میری آنکھیں نم کردیں۔ "جو باپ اپنی بیٹیوں سے محبت کرتا ہو'

اسے یہ پتا ہوتا ہے کہ اس کی کس بیٹی کو گلاب جامن پسند ہیں اور کون سی بیٹی کو سموسے۔" ہمارے والدین نے ہمیں بھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ ثوبیہ جبیں کا مکمل ناول فنٹاسٹک تھا۔ شفق کا معصوم کردار دل کو بھا گیا۔ اس ناول کے لفظوں، کہانی اور کرداروں نے ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ افسانوں میں "ایسا بھی ہوتا ہے" قابل تعریف تھا۔ پڑھ کر مزا آیا۔ اس کے علاوہ سارے سلسلے پسند آئے۔

ج - پیاری مسرت! بیٹیاں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہیں۔ لوگ کچھ بھی کہیں پروا نہ کیا کریں۔ آپ کا تفصیلی تبصرہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بہت اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

شمع مسکان جام پور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد پہلی شعاع پڑھی۔

اس کا تو لفظ ہی دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ پھر اپنا فیورٹ ناول "ستارہ شام" پڑھا۔ آمنہ جی نے نئے سال میں نور کا دھچکا دیا اور یہ انکشاف بھی ہوا کہ شیزوفرینیا کی مریض جنت عرف تنوی ہے۔ بڑی دیر کی مہاں آتے آتے کے مصداق دانیال کا ثروت کی طرف پلٹنا سوری کتنا بہت اچھا لگا۔ وہی روایتی انداز۔ فیضان کا انیبا سے محبت کا اظہار جلتے دل پر پھوار کا کام کر گیا۔ عالیہ بخاری کا "دیوار شب" کی یہ قسط زبردست تھی۔

اب دیکھنا ہے خیام کیا کرتا ہے اور رابعہ کے متعلق اس کے محسوسات کا اختتام عالیہ جی کیا کرتی ہیں؟ "جنت کے پتے" کیا کہیں۔ الفاظ ہی نہیں ملتے جو اس اسٹوری کے شایان شان ہوں۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول "رابعہ کی کہانی" بالکل حقیقت پہ مبنی تحریر تھی۔ ہمارے خاندان میں بھی تعلیم کا فقدان ہے۔ لیکن صرف لڑکیوں میں لڑکے ماشاء اللہ اعلا تعلیم کی حصول میں گم ہر رزلٹ پر اول پوزیشن حاصل کرتے ہیں۔ لڑکیوں کی جابز کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔

ج - پیاری شمع! ہمارے تلخ ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہمیں معلوم ہے ہماری قارئین کا بہت بڑا حصہ دیہی علاقوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے وہ کہانی بھجوانے کے طریقے سے واقف نہیں ہوتیں اور بار بار یہ سوال کرتی ہیں۔ ہمیں حیرت ضرور ہوتی ہے لیکن تلخی یا غصہ نہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے بہت بہت شکریہ۔ تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ آپ کے خاندان میں بھی تبدیلی آ جائے گی۔

عاتکہ یاسمین وڈانچ نے گاؤں کدھر شریف منڈی بہاؤالدین سے لکھا

میں نے ایم اے اردو (پارٹ ون) کے پیپرز دے رکھے ہیں اور رزلٹ آنے ہی والا ہے اور آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ گاؤں سے کچھ دور بلکہ ذرا فاصلے پر ہی بہت اچھے پرائیویٹ اسکول (The Motivators) میں نرسری کی کیوٹ سی ٹیچر ہوں۔ (بچوں کی نظر میں کیوٹ) آپ نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے (پیاری عاتکہ) کہا جس کے لیے ڈھیروں ڈھیر شکریہ۔

ج - پیاری عاتکہ! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ علم کے چراغ روشن کر رہی ہیں۔ چھوٹے شہروں اور گاؤں میں خصوصاً سندھ میں ہماری حکومت نے تعلیم کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دیہی سندھ میں پسماندگی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیاب کرے۔ (آمین)

سیما ساجی ٹنڈو آدم سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

"جنت کے پتے" پڑھ لیا ہے۔ اگر جہان سکندر، پاشا، ڈولی، میجر ایک ہی شخص تھا تو اتنے کردار، اتنی صفائی سے کیسے کر گیا۔ میں حیرت میں ڈوبی بیٹھی ہوں۔ عافیہ یاد آتی جو امریکہ کے عقوبت خانے میں جہنم جیسی زندگی جی رہی ہے۔ اس کی ماں اس سے ملنے کی چاہ میں لمحہ لمحہ موت کے قریب جا رہی ہے۔ عالیہ بخاری جی شکر ہے آپ کو جویا پہ ترس آیا۔ اب پلیز جلدی سے معاذ سے ملوا دیں۔ سمیرا حمید نے کمال کر دیا۔ اچھا ہوتا اگر ایک صفحہ اور بھی ہوتا جلدی اینڈ کر دیا۔

ج - سیما! سمیرا حمید کی کہانی واقعی بہت اچھی تھی۔ ہماری سب ہی قارئین نے اسے بے حد پسند کیا ہے۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے لیے ہر حساس دل خون کے آنسو روتا ہے۔ مغرب کا انصاف مسلمانوں کے لیے کچھ اور ہے اور باقی دنیا کے لیے کچھ اور۔ کسی کو کیا کہیں، خود ہمارے سابق صدر نے ڈالروں کی ہوس میں قوم کی بیٹی کا سودا کیا۔ اسی لیے ہم پلٹنے والوں کو اپنے ملک میں پناہ دے رکھی ہے۔

ماریہ سندھو نے ہمیں خط لکھا ہے

شعاع میں تیرہ یا سترہ سال کی عمر سے پڑھ رہی ہوں۔ شعاع کا حصہ بننے کی ایک خاص وجہ وہی ہے جو آج کل تمام قارئین کی ہے۔ جی ہاں! "جنت کے پتے" میری چھوٹی سسٹر تو دیوانی ہے اس ناول کی۔ بالخصوص پاشا کی۔ آج کل تو کرکٹ کی دھوم میں پکی ہوئی ہیں۔ کرکٹر ناصر جمشید اور سعید اجمل کا انٹرویو ضرور شامل کریں۔

ج : ماریہ! آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ نے ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آئندہ خط لکھیں تو اپنے شہر کا نام ضرور لکھیں۔

فوزیہ ثمر بٹ نے گجرات سے لکھا ہے

میں نے ابھی نیا نیا شعاع پڑھنا شروع کیا ہے۔ مجھے یہ تاریخ کے جھروکوں اور پیارے نبی کی باتیں کی وجہ سے بے حد پسند آیا ہے۔ "رابعہ کی کہانی" بھی اچھی تحریر تھی۔ اکثریت کی سوچ بیٹیوں کے بارے میں ایسی ہی ہوتی ہے۔ افسانے قریباً "گزارے لائق ہی تھے۔ "آشنا ہیں تیرے قدموں سے" بے پناہ حیرت ہوئی۔ جہاں زیب کا کردار اچھا لگا۔ مجھے شفق کا فیصلہ اچھا نہیں لگا۔ جلیل نے کون سا اس کے ساتھ اچھا کیا۔ جو اس نے اپنی خوشی اس کی جھولی میں ڈال دی۔ جنوری کی سب سے اچھی کہانی "حیات ممکن" تھی۔ سمیرا حمید نے تو رلا دیا۔

مجھے اس تحریر کا یہ جملہ بہت اچھا لگا۔ ماں وہ تختی ہے جس پر اولاد کچھ بھی لکھ سکتی ہے۔ مگر ماں صرف محبت لکھتی ہے۔

ج - پیاری فوزیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ! آپ کہانیاں ضرور لکھیں۔ کہانیاں لکھنے کے لیے کسی ڈگری کی نہیں مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھی کتابوں کا مطالعہ آپ کی تعلیم کی کمی کو پورا کر دے گا اور آپ بہت اچھی کہانیاں لکھ سکیں گی۔ شفق نے وہ فیصلہ اپنے بیٹے کے لیے کیا جہاں زیب اسے باپ کا پیار نہیں دے سکتا تھا۔

شاہانہ رفیق، شہناز گل، ثمینہ احمد نے بستی نرالی والا تحصیل علی پور سے لکھا ہے

ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ میرے بھائی نے تو اپنے موبائل میں اس کی تصویر بنالی۔ حیا کے ساتھ اچھا نہیں کیا ولید نے۔ جہان سکندر کے بارے میں پڑھ کے واقعی بہت زیادہ حیرت ہوئی۔ "ستارہ شام" میں جنت بی بی اس حد تک جا سکتی ہیں یہ تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا اور شکر ہے عالیہ صاحبہ نے بھی جویا بے چاری پہ رحم کیا ہے۔ سمیرا حمید کی تحریر بھی بہت عمدہ تھی۔ "آشنا ہیں تیرے قدموں سے" ثوبیہ جی بہت ہی زیادہ اچھی تھی آپ کی کہانی۔ شفق نے واقعی بہت ہی بڑی قربانی دی ہے جہاں زیب کا کردار بھی بہت اچھا تھا۔ باقی تمام سلسلے بھی بہت اچھے تھے۔ آپی ہم شعاع کے ساتھ ساتھ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ پلیز کیا آپ سوال پھر سے شائع کر سکتی ہیں۔

ج - شاہانہ، شہناز اور ثمینہ! آپ کے پچھلے خطوط شائع نہ ہو سکے۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔ شعاع کے ساتھ ساتھ کا سلسلہ بند نہیں کیا گیا۔ آپ اس سلسلے میں شرکت کر سکتی ہیں۔ سوالات دوبارہ شائع کیے جا رہے ہیں۔

زاہدہ چوہدری نے جہلم سے لکھا ہے

شعاع کی سب کہانیاں اچھی ہیں۔ خاص کر نمرہ احمد کا ناول "آشنا ہیں" ثوبیہ جبیں، "حیات ممکن ہے" سمیرا حمید واہ واہ آپی! اگر میں خط میں کچھ اور لکھ کر بھیجوں تو شائع کر دیں گی نا۔ یہ بھی بتا دیں کہ خط کتنی تاریخ تک آپ تک پہنچ جائے۔

ج - پیاری زاہدہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ جو چاہیں لکھیں۔ ہم ضرور شائع کریں گے۔ شعاع کے لیے آپ خط اور دیگر تحریریں اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 18 تاریخ تک مل جائیں۔

عالیہ بخاری

دل آرزو ہے

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے، جس سے اس کی شناسائی ہے جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار، لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ کیتی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھرو سا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایماندار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاحی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

—۵۹—

انسٹھویں قسط

شام ڈھلے آئے مہمان' رات کا کھانا کھا کر بڑے معقول وقت میں رخصت ہوئے تھے۔ سو جو ہنگامہ اور مصروفیت رات دیر گئے تک متوقع تھی' جلد ہی اختتام پذیر ہوئی۔ دادی سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں اور باقی گھر والے ہال میں اب بھی موجود تھے۔

"اتنے سال بیرون ملک رہنے کا نتیجہ ہے۔ نہ اپنا وقت خراب کیا اور نہ دوسروں کو بے آرام کیا۔ ورنہ یہیں کہیں ملنے والوں میں ربیعہ کا رشتہ کیا ہوتا تو آدھی رات گزر جاتی۔ اس ایک دعوت کے پیچھے۔"

شائستہ بے حد خوش تھیں اور ربیعہ کے سسرال کی مستقل تعریف میں مصروف۔

"ابا کے دوست ہیں آخر۔ ان کا اثر تو آنا ہی ہے۔ کیوں خیام؟"

معاذ نے ہنس کر خیام کی طرف دیکھا۔ وہ آج مستقل ہی مصروف رہا تھا۔ ایک ذمہ دار فیملی ممبر کی طرح' مہمانوں کو کمپنی دینے کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتے ہوئے۔ اچھے میزبانوں کی طرح پیش پیش۔ اس کی طرف سے آج معاذ بڑا مطمئن رہا تھا۔

وہ میز پر سے کچھ اٹھا کر کچن میں رکھنے جا رہا تھا۔ معاذ کی بات پر مسکرا کر باہر چلا گیا تھا۔ ابا کی نظر اتفاق سے ہی اس پر پڑی تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ وہم ہی ہو۔" انہوں نے پہلو بدلتے ہوئے کچھ ایسا ہی گمان کیا۔

کچن میں ربیعہ کھڑی ابھی بھی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ خیام کو آتا دیکھ کر وہ کچھ شرمندگی سے مسکرائی تھی۔

"آپ رہنے دیتے۔ میں اٹھا لیتی۔ کب سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔"

مہمانوں کے جانے کے بعد وہ کپڑے تبدیل کر چکی تھی۔ لیکن چہرے پر مٹے مٹے سے میک اپ کے نشان باقی تھے۔

خیام نے ایک بار پھر بہ دقت نگاہ چرائی۔

"ابا کہتے ہیں کہ یہ میرا اپنا گھر ہے۔ پھر آپ کیوں چاہتی ہیں ربیعہ! کہ میں یہاں خود کو غیر سمجھوں۔"

وہ مڑ کر دوسرے کاؤنٹر پر چیزیں رکھنے لگا۔

"میں نے ایسا تو نہیں کہا۔ سوری اگر آپ کو برا لگا۔" وہ کچھ اور بھی شرمندہ ہوئی۔ "اصل میں آج آپ اتنے مصروف ہیں صبح سے کہ۔۔۔"

"میرے لیے یہ سب بہت خوشی کا باعث ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ابا اور معاذ بھائی سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں ہے میرے لیے اس دنیا میں۔"

ربیعہ کی طرف سے پشت کیے وہ دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

اور اس کے لہجے کا خلوص' دل کی انتہائی گہرائی کو چھوتا تھا۔ ربیعہ نے جلدی سے آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو رگڑ کر خشک کیا تھا۔

"آج مجھے بہت سکون ہوا ہے یہ سوچ کر کہ جب میں یہاں نہیں ہوں گی تو آپ ان لوگوں کے پاس ہوں گے۔ ابا اور معاذ اکیلے نہیں ہوں گے۔ ان سے محبت کرنے کے لیے ان کا خیال رکھنے کے لیے آپ یہاں ہوں گے۔"

خیام نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

ربیعہ ہلکے سے مسکرائی۔ "میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ میں اتنی دور۔۔۔" خیام کے سامنے اپنی متوقع سسرال کا ذکر کرتے ہوئے وہ کچھ جھجک سی گئی۔

خیام نے ان دنوں میں کتنی ہی بار اس ان دیکھے شخص کی قسمت پر رشک کیا تھا۔

"میں ان لوگوں کے بغیر بالکل بھی نہیں رہ سکتی۔ پتا نہیں کیا ہوگا۔۔۔ میری بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔۔۔ آپ کو اپنی بات یاد ہے نا۔"

خیام نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

کاش وہ اسے بتا سکتا کہ اس کی کہی ہر بات کو وہ تاعمر خود سے دہراتا رہے گا۔

"جب سے آپ نے کہا ہے۔ میں نے دن میں کتنی ہی بار دعا مانگی ہے کہ آپ معاذ کے لیے کچھ کر سکیں۔ کچھ ایسا جو اس کی زندگی کو بدل دے۔"

"آپ کو دعاؤں کی قبولیت پر یقین ہے ربیعہ؟" وہ جاتے جاتے رکا۔

"بہت' ہر مسلمان کو ہونا چاہیے۔" اس کے لہجے میں گہرا اعتماد تھا۔ "یہ دعا ہی تو ہے جو امید کا دامن چھوڑنے نہیں دیتی۔ اللہ سے تعلق کو مضبوط تر کرتی چلی جاتی ہے۔ اور وہ کب کسی کو مایوس کرتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔!" ایک گہری سانس خیام کے لبوں سے آزاد ہوئی۔ "تو ایک دعا اور کیجیے گا کہ میں بھی اتنے ہی یقین اور بھروسے سے دعا مانگنا سیکھ جاؤں۔"

کچن کے دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے مڑ کر ربیعہ کی طرف دیکھا اور باہر نکل آیا۔

سامنے پچھلے احاطے میں گہری ہوتی رات کا فسوں پھیل رہا تھا۔ خیام نے نگاہ اٹھا کر اوپر ستاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر تیز قدم اٹھاتا ہوا بڑے ہال کی طرف چلا آیا۔

وہاں ابھی تک لائٹیں جل رہی تھیں۔ اور صرف معاذ بیٹھا تھا۔

"ابا اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔ تم بھی جا کر سو جاؤ۔ آج بہت تھک گئے ہو گے تم بھی۔" وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ہال کی لائٹیں بجھاتے ہوئے وہ دونوں باہر نکل آئے۔ اگلے برآمدے میں ہلکی لائٹ کا ایک بلب جل رہا تھا۔

"آپ نہیں سوئیں گے کیا ابھی؟" معاذ کو برآمدے میں رکتے دیکھ کر وہ بھی جاتے جاتے ٹھہرا۔

"سوؤں گا۔ بس ابھی تھوڑی دیر میں۔ اصل میں ابھی نیند نہیں آ رہی۔" معاذ نرمی سے مسکرایا۔

"تو میں بھی رک جاتا ہوں۔ باتیں کرتے ہیں۔"

"نہیں۔ تم جاؤ۔ میں بس ایسے ہی۔۔۔ ابا انتظار کر رہے ہوں گے۔ آج ان کے پاس بہت ساری باتیں ہوں گی کرنے کے لیے۔"

خیام نے ذرا غور سے معاذ کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی خوب صورت براؤن آنکھوں میں اس وقت اور بھی گہری اداسی تھی۔ اور کم از کم اب وہ اسے اپنا وہم کہہ کر ٹال بھی نہیں سکتا ہے۔ خیام کو اپنا دل دکھ سے بیٹھتا ہوا محسوس کیا۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی!" وہ کہتے ہوئے ابا کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کاریڈور کی طرف بڑھا تھا۔ آنکھ کے کونے پر ٹکا ایک آنسو اس نے انگلی کی پور سے جھٹک کر گرایا۔ اس کے قدموں کی رفتار خود بخود تیز ہوئی مگر مڑنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر معاذ کی طرف دیکھا تھا۔

وہ اگلے احاطے میں اترتی برآمدے کی سیڑھیوں پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

تنہا اکیلا جیسے کسی عبادت میں مصروف۔

اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ خیام کو یہاں سے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بہت شدت سے اس کا دل چاہا کہ وہ واپس معاذ کے پاس جا کر بیٹھ جائے۔ لیکن اس دل دکھاتی تنہائی کا احترام آڑے آیا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ ابا اپنے بستر پر لیٹ چکے تھے۔

"تم کہاں رہ گئے تھے بیٹا۔ بہت دیر تک جاگنے لگے ہو تم اور معاذ۔ وہ بھی ابھی نہیں سویا ہوگا؟"
ان کے شفقت بھرے لہجے میں دونوں کے لیے یکساں فکر مندی تھی۔
وہ چپ چاپ آکر اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ انہیں یہ بتا کر کہ معاذ اس وقت بھی اکیلا یخ بستہ سیڑھیوں پر بیٹھا ہے۔ وہ انہیں دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"کیا ہوا لیٹ کیوں نہیں رہے؟" وہ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔
خیام نے اضطراب سے پہلو بدلا تھا۔
سو جو چند گھنٹوں میں انہیں بار بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ خاصا اپ سیٹ ہے۔ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اٹھ کر بیٹھنے میں دیر نہیں کی تھی۔
"آپ لیٹے رہیے۔"
"ادھر میرے پاس آؤ۔" ان کی نگاہ بدستور خیام پر ہی تھی۔
وہ ان کے بیڈ کے انتہائی کونے پر ٹکا تھا۔
اس کا ادب لحاظ۔ گفتگو کا سلیقہ سب ہی اس کی اچھی تربیت کا پتا دیتے تھے۔
آج کے دن کے آغاز پر جب وہ اپنے دل میں چبھا آخری کانٹا بھی ان کے سامنے نکال چکا تھا۔ ان کے خیال میں یہی صحیح وقت تھا کہ اسے یوسف کمالی سے اس کے رشتے کے بارے میں آگاہ کر دیا جائے کیونکہ اب یہ بات زیادہ دیر چھپنے والی نہیں تھی۔
"کمالی صاحب کی جذباتی حالت ٹھیک نہیں ہے ابا! ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ اس طرح ری ایکٹ کر جائیں خیام کے سامنے کہ وہ پھر سے اپنے خول میں بند ہو جائے' ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔ خیام کو صرف اور صرف آپ سنبھال سکتے ہیں ابا! کیسے بتانا ہے اسے۔ یہ آپ کا کام ہے۔"
معاذ کی کہی بات کو یاد کرتے ہوئے انہیں ایسا ہی لگا تھا جیسے خیام کچھ جان چکا ہے۔
شاید یوسف کمالی اسے خود ہی فون وغیرہ کر چکے ہوں اور اس میں کیا حیرت تھی۔
ایک عمر کی نارسائی۔ ایک دل و جان کو توڑتی محرومی کے بعد یوسف کمالی جیسا انسان بھی ٹوٹ کر بکھر ہی چکا تھا۔
"میں تم سے کچھ خاص بات کرنا چاہتا ہوں بیٹا!"
"اور میں بھی!" جس تیزی سے اس نے جواباً کہا ان کا یقین اور بھی مضبوط ہوا۔
"خیام بیٹا! بعض اوقات حالات و واقعات اس طرح پیش آتے ہیں کہ ہم انہیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں حالانکہ جو کچھ محسوس ہوتا ہے' نظر آتا ہے۔ اس کا پس منظر کتنا بھی دھندلا چکا ہو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" ابا تمہید باندھتے باندھتے رکے۔ خیام کی نظر فرش پر جمی تھی' لیکن اس کا دھیان یقیناً" کہیں اور تھا۔ پہلی بار وہ ان کی بات کی طرف متوجہ نہیں تھا۔
وہ برا ماننے کے بجائے متفکر سے ہوئے۔
دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسائے ہوئے وہ کسی اور کشمکش میں تھا۔
ابا چند لمحے دانستہ خاموش رہ کر کھنکھارے تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔
"جی ابا! کچھ کہہ رہے تھے آپ!"
"اوں ہنہ!" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم کہو۔ تم کیا کہنے والے تھے؟"
"کہو۔ خاموش کیوں ہو۔" خیام کے چہرے کے تاثرات ان کی فکر کو مزید بڑھانے لگے۔ یقیناً" کچھ اور تھا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"ابا!" خیام نے خود کو کمپوز کیا' وہ ابھی تک یہ یقین نہیں تھا کہ جو کچھ کہنے جا رہا ہے۔ اس کا ردعمل کیا سامنے آسکتا ہے۔ مگر اب وہ بھی قدم پیچھے ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھا۔
"ابا! میں آپ سے حویا کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔"
اسلام صاحب بری طرح چونکے تھے۔ خیام کے حوالے سے ایک بالکل ہی غیر متوقع موضوع۔
"حویا!" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔
"ان کی امی آئی تھیں یہاں شام میں۔ ملنا چاہتی تھیں آپ سے یا معاذ بھائی سے۔" وہ شرمندہ تھا جیسے یہ ملاقات نہ کروا کر بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔
"شاکرہ آئی تھیں یہاں۔ ہمارے گھر...!"
زندگی سے جڑے اس سب سے بڑے الجھاؤ کے حل کے سارے ہی امکانات مدت سے گم ہوئے تھے۔ کوئی راہ۔ کوئی امید کی کرن۔ کچھ نہیں۔
اور آج ایک سرا ہاتھ بھی آیا تو کس کے!
سامنے بیٹھے خیام کے پاس سنانے کے لیے بہت کچھ تھا۔
دور ٹھنڈے یخ کاریڈور میں بیٹھی ہوئی شاکرہ امی نے بڑی بے بسی سے قریب کھڑی زویا کی طرف دیکھا۔
زویا کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

☼ ☼ ☼

راجو نے گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے لاک کرتے ہوئے ایک نگاہ اطراف میں ڈالی۔
رات کافی ہو چکی تھی گیٹ پر کھڑے گارڈ کے علاوہ اندر کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ دور انیکسی کی لائٹیں ابھی بھی جل رہی تھیں۔
وہ ہلکے سے مسکراتا ہوا اس طرف بڑھ گیا۔ زری اس کے آنے تک "لازماً" جاگتی تھی۔ مگر آج وہ آفس کے بعد سالار کے کچھ کاموں میں مصروف ہو کر روز سے کہیں زیادہ لیٹ تھا۔
تیز آواز میں چلنے والے ٹی وی کی آواز انیکسی کی سیڑھیاں چڑھنے سے قبل ہی اسے آچکی تھی۔
زری ٹی وی دیکھنے کی ازحد شوقین تھی۔ راجو کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ سے ہی ٹی وی ڈراموں کی پرستار ہے یا پھر یہ شوق اسے یہاں آکر لگا ہے۔
دروازے کی ہنڈل پر ہاتھ رکھتے رکھتے اس نے دوسرے ہاتھ سے پٹ کو اندر کی طرف ہلکے سے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ ناگواری کی ایک ہلکی سی شکن راجو کے ماتھے پر ابھری تھی۔ رات گئے تک یہ کھلا دروازہ زری کی طبیعت کی لاپروائی کی بدولت تھا اور روز کا قصہ تھا۔
"تم سے کتنی بار کہا ہے کہ دروازہ بند رکھا کرو۔ سمجھ میں کیوں نہیں آتا ہے تمہارے!" وہ اندر آتے ہی اس پر برسا تھا۔
زری چند منٹ تو سنے گئی۔ پھر کچن میں کھانا گرم کرنے چلی گئی۔ شادی شدہ زندگی کے اس مختصر دورانیہ میں ہی وہ چھوٹے موٹے جھگڑوں کو ٹالنے کا گر سیکھتی جا رہی تھی۔
راجو بد مزاج نہیں تھا۔ زندگی کے جھیلے ہوئے غم اس کی طبیعت میں ایک خاص قسم کا گداز پیدا کر چکے تھے۔ زری کے حق میں وہ اب تک ایک مہربان شوہر ثابت ہوا تھا۔ لیکن آج کچھ برعکس تھا۔
"آئندہ اگر میں نے یہ دروازہ کھلا پایا تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا زری! کان کھول کر سن لو تم۔ اور تم کوئی

چھوٹی بچی نہیں ہو' جو تمہیں بار بار سمجھایا جائے۔ ایک شادی شدہ ' اچھی عمر کی عورت ہو۔"

وہ کھانا لے کر آئی تو تب بھی وہ فکر مند نظر آ رہا تھا۔

گو اس بار لہجہ پہلے کی نسبت بہت نرم تھا۔ مگر زری کو عمر کا طعنہ سب سے زیادہ برا لگا تھا۔

"میں اچھی عمر کی ہوں تو کیوں کی تھی شادی۔ ڈھونڈ لیتے اپنے لیے کوئی کم عمر حسینہ۔ بلکہ ڈھونڈ تو رکھی تھی تم نے۔ قدرت کو ہی منظور نہیں ہوا۔"

راجو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کہنا کیا چاہتی ہو تم؟"

"یہی کہ۔" وہ اس وقت پتا نہیں کیوں چڑچڑی ہوئی جا رہی تھی۔ "تمہارا روزی کے لیے پچھتاوا کم نہیں ہونے کا نام لے رہا ہے۔ ایسا ہی ہے تو کیسے چھپے گا!"

کھانے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے وہ بنا راجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"بات کو دوسرا رنگ مت دو۔ اور روزی۔" وہ کچھ کہتے ہوئے رکا۔

یہ نام شاید تا عمر دل کے دکھنے کا سبب بنا تھا۔

"کہو' چپ کیوں ہو گئے۔" زری نے اس ستم رسیدہ لڑکی سے پہلی بار حسد محسوس کیا تھا' جو آج بھی اس کے شوہر کے دل پر قابض تھی۔

راجو نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"کچھ نہیں۔ بس صرف اتنا کہتا ہوں کہ محتاط رہا کرو۔ گھر میں دس ملازم بھی ہوتے ہیں۔ گھر کا دروازہ بند رہے گا تو سب پر اچھا تاثر پڑتا ہے۔" اس نے جان بوجھ کر روزی کے ذکر کو ٹالا تھا۔

زری بڑبڑاتے ہوئے کھانے کے برتن میز پر رکھنے لگی۔

"گیٹ بند' گارڈز کھڑے ہیں۔ پھر بھی۔"

"اتوار کی ٹکٹیں بک ہو گئی ہیں ہماری پنجاب جانے کے لیے۔"

زری کی بات کاٹتے ہوئے اس نے موضوع بدلنے کی کوشش جاری رکھی۔ "برسات ہے پنجاب کی ٹرینوں پہ۔ سالار بھائی تو کہہ رہے تھے کہ بائی ایئر چلا جاؤں' لیکن میں نے سوچا کہ تم نے اب تک کراچی سے آگے کی دنیا ہی نہیں دیکھی ہے۔ ٹرین میں چلیں گے تو بہت کچھ دیکھنے کو ملے گا۔"

"خیر یہ تو اچھا کیا۔ ہوائی جہاز سے تو مجھے ڈر بھی لگتا ہے ٹرین میں مزہ آتا ہے۔ ایک دو بار ہی بیٹھی ہوں میں تو ٹرین میں بھی۔ اور اتنی دور تک تو کبھی بھی نہیں۔" وہ حسب توقع بہل چکی تھی۔

روزی' کھلا دروازہ سب ہی کچھ پس پشت ہوا۔ لیکن راجو کا ذہن اب بھی الجھا ہوا تھا۔

پنجاب سے واپس آنے کے بعد پہلا کام انیکسی کے دروازے میں ایک بڑا مضبوط سا لاک لگوانے کا ہی کرنا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے پکا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

زری کو زر تاج بیگم کے بیٹے کی خیریت درکار تھی۔ وہاں سے اب تک کوئی تسلی بخش اطلاع نہیں آئی تھی۔

"اب تک کومے میں ہے ان کا بیٹا۔ کچھ خبر نہیں کہ آنکھ کھولے گا بھی یا نہیں۔ سنا ہے کہ خود بیگم کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ آدھی پاگل تو وہ جانے تک ویسے بھی ہو گئی تھی۔" راجو کے لہجے میں ذرا سی ہمدردی یا رعایت نہیں تھی۔

"ملازموں میں بڑی عجیب عجیب سی باتیں اڑ رہی ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ زر تاج بیگم کو وہاں لندن کے کسی پاگل خانے میں داخل کروا دیا ہے۔ خدا جانے جھوٹ یا سچ!"

بے تاثر سے انداز میں وہ ادھر ادھر سے سنی گئی بتا رہا تھا۔

"اللہ رحم کرے!" زری کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا۔

کھانا کھاتے ہوئے راجو کا ہاتھ وہیں تھما تھا۔

"کیوں کرے وہ رحم ایسوں پر۔ دعا بھی ذرا سوچ سمجھ کر دیا کر۔ ایسے ہی نہیں بولتی رہا کر دعائیں بڑی دعائیں دینے والی۔" وہ ایک دم ہی غصے میں آیا تھا۔

زری ہکا بکا سی ہوئی اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"پتا نہیں کتنوں کا صبر پڑا ہے بیگم پر۔ یہ وہ بددعائیں ہیں جو زبان سے کبھی نہیں دی گئیں۔ مگر عرش ہلا گئی ہیں۔ تجھے نہیں کیا خبر کہ کیا کیا انصاف طلب ہے اللہ کی عدالت میں۔"

وہ ایک ہاتھ سے آنسو صاف کرتا ہوا اٹھ کر اندر کمرے میں جا چکا تھا۔

زری وہیں اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھی۔

کیسا زخم تھا راجو کے دل میں' جو بھرنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح ملگجی اور زردی مائل تھی۔

معاذ نے پارکنگ میں گاڑی کھڑے کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا ایک پھیکا پھیکا سا غبار' آسمان کی شفاف نیلاہٹ پر چھایا ہوا تھا۔ خیام اور ابا اس کے ساتھ ہی گاڑی سے اترے تھے۔ درختوں سے گرتے زرد پتے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آزادانہ اڑتے پھر رہے تھے۔

سامنے نیم سرکاری اسپتال کی عمارت نظر آ رہی تھی۔

"کیسی عجیب سی اداسی ہے ابا ماحول پر' یا پتا نہیں میں ہی کچھ زیادہ محسوس کر رہا ہوں۔" ان لوگوں کے ساتھ چلتے ہوئے معاذ نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

ابا اور خیام دونوں ہی نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر نگاہ چرائی۔

"ایک تو آپ بھی منٹ میں پروگرام بدل لیتے ہیں۔ اتنی صبح کون کسی کی عیادت کے لیے آتا ہے بھلا' شام کو اسکول سے واپسی پر بھی دیکھا جا سکتا تھا۔" وہ سیڑھیاں چڑھ کر اندر لابی میں آ چکے تھے۔

ابھی کافی سویرا تھا' اور اسپتال میں روزمرہ کارش شروع ہونے میں خاصا وقت تھا۔

ابا کاؤنٹر پر کسی سے کچھ دریافت کر رہے تھے۔ اور پھر ان دونوں کو اشارہ کرتے ہوئے بائیں ہاتھ پر مڑے۔ سامنے کچھ دور آئی سی یو کی شیشے کی بڑی سی دیوار نظر آ رہی تھی۔ معاذ نے کچھ چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیا وہ اتنے بیمار ہیں؟"

"مجھے نہیں پتا' تم ذرا آگے جا کر دیکھ لو' اگر وہ وہاں ہیں تو مجھے بتا دینا۔ ورنہ اتنی دور تک چل کر جانا اور پھر واپس آنا۔ میں آج تھکن محسوس کر رہا ہوں۔" وہ وہیں رک کر کھڑے تھے۔

"کیا واقعی؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" معاذ نے فکرمندی سے اسلام صاحب کی طرف دیکھا۔

"بس ٹھیک ہوں' تم سے جو کہہ رہا ہوں وہی کرو۔"

"مگر میں تو انہیں پہچانتا بھی نہیں ہوں۔"

"تم پہچانتے ہو!" وہ جھنجلا رہے تھے۔

اس بار معاذ "فوراً" ہی آگے بڑھ گیا تھا۔ لمبا' خاموش کاریڈور قدم بہ قدم طے ہوا تھا۔ انتہائی نگہداشت کے یونٹ پر چھائی اعصاب توڑتی مخصوص سی کیفیت۔

معاذ نے شیشے کی دیوار کے اس پار کسی شناسا چہرے کو تلاشنا چاہا۔
کوئی نہیں ہے... کوئی بھی نہیں۔
ابا کو شاید کسی نے غلط اطلاع دی تھی۔ وہ واپس پلٹنے لگا تھا کہ اس کے قریب ہی کے ایک بیڈ پر جھکی ہوئی نرس سامنے سے ہٹی تب ہی معاذ کی نگاہ اس چہرے پر پڑی جہاں پہچان کی ہلکی سی جھلک اب بھی باقی تھی۔
زردی مائل رنگت' سختی سے بند آنکھیں' کمزور سا وجود جس سے کئی تار منسلک تھے۔ بے چارگی اور مظلومیت کی جیتی جاگتی تصویر۔ وہ پوری جان سے کانپا تھا۔
"جویا!" روح کی گہرائی سے اٹھا نام اس کے ہونٹوں تک بے آواز آیا تھا۔
"جویا... جویا... جویا۔"
یہ وہی تھی۔ مگر وہ کہاں تھی۔
معاذ کی بے قرار نظروں نے اس کے مٹے مٹے سے خدوخال میں اسے ڈھونڈنا چاہا۔
وہ شوخ محبت پر ایمان رکھتی دل کش لڑکی۔
جس کے جذبہ پر اسے ہمیشہ اپنے آپ سے بھی بڑھ کر بھروسا رہا تھا۔
وہ تو کب کی گم شدہ شہری تھی۔
لیکن خود کو اور اسے دونوں کو یکسر بھلا کر' جویا نام کی جو پرچھائیں اس بے ہنگم پھیلے شہر کے کسی کونے میں بسی تھی۔ صرف اور صرف اس کی بے حسی کی نذر ہوئی تھی۔
معاذ کی آنکھ سے گرنے پہلے آنسو میں ہی احساس جرم نہیں اعتراف جرم تھا۔
کاریڈور کے دوسرے سرے پر کھڑے اسلام صاحب خیام کو واپس چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود مڑے تھے۔
"کیا آپ نہیں دیکھیں گے کہ وہ کیسی ہیں اب!" خیام حیران پریشان سا ان کے پیچھے آتا ہوا پوچھ رہا تھا۔
"نہیں ابھی نہیں!" وہ سیڑھیوں سے اتر کر گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔
"اور معاذ بھائی۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے کیا۔!" خیام کی حیرت ابھی بھی کم نہیں ہوئی تھی۔
"وہ نہیں آئے گا۔ اسے آنا بھی نہیں چاہیے۔ ہم اسے یہاں چھوڑنے ہی آئے تھے بیٹا!"
دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے وہ آگے بڑھے ہی تھے کہ کوئی بہت تیزی سے ان کے پاس آیا۔
"اسلام چچا!" کسی کی بھی پروا کیے بغیر وہ ان کے گلے لگ کر روئے جا رہی تھی۔
"زویا... زویا بیٹا!" اسلام صاحب نے بمشکل اسے سنبھالا تھا۔ "تم تو بہت سمجھ دار ہو' تم اس طرح حوصلہ چھوڑ دو گی تو جویا کو کون سنبھالے گا۔"
شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اسے ایک درخت کے نیچے پڑی بینچ پر لے کر بیٹھے۔ "ہمت کرو بیٹا!"
"اب نہیں ہوتی اسلام چچا! قسم سے اب نہیں ہوتی۔" آنسو صاف کرتے ہوئے وہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔
خیام موقعے کی نزاکت کو سمجھ کر گاڑی میں جا کر بیٹھ چکا تھا۔
اسلام صاحب نے چشمہ اتار کر خاموشی سے اپنی آنکھوں کو خشک کیا تھا۔
"آپ نے ہمیں کیوں چھوڑ دیا اسلام چچا۔ باقی سب کے کیے کی سزا مجھے اور جویا کو کیوں دی۔ جویا کا تو آپ پر بڑا حق تھا۔ آپ اسے زبردستی لے جاتے۔ اس جہنم سے لے جاتے۔" درد بھرے شکوے سارے ہی بجا تھے۔
انہیں آخری بار اس گھر کی سیڑھیوں پر سلمان جیسے کم ظرف انسان کے ہاتھوں اٹھائی جانے والی ذلت کا دکھ

نہیں تھا اس بات کا پچھتاوا تھا کہ وہ اسے ایک طرف کرکے سیڑھیاں چڑھ کر خود اوپر کیوں نہیں چلے گئے تھے۔

جواز 'دلیل' سمجھوتے' اصول۔

انسانوں کے اختراع کیے الفاظ اور رویے جن میں سے کچھ بھی کسی ایک فرد کی خوشی اور زندگی سے بڑھ کر نہیں مگر پھر بھی دھڑلے سے زندگیوں پر حکومت کرتے ہیں۔ دلوں کو' خوشیوں کو روند ڈالتے ہیں۔ خدا کی پناہ!

اعمال ناموں میں گناہ کبیرہ کے زمرے میں کیا کچھ درج ہوتا ہوگا۔ مگر کسی کو خبر نہیں۔ کسی کو فکر نہیں۔

دل کی انتہائی گہرائی سے اس شخص نے اللہ کے حضور معافی طلب کی' جو اس سارے گڑبڑ گھٹالے میں سب سے کم قصور وار تھا۔

زویا انہیں آہستہ آہستہ جویا کی بیماری اور اس سے جڑے حالات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ایک ایک بات۔ ایک ایک لفظ۔

وہ دم بخود ہوئے سنے گئے۔

خونی رشتوں سے جڑی محبت کی کہانیوں کی سچائی کتنی بھی محترم سہی' لیکن ان ہی محبتوں کے تال میل کے ساتھ ساتھ ازل سے ایک درد کا سلسلہ بھی جاری و ساری ہے۔

خود غرضی' بے حسی' منافقت کی اذیت سے لبریز۔ ظلم کی آخری حد کو نافذ کرتا ہوا۔

جہاں اپنے اور پرائے کی تمیز مٹتی ہے اور خون پانی سے گاڑھا بھی نہیں دکھائی دیتا ہے۔

انہوں نے اندر موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا جویا کے بارے میں سوچا اور گاڑی میں بیٹھے خیام کی طرف دیکھا۔

معصوم۔ سادہ دل لوگ۔ کس غضب کی آزمائش کی نذر ہوئے تھے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اپنوں کا ظلم نہیں۔ تقدیر کا لکھا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے خیام نے جلتی ہوئی آنکھوں کو بند کرتے ہوئے ٹیک لگائی تھی۔

آگہی کی اس حد کو اگر ابا ہاتھ پکڑ کر نہ پار کرواتے تو۔ وہ ساری عمر کیسے جان سکتا تھا کہ دنیا میں دوسروں کا درد اپنے دل میں محسوس کرنے کا شرف ہی انسان کو اشرف المخلوقات بناتا ہے۔

آج مدت بعد اسے نانی ستارہ یاد آئیں۔

نگینہ خالہ۔ استاد جی۔ شاما تک۔

اور آج اس یاد میں کڑواہٹ کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

وہ بری طرح کنفیوز ہوا۔

٭ ٭ ٭

چوبارے کی سیڑھیوں پر بچت کے خیال سے اب ہلکے پاور کا بلب جلتا تھا۔

کسی اور کو نہ سہی نگینہ کو شام ڈھلے آتے ہوئے' سیڑھیوں پر چڑھنے میں دشواری ہوتی تھی۔ ایک دن تو پاؤں اس بری طرح مڑا تھا کہ گرتے گرتے بچی تھی۔

شاما کو مالش کرنے کا خاص آرٹ آتا تھا۔ سو وہی کام آئی' دوسرے دن ہی ورم اتر گیا تھا۔ لیکن چڑھنے اترنے میں ہلکا سا درد اب مستقل ہی ساتھ رہنے لگا تھا۔

بلب اب بھی نہیں بدلوایا گیا۔

"غلطی میری تھی۔ دیکھ کر نہیں چلی۔ چوٹ تو تیز روشنی میں بھی لگ جاتی۔ رہنے دے بس' بے کار کے خرچے مت بڑھا۔" نانی سے بلب کے لیے پیسے لے جاتی شاما کو اس نے فوراً ہی منع کر دیا تھا۔

نانی خاموش رہیں۔

شاما نے چپ چاپ پیسے نانی کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیے تھے اور پھر سیڑھیوں پر ہلکی روشنی کا ذکر بھی ختم ہوا تھا۔

برآمدہ' آرائشی بالکونی سب ہی میں بجھی بجھی سی روشنی رہنے لگی تھی۔

کام ختم۔ رونق میلہ سب ختم۔

صندل دن چڑھے تک سوتی اور بقیہ وقت یا تو اپنے کمرے میں ہی گزارتی یا پھر تھوڑی سی دیر کے لیے نانی ستارہ یا استاد فراغت بیگ کے پاس جا بیٹھتی۔

پڑوس میں رہنے والی چلبلی باغ و بہار کزن اور خالہ سے اسے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

شاما کی کچن کی مصروفیات مختصر ہو رہی تھیں۔ ایک آدھ چیز پکتی۔ وہ بھی دو وقتوں تک رکھی رہتی۔ استاد جی دودھ دلیہ تک محدود تھے۔ کام سے فارغ ہو کر وہ بھی نانی کے کمرے کے کسی کونے میں دوپٹے سے منہ ڈھک کر اونگھتی رہتی۔ کئی ماہ سے گھر کے ماحول پر جمود طاری تھا۔

ایسے بے زار کن یکسانیت بھرے ماحول میں ایک نگینہ ہی تھی جو صبح دس گیارہ بجے نکلتی تو شام کو سات آٹھ تک واپس ہوتی۔ کبھی کبھی مصروفیت بڑھ جاتی تو اور بھی دیر۔

وہ کیا کر رہی تھی؟ کسی نے بھی یہ سوال نہیں پوچھا تھا۔

ساری زندگی اس نے گھر کا چولہا جلائے رکھنے کی ذمہ داری آخر اٹھائی ہی تھی۔ سو اب بھی وہ کچھ نہ کچھ کر رہی ہوگی۔ یہ سب نے خود ہی فرض کر لیا تھا۔

صرف نانی ستارہ تھیں' جو مضطرب سی نگاہوں سے اس تھکن زدہ وجود کو دیکھتیں اور پھر نگاہ چرا لیتیں۔

اس وقت بھی وہ ان کی بڑی ساری مسہری پر پائنتی کی طرف آڑی ترچھی لیٹی شاما سے کوئی قصہ سننے میں مصروف تھی۔

"شاما۔ ذرا چائے بنا کر لے آ!" نانی نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس کی مستقل چلتی زبان کو بریک دیا' تو وہ سعادت مندی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

"کچھ زیادہ نہیں بولنے لگی یہ شاما۔ تمہارے آتے ہی تو جیسے اس کی زبان میں پہیے لگ جاتے ہیں۔ ایک لمحے کو نہیں رکتی۔ اور تم اسے ٹوکتی بھی نہیں ہو۔ دس بار کے سنے ہوئے قصے بھی اس دلچسپی سے سنتی ہو کہ۔۔۔"

انہوں نے خفگی سے بات ادھوری چھوڑی۔

نگینہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا کرے وہ غریب بھی اماں! اب یہاں کرنے کے لیے ہے ہی کیا۔ پہلے تو اسے پل بھر کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ رات گئے تک کی محفلیں۔ مہمان داریاں' محلے سے مدد کے لیے تین تین لڑکیاں بلائے رکھتی تھی۔ اب تو محلے میں نکلتی بھی نہیں ہے۔ ساتھ میں گلناز کے ہاں کتنی رونق لگتی ہے۔ وہاں تک جا کر نہیں جھانکتی۔ باتیں ہی تو کرتی ہے۔ وہ بھی نہ کرے تو مر جائے گی۔"

نانی ستارہ نے اکتائے ہوئے انداز میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

یہ سارے ملال بھی اب پرانے ہوئے تھے۔

"گیتی کا فون آیا تھا!" ان کے پاس تازہ اطلاع تھی۔

"اچھا۔" نگینہ اٹھ کر بیٹھی "حیرت ہے کہ شاما نے نہیں بتایا مجھے۔"

"میں نے اسے نہیں بتایا تھا گیتی کے فون کے بارے میں!" نانی ستارہ کی آواز دھیمی ہوئی تھی۔

نگینہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

شہ، جیسی ملازمہ کے ساتھ رازداری برتنے کا کوئی تصور نہیں تھا گھر میں۔ ہر دکھ' ہر پریشانی میں وہ برابر کی ساتھی رہی تھی ہمیشہ۔۔۔ فیروزہ مرحومہ کے سارے زیورات تک اسی کی معرفت بکتے تھے۔۔۔ پھر کیوں؟

"گیتی بہت پریشان تھی نگینہ۔۔۔ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے وہاں! شک تو مجھے کئی دن سے ہو رہا تھا لیکن وہم سمجھ کر ٹالتی رہی۔ مگر اب اس نے خود کہا ہے مجھ سے۔"

نگینہ ساکت ہوئی ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"وہ شاید واپس آنے والی ہے۔"

نگینہ کا دل اچھل کر حلق میں آیا۔ "گیتی نے کہا آپ سے خود کہ وہ آرہی ہے؟"

"ہاں۔۔۔ اس نے کہا کہ وہ بہت یاد کر رہی ہے ہمیں۔۔۔ اس لیے دو چار دن بعد آنے والی ہے۔"

"ہا!" نگینہ نے ایک اطمینان بھری سانس لی اور ہنس پڑی۔ "توبہ ہے اماں! آپ بھی جان نکال دیتی ہیں۔۔۔ ظاہر ہے اتنا عرصہ ہو گیا ہے گیتی کو کراچی گئے ہوئے۔۔۔ ایک بار بھی تو نہیں آئی' یاد تو کرتی ہوگی۔۔۔ اسی لیے آ رہی ہے۔ ہائے' کتنے عرصے بعد میں اسے دیکھوں گی۔"

نانی ستارہ نے بے ساختہ ہی ماتھے کو چھوا۔

"وہ ملنے نہیں آ رہی ہے۔ کوئی اور وجہ ہے اس کے آنے کی۔ وہ رو رہی تھی۔ اصرار کے باوجود بھی نہیں بتایا کچھ بھی۔ کہہ رہی تھی کہ آکر بتاؤں گی کہ کیا بات ہے۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے نا۔۔۔ فون پر ساری باتیں۔۔۔"

لاپروائی سے کہتے ہوئے وہ ایک دم ہی ٹھٹکی! نانی ستارہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ایسا نہیں ہے نگینہ۔۔۔ سمجھ کیوں نہیں رہی ہو میری بات' ہماری گیتی آرا پریشان ہے' بہت زیادہ۔ کچھ ہوا ہے جو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

نگینہ دم بخود ہوئی۔

"سالار تو ایسا نہیں ہے اماں!" ڈوبتی ہوئی آواز میں اس نے تنکے کا سہارا پکڑنا چاہا "بہت محبت کرتا ہے وہ گیتی سے۔"

"میں جانتی ہوں اور گیتی نے بھی اس پریشانی کے عالم میں بھی اپنے شوہر کی تعریف ہی کی ہے۔ بلکہ سچی بات یہ کہ وہ خود سے زیادہ اس کے لیے پریشان تھی۔۔۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس کی غلطی تھی جو وہ سالار جیسے نیک انسان کی زندگی میں آگئی۔" نانی ستارہ نے گیتی کی کہی بات کو دہرایا۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟" وہ نگینہ سے پوچھ رہی تھیں۔

"شاید ہمارا حوالہ بے عزتی کا باعث بنا ہو گیتی اور سالار دونوں کے لیے۔۔۔ مگر ہم نے ایسا تو کچھ نہیں کیا۔۔۔ اور گیتی وہ تو بالکل ہی معصوم۔۔۔"

"نگینہ۔۔۔ نگینہ۔۔۔!" گلناز کی چہکتی ہوئی آواز برآمدے کے دوسرے سرے سے ہی سنائی دے رہی تھی۔

نگینہ نے تیزی سے اپنی آنکھیں رگڑ کر خشک کیں اور سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اسے بھی اسی وقت آنا تھا!" وہ بڑبڑائی۔

"توبہ کیسا سناٹا پڑا ہے۔۔۔ شام ابد بخت تو لائٹیں تو جلا کر رکھا کر۔ اللہ میری خالہ کو سلامت رکھے۔ کیسا نحوست بھرا اندھیرا پھیلا رکھا ہے گھر میں۔"

وہ بولتی ہوئی کمرے کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

"اندر آجاؤ گلناز!" نانی ستارہ نے متانت سے اتنا ہی کہا تو وہ مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی۔
"السلام علیکم خالہ!" ان کے سامنے حسب عادت وہ جھک کر دوہری ہوئی۔
"جیتی رہو، خیر تو ہے۔ اس وقت کیسے آگئیں۔" نانی کو فطری سی فکر ہوئی۔
یہ وقت اس کے ہاں کی محفل کا ہوتا تھا۔ سو مصروفیت ہی مصروفیت۔
"آج چھٹی ہے!" وہ شوخی سے مسکرائی۔
نگینہ بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گلناز کے چہرے پر بڑی تازگی تھی۔ خوب صورت قیمتی لباس، زیورات کی چمک۔

سامنے شیشے میں نظر آتے اس کے اور گلناز کے مشترکہ عکس میں ایسا ہی فرق تھا، جیسے اندھیرے اور اجالے میں۔ نانی ستارہ نے شاید گلناز سے چھٹی کی وجہ پوچھی تھی۔ نگینہ نے اس طرف دھیان لگانا چاہا۔
"کراچی کا پروگرام ہے، پرائیویٹ محفل کی بکنگ ہے۔ اس کی تیاریاں شروع کی ہیں کل سے۔ ہفتے کی رات کا فنکشن ہے۔ پی سی میں سارے لوگوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہے۔ منہ مانگا معاوضہ دیا ہے پارٹی نے۔"
نگینہ نے ساری تفصیل اکتاہٹ کے ساتھ سنی تھی۔ کچھ بھی نیا نہیں تھا۔
ایسے پروگرام، گلناز اور الماس کے روٹین کا حصہ تھے اور انہیں ہمیشہ ہی ایسے لوگ مل جاتے تھے جو انہیں بقول ان کے منہ مانگا معاوضہ بھی دے دیا کرتے تھے۔
"واللہ اعلم!" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔
جب سے نیکی کے بارے میں سنا تھا، دل اڑا اڑا سا تھا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، نہ گلناز اور نہ اس کے پروگرام کی تفصیل۔
نانی ستارہ میں بڑی استقامت تھی جو دل کی ہر کیفیت کو ہمیشہ ہی کامیابی سے چھپا لیتی تھیں۔
"پہلے پہل تو میرا دل نہیں تھا۔ اصل میں تو یہ شخص میرے دل سے اتر چکا ہے۔ کمینہ خبیث!" گلناز کو چند تلخ باتیں آئیں۔ "پھر میں نے سوچا، ہمیں کون سا رشتہ داری کرنی ہے۔ لعنت بھیجو۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ پرفارم کرنا ہے اور آنا ہے واپس۔ کیوں نگینہ!"
اس نے نگینہ سے تائید چاہی تو وہ زبردستی مسکرادی۔
"اصل میں تو میں اس لیے آئی تھی کہ۔۔۔" وہ مسہری پر نانی ستارہ کے قریب کھسک کر بیٹھی۔ "دیکھیں خالہ! بے شک جوتی اٹھا کر میرے سر پر ماردیں۔۔۔ مگر میری نیت پر شک مت کیجیے گا۔" گلناز کی تمہید میں بڑی عاجزی تھی۔ سو بات خود بخود گمبھیر ہونے لگی۔
"سچ کہتی ہوں، چوبارے کا حال دیکھا نہیں جارہا۔ نگینہ میری بہن ہے۔ ساری عمر کی خواری کے بعد بے چاری آج بھی روٹی روزی کمانے کے لیے۔۔۔"
"بات کیا ہے، وہ کہو گلناز!" نانی ستارہ نے بے تاثر لہجے میں اس کی بات کاٹی۔
"میں چاہ رہی تھی کہ صندل بھی پروگرام میں ہمارے ساتھ چلی چلے۔ ایک شو سے اتنا کمالے گی کہ بے فکری ہوجائے گی نگینہ کو۔ غصہ مت کیجیے گا خالہ۔ صندل بہترین ڈانسر ہے اپنی خالہ فیروزہ کی طرح۔۔۔ اور پھر یہ ہمارا کام ہی تو ہے۔"
گلناز نے جھجکتے اٹکتے بات پوری کرہی لی۔
اندر آتی شاما نے ہاتھ میں تھامی ٹرے خاموشی سے میز پر رکھی۔ کمرے میں چند لمحوں کے لیے گہری خاموشی اتری تھی۔

"میں نے کچھ غلط کہا کیا خالہ! اس میں کیا برائی ہے اگر صندل۔۔۔" گلناز ہمت پکڑ کر پھر پوچھ رہی تھی۔ "کراچی کا بڑا امیر آدمی ہے۔ فنکشن بھی گھر پر ہی ہے۔ اور پیسے بھی منہ مانگے۔ صندل کو تو الماس سے زیادہ ملے گا۔ ہیروئین رہ چکی ہے آخر میری بھانجی۔۔۔ اور اصل میں تو خود نبیل کی بڑی خواہش ہے کہ اس کے فنکشن میں صندل کی پرفارمنس ہو۔ دس دس فون کررہا ہے کہ جیسے بھی ہو صرف ایک پرفارمنس کے لیے صندل بھی آئے اور آپ سب بھی مہمان کی حیثیت سے شرکت کریں۔۔۔ مان جائیں نا خالہ۔۔۔ میں نے وعدہ کرلیا ہے کہ بس لے آؤں گی۔۔۔ میری بات رکھ لیں نا۔"
اس نے عاجزی سے نانی ستارہ کے پیروں پر ہاتھ رکھنا چاہا تو انہوں نے پیر پیچھے کھینچ لیے۔
"صندل کا اختیار مجھے نہیں، نگینہ کو ہے۔ اس کی مرضی وہ اپنی بیٹی کو بھیجتی ہے یا نہیں۔۔۔ مجھے نہ اقرار ہے اور نہ اعتراض۔ نگینہ جانے۔۔۔ صندل جانے۔"
وہ خوبی سے بری الذمہ ہوئیں۔ نگینہ کے چہرے پر کشمکش سی تھی۔
"برائی کیا تھی۔ وہی ڈانس جو صندل آج تک کرتی آئی ہے وہی کرنا تھا۔ چند منٹ کا صرف ایک رقص۔۔۔ جیسے تیسے صندل کو بھی منایا جاسکتا تھا۔ زندگی کو بہتری کی طرف لانے کے لیے کہیں سے تو اسے بھی ایک نئی ابتدا کرنا تھی آخر۔" نگینہ نے بروقت حقیقت پسندی کا سہارا لیا تھا۔
"شاید وہ اب بری طرح تھک چکی ہے۔ ذمہ داریوں کا بوجھ صندل کو شیئر کرنا ہی تھا اور ایک اتنی اچھی پرفارمر کا کریئر کی ابتدا میں ہی مایوس ہو کر بیٹھ جانا بھی تو سمجھ داری نہیں تھی۔۔۔ اور ابھی چند ہی دن پہلے بالی کی دوسری ہیروئین کی پہلی فلم بھی تو بری طرح پٹی ہے۔"
کسی ماہر کاروباری کی طرح اس نے چند لمحوں میں سارے آپشنز پر غور کیا تھا۔ گلناز ابھی بھی اسے امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ نگینہ نے ہلکے سے کھنکھار کر گلے کو صاف کیا۔
"ٹھیک ہے۔ میں صندل سے بات کرکے بتاتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ مان جائے گی۔ پر وعدہ نہیں کرتی۔"
نانی ستارہ اور شاما دونوں ہی نے چونک کر نگینہ کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاں کی کسی لڑکی نے کبھی بھی پرائیویٹ پرفارم نہیں کیا تھا۔ صندل بھی چوبارے سے اٹھ کر فلم میں ہی گئی تھی۔ اور فیروزہ وہ کمال درجے کی فنکارہ جس نے کبھی نہ فلم کی آفر قبول کی اور نہ ہی کسی کے گھر پر جاکر پرفارم کیا۔ گلی بھری ہوتی تھی اس کے رقص کو دیکھنے والوں سے۔
نانی اور شاما تقریباً ایک سی کیفیت سے گزریں۔
گلناز کا رنگ خوشی سے سرخ ہورہا تھا۔ وہ بے ساختہ اٹھ کر نگینہ کے گلے لگی تھی۔
"مجھے بس تیری ہاں کی فکر تھی نگینہ۔ دیکھنا اب کتنی جلدی دن بدلیں گے۔ میں ابھی جاکر خوش خبری سناتی ہوں ہائے۔۔۔ تونے تو دل خوش کردیا نگینہ۔۔۔ ایڈوانس کا چیک بھی ایک دو دن میں آجائے گا تیرے پاس۔"
گلناز خوشی سے بے حال تھی۔
پارٹی کو خوش خبری دینے کی اسے اتنی جلدی تھی کہ وہ پھر ایک منٹ بھی نہیں رکی۔
"پتا نہیں خود ہمیں لانے کا کتنا کمیشن وصول کرے گی اب!" بہت دنوں بعد اس نے گلناز کے لیے دل میں وہی پرانی تلخی محسوس کی تھی۔
نانی ستارہ کی سوالیہ نظریں ابھی بھی اس کے چہرے پر جمی تھیں سو وہ ان سے بچنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"تھوڑی دیر لیٹوں گی، نیکی آرا کا فون آئے تو مجھ سے بات کروا دیجیے گا اللہ نے چاہا تو اس کی مشکل بھی حل ہو گی۔" وہ کہتی ہوئی باہر نکلی تھی۔

نانی ستارہ نے دل پر بڑا بھاری سا بوجھ پڑتا محسوس کیا تھا ایسا بوجھ جو نگینہ کی کمر توڑ محنت کو دیکھ کر بھی نہیں پڑتا تھا۔

☆ ☆ ☆

آپا گل کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"کوئی مجھے پکڑو۔۔۔ میں گرنے کو ہوں۔۔۔ بے ہوش ہونے والی ہوں۔" ہر ایک منٹ میں وہ اپنے بے ہوش ہونے کی اطلاع دے کر پھر سے سنبھل جاتی تھیں۔

"جنازہ نکل چکا ہے ہماری عزت کا۔ یہ جویا ہمیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔ مجھے پہلے ہی یقین تھا اور وہی ہوا۔ کیا ڈراما کیا ہے اس نے عین مایوں کی رسم میں۔ اتنے دن منہ بند کیے بیٹھی رہی۔ صرف ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے۔"

لاؤنج میں جس رخ سے دھوپ آ رہی تھی' وہ اسی طرف کرسی بچھائے بڑی آرام دہ پوزیشن میں بیٹھی تھیں۔

اظہار صاحب' سلمان اور شاکرہ امی۔۔۔ تینوں ہی ان کے سامنے خاموش بیٹھے تھے۔

"اور دیکھ لیں۔ اس نے وہی کیا' جو اسے کرنا تھا۔ ذلیل کروا کر رکھ دیا ہے ہمیں۔ اب نہیں کرنے والا فرید الدین اس سے شادی وادی۔ اس کی بہن نے کہہ دیا ہے کہ لڑکی کو کوئی موذی بیماری ہے۔ ٹی بی کا آخری اسٹیج یا پھر۔۔۔"

"خدا نہ کرے۔۔۔ خدا نہ کرے۔" شاکرہ امی نے تڑپ کر آپا گل کی طرف دیکھا۔ "وہ اچھی ہو جائے گی ان شاء اللہ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔"

آپا گل کے چہرے پر بڑی تلخ سی مسکراہٹ ابھری۔

"وہ بیمار کب ہے۔ یوں ہی مکر کر کے اسپتال میں جا کر لیٹ گئی ہے۔ آنکھیں بند کر کے پڑے رہنے میں کیا مشکل ہے۔ ابھی مجھ سے کہو۔ میں مہینے بھر بھی آنکھیں کھول کر نہ دیکھوں۔۔۔ آرام سے پڑی رہوں بستر پر۔۔۔"

"استغفر اللہ!" سامنے کمرے میں سے کچھ نکالتے ہوئے زویا نے زیر لب کہا۔ وہ کچھ ضروری چیزیں لینے آئی تھی اور ابھی اسے "فوراً" ہی واپس اسپتال چلے جانا تھا۔

"تو اب کیا ہو گا آپا! کیا فرید الدین ہمیں اس گھر سے نکال دے گا۔ ہم کہاں جائیں گے؟ اس سے تو وہ پہلے والا گھر ہی اچھا تھا۔ آرام سے رہ رہے تھے۔ اس کا کرایہ دینا تو ہمارے لیے ناممکن ہے۔" سلمان کے لہجے میں فکر بھی تھی اور خوف بھی۔

زویا کا دل چاہا کہ وہ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ مگر بس اک صبر۔

وہ جلدی جلدی بیگ میں چیزیں رکھ رہی تھی۔ اسے واپس اسپتال پہنچنا تھا۔ کسی نے بھی آ کر کمرے میں جھانکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ سوائے ایک شاکرہ امی کے جنہیں وہ بمشکل ہی گھر پر ٹھہرنے کے لیے آمادہ کر پائی تھی۔

"ایک ہی صورت ہے کہ یہ بیماری وبیماری کا ڈراما ختم کر کے اسے گھر لے آؤ۔ نکاح پڑھوا کر رخصت کرو۔ فرید الدین خود ہی علاج کرواتا رہے گا۔ ہماری ذمہ داری ختم۔" ان کی بے قراری عروج پر تھی۔

زویا لاؤنج میں آ کھڑی ہوئی۔

"آپ تو اگر وہ مر بھی جائے تو یقین کرنے والی نہیں ہیں اسی کفن میں اسے فرید الدین کے ساتھ۔۔۔"

شدت جذبات سے زویا کی آواز کانپ رہی تھی۔ اظہار صاحب نے چونک کر زویا کی طرف دیکھا۔

"کیا وہ اتنی زیادہ بیمار ہے؟" جویا کے حوالے سے پہلا سوال جو ان کی طرف سے آیا تھا۔

"ارے نہیں ابا۔۔۔ یوں ہی جھوٹ موٹ۔۔۔ اسپتال والوں کو تو اپنا بل بنانا ہوتا ہے۔ کر لیتے ہیں داخل ایمرجنسی میں۔"

"میں زویا سے پوچھ رہا ہوں!"

"شکر ہے جو آپ کو اس کا اتنا خیال تو آیا۔۔۔" ایک گہری سانس لیتے ہوئے زویا نے ان کی طرف دیکھا۔ "وہ آئی سی یو میں ہے پرسوں سے۔ ڈاکٹر کچھ زیادہ امید نہیں دلا رہے ہیں اس کے لیے۔ ایک بار بھی اس نے آنکھ کھول کر کچھ نہیں دیکھا ہے ابو! بہت سارے Complications ہیں جویا کے۔ وہ اندر ہی اندر کھل چکی ہے۔ اس کے لنگز بھی ایفیکٹڈ ہیں خون کی انتہائی کمی وائٹ سیل ختم ہونے کو۔۔۔"

وہ ایک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لاؤنج میں سناٹا سا پھیلا۔

"اب ہمیں کوئی الہام تو ہوا نہیں تھا۔ بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا۔ میں ابھی فرید بھائی کو فون کرتی ہوں۔ وہ بہترین علاج کا بندوبست کروا دیں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ سارا کھیل پیسے کا ہے بس۔"

اس سناٹے میں بھی گونجنے والی آواز آپا گل ہی کی تھی۔

"مت دیں انہیں تکلیف۔۔۔ جتنا خرچ جویا کے علاج پر آنے والا ہے۔ آپ کے فرید الدین ادا نہیں کریں گے کبھی بھی۔۔۔ اور اگر پھر بھی آپ انہیں آزمانا چاہیں تو بتا دیجیے گا کہ ہم اسے اس سرکاری اسپتال سے شفٹ کر چکے ہیں دوسری جگہ۔۔۔ اس امید پر کہ شاید وہ بہتری کی طرف آ جائے۔"

خود پر قابو پا کر اس نے پورے تحمل سے ان کی بات کا جواب دیا۔

"اتنا مہنگا اسپتال!" وہ بے ہوشی کا ڈراما بھول کر اٹھ کر کھڑی ہوئی تھیں۔

"کیا پاگل ہو گئی ہو زویا۔ لوگ کیا سرکاری اسپتالوں میں علاج نہیں کرواتے ہیں۔ بھرے پڑے ہیں اسپتال بیماروں سے۔۔۔ اور جویا کیا انوکھی بیمار پڑی ہے۔ ذرا سی کمزوری کو مسئلہ بنا کر رکھ دیا ہے تم لوگوں نے۔۔۔ ظاہر ہے اتنے عرصے سے اچھا کھانا پینا ختم ہو چکا ہے گھر میں صحتیں تو خراب ہوتی ہیں۔ اور یہ اتنا مہنگا علاج کون کروائے گا۔ کیا خیراتی فنڈ۔۔۔"

"بس کر دیں۔۔۔ خدا کے واسطے۔" زویا نے ایک جھٹکے سے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔۔۔ "ہو جائے گا اس کا علاج جنہوں نے داخل کروایا ہے۔ وہ بل بھی دے دیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔"

"اچھا!" وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ "کون ہے تمہارا ہمدرد جو اتنا مال دار ہے کہ یوں ہی فی سبیل اللہ بیماروں کا علاج کروا رہا ہے۔"

وہ کبھی بدلنے والی نہیں تھیں۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے زویا نے خود کو کمپوزڈ رکھنا چاہا۔

اگر وہ قیامت تک بھی ان کے سامنے کھڑی رہے تو بھی ان کے سوال ختم ہونے والے نہیں ہیں۔

"دیکھا۔۔۔ کوئی جواب نہیں ہے اس کے پاس۔۔۔ سب ڈرامے ہیں تم دونوں کے۔" وہ بیک وقت سب سے مخاطب تھیں۔ "میں فرید بھائی کو فون کر کے ابھی بلا رہی ہوں پھر ہم دونوں ہی تمہارے ساتھ چل کر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔"

"کسی کو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ جویا کے پاس اسلام چچا آ چکے ہیں اور وہی اس کے سارے علاج کے ذمہ دار ہیں۔ ہو گئی تسلی آپ کی۔"

آپا گل کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔

سب ہی الگ الگ متضاد کیفیت سے گزرے۔

شاکرہ ای ایک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ لیکن صرف زویا جانتی تھی کہ یہ آنسو دکھ سے نہیں سکون کے باعث ہیں۔

دھیرے سے اس نے ان کا کندھا تھپتھپایا۔

وہ ماں تھیں۔ کتنی بھی خود غرض اور مصلحتوں کا شکار سہی۔ لیکن انہوں نے ہی تلافی بھی کی تھی۔ وہ بھی ہمت سے بڑھ کر۔

"میں ہاسپٹل جا رہی ہوں!" وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اظہار صاحب کا سر جھکا ہوا تھا۔ کوئی بھی اس کے پیچھے نہیں آیا۔ اسے توقع بھی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی دکھ تھا۔

معاذ اسے آئی سی یو کے آس پاس ہی مل گیا تھا۔

کل سے اب تک جویا کو دوسرے اسپتال میں شفٹ کرنے کے مرحلے میں وہ ساتھ تھا۔ ایمبولینس میں جویا کمزور سرد ہاتھ تھام کر بیٹھا ہوا بار بار اپنے آنسو صاف کرتا ہوا۔

زویا نے دانستہ بار بار ہی نگاہ چرائی تھی۔

اور ان کے یہاں پہنچنے سے پہلے اسلام چچا آ چکے تھے۔

جویا کے سب کام ہو رہے تھے۔ مگر وہ خود کہاں تھی؟

"تم کیوں آ گئیں۔ میں ہوں نا یہاں!" معاذ نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔

زویا نے یوں ہی دھیرے سے سر ہلایا تھا۔

ایک مدت سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں تھا ان دونوں کا مگر یہ بھی ایک غلط فہمی ہی تھی سب کی۔

"کاش جویا آنکھ کھول کر دیکھے معاذ بھائی کہ آپ اس کی کتنی پروا کرتے ہیں۔"

معاذ کے ساتھ لابی کے صوفوں پر بیٹھتے ہوئے اس نے بہت آہستگی سے کہا تھا۔ معاذ چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھے گیا۔

"وہ بالکل خالی ہے اندر سے۔ کوئی تمنا، کوئی امید کچھ بھی نہیں۔ آپ کے حوالے سے اس کا ہر خواب جل کر راکھ ہوئے بھی عرصہ ہو چکا لیکن وہ اس طرح ناامید ہو کر نہ جائے۔۔۔"

زویا کی آنکھوں سے بہت سارے آنسو ایک ساتھ گرے جنہیں اس نے خاموشی سے صاف کیا تھا۔

"کم از کم یہ خوشی تو اس کے ساتھ ہوتی۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی آپ ۔۔۔ اس سے محبت کرتے ہیں۔ میری بہن بالکل نامراد اس دنیا سے چلی گئی تو۔۔۔"

اپنے لبوں پر سختی سے ہاتھ رکھتے ہوئے زویا نے شیشے کی دیوار کے اس پار نظر آتے سبزہ زار کی طرف دیکھا۔ سارا منظر دھندلا رہا تھا۔

"اسے کچھ نہیں ہوگا زویا! تم دیکھنا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ بالکل ٹھیک۔ پہلے سے بھی زیادہ اچھی۔ ویسی ہی خوش مزاج، ویسی ہی لڑتی جھگڑتی۔"

معاذ کی آنکھوں میں گزرے ہوئے اچھے دنوں کی چمک اتری تھی۔

وہ دن جب جویا ربیعہ کے ساتھ کالج کے گیٹ پر اس سے لڑنے کے بہانے ڈھونڈتی اور اس کے ہر طنز کو ایک ہنسی میں اڑاتی تھی۔ اور وہ دن جب۔۔۔

زویا کو کچھ اور خیال آیا تھا۔

"میں نے گھر میں آپ کا اور اسلام چچا کا بتا دیا تھا۔ اصل میں ابا اب بہت اچھا چل پھر نہیں سکتے ہیں۔ ان کی

صحت اچھی نہیں ہے۔" وہ جیل کے تذکرے سے جھجک کر گزری۔ معاذ نے تیزی سے بات بدلی۔

"میں کسی دن جاؤں گا، ظہار چچا سے ملنے۔۔۔ جو بھی میری غلطی ہے اس پر معافی مانگ لوں گا، ان سے ٹھیک ہو جائے گا سب۔"

زویا افسردگی سے مسکرائی۔

"وہ لوگ بدل سکتے، آپ کو پتا ہے آپا گل نے ابھی میرے سامنے کہا کہ جویا کو صرف ویک نیس (کمزوری) ہے، ڈراما کر رہی ہے بیماری کا۔ اسے گھر لا کر نکاح پڑھوا کر رخصت کر دیا جائے اس فرید الدین کے ساتھ۔"

معاذ کے ہاتھ کے اشارے نے اسے خاموش کیا تھا۔ اس کا نچلا لب دانت تلے سختی سے دبا تھا۔

زویا کو افسوس ہوا تھا۔ اسے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا شاید۔ "سوری معاذ بھائی!"

"غلطی تمہاری نہیں ہے اپنی بہن کا اثر تو آتا ہے۔ وہ بھی تو کم اذیت پسند نہیں ہے۔"

معاذ نے حسب عادت خود کو نارمل کیا تھا۔

"تم بیٹھو میں ذرا دیکھ کر آتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

زویا خاموشی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

اسے پتا تھا کہ اب پھر وہ بڑی دیر تک وہیں باہر کھڑا رہے گا جہاں سے اسے جویا کی ایک جھلک دکھائی دیتی رہے گی۔

☼ ☼ ☼

گیتی کی نگاہ ایک بار پھر دیوار پر لگی گھڑی پر جمی تھی۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔

"اتنی دیر ہوتی تو نہیں چاہیے تھی۔ راجو تو کہہ رہے تھے کہ ساڑھے دس تک فیصلہ سنا بھی دیا جائے گا۔ پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں یہ لوگ۔ لگ رہا ہے جج صاحب دیر سے آئے ہوں گے۔"

گیتی نے پلٹ کر زری کی طرف دیکھا۔ وہ سینٹر ٹیبل پر پھول سجا رہی تھی اور روز سے زیادہ تیار تھی۔

"آپ بھی کوئی اچھے سے کپڑے پہن لیں بھابھی۔۔۔ سالار بھائی کتنا خوش ہوں گے۔ آپ کو دیکھ کر اور بھی
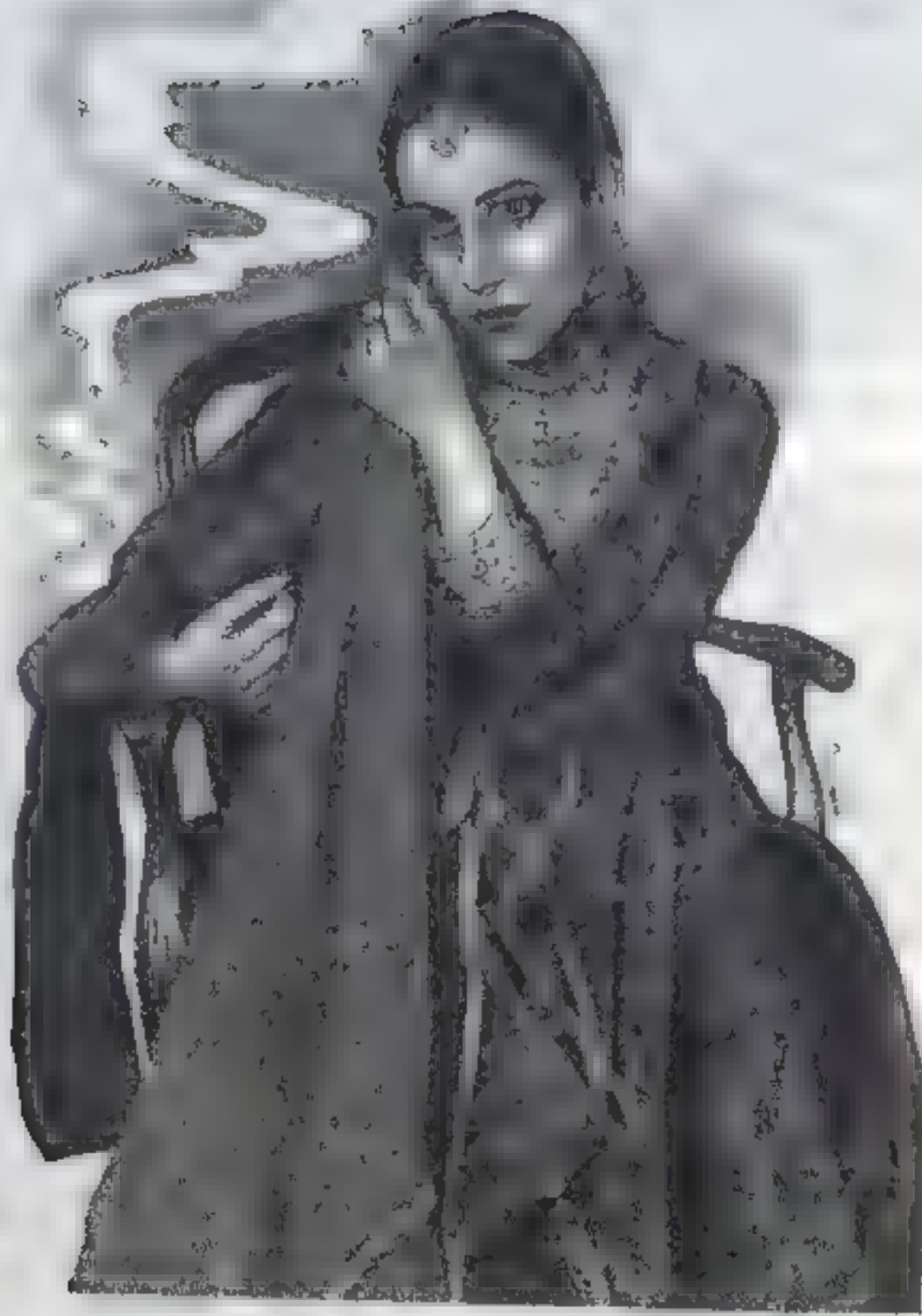
خوش ہو جائیں گے۔ آج تو بڑا دن ہے۔ راجو تو رات بھر سوئے نہیں۔ بہت بے چین تھے۔ بڑے طویل انتظار کے بعد آج انصاف ملے گا۔ ظالموں کو ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ جہنم رسید ہوں گے۔"

وہ بہت خوش تھی اور پر یقین بھی۔

لاعلمی واقعی کتنی بڑی نعمت ہے!

گیتی نے رشک سے اس کی طرف دیکھا اور قریبی صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ ٹانگیں مستقل کانپ رہی تھیں۔ لگ رہا تھا کہ اور کھڑی رہی تو یقیناً "گر پڑے گی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ چہرہ سفید ہو رہا ہے۔"

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں؟" وہ زبردستی بھی نہیں مسکرا سکی۔

"زری! تمہیں لگتا ہے کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا۔"

"بالکل' آخر تو ظالموں کو سزا تو ملنی ہی ہے۔ دنیا کی طرف سے بھی اور اللہ کی طرف سے بھی۔ کوئی بھی ظلم کر کے بچ نہیں سکتا ہے بھابھی۔۔۔ قدرت کا قانون ہے اس پر شک کیسا۔ نبیل کو تو عدالت میں ہی سے گرفتار کر کے جیل لے گئے ہوں گے دیکھ لیجئے گا۔ مٹھائی وٹھائی لینے میں دیر ہو گئی ہے سالار بھائی کو۔"

وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ باہر سے سالار کی گاڑی کا ہارن سنائی دینے لگا۔ گیتی کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔

اگر فیصلہ وہی تھا جو پہلے ہی نبیل سنا چکا تھا تو پھر سالار کا سامنا کرنا کتنا مشکل تھا۔

ایک نیک اور بے چارے شخص کی بدی کے آگے ہار۔

اور اب نبیل کو کون روک سکتا تھا کہ وہ اپنے کیے ہر برے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

وہ آج ہی لاہور چلی جائے گی۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ ان آخری لمحات میں اس نے سالار کے لیے دل سے دعا کی کہ وہ اس کے حوالے سے اچھالی جانے والی کیچڑ سے کم از کم محفوظ رہے۔

باہر سے آتے ہوئے قدموں کی چاپ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

دروازہ کھول کر سالار اندر آیا تھا۔

گیتی کی نگاہ نے سالار پر پڑتی پہلی نگاہ میں ہی کیس کے فیصلے کو جان لیا تھا۔ وہ مایوس تھا' اتنا مایوس جتنا پہلے کبھی بھی نہیں نظر آیا تھا اس کے پیچھے حواس باختہ سی زری۔۔۔ اور راجو؟

گیتی کی نگاہ نے راجو کو ڈھونڈا۔

مگر وہ ساتھ نہیں تھا۔ اپنا غم منانے کے لیے کہیں کسی گوشہ تنہائی میں جا چکا تھا۔

"ہم کیس ہار گئے گیتی۔۔۔ عدالت نے روزی کی موت کو محض حادثہ قرار دیا ہے۔ کچھ نہیں بگڑ سکا نبیل کا۔ ہم ناکام رہے۔"

وہ بہت تھک کر صوفے پر بیٹھا۔

☼ ☼ ☼

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ایلیا یقین

"آپ کا بچہ پچھلے چند ماہ سے عجیب سا رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ تعلیمی سال کے شروع میں پڑھائی میں کافی دلچسپی لیتا تھا مگر اب ایسا نہیں۔ اب اس کا ذہن دوسرے بچوں کی چیزوں میں زیادہ ہے۔ وہ سرگرمیوں میں بھی حصہ نہیں لے رہا۔" لوزان کی کلاس ٹیچر ایک ہی سانس میں کہہ کر رکیں۔

"اچھا تو یہ ہوا کہ اذان کی والدہ آئیں۔ شاید وہ بتا سکتیں کہ وہ اس رویے کو محسوس کر رہی ہیں کہ نہیں۔ اب آپ ہی بتائیے' آپ نے یہ سب نوٹ کیا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟" اب وہ میرے جواب کی منتظر تھیں۔

میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا پھر بھی میں نے رسماً" کہہ دیا کہ میں یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میری بوکھلاہٹ کو محسوس کر کے وہ بڑی دیر تک بچوں کی نفسیات پر سیر حاصل گفتگو کرتی رہیں۔ میرے پاس نفسیات سے متعلق نہ تو معلومات ہیں' نہ ہی اس کی اہمیت کا مجھے کوئی اندازہ' کیونکہ میں ایک اکاؤنٹنٹ ہوں۔

میں متوسط طبقے کا ایک فرد ہوں۔ میرا خاندان ایک امی' دو بچوں اور ان کی امی یعنی میری پیاری بیوی پر مشتمل ہے میری زندگی میں تعلیم صرف شوق نہیں' بلکہ جنون کی حد تک اہم رہی ہے۔ ابا کی وفات کے بعد میں حالات کے پیش نظر انجینئرنگ یونی ورسٹی چھوڑ کر جو روزی کے چکر میں پڑا تو فقط بی کام ہی کر سکا۔ اب پڑھنے کے سارے ارمان اپنے بچوں پر نکالنا چاہتا ہوں لیکن اس صورت حال سے امی ناخوش ہیں اور نادیہ بھی۔ امی برملا کہتی ہیں اور نادیہ چپ ہے کہ امی کے کہنے کا مجھ پر اثر نہیں ہو رہا تو اس کے کہنے کا فائدہ؟

لیکن وہ ہمیشہ مجھ سے بہت تعاون کرتی ہے۔ اگر میں دس برس کی کامیاب گھریلو زندگی کا سارا کریڈٹ ان ساس بہو کو دوں تو بے جا نہ ہو گا۔ مگر اذان کی پڑھائی کا معاملہ ہمیشہ ہی متنازعہ رہا ہے۔

تین برس پہلے اذان کو میں نے ایک نامی گرامی نجی تعلیمی ادارے میں داخلہ دلوا دیا' جہاں رؤسا کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ داخلے سے لے کر ایک برس تک وہ رقم کام آئی جو نادیہ نے پانچ برس میں پس انداز کی تھی۔

دوسرے سال امی کے کنگن بکے۔ تیسرے برس میں نے قرض لیا اور پھر نادیہ نے ملازمت شروع کر دی پھر حالات ایسے ہو گئے کہ ہم کوئی نیا لباس نہ لے پاتے۔ ہفتے میں ایک بار گوشت پکتا۔ رشتہ دار آتے تو بجٹ متاثر ہو جاتا۔ اذان کی پڑھائی کے لیے ہم ہر طرح سے بچت کرنے لگے اور اس پر ٹیچر کے یہ تاثرات۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"یہ اذان کو کیا ہو گیا ہے نادیہ! یہ اس طرح کیوں ہو گیا ہے؟" میں جھنجلایا ہوا تھا اور وہ تھکی ہوئی۔

اس کے روز مرہ معمولات سے آرام و سکون ہٹ گیا تھا۔ گھر کا کام' اسکول کی ملازمت' بچوں کے نخرے اور امی کے کام جو کہ جوڑوں کے درد کی بنا پر اس کی کوئی بھی مدد کرنے سے قاصر تھیں۔ رات پر جب جوانی چڑھتی تو وہ ساری ہمت مجتمع کر کے کاپیاں جانچتی رہتی۔

"بلال! وہ ایک مہنگے اسکول میں پڑھتا ہے۔ ہر جگہ کا کوئی معیار ہوتا ہے۔ وہ جس جگہ ہے' ہم ادھر کے معیار کو کبھی نہیں پہنچ سکتے۔" اس کے لہجے میں تھکن تھی۔

"کیوں؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ ابھی کہہ کر گیا ہے کہ میں اسکرٹ اور جینز نہیں پہنتی بلکہ بہت پرانے کپڑے پہنتی ہوں۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔ "اور کل وہ امی سے کہہ رہا تھا کہ دادی! آپ ایکسرسائز کیا کریں۔ جم جوائن کر لیں فٹ رہیں گی۔ وہ ان کو بال ڈائی کرنے کا مشورہ بھی دے رہا تھا۔"

میں ہکا بکا نادیہ کو دیکھتا چلا گیا۔ وہ لان کے بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس پیاز تل رہی تھی۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اسے یہ سب باتیں کہاں سے آئیں؟"

"وہ مٹی کا مادھو نہیں ہے۔ اپنی کلاس کے بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ یہی کچھ سنتا ہو گا۔" اب وہ سنبھل چکی تھی۔

میں چپ چاپ باہر آ کر لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ اذان بھی [illegible] کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر سیدھا ہو گیا۔

"پاپا! میرے سب کلاس فیلوز کو ان کے فادرز یا ڈرائیور لینے آتے ہیں۔ آپ بھی مجھے لینے آیا کریں۔"

"ٹھیک ہے! میں کوشش کروں گا۔" میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن لنچ ٹائم میں نادیہ نے مجھے کال کر کے یاد دلایا کہ میں اذان کو لینے جاؤں۔ وہ تاکید کر گیا تھا کہ نادیہ مجھے یاد دہانی کرا دے۔ میں اپنی سیکنڈ ہینڈ ایف ایکس پر جو کہ نادیہ کا زیور اور میری بائیک بیچ کر خریدی گئی تھی' وہ بھی اذان کی فرمائش پر' اسے لینے چلا گیا۔ دو دن تک میں اسے لینے جاتا رہا۔

تیسرے دن اس نے خود ہی منع کر دیا کہ میں اسے لینے نہ آؤں' اس کے کلاس فیلوز کی مہنگی گاڑیوں کے سامنے معمولی گاڑی میں آتے ہوئے اسے سبکی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے چند دن بعد اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں اسے لیپ ٹاپ لے دوں تو وہ پڑھائی میں محنت کرے گا۔ باوجود اس کے کہ ڈیسک ٹاپ گھر میں موجود تھا۔ تب مجھے لگا کہ وہ جانتا ہے کہ وہ محنت نہیں کر رہا اور مجھے لالی پاپ دے رہا ہے جیسے وہ میرا باپ ہو۔ غصہ تو مجھے بہت آیا' لیکن میں چپ ہی رہا۔

نادیہ تھکنے لگی تھی اور میں اذان کے رویے میں بدتمیزی کی آمیزش دیکھ کر پریشان رہنے لگا۔ ہماری بیٹی حرا زیادہ وقت امی کے ساتھ گزارتی' لیکن نادیہ کو اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا پورا احساس تھا۔ وہ نظر انداز ہو رہی تھی۔ نادیہ کی خوش مزاجی رخصت ہو گئی۔ دس برس ہم نے جس امن و سکون سے گزارے تھے' رخصت ہونے لگا۔

☼ ☼ ☼

ایک روز میں صبح اٹھا۔ نہانے کے لیے غسل خانے میں جانے لگا تو وہاں کپڑے نہیں تھے جو کہ خلاف معمول بات تھی۔ میں تاخیر سے اٹھا تھا۔ میں نے بیڈ روم سے ہی اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ نادیہ شدید جھنجلاہٹ میں باورچی خانے سے آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں بیلی ہوئی روٹی تھی۔ الماری سے کپڑے نکالنا یقیناً" ناممکن تھا۔ وہ مجھے بتا کر چلی گئی کہ کپڑے ہینگر میں ہیں۔ اور میں بلاوجہ ہی طیش میں آ کر اسے برا بھلا کہنے لگا اور ناشتے کے بغیر ہی دفتر آ گیا۔ یوں سارا دن اپنی بے وقوفی پر شرمندہ ہوتا رہا۔ گھر میں نادیہ بجھی بجھی بیٹھی تھی۔ ہم میں ہلکا سا کھنچاؤ آ گیا۔

رات کے کھانے پر فضا بڑی بوجھل تھی۔ پھر امی نے ہمیں اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ وہ بہت خفا دکھائی دیتی تھیں۔

اپنی اولاد کا تو تم جو چاہو کرو' لیکن اس دوران جو مسائل جنم لے رہے ہیں' ان کا کیا ہو گا؟ نادیہ کیا کرے؟ وہ صبح ناشتا بنائے۔ تمہیں تمہارے بچے کو تیار کرے۔ پورے گھر کو ناشتا دے' پھر خود تیار ہو۔ اسکول جائے۔ پھر گھر آ کر دوبارہ گھر کے کاموں میں جت جائے۔ حرا اس کی شکل دیکھنے کو ترس جاتی ہے اور اوپر سے تمہارا یہ رویہ؟ آخر تم کیا چاہ رہے ہو؟"

ایسی جھاڑ کم ہی سننے کو ملتی تھی۔ میں امی کا اکلوتا پیارا بیٹا ضرور ہوں' لیکن ثانیہ آپی اور سفینہ باجی پر مجھے کوئی ترجیح حاصل نہیں۔ ہاں! مگر امی بہت نرم مزاج ہیں۔ میں شرمندہ ہو گیا اور نادیہ سے سوری کر لی۔ لیکن امی کے چہرے سے تاسف کم نہ ہوا۔

اگلے روز ہم بازار گئے تو اذان ریموٹ کنٹرول والا ہیلی کاپٹر لینے کی ضد کرنے لگا۔ وہیں مجھے ضمیر مل گیا جو کہ میرا اسکول کا دوست ہے۔ ہم ملاقات کا وقت طے کرتے جدا ہوئے اور خریداری میں مصروف ہو گئے۔

دو روز بعد ہفتہ واری تعطیل تھی۔ وہی دن جس

میں ضمیر کو آنا تھا اور وہ آیا بھی۔ اس سے ملاقات کے بعد اذان کے متعلق میرا ارادہ بدل گیا۔ ہوا یوں کہ میں نے اس سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا تو اس نے مجھے مشورہ دیا۔

"تم اذان کو سرکاری اسکول میں داخل کروا دو۔ اس کا نقصان یہ ہوگا کہ تم مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہارا بیٹا! مہنگے اسکول میں پڑھ کر اسٹیٹس کا شکار ہو جائے گا اور پھر تم سے ہمیشہ کے لیے کٹ جائے گا۔"

اس نے مجھے مزید سمجھایا۔

"اگر تم خود بھی اس کا خرچ اٹھاؤ تب بھی تمہارے پورے خاندان کو اس کے لیے جو قربانی دینی پڑ رہی ہے، وہ بہت زیادہ ہے۔ رشتہ داروں سے تعلقات لین دین ختم ہو رہا ہے۔ تم نے اپنی زندگی سے جائز خواہشات کو بھی حذف کر دیا ہے، پھر بھی اذان میں احساس کمتری پیدا ہو چکا ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ پھلے پھولے گا اور اذان اس احساس سے بچنے کے لیے ساری زندگی پوش طبقے میں شامل ہونے کی سرتوڑ کوشش میں لگا رہے گا اور یہ کوشش اس کا سکون اور انسانیت ختم کر دے گی۔ وہ کامیاب ہو گیا تو مڈل کلاس ماں باپ کو چھوڑ دے گا... کامیاب نہ ہوا تو احساس محرومی سے کبھی نجات نہ پا سکے گا اور ہمیشہ ناشکرا رہے گا۔ اس کی استانی ٹھیک کہہ رہی تھیں کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا ہے... اور اماں بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ تم نے چادر دیکھ کر پیر نہ پھیلائے، بلکہ چادر کو کھینچ کر بڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس سے چادر پھٹ جائے گی۔"

میں نے اذان کے پیدا ہوتے ہی خواب بننے شروع کر دیے تھے کہ میں اپنے بیٹے کو اچھی تعلیم دلواؤں گا۔ اب یہ رنگین خواب بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔

ضمیر ٹھیک کہہ رہا تھا کہ میں اس کی فیس ادا کر سکتا ہوں، بہت سی قربانیاں دے کر اسکول کا خرچ اٹھا سکتا ہوں، لیکن اسے ہمیشہ اعلا برانڈ کے کپڑے، جوتے اور دیگر چیزیں دلانا مشکل ہے۔ اس کے لیے نئے ماڈل کی کار اور پوش علاقے میں گھر لینا یقیناً "میری چادر" میں نہیں آتا۔

اب میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں "رنگین خوابوں" سے پیچھا چھڑا کر "بلیک اینڈ وائٹ حقیقت" کو قبول کر لوں۔ نادیہ ایک پڑھی لکھی ماں ہے۔ اگر اس کا بیٹا سرکاری اسکول میں بھی پڑھتا ہے تو وہ یقیناً اس پر محنت کر کے اسے بہتر کر دے گی۔ تو مجھے کیا حق ہے کہ میں ایک ماں کو اس کا وہ وقت جو اس کے بچوں کا حق ہے، دوسروں کے بچوں پر صرف کرنے پر مجبور کر دوں۔ آخر نرسری بھی تو نادیہ نے خود ہی اذان کو پڑھائی ہے اور ویسے بھی ہماری بیٹی حرا، نادیہ کی ملازمت سے بہت چڑچڑی ہو گئی ہے۔

اذان کو سستے اسکول میں پڑھا کر میں اپنے فرائض نبھا سکوں گا۔ اپنی ماں اور بیوی بچوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشات پوری کرنا میرے بس سے باہر نہیں ہوگا۔ ہم اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے گھر جا سکیں گے اور نئے کپڑے بھی لے سکیں گے۔ زندگی کتنی سہل ہو جائے گی اس ذرا سی تکلیف سے۔

واہ! میں یہ سب سوچ کر کتنا اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ ایک رنگین خواب کو بلیک اینڈ وائٹ کر کے زندگی کے کینوس پر نئے نئے رنگ بکھرتے دیکھ رہا ہوں۔

سعدیہ عزیز آفریدی

زندگی کا مطلب ہے جدوجہد محنت بھی تم بھاگ' بس سفر طے کرتے چلے جانا۔ وہ بھی اسی زندگی کا ایک مسافر تھا' جس کی زندگی کی گھڑی صبح آٹھ بجے سے شروع ہوتی اور رات آٹھ ہی بجے آزادی پاتی۔ چاروں طرف سے زنجیریں ہی زنجیریں تھیں جن میں وہ قید رہتا تھا۔ جیل کے قیدی نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ کچھ کو ان سے ہمدردی ہوتی ہے۔ مگر زندگی کے قیدیوں سے کسی کو تو کیا خود اس قیدی کو بھی محبت نہیں ہوتی۔

بہت چھوٹا تھا جب ابا نے دوسری شادی کرلی تھی۔ ماں اسی غم میں مر گئی۔ وہ باپ کی دہلیز پر آن پڑا تھا۔ نئی ماں نے مشروط طور پر گھر میں جگہ دی جہاں وہ ملازم سے زیادہ کچھ نہیں تھا' مگر ایک قیدی کی طرح۔

اس کے خوابوں کی پرواز بہت بلند تھی۔ ماں کی مار اور بے انتہا تھکن بھی اسے پڑھائی سے دور نہ کر سکی۔ اس کے لیے اس نے سودا سلف میں سے ڈنڈی ماری۔ دوسرے بہن بھائیوں کی کتابوں کی چوری کی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھا اور جب تیرہ برس کا ہوا تو گھر سے بھاگ نکلا۔ محنت مزدوری کرتا' رات کو پڑھتا یہاں تک کہ ایم اے کرلیا۔ اس نے اتنی نوکریاں بدلیں کہ اسے یہ تک یاد نہیں تھا کہ اس نے سب سے پہلے کیا نوکری کی تھی۔ ہاں کچھ چیزیں تھیں جن کو اس نے ٹیگ لگا کر یاد رکھا ہوا تھا کہ شیخ صاحب کا حساب دیکھا تھا تو الماری خریدی تھی' کچن کے لیے چولہا کس نوکری سے آیا تھا' کس نوکری سے کون سی شرٹ پرانی ہے' جس کپ میں وہ چائے پیتا ہے' وہ کب اس نے کس سیلری سے خریدا تھا' لہٰذا بازار سے گرم کمبل' جیکٹ کس شخص کی دکان میں سیلز مینی کر کے خریدا تھا۔

اسے تو یہ بھی یاد تھا کون سی سردی کرایہ نہ دینے اس نے کس سڑک پر ٹھٹھرتے ہوئے گزاری تھی۔ یہ اسے زیادہ سہولت سے یاد رہتا تھا۔ انسان خوشی بھول سکتا ہے' خوشی کا سندیسہ دینے والا بھول سکتا ہے مگر تکلیف بھولتا ہے نہ تکلیف دینے والا۔

اس نے اس شہر کے کتنے گھر چھوڑے۔ کتنے کمروں میں آدھی ادھوری نیندوں کو ساری ساری رات جاگنے کی سزائیں دیں۔ سب یاد تھا۔ اور آج ایک چینل میں نوکری کر رہا تھا تو ساری سہولیات کے باوجود ماضی کا ایک ایک عکس اس کے وجود سے منعکس ہوتا تھا۔ وہ خوش ہونا چاہتا تو بھی خوش نہ ہوتا۔ آزاد ہونا چاہتا تو قیدی محسوس کرتا۔ کبھی کبھی کوئی دکھ اتنا گہرا ہو کر دل میں دیمک کی طرح بیٹھ جاتا ہے' ہر خوشی کو چپکے چپکے چاٹتا رہتا ہے اور آپ کو وجہ تک نہیں پتا چلتی۔

"مجھے کیا غم ہے؟" وہ اکثر سوچتا اور جواب ہمیشہ ندارد ہوتا۔

"تمہیں اداس رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ خود کو مظلوم سمجھنا چھوڑ دو۔ شادی کرلو۔ بیوی آجائے گی تو زندگی کو چھوٹی چھوٹی خوشیاں تلاش کرنے کے لیے کسی کی منت زاری نہیں کرنی پڑے گی۔"

وہ خالی آنکھوں سے دیکھ کر رہ جاتا۔ اس کا دل یہ انتہائی قدم اٹھانے سے ہمیشہ کتراتا۔ اسے اپنی مرکی

ہوئی ماں یاد آجاتی اور اپنا بے حس باپ یاد آجاتا۔

"محبت وحبت کچھ نہیں ہوتی۔ تو ساری عمر بھی اس شخص کے قدموں میں پڑی رہے گی تب بھی یہ تجھے روند کر گزر جائے گا۔ اسے تجھ سے محبت نہیں ہے۔" بچپن کی ایک یاد کراتی تو وہ گہرے لمبے سانس بھر کر اپنی نانی کو یاد کرتا۔ تب ہی ماں اس کے قریب آن بیٹھتی۔

"تم ہی نے پلے باندھا تھا۔ کہا تھا، مجازی خدا ہے۔ زندہ بیاہ کر جا رہی ہو تو جنازہ ہی نکلنا چاہیے۔ تم نے ہی کہا تھا اماں! تو میں نے سر سے لے کر پیر تک اس شخص کو چاہا۔ یہ محبت فطری تھی۔ کسی سمندری طوفان کی طرح میرے دل سے اٹھی تھی۔ میں کیا کرتی۔ میں اب کیا کر سکتی ہوں۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ میرے علی حسن کا باپ ہے دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کا اعتبار بھرا دلاسا ہے۔ میں کیسے اپنے بچے کے آگے سے زندگی کا پھیلا دستر خوان اٹھا دوں اور کھوں گھر میں بھوک بس گئی ہے، جاؤ! جا کر کوئی اور اعتبار بھرا دلاسا ڈھونڈو۔ میں دوسری شادی کروں گی تو لوگوں کے سارے پتھر میری ہستی کے بت کو لگیں گے۔ عورت کیسی ہو، کچھ بھی کرے۔ الگ ہوتی ہے۔ لوگ بس اندھے یقین کی طرح فرض کر لیتے ہیں قصور عورت کا ہو گا، بسنا ہی نہیں آتا ہو گا اسے ورنہ عورتوں نے کیسے کیسے بے مہار مردوں کے ساتھ گزارہ کر لیا۔"

"پھر رہ اسی گھر میں۔ میں اتنی آسودہ نہیں کہ تیرے اور تیرے بچے کا غم بانٹتی رہوں اپنے بچوں کی بھوک بھر بھر کر تیرے اور تیرے بیٹے کے پیٹ میں اتارتی رہوں۔"

وہ دروازے کے پیچھے چھپا سنتا رہا۔ تب اس کی ماں نے اپنی ماں کے پاؤں کو ہاتھ لگایا، پھر گلے سے لگا کر ممتا سے کہا۔

"پہلے میں بیٹی تھی۔ بڑا حق تھا میرا تجھ پر۔ جو تیں نے زبردستی سے وہ حق چھین بھی لیتی تھی۔ کبھی تجھے شکایت سے دیکھا۔ کبھی تجھ سے اپنی بے چارگی پر جھگڑا بھی کیا۔ مگر اب میں ماں ہوں، مجھے پتا ہے، ماں کا دل سمندر ہوتا ہے۔ مگر اپنی اولاد کے لیے وہ سمندر سمٹ کر کوزے میں آجاتا ہے۔ جیسے کبھی میں چراغ بجھا کر بھوک بھی اپنے بیٹے کے پیٹ میں ڈال دیتی ہوں۔ تجھ سے کوئی گلہ نہیں۔ اللہ تجھے دونوں جہانوں میں سکھی رکھے۔"

اور گلے سے لگی ایک ماں دوسری ماں کی محبت میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی اور شاید یہ ہی رونا اس کے اندر ایک بلیک ہول بنا گیا تھا۔ جس کے اندر ساری خوشیاں جا گرتی تھیں۔

"میری آزادی، میری زندگی۔ مجھے کس کی تلاش ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ نئی نوکری چھوڑ کر ایک نئے شہر آگیا، مگر یہ شہر اجنبی ہو کر اس کے احساسات کو چھوتا رہتا تھا۔ جیسے کوئی گم شدہ بچہ ہر انسان میں اپنا آشنا آسرا ڈھونڈے۔ وہ دن بھر کام کرتا اور رات کو شہر کی گلیاں کھنگالتا۔ پھر ایک دن یوں ہوا ایک پرانی یاد نے اسے ایک گھر کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔

"یہ گھر۔" ایک تلخ یاد بچھو کی طرح اس کو ڈسنے لگی۔

کرایہ نہ دینے پر مالک مکان نے اماں کو گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ ان دنوں بھی سردی آج کی طرح تھی۔ اس کی ماں نے اسے اپنی چادر میں چھپا کر اپنے وجود کی گرمی دی تھی۔ تب اس کی ماں کی ماں آئی تھی۔ اپنے دوپٹے کے پلو سے بہت سارے نوٹ کھول کر اس کی ماں کے دامن میں ڈالے تھے۔

ایک ایک مٹھی اناج کم کر کر کے اپنے حصے کی بھوک کے پیسے جمع کیے تھے کہ دو سال بعد نئی چھت لینی تھی۔ جاڑے میں بڑی ٹھنڈ اور بارش میں سارا پانی بچوں کو بھگوتا ہے، مگر تو بھی تو کوئی دشمن نہیں۔ تیرے سر پہ چھت نہ ہو تو ماں گرم کمرے میں بکل ڈال کر سو سکتی ہے بھلا۔" ماں پھر رونے لگی تھی۔

مالک مکان نے کرایہ لے کر ماں کو پھر اسی ایک کمرے کے گھر میں آنے کی اجازت دے دی تھی اور یہیں تو گھر تھا، جب اس کے ماں کے جنازے کے بعد اس کا بڑا ماما اسے لینے آیا تھا۔ وہ یکدم سوتے میں سے جاگا تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ اپنے ماما کے گھر نہیں گیا تھا بلکہ سیدھا اس باپ کے گھر گیا تھا، جہاں اس کی بیری بھرے طعنے کے ساتھ اس کی سوتیلی ماں نے اسے ناقبولیت کی مہر لگا کر قبول کیا تھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا ابا کا گھر بہت شان دار ہو گیا تھا۔ ابا کو اماں کی جدائی تو خوشی کی طرح لگی تھی۔

وہ گیٹ کے باہر کھڑا تھا جب ایک آواز گونجی۔

"اتنا اچھا کماتا ہے، مگر میں نے تجھے کبھی نہ اچھا کھاتے دیکھا ہے، نہ ہی کبھی تو ایک کمرے کے گھر سے آگے بڑھا ہے۔ تو کنجوس بھی نہیں ہے، اچھی خاصی رقم جرا کے شوق میں خیرات کر دیتا ہے۔ تو کیوں ہے ایسا؟ تیری سائیکی میں کوئی گہری گرہ پڑ گئی ہے جسے دانتوں سے بھی نہیں کھولا جا سکتا؟"

اور آج وہ اس شان دار گھر کے سامنے کھڑا تھا تو اس کے دل نے اپنی سائیکی کی وہ گرہ کھول لی تھی۔

ایک کمرے کا گھر مجھے ماں کی گود کی طرح لگتا ہے جب میں اکیلا اس گھر میں داخل ہوتا ہوں تو مجھے لگتا ہے میری ماں کہیں کسی کونے میں میرا انتظار کر رہی ہے اس سرورات کے شکنجے سے اور اپنی ماں کے بے چارگی بھرے آنسوؤں سے اوپر نہیں اٹھ پاتا۔ مجھے لگتا ہے اگر میں ویسا نہیں جیا، جیسا میری ماں جی کر چلی گئی تو ماں کو لگے گا، میں بھی اپنے باپ کا ایکسٹینشن ہوں، بے حس، خود غرض اور ظالم۔ میری ماں امارت سے ایسے ڈرتی تھی جیسے اس زمانے میں کوئی کینسر کا مرض تشخیص ہونے پر اپنی زندگی سے ڈرنے لگتا ہے۔ وہ کہتی تھی کہ بہت سکون بہت شان و شوکت کی زندگی جینے والوں کو بڑا حساب کتاب دینا پڑتا ہے اور میں دروگی جینا چاہتی ہوں۔ جہاں ہوں جہاں سے پکاری جاؤں اپنی چادر جھاڑ کر ایک جست میں اس سوہنے رب کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاؤں اور اس نے وہی زندگی جی تھی۔

اور میں اچھا اس لیے نہیں کھاتا کیونکہ ہر آن ہر وقت مجھ میں میری ماں کی بھوک، نڈھال جیتی رہتی ہے۔ میں ہاتھ کھول کر خرچ کرنے لگتا ہوں تو یکدم میری ماں کے وہ دن، وہ راتیں یاد آجاتی ہیں جو اناج کے بغیر صرف میرے پیٹ کو اپنی بھوک بھی دان کرتی رہتی تھی۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے۔؟" گیٹ خود بخود کھلا اور اس کی سوچیں پھر سے پٹارے میں بند ہو گئیں۔

"مجھے احسن مراد سے ملنا تھا۔ میں ان کے ایک دوست کا بیٹا ہوں۔ اس شہر میں آیا تو حکم ملا تھا ان سے ضرور مل کے آنا۔"

"واہ! بڑے میاں کے بھی جان پہچان کے لوگ باقی رہ گئے ہیں۔" وہ ملازم لگ رہا تھا۔ اس نے سرونٹ کوارٹر میں لے جا کر بٹھا دیا۔

کوئی واش روم میں نہا رہا تھا۔ پھر بہت دیر بعد یا شاید اسے لگا ابا باہر نکل کر آئے تھے۔ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"تم کون ہو۔۔۔؟"

"آپ تو بہت اچھی نوکری کرتے تھے، پھر یہاں اس حالت میں۔۔۔؟" اور ابا کسی پردیس میں بیٹھے مسافر کی طرح بستر پر بیٹھ گئے۔

"میری یہاں کوئی نہیں سنتا۔ میں الہ دین کا چراغ تھا، جس کو جب میری ضرورت پڑی۔ اس نے مجھے استعمال کیا اور اب اس چراغ کو کسی ٹھیلے والے کو بیچ دیا ہے۔"

بے ربط گفتگو۔۔۔ اس نے ماضی میں اپنی ماں کی طرح اپنے ابا کے پاؤں چھوئے تھے۔

"آپ کا تو غصہ دبنگ تھا۔ آواز، لہجہ چہار محلے گونجا کرتا تھا۔ کوئی پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا تھا۔"

"جوانی جب تک تھی۔ میں اڑیل گھوڑا تھا اور میرے بچے میمنے۔ پھر وہ اڑیل گھوڑا بن گئے اور مجھے میمنے کی طرح یہاں لا کر باندھ دیا۔ تین وقت کھانا ڈال جاتا ہے ملازم۔ میں کھاؤں نہ کھاؤں کوئی نہیں

پوچھتا۔" ابا کسی گہری سوچ میں گم ہو کر واپس پہنچے تھے۔ "تم کون ہو میرے کس دوست کے بیٹے؟"

وہ دکھ سے ابا کی حالت دیکھنے لگا۔

"کبھی میری اماں یاد آئیں آپ کو؟" ابا کی شناسائی ٹٹولتی آنکھوں نے اسٹور روم میں پڑی یادداشت کی فائلوں پر سے گرد جھاڑتے جھاڑتے یکدم چونک کر اسے دیکھا۔

"تیری ماں۔۔۔؟" ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"شمسہ بدر الدین۔۔۔"

ابا کے چہرے پر برسوں سے لے کر وہاں تک قمقمے جل اٹھے۔

"شمسہ بدر الدین۔۔۔ وہ جنتی عورت تھی۔ اس نے پہلا اور آخری مرد سمجھ کر مجھے چاہا اور میرے اندر کا مرد نئی دریافتیں کرنے کا عادی اس کی محبت کو سمجھ ہی نہیں پایا۔۔۔ وہ مجھے بہت یاد آتی ہے علی حسن۔۔۔!"

ابا اس کی ماں اور اس کا نام جانتا تھا۔ یعنی اس کی تنہائی ان دونوں کے دکھ سے بھری ہوئی تھی۔ اسے لگا یکدم قیدی کی زنجیریں ایک ایک کر کے کھلنے لگی تھیں۔

اس کے پاس ایک حوالہ تھا زندگی کا۔ ایک کمرے میں بند حبس زدہ زندگی کو پھر سے متحرک کرنے "تازہ ہوا سے زندہ جینے کا ارجن۔ اسے ابا سے نفرت تھی مگر اس کی ماں کو اس کے ابا سے محبت تھی اور اسے اپنی ماں سے محبت تھی۔ اس لیے اسے اپنے ابا سے نفرت کو محبت میں بدلنا ہی پڑا۔

ابا آج وہاں کھڑا تھا جہاں اس کی ماں تھی۔ وہ کل اپنی ماں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا، مگر آج اپنے ابا کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔

"ابا! میرے ساتھ چلو گے؟ میری ماں کی محبت ہمیشہ میرے گھر کی خواہش میں ہر کمرے میں رہتی بستی دربدر پھر رہی ہے آج تک۔۔۔ اسے اس سزا سے آزادی کا پروانہ دو گے؟"

ابا نے "ہوں" کہا نہ "ہاں" اور اپنا مصلیٰ اور تسبیح لے کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

"اس گھر کے لوگ مجھے اولڈ ہوم میں ڈالنے جا رہے ہیں۔ اس لیے میری گم شدگی کبھی کسی کی نیند رد ھم کو نہیں ٹوٹنے دے گی۔"

"ایک ہوتا ہے بچھڑنا ایک ہوتا ہے چھوٹنا۔ بچھڑنے میں دکھ ہوتا ہے۔ چھٹکارا میں سکون۔"

اس نے چونک کر ابا کو دیکھا۔ اس نے اماں سے جلتی آنکھوں کو ابا کے اس دکھ سے اک سار سکون کے عوض خرید لیا تھا۔

ابا اس کے ساتھ چل رہے تھے اور سوال ابھر رہے تھے۔

"گھر بسایا تو نے؟ تیری بیوی برا تو نہیں منائے گی اچانک سے رشتہ داری جوڑنے جو جا رہا ہوں۔۔۔"

"گھر۔۔۔ سکون۔۔۔ بیوی۔۔۔" وہ مسکرایا۔

"کل نیا برس شروع ہو گا اور میں نے سوچا ہے میرے لیے بیوی آپ اپنی پسند سے ڈھونڈو۔ میرا گھر آپ کو بسانا ہے۔ آپ میرے ساتھ ہو گے تو میرا گھر خود بس جائے گا۔"

ابا نے اسے اپنے چوڑے سینے سے لگا لیا۔

اسے لگا 'بے قرار اماں کو اس ساعت سکون مل گیا۔ زندگی سے ایک سرخوشی کی طرح مانگ لیا تھا۔ الوہی مسکراہٹ سجائے آج وہ پہلی بار اپنے کمرے میں نہیں، ایک گھر میں داخل ہو رہا تھا۔

وہ گھر جس میں جینے کی آرزو میں وہ کب سے مرا پڑا تھا۔

آزاد سانس کمرے کی فضا میں بکھیر کر اس نے لائٹ آن کی اور منظر پس منظر سب روشن ہوتے چلے گئے۔

ایسی

صباحت یاسمین

رخسار بھابھی کو میں جب بھی دیکھتا عجیب و غریب احساسات میں گھر جاتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی نصف بہتر کا موازنہ ان سے کرنے لگتا اور اسے ویسی ہی نہ پا کر غم و غصے کا شکار ہو جاتا۔ ان کے بیاہ کے چند ہی دن بعد میں نے ایک بات طے کر لی تھی اور جب اماں جی نے میرا رشتہ ڈھونڈنے کا قصد کیا تو میں نے صرف ایک بات کی۔۔۔

"لڑکی ویسی ہی ہو جیسی رخسار بھابھی ہیں۔"

آگے کی کہانی بڑی المناک ہے۔ رخسار بھابھی جو میری دور پار کی کزن بھی ہیں۔ اماں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ان کی ایک چچیری بہن برآمد کی۔ یہ بہت بعد میں پتا چلا کہ یہ اماں کی اس اکلوتی بہن کی نشانی ہے جس کی پسند کی شادی کے بعد میرے نانا اور دادا دونوں نے اماں کی اس بہن کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تو صرف اتنا کہ وہ بھابھی کی چچا زاد ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اماں کو مزید جانچ پرکھ اور چھان بین کا کہتا انہوں نے جھٹ سے رخسار بھابھی کو بطور گواہ آگے کر دیا وہ فوراً بولیں۔

"بھائی ولی! فکر مت کریں۔ میری دادی کے سگے ماموں زاد بیٹے کی بیٹی ہے۔ اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ اس پر آپ یوں اعتماد کر سکتے ہیں جیسے کہ وہ میری بہن ہو۔"

"اچھا؟ مگر رشتہ تو خاصا لمبا بتا رہی ہیں آپ۔ مجھے سننے کو ملا تھا کہ وہ آپ کی کزن ہے۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ اصل میں میں بھابھی کا اتنا بڑا عقیدت مند تھا کہ ان کی بات پہ اعتراض کرتے ہوئے بھی جھجکتا۔

"ارے بھائی! وہ جن کی بیٹی ہے رشتے میں وہ میرے چچا لگتے ہیں تو کزن ہی ہوئی نا۔ آپ شش و پنج میں مت پڑیں ورنہ رشتہ نکل جائے گا ہاتھ سے۔"

ان کی بات پہ مؤدب انداز میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مجھے گمان تک نہیں تھا کہ وہ ویسی نہیں ہوگی جیسا انہوں نے کہا ہے، چونکہ مجھے خاندان بھر میں کبھی کوئی ایسی لڑکی نظر نہیں آئی تھی جس کی رنگت دبی ہوئی یا قد چھوٹا ہو لہٰذا میں تصویر اور دیکھنے دکھانے کے جھنجھٹ میں بالکل نہیں پڑا۔ البتہ وہ لوگ بیسیوں بار آئے اور سینکڑوں بار مجھے چوم چاٹ کے گئے۔

شادی کی رات میں کمرے میں پہنچا تو کم و بیش آدھے بیڈ پہ پھیلے ہوئے وجود کو دیکھ کر ٹھٹکا مگر پھر ہلکی سی مسکان لیے بیڈ کے کنارے پہ آٹکا۔ سرخ کامدار دوپٹے میں اس کا وجود پوری طرح چھپا ہوا تھا۔ مجھے خوامخواہ ہی پیار آیا کہ یہ دھان پان لڑکی (چشم تصور میں اس کا سراپا مجھے ہمیشہ رخسار بھابھی جیسا لگا تھا) بھاری لباس پہنے ہوئے ہے، آہ۔ میں آؤں، سراہوں۔

"السلام علیکم!" میں نے ذرا آگے سرک کر گفتگو کا آغاز کیا۔

"وعلیکم السلام۔" باریک سی آواز اور نرم لہجہ پا کر مجھے گوناگوں ڈھارس ہوئی اور جھٹ سے گھونگھٹ الٹ دیا اور اس کے بعد۔۔۔ یوں لگا جیسے کسی نے مجھے الٹ دیا ہو۔

اس کا چہرہ اتنا بڑا تھا کہ اس سے بڑا چہرہ میں نے عمر بھر دیکھا ہی نہیں تھا۔

"شادی مبارک۔" میرے منہ سے پھنسی پھنسی گھٹی گھٹی آواز نکلی تو وہ یوں شرمائی کہ مجھے لگا ابھی کے ابھی مارے شرم کے زمین میں گڑ جائے گی۔

"کیسی ہیں؟" آج میں آنسوؤں میں نہیں لفظوں میں رو رہا تھا۔

"بوند بوند آپ کی ہوں۔"

"بوند بوند؟" شدید حیرت کے ساتھ اس کے لفظ سوچتے ہوئے میں نے دانت پیسے۔ وہ بحر الکاہل تو کم سے کم تھا۔ میرے ساتھ وہ ہوئی تھی کہ کبھی کسی کے ساتھ نہیں ہوئی ہوگی۔

اگلے روز میرا منہ اپنی زوجہ محترمہ کے وجود سے زیادہ پھولا ہوا تھا۔

"اماں!" میں عورتوں میں گھری اماں کو کھینچ کر ادھر لے گیا۔

"ولی میرا بچہ!" انہوں نے کہہ کر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "دیکھو تو خوشی سے پھولا نہیں رہا ماشاء اللہ۔"

کے بعد دیگرے انہوں نے میرے کئی بوسے لے ڈالے۔

"اماں! میں نے آپ سے ایک ہی بات کہی تھی کہ وہ ویسی ہی ہو جیسی رخسار بھابھی ہیں۔" میرا انگ انگ شکوہ کناں تھا۔ اماں جھٹ سے بولیں۔

"اور دیکھ! تیری وہی ایک بات میں نے گرہ سے باندھ لی۔"

"جی! اور یوں باندھی کہ کھولنا بھول گئیں۔"

"چل ہٹ! شریر کہیں کا۔" کہہ کر انہوں نے مجھے سینے سے لپٹا لیا۔

"اماں۔۔۔!" میں نے احتجاج کرنا چاہا۔

"بس بس! ماں کو شکریہ بولے گا کیا؟ پاگل ہو گیا ہے۔"

انہوں نے انگوٹھا میرے ایک گال پہ اور انگلیاں دوسرے پہ رکھ کر یوں دبایا کہ میرا جبڑا ہل کر رہ گیا اور میں مزید کچھ نہیں بول پایا۔ یوں بھی لب کشائی کا فائدہ نہیں تھا۔ جنوں کے ہاں کسی کی ٹانگیں، بازو توڑنا معمول کی بات ہے، اخلاقیات کے دائرے اور قاعدے قانون توڑنا معمولات روز مرہ ہیں، مگر شادی توڑنا گناہ کبیرہ۔ مجھے اب ساری عمر اس بات پہ رونا تھا کہ وہ ویسی ہی کیوں نہیں ہے؟

☼ ☼ ☼
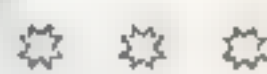
"کون تھی وہ علینا سینٹر والی؟"

اشعر کلیم جٹ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چپس کھاتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔

ہاہاہا۔۔۔ "وہ؟ نئی بچی ہے۔ کیسا پیس ہے؟" اشعر نے جواباً مجھے آنکھ مار کر بھرپور چٹخارہ لیا۔

"اشعر یار! اتنی کانفیڈنٹ، اسمارٹ، ویل کلچرڈ بیوی کے ہوتے ہوئے تم اور لڑکیوں کو دیکھتے ہو؟"

"مائی ڈیئر ولی! شوہر جب ہوس کا پجاری ہو تو پاکباز بیوی کی خوبیاں اور اچھائیاں اسے کبھی روک نہیں پاتیں، کیونکہ وہ اتنے نیچ مقام پہ ہوتا ہے، جہاں سے اسے اپنی بیوی کی خصوصیات نظر نہیں آیا کرتیں۔" اشعر گہرا سا جواب دے کر بڑی آسانی سے اپنی ذات ہلکی کر گیا۔ مجھے چپ لگ گئی۔ یہ میرا بیسٹ فرینڈ بھی تھا، کزن بھی، رضاعی بھائی بھی مگر اس کا یہ روپ مجھے ہمیشہ ہی چبھتا تھا۔

"السلام علیکم ولی بھائی! کیسے ہیں آپ؟" رخسار بھابھی ٹرے لے کر آئیں اور ہمیں چائے پیش کرنے لگیں۔ میں پھر سے اسی احساس کمتری میں چلا گیا جس میں انہیں دیکھ کر جاتا ہوں۔ ہماری معاشی حالت اشعر سے کہیں مستحکم تھی مگر نہ گھر کے سامان میں ترتیب تھی نہ تزئین و آرائش کا اہتمام تھا۔ بہت اچھے کھانوں کو بھی اس بری طرح پیش کیا جاتا کہ میں شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔ میں جب بھی اسے اپنے کسی دوست کو سلام کرنے کا کہتا تو وہ سمجھتی کہ میرا دوست حج یا عمرہ کو جانے والا ہے یا پھر قریب المرگ ہے۔ نتیجتاً وہ اس سے ایسی گفتگو کرتی کہ میں شرمندہ ہو جاتا۔

"ولی بھائی! آنٹی خیریت سے ہیں نا؟" بھابھی کی آواز نے مجھے مزید یہ سوچنے سے روکا کہ وہ کبھی تو بھابھی جیسی نظر آئے۔ کہیں تو ان سی دکھے۔

"جی جی بھابھی! شکر ہے اللہ کا۔"

"اور باجی کیسی ہیں؟" وہ چونکہ عمر میں میری مسز سے چھوٹی تھیں لہٰذا اسے باجی کہا کرتی تھیں۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہے وہ بھی۔"

"آپ چائے لیجیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔" شائستگی سے کہہ کر وہ اٹھ گئیں تو ہم دونوں چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ ابھی چائے کے کپ ہمارے ہاتھوں میں ہی تھے کہ وہ پھر سے آ گئیں۔

"ولی بھائی! باجی کی رنگ، آپ تو شاید بھول ہی گئے اسے۔" آتے ہی بھابھی نے سونے کی انگوٹھی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے انگوٹھی تھام تو لی مگر سمجھ نہیں سکا کہ اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔

"فکر مت کریں۔ میں باجی کو نہیں بتاؤں گی۔ اشعر مجھے بتا چکے ہیں کہ آپ ویڈنگ اینی ورسری پہ ان کو سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے آپ نے ان کے پاس رکھوائی ہوئی ہے۔"

"یہ میری نہیں ہے، نہ ہی میں اسے ایسا گفٹ دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"میں سمجھی آپ آج انگوٹھی لینے آئے ہیں۔" وہ بات مجھ سے کر رہی تھیں مگر ان کا چہرہ اشعر کی طرف مڑ چکا تھا۔

"ارے کہاں بھابھی! وہ تو ان سب باتوں کو گناہ سمجھتی ہے۔" جوں ہی یہ فقرہ میرے منہ سے پھسلا، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر غلطی ہو چکی تھی۔ بھابھی کی سنجیدہ بردبار شکل پہ دراڑیں نظر آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ رعشہ زدہ اور ٹانگیں لرزاں تھیں۔ انہوں نے اشعر کلیم کو ایک نظر دیکھا، پھر ان کی نظر انگوٹھی تک گئی اور پھر وہ پلٹ گئیں نہایت شکستگی کے ساتھ۔

☼ ☼ ☼
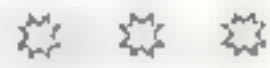
جوں ہی میں پہلو بدلتا ہوا اٹھ کر بیٹھا۔ اس نے فوراً" کمبل سے سر نکالا اور بولی۔

"شمسہ کے ابو! چائے لاؤں؟"

شمسہ مجھے "باباجان" اور اسے "ماماجان" کہتی تھی مگر وہ خود کو "شمسہ کی امی" کہہ کر متعارف کرائی اور مجھے "شمسہ کے ابو" کہہ کر بلاتی۔ جب بھی میں بیمار ہوا، وہ فوراً" اپنی خدمات سمیت میسر ہو جاتی۔ پاک و ہند کے ٹوٹکے بھی اسے ازبر تھے اور وہ ہر بیماری پھکیوں، قہووں اور جڑی بوٹیوں کی دھونی سے ختم کرنے میں ملکہ رکھتی تھی۔

"ہاں! بنا لو، مگر خوب اچھی طرح کاڑھنا۔ ٹھیک ہے؟"

میرا مثبت جواب پاتے ہی وہ کمبل دور پھینک کے بھاگ گئی۔

کچھ روز پہلے ابا کے زمانے کا اکاؤنٹنٹ اگلے جہان سدھارا تو اس کی جگہ ایک لڑکی رکھی گئی تھی۔ آج میں اسی کی وجہ سے پہلو بدل رہا تھا۔ آتے ہی اس نے مجھے گھاس ڈالنی شروع کر دی۔ جبکہ میں وہ گدھا ہوں، جس کو یونیورسٹی کی فضول سے فضول لڑکی تک بھی گھاس نہیں ڈالا کرتی تھی۔ بہت دنوں تک اس سے نظریں چراتا رہا، گریز کرتا رہا، مگر مجھ ایسے پتھر میں بھی جب مستقل بوند ٹپکے گی تو سوراخ بن گیا۔ اب وہ ہوتی تھی میں، میسجز، کالز، کنفشس اور موج مستی۔

شمسہ کی امی کے باہر نکلتے ہی میں نے اسے کال ملائی مگر اس نے ریسیو نہ کی۔ میں نے کاٹ کر دوبارہ نمبر ملایا پھر جواب ندارد۔ چھٹی، ساتویں بار کوئی آٹھویں تو یہ بیل پہ اس نے فون اٹھا ہی لیا۔

"کیا ہے اب؟"

"ناراض ہو سویٹ ہارٹ؟"

"نہیں! بہت خوش ہوں کہ تم اپنی فضول بیوی سے ذرا سا دور جا کر ایک کال نہیں کرتے مجھے۔ اتنا پیار ہے تمہیں مجھ سے۔"

"چھوڑو نا ڈیئر! آؤ تمہیں منا دوں، جیسے کہو گی ویسے ہی گڈ ناٹ بوائے بن جاؤں گا۔ ناراض تو نہ ہو نا۔"

"نہیں! جاؤ تم اسی کے پاس۔" اس نے نروٹھے پن سے مجھے دھتکار دیا۔

"کم آن جان من! اس فضول سی عورت کے لیے تمہارا دل بھلا کیوں دکھاؤں؟ وہ صرف بیوی ہے، محبوبہ تو تم ہو نا جان!"

اچانک ہی میرا دھیان ہٹ گیا کہ وہ جواب میں کیا کہہ رہی ہے۔ موبائل میرے ہاتھ سے پھسل اور کمبل میں کہیں گم ہو گیا۔ وہ سامنے کھڑی تھی، مگر خاموش رہی۔ اتنی ہی خاموش جیسے رخسار بھابھی تھیں۔ اس کے صحت مند چوڑے چہرے پہ دراڑیں نظر آ رہی تھیں۔ ایسی ہی دراڑیں جیسی رخسار بھابھی کے چہرے پہ تھیں۔ اس کی آنکھوں میں نم دار چمک تھی۔ ویسی ہی جو رخسار بھابھی کی آنکھوں میں تھی۔ اس کی ٹانگوں اور ہاتھوں میں وہی لرزش تھی، جو بھابھی کے ہاتھوں اور ٹانگوں میں تھی۔ ایک نظر اس نے مجھ پہ ڈالی اور دوسری کمبل میں غروب ہوئے موبائل پہ۔

یہ نظریں ویسی ہی تھیں جیسے چند دن پہلے رخسار بھابھی نے اشعر اور انگوٹھی پہ ڈالی تھیں۔ آہستگی سے چلتے ہوئے وہ چائے کے مگ سمیت مجھ تک پہنچی۔ کپ میرے ہاتھ میں تھمایا اور پلٹ گئی۔ ویسی ہی شکستگی کے ساتھ جس کے ساتھ بھابھی پلٹی تھیں۔ میرا شکوہ دور ہو گیا۔ آج وہ مجھے ویسی ہی لگ رہی تھی، جیسی پرسوں رخسار بھابھی لگی تھیں۔ بالکل ویسی۔

☼

عائشہ نصیر

اس راہ طلب میں

"زندگی ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں کہ اسے ہم کسی اور کے جذبات و نظریات کی بھینٹ چڑھا دیں اور دل کو یہ سوچ کر تسلی دے لیں کہ کوئی بات نہیں اگلی بار ہم صرف اپنی مرضی سے اپنے طریقے سے جئیں گے اس بار یہ قربان سہی۔"

صوفے پر نیم دراز ایک کشن کو بازو میں دبوچے اور دوسرے ہاتھ سے ریسیور کان سے لگائے وہ نجانے کس سے اپنے خیالات بیان کر رہی تھی۔ اسود جو اسی وقت لاؤنج میں داخل ہوا تھا' چند لمحے تو جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر بنا کوئی آہٹ کیے اس کے قریب آ کر اس کے ہاتھ سے فون چھین لیا۔

"ارے! یہ کیا بے ہودگی ہے۔" اس اچانک حملے پر وہ بوکھلا کر کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اسود پر نظر پڑتے ہی باقی کا جملہ اس کے منہ میں رہ گیا۔

"آج کل لگتا ہے تم ہر کام کاج سے فارغ ہو۔ کسی سے فون پر لگی رہتی ہو۔" اسود نے کال کاٹ کر موبائل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے جتایا تھا۔ اسے غصہ آ گیا۔

"ذرا آخری بار اپنے یہاں آنے کی ڈیٹ تو بتاؤ' مہینے بھر میں ایک تو تم اپنی شکل دکھاتے ہو۔ اب اگر اتفاقاً اسی دن میری کسی فرینڈ کا فون آ جائے تو کیا اس میں میرا قصور ہے۔"

ناراض لہجے میں کہتے ہوئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی

مکمل ناول
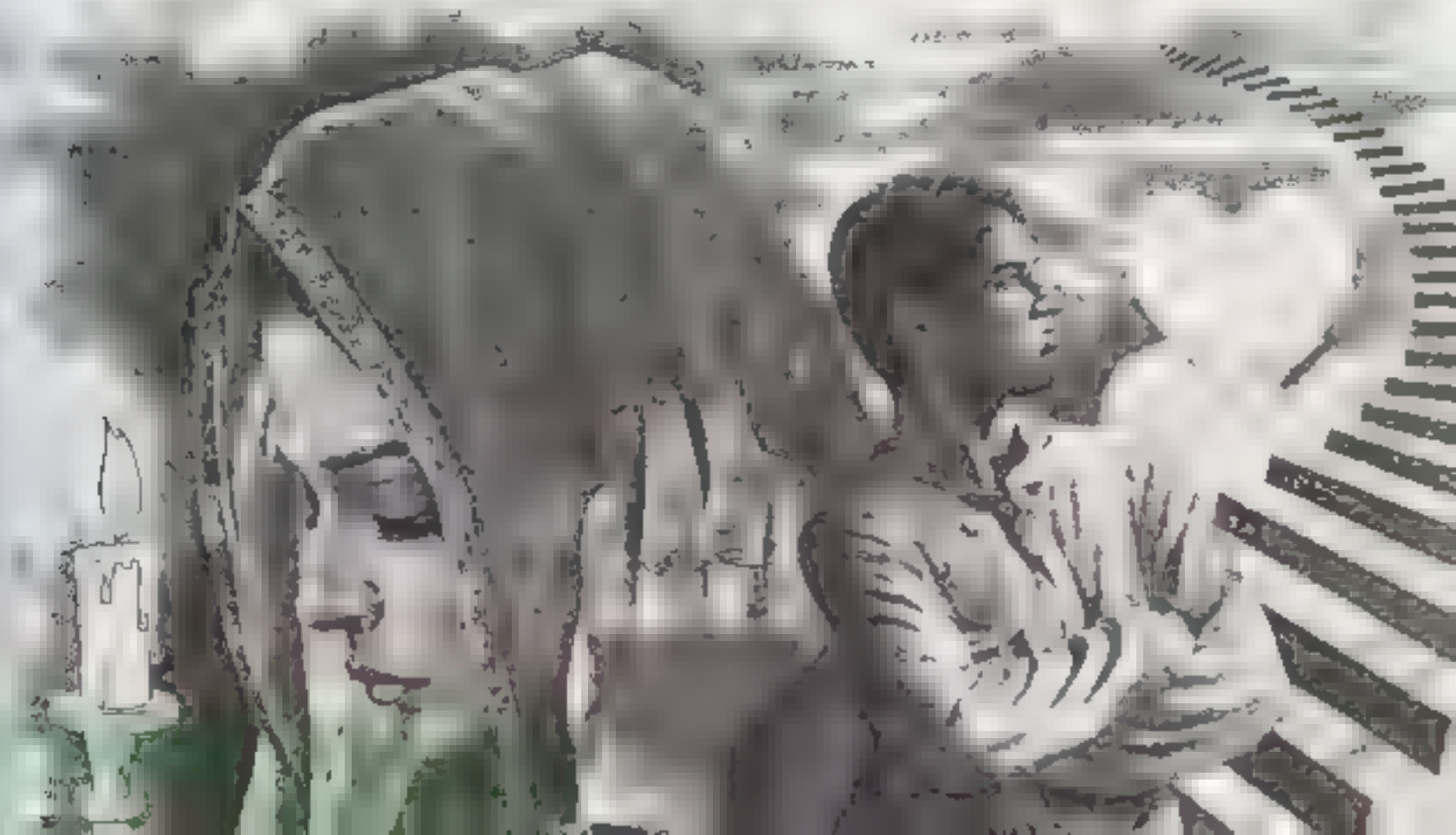
اس کے نہ آنے کی شکایت کرگئی۔ اسود کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تم مجھے اتنا مس کرتی ہو ورنہ میں ہر دوسرے دن تمہیں اپنے درشن کروانے آجاؤں۔"

"میں کوئی تمہیں مس وس نہیں کرتی۔ یہ تو پہچاننے میں مشکل نہ ہو' اسی لیے ہفتے میں کم از کم ایک دفعہ۔" اس نے جھینپ کر فوراً" ہی اس کی خوش فہمی دور کرنی چاہی۔

"بے مروت لڑکی۔۔۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ سچ کہوں تو تم لوگوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے دنیا سے لحاظ و مروت ناپید ہوتی جارہی ہے۔" وہ مصنوعی تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگیا۔

"شرم کرلو اسود۔۔۔ اس گھر میں تمہارے چچا چچی بھی رہتے ہیں۔" اس نے اسود کو گھر کا۔

"چچی کو چھوڑ کے۔" وہ بولا تو جوہی نے کچھ حیران ہوکر اسے گھورا۔

"کیا مطلب اور چچا۔۔۔؟"

"وہ تو چنگیز خان کا دوسرا جنم لگتے ہیں۔" اسود دھیرے سے بڑبڑایا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسی وقت ردا بھابھی لاؤنج میں داخل ہوگئیں۔ ورنہ اگر جوہی یہ بات سن لیتی تو مہینہ بھر اس کی ناراضی چلنی تھی۔

"ارے! اسود صاحب آئے ہیں۔" انہوں نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

"لگتا ہے اسود تمہیں ابھی تک اپنے گھر کے گیٹ کا کلر یاد نہیں ہوا۔ ہمیشہ بلیک کو گرے سمجھ کر داخل ہوجاتے ہو۔" بظاہر سادہ لہجے میں کہتے ہوئے بھابھی نے طنز اس پر کیا تھا۔ اسود نے کشن میں منہ چھپالیا۔

"بس کیجیے خدارا۔۔۔ میں اور نہیں سہہ سکتا۔ نہ آؤں تو مصیبت اور آجاؤں تو اس سے بڑی مصیبت۔ آپ کے ہاں مہمانوں کو چائے پانی پوچھنے کے بجائے صرف طنز میں بھگوئے جوتے کھلائے جاتے ہیں کیا؟" ان کی گود سے ڈیڑھ سالہ گپلو سے فہد کو لیتے ہوئے، کچھ چپ کروا رہا تھا۔ جوہی ہنس پڑی۔

"چائے پانی ہم مہمانوں سے پوچھتے ہیں۔ تم کس حساب میں شکایت کررہے ہو؟"

"اچھا بتاؤ! کیا کھاؤ گے' ویسے میں مہمانوں کو یہ چوائس نہیں دیتی۔" بھابھی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولیں۔

"چائے پلوا دیجیے اسٹرونگ سی۔ اسنیکس میں' میں آپ کے اس اکلوتے سپوت سے ہی کام چلالوں گا۔" اس نے فہد کے پھولے گال پر ہلکا سا چکھ مارا۔

"بائی دا وے یہ علی کہاں ہے؟" اسے اچانک خیال آیا تو پوچھنے لگا۔

"یہ تم اس سے فون کرکے پوچھ لو۔ وہ کب گھر پر ہوتا ہے اور کب نہیں۔ یہ تو ہم بھی نہیں جانتے۔" بھابھی کمرے سے جاتے جاتے جواب دے گئی تھیں اور وہ استفساریہ نظروں سے جوہی کو دیکھنے لگا۔

"تم علی سے ملنے آئے ہو؟"

"کیا اس پر بھی کوئی دفعہ لگے گی؟" اسے جوہی کی سنجیدگی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

"توبہ ہے اسود! یوں ہی ایک بات پوچھ لی تھی۔ خود سے تو آتے ہوئے تمہاری شان گھٹتی ہے۔ مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ تم کسی کے بلانے پر ہی آسکتے ہو۔" اس نے منہ بنا کر وضاحت دی۔

"تم ایسی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ یقین کرو' سر کے بل دوڑا چلا آؤں گا۔" اسود نے اس پر ایک گہری نگاہ ڈال کر کچھ جتانا چاہا لیکن وہ بھی جوہی تھی ہمیشہ کی طرح اس کی بات کا کوئی اثر لیے بغیر اس کی گود سے منہ بسورتے فہد کو لے کر بہلانے لگی۔

"مریم کیوں نہیں آرہی اتنے دنوں سے؟"

"یہی بات مریم نے تمہارے لیے بھی پوچھی ہے۔" وہ کچھ جھلا سا گیا اس کی بے نیازی پر۔ اس نے تو سنا تھا "لڑکیاں خود پر پڑنے والی خاص نظر فوراً" پہچان

جاتی ہیں۔ لیکن جوہی نے نجانے کیسی فولادی دیواریں کھڑی کررکھی تھیں اپنے دل کے اردگرد کہ اس تک اسود کے جذبوں کی تپش پہنچ ہی نہیں پا رہی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا جیسے وہ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہو۔

"پھپھو! آپ کو دادو بلا رہی ہیں۔" زین نے آکر کہا۔

"اچھا میں جارہی ہوں۔ تم جاکر چاچو سے کہو۔ اسود انکل آئے ہیں۔"

"علی گھر پر ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں صبح سے اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔"

"مجھے تو کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے اپنے اضطراب کا اظہار کرگیا۔

"تمہیں مزید کچھ جاننا ہے تو وہ تم علی سے ہی پوچھ لینا۔" ایک مبہم سا جواب دے کر وہ اس کی الجھن مزید بڑھاتی کمرے سے نکل گئی اور وہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"جی امی! بلایا تھا آپ نے۔۔۔؟" فہد کو بھابھی کے سپرد کرکے وہ امی کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

"میں نے تم سے ایک کام کہا تھا۔ کیا تم نے۔۔۔؟" انہوں نے پوچھا تو وہ سوچ میں پڑگئی۔

"کام۔۔۔ کون سا کام۔۔۔؟"

"تمہاری یادداشت تو مجھ سے بھی گئی گزری ہے جوہی! کل رات ہی تو میں نے تم سے علی سے بات کرنے کو کہا تھا۔" امی کو غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی۔

"اوہ! اچھا وہ۔۔۔" اس نے سر ہلایا۔ "کی تھی میں نے بات۔"

"پھر کیا کہا اس نے؟" ان کے لہجے میں تفکر تھا۔

"کیا کہنا تھا اس نے۔ وہی انکار اگلا لاپتا رہا۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا آپ سے۔ آپ کو کیا لگا تھا' میں بات کروں گی تو وہ مان جائے گا۔ جب اس نے بابا کی بات نہیں مانی تو میں کس گنتی میں ہوں۔" اسے علی کا غصہ یاد کرکے رونا سا آنے لگا۔ وہ تو اس کی چہیتی بہن تھی اس کے باوجود علی نے کس بری طرح اسے جھڑک دیا تھا۔

"میرا تو خیال تھا کہ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔ اپنے دل کی ہر بات تمہیں ہی بتاتا ہے۔ شاید وہ تمہاری بات رکھ لے۔" امی مزید پریشان ہوگئیں۔

"اوہو امی۔۔۔ اس معاملے میں وہ کسی کی نہیں سننے والا۔ اور میں تو آپ سے بھی کہتی ہوں۔ آپ اس بکھیڑے میں نہ ہی پڑیں تو اچھا ہے۔ نمٹنے دیں علی اور بابا کو اپنا معاملہ آپ ہی۔"

جوہی نے امی کی پریشان صورت دیکھی تو اسے بابا پر

غصہ آنے لگا جو علی سے خود کبھی بات نہیں کرتے تھے، ہمیشہ امی کو آگے کر دیتے تھے۔ اس معاملے میں تو جوہی بھی علی کے ساتھ تھی۔ اگر وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتا تھا تو بابا اسے کرنے دیں۔ دو بیٹوں کی شادی اپنی پسند سے اپنی حیثیت کے لوگوں میں کر چکے تھے۔ اب کم از کم علی کو تو اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنے کی اجازت دے دیں۔

"یہ فضول کی دردسری پال لی ہے آپ نے۔ ایک طرف علی کے سامنے بُری بنتی ہیں۔ دوسری طرف بابا بھی آپ ہی کو سناتے ہیں۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ آپ درمیان سے ہٹ جائیں۔ بابا براہ راست علی سے بات کریں گے تو انہیں اندازہ ہوگا کہ علی اپنے موقف پر کتنا ڈٹا ہوا ہے۔"

"پہلے میں بھی یہی سوچ رہی تھی لیکن علی کو دیکھا ہے تم نے۔ کتنا گستاخ ہو رہا ہے آج کل۔ اگر تمہارے بابا نے اس سے بات کی اور جواباً علی نے کچھ الٹا سیدھا بول دیا تو وہ کتنا غصہ ہوں گے اور غصہ میں انہوں نے کوئی انتہائی فیصلہ کر لیا تو۔" امی انتہائی بے بس لگ رہی تھیں۔

"کیا کریں گے زیادہ سے زیادہ۔ اسے عاق کر دیں گے۔ اس گھر سے نکال دیں گے تو علی کو اس کی بھی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس نے میرے سامنے کہی ہے یہ بات۔"

جوہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ مسئلہ جب بھی چھڑتا تھا ایک عجیب سی ٹینشن پیدا کر دیتا تھا اور اسے ٹینشن سے نفرت تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی وہ۔ کسی بھی ذمہ داری اور فکر سے آزاد زندگی گزاری تھی اس نے اس لیے جب بھی کوئی معمولی سی بات بھی اس کے اعصاب پر بوجھ بنتی تو اس کے اعصاب چٹخنے لگتے تھے۔

"آپ اپنی بھابھیوں کے سامنے یہ قصے لے کر مت بیٹھ جانا۔" امی نے اسے نکلتے دیکھا تو تاکید کی۔

"میں نہیں کہوں گی تو جیسے انہیں پتا نہیں چلے گا۔ اسی گھر میں رہتی ہیں وہ۔ عجیب بات کرتی ہیں آپ بھی۔" بے زاری سے بڑبڑاتی وہ باہر نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں یاد ہے جوہی! انصر کی شادی میں میں نے تمہیں اپنے ایک کزن سے ملوایا تھا؟"

وہ کچن میں ثمن بھابھی کے ساتھ شام کے کھانے کی تیاری میں مدد کر رہی تھی، جب انہوں نے اچانک ہی اس سے پوچھا تھا۔ انصر تو ان کا بھائی تھا لیکن جوہی کو ان کا کزن نہیں یاد آسکا۔

"آپ اپنے کس کزن کی بات کر رہی ہیں بھابھی! ان کا کوئی نام تو ہوگا۔"

ڈھیر ساری پیاز کاٹنے کے بعد اب وہ رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھو رہی تھی۔ اسے یہ کام انتہائی فضول لگتا تھا۔ اس کے باوجود وہ جب بھی ثمن بھابھی کی مدد کے خیال سے کچن میں آتی، وہ ہمیشہ اسے پیاز کاٹنے پر لگا دیتی تھیں۔ اب تو اس نے سوچ لیا تھا کہ ان کی موجودگی میں وہ کچن میں جھانکے گی بھی نہیں۔

"میں واثق کی بات کر رہی ہوں۔ واثق ادریس کی۔ میری پھپھو کا اکلوتا بیٹا۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے جوہی! وہ بھولنے والی شخصیت تو نہیں ہے، پھر تم۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

"اچھا ہاں۔" اس نے سر ہلا دیا حالانکہ یاد اسے تب بھی نہیں آیا تھا لیکن بھابھی کی مزید ناراضی کے ڈر سے اسے یہ کہنا ہی پڑا۔

"آپ کو تو یاد ہوگا بھابھی! اس دن میری طبیعت کتنی خراب تھی۔ بخار کی وجہ سے میں نے بارات اور ولیمہ بھی اٹینڈ نہیں کیا تھا، خیر! آپ بتائیے۔ کیا ہوا واثق کو۔"

"کچھ نہیں۔ بے چارہ بس تم جیسی ناقدری لڑکی کو اپنا دل دے بیٹھا ہے۔" بھابھی کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ یہ کوئی مذاق ہے؟" یہ خیال آتے ہی اس کے لہجے میں یکدم ناگواری آ گئی۔

"اس میں اتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے۔ نہ ہوتی اتنی پیاری۔ اور پھر میں تم سے اس قسم کا مذاق کر سکتی ہوں بھلا۔" انہوں نے اتنے مشفق لہجے میں پوچھا کہ وہ بے اختیار نفی میں سر ہلا گئی۔

"واثق بہت اچھا لڑکا ہے۔ مجھے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ تمہارے بارے میں اس طرح سوچتا ہے لیکن جب اس نے مجھے بتایا تو یقین کرو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ اتنا بہترین انسان ہے کہ کوئی بھی لڑکی جسے وہ پسند کرے، اپنی قسمت پر رشک کرے گی۔ پرسوں جب میں وہاں گئی تھی تو۔" اس سے پہلے کہ بھابھی اپنا جملہ پورا کرتیں علی نے اندر جھانکا۔ وہ دونوں ہی چونک گئیں۔

"بھابھی! ایک کپ چائے ذرا میرے کمرے میں بھجوا دیں پلیز۔" وہ نظریں چرائے دھیمے لہجے میں بولا تھا۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں کی سرخی، اس کے لہجے کی شکستگی ان سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ اتنا تھکا تھکا اور مضمحل لگ رہا تھا کہ جوہی کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"یہ علی کو کیا ہوا؟" اس کے جاتے ہی بھابھی نے حیرت سے کہا تھا۔ وہ جواب دیے بغیر باہر نکلنے لگی۔

"جوہی۔ تم کہاں۔ مجھے بات کرنی ہے تم سے۔"

"پلیز بھابھی! میں آپ سے آکر بات کرتی ہوں۔"

اپنے پیارے بھائی کو اتنی دگرگوں حالت میں دیکھ کر اس کے ذہن سے ہر چیز نکل گئی تھی۔ جوہی علی کے کمرے میں پہنچی تو وہ تولیے سے منہ پونچھتا ہوا واش روم سے نکل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"کیا ہوا علی۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟" وہ ہراساں لہجے میں کہتی اس کے پاس آئی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہونا ہے۔" اس نے بے تاثر لہجے میں کہہ کر تولیہ ایک طرف اچھالا اور بیڈ پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"تم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی؟" اس نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔ کیا کیا کیفیات جھلک رہی تھیں اس کی آنکھوں سے۔ کرب، اداسی، بے بسی اور کچھ کھو دینے کا ملال۔

"اب یہ سب باتیں بے معنی ہیں جوہی۔ میں اپنی محبت کھو چکا ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں بچا۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا تھا۔ اسے اس طرح بکھرتے دیکھ کر وہ اندر ہی اندر سلگنے لگی۔

"اس کا رشتہ کہیں اور طے ہو گیا؟" اس نے ڈوبتے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"ہاں۔" علی کی آواز میں ارتعاش تھا۔ "اس کی منگنی تھی آج۔ اس سے زیادہ کچھ مت پوچھو جوہی! میں بتا نہیں پاؤں گا۔ اس وقت۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو پلیز۔"

وہ رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ جوہی کو اس کی دلی حالت کا اندازہ تھا۔ وہ ملول سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی پشت دیکھتے ہوئے اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ہونٹ بھینچ کر باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

"تو اس لڑکی کا رشتہ کہیں اور طے ہو گیا جسے علی پسند کرتا تھا۔" سحر نے اس کے سامنے کولڈ ڈرنک رکھتے ہوئے متاسف لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔" ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سحر اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اور وہ اس وقت اس کے گھر میں بیٹھی تھی۔

"وہ لڑکی بھی تو علی سے محبت کرتی ہوگی پھر اس نے اسٹینڈ کیوں نہیں لیا۔ چپ چاپ کسی اور سے منگنی کیوں کر لی۔" سحر کے لہجے میں اس لڑکی کے لیے کاٹ بھری تھی۔

"فضول باتیں مت کرو سحر! جب علی ایک مرد ہو کر اتنا مجبور ہو سکتا ہے تو کیا نشا مجبور نہیں ہو سکتی۔" جوہی نے ڈپٹ کر کہا۔

"اور پھر اس کے ماں باپ۔ وہ بھلا کب تک ایک ایسے شخص کے لیے اپنی بیٹی کو بٹھائے رکھتے جس کے ساتھ اس کا مستقبل غیر یقینی تھا۔ جس کے گھر میں بھی اسے ایک من چاہی بہو کی حیثیت اور عزت نہیں ملنی تھی اور وہ تو پھر بھی تیار تھے۔ بس وہ یہ چاہتے تھے

کہ ان کی بیٹی کا رشتہ باوقار انداز میں اور پورے مان کے ساتھ مانگا جائے لیکن بابا... انہوں نے تو جیسے قسم ہی کھالی تھی شاہ کو سوت بنانے کی۔ علی نے کیا کچھ نہیں کیا انہیں منانے کے لیے۔ لیکن ان کی ہٹ پھر بھی قائم رہی اور اب... جتنا زہر' جتنی کڑواہٹ علی کے دل میں بابا کے لیے بھر چکی ہے۔ میں سوچتی ہوں تو گھبرا جاتی ہوں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔" اس کے لہجے میں عجیب سے اندیشے بول رہے تھے۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" سحر نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "وہ کچھ سخت مزاج ہیں لیکن ہیں تو اس کے باپ ہی۔ ابھی علی ان سے جتنا بھی ناراض ہو' لیکن جب اس کے جذبات ٹھنڈے پڑیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کہہ دینے سے سب ٹھیک نہیں ہو جاتا سحر!" وہ دل گرفتی سے بولی۔ "علی کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل کی پھانس بنانے والا شخص ہے اور یہ تو پھر اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی جو بابا کی بے جا ضد اور حاکمیت پسند طبیعت کی وجہ سے ان سے چھن گئی۔ کیا ملا بابا کو یہ سب کر کے۔ انہوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ زندگی علی کو گزارنی ہے' ان کو نہیں۔ وہ کہتے ہیں' علی نادان ہے اسے برے بھلے کی پہچان نہیں' تو کیا جو انہوں نے کیا' وہ دانش مندی ہے؟ جوان اولاد پر زبردستی اپنے فیصلے مسلط کرنا اور پھر ان سے خوش رہنے کی توقع بھی کرنا' اولاد کی پسند کو اولیت دینا تو ایک طرف' انہیں سرے سے ماننے سے ہی انکار کر دیا جائے' یہ کہاں کا انصاف ہے؟" وہ انتہائی تلخ ہو رہی تھی۔

"کام ڈاؤن جوہی..." سحر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تمہارے بڑے بھائیوں کی شادیاں بھی تو تمہارے بابا نے اپنی پسند سے کی ہیں تو کیا وہ اب خوش نہیں؟" سحر نے پوچھا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔ پھر قدرے توقف سے بولی۔

"زوار بھائی تو نہیں۔ البتہ وقار بھائی اپنے آفس میں کسی کو پسند کرتے تھے' لیکن ہوتا تو وہی تھا جو بابا چاہتے تھے۔ وقار بھائی نے ان کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا۔ وہ شروع سے ہی کافی فرماں بردار قسم کے بیٹے رہے ہیں۔ اب بظاہر تو وہ ردا بھابھی کے ساتھ ایک خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں' لیکن کون جانے ان کے دل کے کسی گوشے میں اب بھی وہ (لڑکی) بسی ہوئی ہو۔"

"ہوں... تو اس کا مطلب ہے کہ یہ ناانصافی صرف علی کے ساتھ نہیں ہوئی۔ تمہارے وقار بھائی کے ساتھ بھی ہو چکی ہے۔" سحر نے ایک گہری سانس لی' پھر کسی خیال کے تحت چونک کر اسے دیکھا تھا۔ "اور تمہارے ساتھ جوہی... تمہارے ساتھ کیا ہوگا...؟"

"میرے ساتھ...؟" جوہی بھی ٹھٹک گئی۔

"میرے ساتھ کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے بے نیازی سے سر جھٹکا۔ "میں خوش ہوں کیونکہ میں نے ایسی کوئی مصیبت نہیں پالی۔ اس لیے بابا جہاں بھی میرا رشتہ طے کریں گے۔ میں بنا کسی چوں و چرا کے ہاں کہہ دوں گی۔" اس کے انداز میں کافی اعتماد تھا۔ سحر بغور اسے دیکھنے لگی۔

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"آف کورس یار... میں تم سے جھوٹ بولوں گی۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں سب سے پہلے تمہیں بتاتی۔ میں کبھی ایسے چکر میں نہیں پڑوں گی میرے لیے محبت کرنا خودکشی کرنے جیسا ہی ہے۔"

وہ اپنے جملوں کی سنگینی سے بے نیاز پُراعتماد لہجے میں بول رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

واثق نے اسے پہلی بار الصر کی مہندی والے روز دیکھا تھا۔ وہ حیدر کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا' جب اس کے کانوں میں وہ مدھر مگر جھنجلاہٹ بھری آواز آئی تھی۔

"افوہ اشتہ... چپ کرو ایک لگاؤں گی الٹے ہاتھ کا... جان عذاب میں ڈال دی ہے۔"

"توبہ ہے جوہی! ابھی ہی تو ہے۔ اتنا ڈانٹ کیوں رہی ہو۔"

واثق نے ابھی اس طرف نہیں دیکھا تھا مگر فرحین کی آواز سے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ لڑکی شاید کوئی قریبی تھی۔

"پنی ہے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے سیریلیک کھلانے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن اس کے نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے۔ ایک تو پہلے ہی میرے سر میں اتنا درد ہے اور اوپر سے اس کا یہ پاجامہ۔ بھی کہاں ہیں لے جاؤ اسے ان کے پاس... مجھ سے نہیں سنبھل رہی یہ۔" وہ مزید غصے سے گویا ہوئی تھی۔

واثق نے یونہی گردن موڑ کر اس طرف دیکھا تھا اور تب ہی ڈائننگ ایریا میں ایک کرسی پر بیٹھی وہ اپنے سراپے کی تمام تر رعنائیوں سمیت اس کی نظروں کی گرفت میں آئی تھی۔

گلابی رنگ کا لباس پہنے وہ خفا خفا سے چہرے والی لڑکی۔ جس کی رنگت بے حد سفید تھی۔ اتنی کہ واثق نے آج تک کسی کو اتنا اجلا' شفاف اور تابناک نہیں دیکھا تھا۔ گھنیری لمبی پلکوں سے ڈھکی اس کی بڑی بڑی سیاہ مغرور سی آنکھیں اور ان کو کچھ اور بھی تمکنت بخشتے تیکھے کمان جیسے ابرو' گھنے سیاہ لہریے دار بال اس نے دائیں شانے پر آگے کو سمیٹ رکھے تھے اسی لیے اس کی خوبصورت راج ہنس جیسی گردن اور اس پر چمکتے دو سیاہ تل بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکے تھے۔ نازک گلابی لب دانتوں تلے بھینچے کچھ برہمی کا تاثر دیتی وہ اجنبی لڑکی جسے اس پل واثق نے پہلی بار دیکھا تھا اور اب دیکھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اتنا مکمل اور ایسا بے مثال حسن اس نے اپنی تیس سالہ زندگی میں آج تک نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اتنے برسوں میں کبھی اس پر کسی کو دیکھتے ہوئے یوں بے اختیاری طاری ہوئی تھی۔ وہ کب اپنی جگہ سے اٹھی' کب گئی... اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ اس کی چائے بالکل ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

"واثق بھائی... آپ کے لیے تازہ چائے بنا دوں؟" فرحین پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔" وہ گڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا دل یکدم ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

دوسری بار اسی دن شام میں جب وہ ایک نسبتاً خاموش کونے میں کھڑا ایک دوست سے فون پر بات کر رہا تھا۔ ثمن آپی نے اسے پکارا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کو ریسیور کان سے ہٹا کر انہیں دیکھا اور پھر ان کے برابر میں کھڑے دلکشی کے اس پیکر پر نظر پڑتے ہی اس کی انگلیوں نے خود بخود کال منقطع کر دی تھی۔ وہ دوپہر سے لے کر اب تک وہ ایک لمحے کے لیے بھی تو اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔

"ادھر آؤ واثق... میں تمہیں جوہی سے ملواؤں... یہ میری اکلوتی نند ہے اور جوہی! یہ واثق ہے میری پھپھو کا اکلوتا بیٹا۔ تم اس سے پہلے نہیں ملی ہوگی۔ کیونکہ پہلے یہ لوگ اسلام آباد میں رہتے تھے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی کراچی شفٹ ہوئے ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے تعارف کرا رہی تھیں اور وہ یوں لاتعلق سی کھڑی تھی جیسے یہ بات اس سے نہیں کسی اور سے کی جا رہی ہو۔ واثق نے بغور اس کے تاثرات کا جائزہ لیا' پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر اسے "ہیلو" کہا تھا مگر اسے خاصا شاک لگا' جب اس بے مروت لڑکی نے کوئی اخلاقیات نہیں نبھائی۔ نہ تو وہ مسکرائی تھی۔ نہ ہی کوئی خیر مقدمی جملہ کہا تھا۔ بس گردن کی ایک خفیف سی جنبش سے اس کے ہیلو کا جواب دیتے ہوئے اس نے نہایت دھیمے لہجے میں ثمن سے کچھ کہا اور پھر اس کی طرف دیکھے بغیر وہ ایک سمت کو بڑھ گئی۔ واثق ہکا بکا سا رہ گیا۔ اس سے پہلے اسے اپنا آپ اتنا غیر اہم کبھی نہیں لگا تھا۔ جتنا آج وہ اسے بنا گئی تھی۔ ثمن نے گھبرا کر معذرت خواہانہ انداز میں اسے دیکھا۔

"مائنڈ مت کرنا واثق... یہ بس ایسی ہی ہے۔" ان کے گرم جوش تعارف کے بعد بھی جوہی نے جس طرح رد عمل دیا تھا۔ وہ انہیں اس کے سامنے شرمندہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

"یعنی بے نیاز' بے لحاظ اور بے پروا...!" اس نے

سوچا تھا۔

"اصل میں آج اس کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں زبردستی کھینچ لائی ہوں اسے اب دعا کررہی ہوں کہ یہ ٹھیک ہی رہے ورنہ پھر میری شامت آئے گی۔" عجلت میں ایک ادھوری سی وضاحت دے کر وہ اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کام کا بہانہ بنا کر نکل گئیں۔

ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ رونق تھی' شور تھا' گہما گہمی تھی۔ مگر ایک اس کے منظر سے ہٹتے ہی واثق کو وہ جگہ بیابان معلوم ہوئی۔ زندگی میں پہلی بار ایک انجانی پریشانی سے واثق کی نیندیں اڑی تھیں اور اس کی وہ رات سگریٹ پھونکتے ہوئے گزری تھی۔

وہ دوبارہ اس لڑکی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا جس کی ایک جھلک نے ہی اس جیسے میچور اور مضبوط انسان کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور جس نے اس کے ساتھ یہ سب کیا ہے اسے تو اس کا نام بھی یاد نہیں ہوگا۔ کیا یہ اس جیسے انا پرست بندے کے لیے شرم کی بات نہیں تھی۔

اور یہ غنیمت ہی تھا کہ اسے وہ پورے دن کہیں نظر نہیں آئی۔ مگر شام میں جب وہ تیار ہونے جارہا تھا تب ہی وہ لاؤنج میں داخل ہوتی نظر آئی تھی۔ واثق دل پر جبر کرکے اسے نظر انداز کرجاتا اگر وہ اس کی توجہ اپنے مخصوص جھنجلاہٹ اور بے زاری بھرے رویے سے اپنی جانب مبذول نہ کراتی۔ لاؤنج کے دروازے کے قریب ہی کسی نے آرائشی پھولوں کی جھالریں اور لڑیاں جو شاید اضافی تھیں' پھینک دی تھیں اور ان میں اب اس کا پیر الجھ گیا تھا۔ وہ چند لمحے تو خود ہی اپنا پیر آزاد کروانے کی کوشش کرتی رہی مگر ناکام ہونے پر بے اختیار جھلائی تھی۔

واثق اس کے قریب آیا لیکن جوہی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تک نہیں۔ شیفون کے آف وائٹ سوٹ میں اس کی گوری رنگت کچھ اور بھی چمک رہی تھی۔ بالوں کی چوٹی سے نکلتے لہریے دار بالوں کی چند لٹوں نے اس کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔ میک اپ کے نام پر اس نے کاجل تو کیا ہلکی سی لپ اسٹک بھی نہیں لگائی تھی۔ صرف موتیا کے گجرے تھے جو اس کی چوٹی میں گوندھے ہوئے تھے۔ وہ نازک حسین سی لڑکی وہیں کھڑے کھڑے واثق ادریس کی پوری ذات پر قابض ہوگئی تھی۔

"کچھ لوگوں کو خدا حسن دے کر اتنی بے نیازی کیوں عطا کردیتا ہے کہ پھر وہ کسی کے لیے وبال جان بن جائے۔" وہ اسے دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا۔

"یہ کیا مصیبت ہے۔ کوئی اس طرح بیچ راستے میں پھینکتا ہے یہ؟" تیکھے خمیدہ ابرو چڑھائے وہ برہمی سے فرحین سے پوچھ رہی تھی۔ اس کی شاہ مزاجی کا یہ عالم تھا کہ وہ ذرا سی جھکنے کی بھی روادار نہیں تھی کہ خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنا پیر آزاد کروالیتی۔

"ٹھہو جوہی... میں کردیتی ہوں۔" فرحین نے جلدی سے ہاتھ میں تھامے ڈبے ایک طرف رکھے اور بیٹھ کر ایک لمحے میں اس کا پیر آزاد کروا دیا اور وہ جواب میں فرحین کو شکریہ کہے بغیر ان کاغذی پھولوں کو اپنے پیروں تلے روند کر گویا ان سے اپنی اتنی دیر کی کوفت کا بدلہ لیتے ہوئے اندر چلی گئی تھی۔ واثق کو عجیب سا خوف محسوس ہوا یہ سوچ کر کہ اگر اس نے اس کے جذبوں کو بھی اپنی اس بے نیازی اور بے حسی کی بھینٹ چڑھا دیا تب وہ کیا کرے گا۔ وہ کوئی امیچور دل پھینک نوجوان نہیں تھا کہ کسی بھی لڑکی کو دیکھ کر سدھ بدھ کھو دیتا۔ اسے کبھی کسی نے اس حد تک متاثر نہیں کیا تھا' بلکہ یہاں لفظ متاثر چھوٹا پڑ رہا تھا جو کیفیات اسے جوہی کو دیکھتے ہوئے محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی تھیں۔

کبھی وہ اسے چاند کا عکس لگتی تو کبھی کسی شبنمی گلاب کی مانند جس کے لمس کا محض احساس ہی اس کے رگ رگ میں تازگی بھرنے لگتا تھا اور سب سے بڑھ کر جس چیز نے واثق کو اس کا دیوانہ بنایا تھا وہ اس کی یہ بے نیازی ہی تو تھی۔ وہ جیسے ہر وقت ساری دنیا سے بے زار نظر آتی تھی مگر یہ بے زار کن' نخوت سے نزاکت بھی اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتے تھے۔ اس نے جب اس بات کا ذکر آپی سے کیا تو وہ ہنس کر بولی تھیں۔

"ارے بہت مزاج دار ہے۔ اکلوتی ہے نا۔ اس کے نخروں سے تو اماں ہی بھلی۔ تمہیں تو اندازہ بھی نہیں ہوگا۔ میں جھیلتی ہوں' مجھے پتا ہے۔ مجھے تو اس بے چارے پر ترس آتا ہے جس کی قسمت اس کے ہاتھ پھوٹے گی۔" اور واثق نے سوچا تھا کہ وہ تو خوشی خوشی ہمیشہ کے لیے یہ بلا اپنے سر لینے کو تیار ہے۔ بے حد بے بس ہو کر بالآخر اس نے ثمن آپی کے سامنے حال دل کھول دیا تھا اور وہ ششدر رہ گئی تھیں۔

"کیا کہہ رہے ہو واثق؟"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ نہیں جانتیں۔ میں سویا نہیں ہوں جس دن سے میں نے اسے دیکھا ہے۔" بھاری لہجے میں کہتے اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اضطراب نے جیسے اس کے روم روم میں بسیرا کرلیا تھا۔

"اب میرے دل کی آبادی اور بربادی آپ کے ہاتھ میں ہے۔!"

"اف میرے بھائی۔ یہ کہاں دل لگالیا تم نے۔" اس کی حالت محسوس کرتے ہی انہیں بے اختیار اس پر ترس سا آگیا تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ کافی دنوں سے تائی جی کی طرف نہیں جاپائی تھی حالانکہ محض دو قدم کے فاصلے پر ہی ان کا گھر تھا اور کل تائی جی کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ ان کی مزاج پرسی کے ارادے سے وہ گھر سے نکل آئی تھی۔ ابھی وہ گیٹ سے نکلی ہی تھی کہ اچانک ایک تیز رفتار بائیک نے اس کے بے حد قریب آکر بریک لگائے تھے۔ وہ بے اختیار اچھل کر پیچھے ہٹی۔

"کیا کرتے ہو بدتمیز۔ دکھائی نہیں دیتا۔"

"دکھائی دیتا ہے اسی لیے تو رکا ہوں۔ چلو بیٹھو جلدی سے۔" اس نے آرڈر جاری کردیا۔

"میں تائی جی کی طبیعت پوچھنے جارہی تھی۔" جوہی نے گویا اسے اطلاع دی۔

"آکر پوچھ لینا۔ ویسے بھی اب تو وہ ٹھیک ہیں اور جان لو آج اگر یہ بات ٹل گئی تو ہفتوں ٹلی رہے گی۔" اسود نے اسے خبردار کیا تو وہ کچھ متذبذب سی ہوگئی۔

"پھر تم مجھے ندیدی تو نہیں کہو گے نا...؟" نیم رضا مندی ظاہر کرتے اس نے اپنے دل کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ اسود ہنسنے لگا۔

"کنفرم نہیں بتاسکتا۔"

"میں نہیں جارہی۔" تیزی سے اس کی بات کاٹ کر جوہی نے قدم آگے بڑھائے۔

"جوہی آجاؤ پلیز... مجھے اس طرح بیچ راستے میں کھڑے ہو کر لمبی بات کرنا پسند نہیں۔" اسود کے ملتجی لہجے نے اس کے قدموں کو روک دیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر بائیک کے پاس آگئی۔

"تھینکس۔" اسود کا چہرہ کھل گیا تھا۔

"آہستہ چلانا پلیز... ایک تو مجھے ویسے ہی بائیک پر بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا ہے اور اب تم چلا رہے ہو تو خدا خیر ہی کرے۔" پچھلی سیٹ پر بیٹھتے اس نے اسود کے شانے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اسود نے کچھ چونک کر اپنے شانے پر دھرے اس کے سفید موٹی ہاتھ کو دیکھا۔ دل نے یکایک ہی شور مچا کر اسود کو اس کے قرب کا احساس دلایا تھا۔ ایک عجیب سی سرشاری کے زیر اثر اس نے مسکراتے ہوئے بائیک اسٹارٹ کی اور وہ پہلے جھٹکے پر چلا اٹھی۔

"اسود! کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"میں ساتھ ہوں پھر بھی ڈر لگ رہا ہے؟" اس نے جان بوجھ کر رفتار تیز کردی تھی۔

"تم ساتھ ہو اسی لیے ڈر لگ رہا ہے... پلیز آہستہ چلاؤ۔"

"تم میری انسلٹ کروگی تو یہ کبھی نہیں ہوگا۔" اسود کو اسے ڈرانے میں لطف آرہا تھا کیونکہ اس عالم

میں وہ اس کے مزید قریب ہو کر بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر چکی تھی۔

"میں نے کب کی ہے تمہاری انسلٹ۔" وہ روہانسی ہوئی۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس چلتی بلکہ اڑتی ہوئی بائیک سے چھلانگ لگا کر عین جوانی میں اس جہان کو الوداع کہہ دوں؟"

"نہیں۔۔۔ میں ایسا کیوں چاہوں گا۔۔۔ جتنی تمہیں اپنی جان عزیز ہے اس سے کہیں زیادہ مجھے تمہاری جان عزیز ہے۔ کیونکہ تمہاری جان ہے تو میرے لیے جہان ہے۔" اسود نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہتے ہوئے رفتار دھیمی کر دی تھی اور جوہی کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے پہلے جملے کا جواب دے یا پھر آخری جملے کا مفہوم پوچھے۔ اس وقت وہ ایک مصروف سڑک پر تھے اس لیے اس نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی اور پھر آئس کریم پارلر میں بیٹھ کر آئس کریم کھاتے ہوئے تک وہ یہ بات بھول ہی چکی تھی۔

"گھر نہیں آئے اتنے دنوں سے۔۔۔ تم کو اتنا بھی خیال نہیں اسود کہ اس گھر میں تمہارا ایک دوست بھی رہتا ہے اور آج کل اس کی جو حالت ہے ایسے میں ایک دوست ہونے کے ناطے اس کی دل جوئی کرنا تمہارا فرض بنتا ہے۔"

اسود نے علی کا پوچھا تھا اور جوہی نے موقع ملتے ہی اسے سنا ڈالی۔

"آج کل وہ "صاحب فراموش" ہے۔ اسے کچھ عرصے کے لیے اس کے حال پر چھوڑ دو' دھیرے دھیرے خود ہی سنبھل جائے گا۔۔۔ ویسے بھی سنا ہے تمہارے بابا رفیق انکل کی بیٹی کو اس کے پلے باندھنے والے ہیں۔" اسود نے نہایت عام سے لہجے میں کافی بڑا انکشاف کر دیا تھا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم سے کس نے کہی یہ بات؟" اس کی حیرانی بجا تھی کیونکہ ایسا کوئی ذکر تو امی نے بھی اس کے سامنے نہیں کیا تھا۔

"ابو بتا رہے تھے۔ چچا نے شاید ان کے مشورے سے رفیق انکل سے بات کی ہوگی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اسود نے مزید بتایا۔ رفیق انکل تایا جی کے بہت گہرے دوست تھے اور ان کے ساتھ ساتھ جوہی کے بابا سے بھی بہت اچھے تعلقات تھے۔

"علی تو کبھی نہیں مانے گا۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"یہ بات تمہارے بابا کو سوچنی چاہیے۔۔۔ تم کیوں فکر کر رہی ہو۔" اسود بے نیازی سے بولا۔

"ویسے چچا جی کی صلاحیتوں پر مجھے کوئی شک نہیں۔ جب وہ علی سے اس کا پیار چھڑوا سکتے ہیں تو مقدس کو بھی اس کی زندگی میں شامل کروا کے ہی دم لیں گے۔"

"اور مجھے ایسا بالکل نہیں لگتا۔ علی ایک بار ہار مان چکا ہے' دوسری بار کبھی نہیں جھکے گا۔"

"چلو اس پر شرط ہم بعد میں لگالیں گے۔۔۔ یہاں میں تمہیں کچھ اور کہنے کے لیے لایا تھا۔" اسود نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔ میں سمجھی تم مجھے آئس کریم کھلانے یہاں لائے ہو۔" جوہی ہنسی۔

"جانتی ہو امی ان دنوں میرے سہرے کے پھول کھلانے کے چکر میں ہیں۔" اسود اس کی بات پر توجہ دیے بغیر بولا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تو کیا انہوں نے کوئی لڑکی دیکھ لی ہے؟" کہنیاں ٹیبل پر ٹکا کر اس نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"ان کا تو مجھے نہیں پتا۔۔۔ لیکن میں نے ضرور ایک لڑکی دیکھی ہے اور باقی کی ساری زندگی بھی میں اسے ہی دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔" وہ اسے اپنی گہری نگاہوں کے حصار میں لے کر بولا۔ جوہی جو اس لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی' ایک عجیب سے احساس سے دوچار ہو کر بلا ارادہ ہی نگاہیں جھکا گئی۔

"کون ہے وہ؟"

"تم۔" اسود نے اس ایک لفظی جواب کو کافی سمجھا تھا۔ اس کے خیال میں آگے جو بھی کہنا تھا جوہی کو کہنا تھا۔ لیکن اسے تو اسود کا جواب سن کر ہی جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا۔۔۔ میں نے ایسی کیا انوکھی بات کہہ دی ہے جو تم یوں بت بن گئی ہو۔ کچھ کہو۔"

"سمجھ میں نہیں آرہا کیا کہوں۔" انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس نے بے بسی سے کہا۔ اسود کی بات نے اسے کافی جھٹکا دیا تھا۔

"جو تمہارے دل میں ہے' وہ کہو۔" وہ سنجیدہ ہوئے۔

"لیکن میرے دل میں تو کچھ نہیں ہے۔" اس نے سچائی سے بتایا۔

"نہیں۔۔۔ کچھ تو ضرور ہوگا۔" اسود نے اپنی بات پر زور دیا۔ "یہ خیال کہ تم نے میرے بارے میں ایسا سوچا بھی کیسے یا پھر یہ کہ میرے دل میں تو ہمیشہ سے صرف تم ہی تھے۔"

"میرے دل میں ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ جھلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو اسود کو بھی اٹھنا پڑا۔

"جب تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال آئے تو مجھ سے شیئر ضرور کرنا۔ میں انتظار کروں گا۔" وہ اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کب تک؟" جوہی آنکھوں میں سوال لیے اسے دیکھنے لگی۔

"جب تک زندہ ہوں۔" اسود نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"سچ کہوں تو مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"تو ٹھیک ہے پھر۔" وہ بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "میں امی کو تمہارے بارے میں بتادیتا ہوں۔ وہ جب چچی جان سے بات کریں گی تب تو تمہیں یقین آجائے گا نا۔"

وہ چپ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"امی! اتنی بڑی بات ہو گئی اور آپ نے مجھے بتائی تک نہیں۔" اس دن وہ گھر آتے ہی امی کے پاس چلی آئی تھی۔

"کیا نہیں بتایا میں نے تمہیں؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی کہ بابا علی کا رشتہ مقدس کے ساتھ کرنا چاہ رہے ہیں۔" جوہی کے لہجے میں ناراضی تھی۔

"بتانا تو چاہ رہی تھی مگر موقع نہیں ملا۔" امی کے چہرے سے لگ رہا تھا وہ بھی کچھ زیادہ خوش نہیں تھیں۔

"آپ نے بابا کو روکا نہیں' ایک اور غلطی کرنے سے۔ علی ابھی تک اس غم سے نہیں نکلا ہے' نہ ہی وہ نشا کو بھولا ہوگا پھر بابا کیوں اتنی جلدی اس کی شادی کروانا چاہ رہے ہیں۔ اسے تھوڑا وقت تو دیں۔" وہ احتجاج کر رہی تھی۔

"تمہارے بابا کا خیال ہے کہ علی کی شادی جتنی جلدی ہوگی' اتنی ہی جلدی وہ اس لڑکی کو بھول سکے گا۔" امی نے بابا کے خیالات اس تک پہنچائے۔

"سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں۔۔۔ علی کو اتنے اجڑے بکھرے حال میں دیکھتی ہوں تو دل کٹنے لگتا ہے۔ کیسا ہنستا کھیلتا بچہ تھا میرا۔۔۔ نجانے کس کی نظر لگ گئی اسے۔" بے بسی سے کہتے وہ دوپٹے میں منہ چھپا کے رونے لگی تھیں۔

"اگر آپ چاہتیں تو روک سکتی تھیں بابا سے علی کی خوشی کے لیے۔ تین بیٹوں کی ماں ہیں۔ آپ کی پوزیشن اتنی کمزور تو نہیں کہ اپنے بچوں کی خوشی کے لیے ان کے سامنے ڈٹ بھی نہ سکیں۔ لیکن آپ کو تو یہ سب کرنا آتا ہی نہیں ہے۔ آپ نے تو ساری زندگی بس ان کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ ان کے ہر فیصلے پر چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز' سر تسلیم خم کیا ہے۔ آج علی کی اس حالت کے ذمہ دار صرف بابا ہی نہیں۔۔۔ آپ بھی اس میں برابر کی حصے دار ہیں۔" کھولتے ہوئے دماغ کے ساتھ وہ کتنا تلخ بول رہی تھی اسے اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کافی بھیگ چکی تھی۔ اسود کی باتیں رہ رہ کر

اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

اس نے بلا ارادہ فون اٹھا کر اسود کو کال ملائی' یہ سوچے بغیر کہ رات کے ڈھائی بجے کیا وہ جاگ رہا ہو گا۔ لیکن اس نے دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کرلی تھی اور تب ہی اسے احساس ہوا۔

"سو رہے تھے کیا؟" اس نے کچھ شرمندگی سے پوچھا۔

"نہیں۔ مگر لگتا ہے تمہاری نیند بھی اڑ گئی ہے میری طرح۔" وہ ہنس کر بولا۔ آواز سے خاصی بشاشت جھلک رہی تھی۔

"سنو۔ تم نے آج جو بھی کہا وہ مذاق تو نہیں تھا نا؟"

"بے شک میں نے کبھی اس بات کا ڈھنگ سے اظہار نہ کیا ہو لیکن۔" وہ کہتے کہتے رکا اور جب بولا تو دل کی ساری گہرائیاں لہجے میں سمٹ آئی تھیں۔

"میری دعاؤں میں' میری خواہشوں میں ہمیشہ سے صرف تم رہی ہو۔ میرے ہر خواب کی تعبیر' میری ذات کی تکمیل صرف تم ہو۔ تم سے میرے دل کی دھڑکنیں رواں ہیں۔ تم ہو تو میرے جینے کا کوئی مقصد ہے۔ دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر اگر میرے لیے کچھ ہے۔ تو وہ تمہاری محبت ہے۔"

رات کی اس نرم سی خاموشی میں وہ بوجھل لہجے میں اپنی محبت کا اقرار کرتا جوہی کے دل کے سارے کواڑ کھولتا جا رہا تھا۔ وہ فون کان سے لگائے ساکت سی ہو گئی تھی مگر دل اتنا شور مچا رہا تھا۔ جوہی کو لگا جیسے دوسری طرف اسود بھی اس کی دھڑکنیں سن رہا ہو۔

"جوہی تم۔ سن رہی ہو نا؟" اس کی خاموشی نے اسود کو بے چین کر دیا تھا۔

"ہاں۔" اس نے ایک نظر اپنی پسینے سے بھیگی ہتھیلی پر ڈالی۔

"میں امی سے بھی بات کرنے والا تھا لیکن ابھی تو وہ آپی کی طبیعت کی وجہ سے لاہور جا رہی ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا تب تک انتظار کرلوں۔ جب وہ واپس آئیں گی تو ایک بھی دن ضائع کیے بغیر انہیں تمہارے گھر بھیجوں گا۔" اس نے کہتے ہوئے ذرا توقف کیا۔

"مجھے بس ایک ہی بات کی فکر ہے جوہی۔ چچا جی کے مزاج کا کچھ پتا نہیں چلتا وہ مان تو جائیں گے نا۔" اسود کے لہجے میں نامعلوم سے اندیشے بول رہے تھے۔

"پتا نہیں۔" وہ دھیرے سے بولی کیونکہ یہ تو سچ ہی تھا کہ بابا کوئی بھی فیصلہ کرسکتے تھے۔ بھتیجا ہونے کے باوجود اسود کی کس بات کو بنیاد بنا کر وہ انکار کر دیتے اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

"اگر ایسا کچھ ہوا تو تم میرا ساتھ دو گی نا؟" وہ آس بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔" بلا ارادہ ہی اس کے منہ سے یہ اثباتی لفظ نکلا تھا۔ بعد میں اسے احساس ہوا تو اسے خود پر حیرانی ہوئی تھی۔

"مجھے پتا تھا جوہی۔ تھینکس۔" اسود کے لہجے میں اسے واضح خوشی محسوس ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج چھٹی کا دن تھا۔ بابا گھر پر ہی تھے اور علی بھی' جو آج کل کم کم ہی گھر پر نظر آتا تھا۔ اس موقع کو مناسب خیال کرتے ہوئے بابا نے زوار بھائی اور وقار بھائی کی موجودگی میں علی کو بات کرنے کے لیے بٹھالیا تھا۔ امی تو فکر مند تھیں ہی لیکن زیادہ اضطرار جوہی کے وجود میں پھیلا ہوا تھا۔ بابا کے کمرے کے باہر ٹہلتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے بھی وہاں سے نہیں ہٹ رہی تھی۔ اس سے پہلے بابا کا جو بھی حکم علی تک پہنچتا تھا امی کے ذریعے پہنچتا تھا اور اب بابا براہ راست علی سے بات کرنے لگے تھے جس کا حتمی نتیجہ ایک ہنگامے کی صورت میں ہی نکلنا تھا۔ کیونکہ جوہی کو یقین تھا کہ علی کبھی بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہو گا۔ اگر علی کی جگہ وہ ہوتی تو وہ بھی ایسا ہی کرتی۔

"جوہی! کب تک یہاں ٹہلتی رہو گی۔ جو بھی بات ہے تھوڑی دیر میں سب کے سامنے آہی جائے گی۔ تم چل کر ذرا میرے ساتھ۔"

"سوری بھابھی!" روا بھابھی کے کسی کام کے کہنے سے پہلے جوہی نے ان کی بات کاٹ دی۔ "میں اس وقت کوئی کام کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"تو عجیب ہے۔ پھر فہد کو ہی سنبھال لو۔ اتنا تنگ کر رہا ہے۔ کوئی کام نہیں کرنے دے رہا۔" روا بھابھی نے فہد کو ان سے دوسرا حل پیش کر دیا اور فہد کو اسے پکڑا کر وہ آگے بڑھ گئیں۔

"کیا مصیبت ہے۔ کام کرو۔ نہیں تو ان کے بچوں کی آیا گیری کرو۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے سوچا۔

اس وقت اس کا دل چاہا فہد کو امی کو دینے کے بہانے اندر چلی جائے اور صورت حال کا جائزہ لے تب ہی وقار بھائی باہر نکلے تھے اور ان کے پیچھے علی۔ علی کا چہرہ بجھا ہوا تھا لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ علی کا موڈ ان دنوں آف ہی رہتا تھا۔ بابا کے کمرے سے نکلتے ہی وہ کافی تیزی سے گھر سے نکل گیا تھا۔ وہ وہیں الجھی کھڑی رہ گئی۔ امی اور زوار بھائی ابھی اندر ہی تھے۔ اسے وقار بھائی کے پاس آنا پڑا جو اپنے کمرے میں آچکے تھے۔

"بھائی! کیا ہوا۔ علی نے کیا جواب دیا بابا کو؟"

"وہی جو بابا چاہتے تھے۔" وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر بولے۔

"کیا۔؟" اس کا دل جیسے کسی کھائی میں گرتا چلا گیا۔

"مجھے امید تو نہیں تھی کہ علی اتنی آسانی سے مان جائے گا۔ کہاں تو وہ سارے گھر والوں سے ناراض منہ پھیلائے پھر رہا تھا' کہاں اب بابا کے ایک بار کہنے پر ہی اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔"

وہ اپنی زبان میں گویا جوہی کے خیالات بیان کر رہے تھے۔

"ویسے تو یہ ایک خوش آئند صورت حال ہے کہ علی نے پچھلی باتوں کو بھلا کر اپنے آگے کی زندگی کو سوچنا شروع کر دیا ہے۔ یقیناً" وہ اندرونی طور پر سنبھل چکا ہو گا جب ہی اس نے اس رشتے کے لیے ہامی بھری ہے لیکن پھر بھی۔ نجانے کیوں۔ میرے دل میں کچھ کھٹک رہا ہے۔" وقار بھائی اپنی بے چینی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ مزید ہراساں ہو گئی۔

اسے اب تک یقین نہیں آرہا تھا کہ علی مان گیا ہے۔ کیوں؟ کیسے؟ اب تو اس کی کوئی مجبوری بھی نہیں رہی تھی پھر وہ کیوں مانا۔ جوہی کا خیال تھا کہ وہ یہ بات سنتے ہی ایک طوفان اٹھا دے گا۔ اسی ڈر سے تو امی نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ صورت حال جوہی کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ ابھی تو علی کے دل کے سارے زخم تازہ تھے۔ ابھی تو بابا کے لیے علی کا غصہ اور ناراضی سرد بھی نہیں پڑی تھی اور علی نے ان ہی کی پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ وہ جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی جاتی۔

☆ ☆ ☆

آج وہ بہت دنوں بعد تایا جی کی طرف آئی تھی شاید تائی جی کے لاہور جانے کے بعد پہلی بار۔ خاموشیوں میں گھرا یہ خوبصورت سا گھر اپنے در و دیوار میں ایک عجیب سا سکون سمیٹے ہوئے تھا۔ اس لیے یہاں آتے ہی جوہی کے اعصاب ہلکے ہو جاتے تھے۔ ایک وقت تھا جب اس کا زیادہ تر وقت یہیں گزرتا تھا۔ تب یہاں کافی رونق ہوا کرتی تھی۔ فرحان بھائی تھے جو وقار بھائی اور زوار بھائی کی طرح خشک مزاج اور سنجیدہ نہیں تھے۔ ان کے ساتھ اتنی موج مستی اور ہنسی مذاق کرتے کہ انہیں اپنے اور ان کے بیچ عمروں کے فرق کا احساس ہی نہیں رہتا تھا۔ بے حد خوش مزاج اور بات بے بات قہقہے لگانے والی مہرین آپی تھیں۔ اس سے بے حد پیار کرتی تھیں تو کبھی کبھی تنگ بھی کرلیتی تھیں۔ مریم اور اسود تو تھے ہی اس کے ہم عمر۔ اسی لیے اسکول سے آنے کے بعد علی اور جوہی سیدھا یہیں کا رخ کرتے تھے۔ ان کا گھر اور گھر کا ماحول دیکھ کر اکثر جوہی احساس کمتری کا شکار ہو جاتی تھی۔ یہاں سب ہی کتنی بھرپور زندگی جی رہے تھے۔ جوہی کا خیال تھا گھر کی رونق لڑکیوں سے ہوتی ہے مگر جب وہ فرحان بھائی اور اسود کو دیکھتی تو اسے اپنا یہ خیال منہ چڑاتا

محسوس ہوتا۔

اس کے گھر میں سب ہی اپنے اپنے خول میں بند ایک ایسی زندگی گزار رہے تھے کہ دوسرا چاہ کر بھی اس میں دخل اندازی نہیں کرپاتا تھا۔ ایک لگے بندھے روٹین میں سیٹ۔ ایک روکھی سپاٹ زندگی۔ زوار بھائی کو اپنے بڑے ہونے کا خیال تھا۔ ان کی یہ سوچ انہیں کسی سے گھلنے ملنے نہیں دیتی تھی۔ ایک طرح سے وہ وقت سے پہلے ہی بابا کی گدی پر بیٹھ گئے تھے۔ وقار بھائی کے مزاج میں جو تھوڑی بہت شگفتگی تھی۔ وہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ کہیں کھو سی گئی تھی۔ امی پیار کرتی تھیں۔ خیال بھی بہت رکھتی تھیں۔ لیکن ماں اور بچوں کے درمیان جو دوستی اور اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے وہ ان کے درمیان ناپید تھا۔

علی اور جوہی ایک جیسے تھے۔ ایک جیسا سوچتے تھے۔ گھر کے سُونے پن کو ختم کرنے کی اپنی سی سعی بھی کرتے اور ناکامی پر اس ماحول سے فرار حاصل کرنے کی کوششوں میں ان کا ایک ہی گوشہ عافیت ہوتا تھا اور وہ تھا تایا جی کا گھر۔ اس وقت اس گھر کو دیکھتے ہوئے اس کا ذہن جانے کہاں کہاں بھٹک نکلا تھا۔ اسے احساس تک نہ ہوسکا۔

"ارے جوہی! تم کب آئیں؟" مریم نجانے کس کام سے باہر آئی تھی۔ برآمدے میں اسے کھڑا دیکھ کر حیران ہوگئی۔

"بس کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔" اسے اپنے آپ میں آتے دیر نہیں لگی۔

"لگتا ہے نیند سے اٹھ کر سیدھا یہیں آرہی ہو جب ہی تو خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔" مریم نے اس کی کیفیت محسوس کرلی تھی اس لیے ہنس کر بولی۔ "جاگ تو گئی ہونا؟"

"ہاں بھئی جاگ گئی ہوں۔ چلو اب اندر۔"

"اندر" مریم نے برہمی سے دہرایا۔ "میں نے تو سوچا تھا کہ اب اگر تم آئیں تو میں تمہیں دروازے سے چلتا کردوں گی۔ اندر گھسنے ہی نہیں دوں گی۔" مریم ناراض تھی اور جوہی کو اس کی وجہ بھی معلوم تھی پھر بھی انجان بن کر پوچھ لیا۔

"کیوں؟"

"کیوں کیا۔ امی کب گئی ہیں، تمہیں کچھ یاد ہے تم نے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا کہ جاکر مریم کا ہی احوال دریافت کر آؤں۔ بے مروتی اور بے رخی بھی کوئی حد ہوتی ہے جوہی! مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔" اسے واقعی بہت غصہ تھا۔ جوہی شرمندہ ہوگئی۔

"اچھا نا۔ چھوڑو۔ اب تو آگئی ہوں۔ کیا پھر دروازے سے بھگا دو گی؟"

"نہیں، چلو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلی آئی۔ "آج مجھے کافی بڑی خوش خبری ملی ہے اس لیے تمہیں معاف کیا۔"

"کیسی خوش خبری۔ کہیں مہرین آپی کی طرف تو نہیں؟" اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"ہاں" خوشی مریم کے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ "مہرین آپی کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ کچھ دیر پہلے ہی امی کا فون آیا تھا۔ میں وہی بتانے کے لیے تو تمہاری طرف آرہی تھی۔"

"بہت بہت مبارک ہو۔" اسے حقیقتاً خوشی ہوئی۔ "تین بیٹیوں کے بعد ایک بیٹا۔ مہرین آپی تو بہت خوش ہوں گی۔" اس نے تصور ہی تصور میں ان کا کھلتا ہوا چہرہ دیکھا۔

"امی بتارہی تھیں بہت پیارا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا میں اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔" مریم بہت پُرجوش ہورہی تھی بھانجے کو دیکھنے کے لیے۔

"نام وام کوئی سوچا ہے یا نہیں؟" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، آپی خود ہی رکھیں گی کوئی۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"پتا ہے کیا، جب فہد ہوا تھا، ردا بھابھی سمیر نام رکھنا چاہ رہی تھیں مگر مجھے فہد نام بہت پسند تھا اور پھر میری ضد تھی کہ بھئی میرا پہلا لاڈلا بھتیجا ہے تو نام میں ہی رکھوں گی۔ بس پھر وقار بھائی نے بھی کہہ دیا ہم اس کا نام ... بتائیں گے جو جوہی کو پسند ہے۔ بے چاری ردا بھابھی دل میں محسوس کر رہ گئی تھیں۔" وہ ہنستے ہوئے بتا رہی تھی۔

"تو پھر مجھے ایسا مشورہ کیوں دے رہی ہو۔ کیا پتا شادی کے بعد مجھے بھی تمہاری جیسی کوئی من مانی ... مل گئی تو میں کیا کروں گی۔ یہ نام تو میرے دل میں ہی رہ جائے گا نا جیسے ردا بھابھی کا رہ گیا تھا۔"

جوہی کے لہجے میں عجیب سا زعم اتر آیا تھا۔ مریم نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"پتا ہے جوہی۔ تم ایک بالکل روایتی نند ہو اور اکلوتی ہو تو سونے پر سہاگہ۔ میں نے بھی تم سے کافی گُر سیکھے تھے بھابھیوں کے ناک میں دم کرنے کے۔ یہ سوچ کر کہ اپنی بھابھیوں پر آزماؤں گی مگر افسوس۔ فرحان بھائی تو جرمنی جاکر بیٹھ گئے۔ اب صرف اسود ہی بچا ہے اس لیے۔" مریم نے قدرے رک کر ذرا سا توقف کیا تو وہ بے صبری سے بول اٹھی۔

"اس لیے کیا۔۔؟"

"تیاری پکڑلو۔ میں ردا بھابھی اور ثمن بھابھی کے سارے بدلے تم سے گن گن کے لینے والی ہوں۔" مریم نے مسکراہٹ دباتے ہوئے معنی خیزی سے کہا تھا، وہ حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی اور اگلے ہی پل اسے کشن اٹھا کر دے مارا۔

"بکواس بند کرو اور مجھے چائے پلاؤ۔ اتنی دیر سے آئی بیٹھی ہوں۔ خوش خبری سنادی بغیر مٹھائی کے۔ اب کم از کم چائے کا تو پوچھ لو۔" اس نے اپنی شرم کو غصے میں چھپانا چاہا تھا۔ مریم ہنس پڑی تھی۔

"یار جوہی! شرماتے ہوئے بہت خوبصورت لگ رہی ہو قسم سے۔"

"ہاں اور اگر تم نے ہنسنا بند نہیں کیا تو تھوڑی دیر میں بہت خطرناک بھی لگنے والی ہوں۔" اب اسے واقعی غصہ آگیا تھا۔

"او کے۔ او کے۔" مریم نے ہنسی کو بریک لگایا۔ "بتاؤ کیا لوگی۔ ٹھنڈا یا گرم؟"

"لگتا ہے اسود آگیا۔" مریم نے کہا۔

اسود کا نام سنتے ہی اس کا دل جیسے ہتھیلیوں میں دھڑکا تھا۔ شیشے کا گلاس اس کے ہاتھ میں کانپا اور تھوڑی سی کولڈ ڈرنک چھلک گئی۔

"چائے کا پانی رکھ دوں۔ اسے تو آتے ہی چائے چاہیے ہوتی ہے۔" مریم زیر لب بڑبڑائی تھی اور وہ اس سے اپنے چہرے کے رنگ چھپانے کی خاطر باہر نکل آئی۔

"یقین نہیں آتا۔ آج سورج مشرق سے ہی نکلا تھا۔" اندر آتے ہی جب اس کی نظر جوہی پر پڑی تو اس کا چہرہ کھل سا گیا تھا۔ لودیتی نگاہیں اس پر مرکوز کیے وہ یہ بولے بنا نہ رہ سکا۔

"اگر کوئی شک ہے تو دوبارہ جاکر چیک کرلو۔" اس نے مسکراہٹ دبائی تھی۔

"اور اس کی یہاں موجودگی کو کیا کہو گے؟" مریم بھی چلی آئی تھی۔

"اپنی دعا کی قبولیت۔" وہ دھیرے سے بولا تو جوہی پہلو بدل کر رہ گئی۔

"یعنی تم نے آج دعا کی تھی۔ جوہی سے ملنے کی۔" مریم کے لہجے سے شرارت چھلک رہی تھی۔

"یہ چائے کب بنے گی مریم؟" جھینپ کر اس نے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ اسود کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"یااللہ! یہ لڑکی ابھی سے مجھ سے اتنا کام کروا رہی ہے۔ بعد میں تو میرا حشر ہی کردے گی۔" وہ جاتے جاتے بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آئی تھی۔ پھر اسود کے ساتھ لان میں ٹہلتے ہوئے اس نے یونہی بلا ارادہ پوچھ لیا۔

"یہ مقدس کیسی لڑکی ہے؟"

اسود نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ "کیا ہمارے درمیان اپنی بات کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا جو ہم دوسروں کو ڈسکس کررہے ہیں۔" جوہی حیران ہوگئی۔

"وہ کوئی دوسری نہیں، میری ہونے والی بھابھی ہے۔" اس کا لہجہ تُروٹھا ہوگیا۔ اسود نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سفید رنگ کے لباس میں ملبوس' اپنے سیاہ ریشمی بال کھلے چھوڑے' شانوں سے پھسلتے دوپٹے کو بار بار درست کرتی وہ اس کی نظروں کے ارتکاز سے نروس ہوگئی۔

"اس طرح مجھے گھور گھور کے نروس کرو گے تو پھر میں دوسروں کی ہی باتیں کروں گی۔" اس نے خفا ہو کر دھمکی دے ڈالی۔ وہ ہنس پڑا۔

"یقین نہیں آتا کہ تم نروس بھی ہو سکتی ہو اور وہ بھی مجھ سے۔"

"پہلے نہیں ہوتی تھی لیکن اب ہونے لگی ہوں۔ پتا نہیں تم میں تبدیلی آگئی ہے یا پھر میں ہی بدل گئی ہوں۔"

اس کی پلکیں لرزنے لگی تھیں اور چہرے پر بکھرتی دھنک اسے کچھ اور بھی دلکشی عطا کر رہی تھی۔ اس لمحے اسود کو دیکھتے ہوئے جوہی نے بے حد آسانی سے اس بات کا اعتراف کرلیا تھا کہ بنا دستک دیے بہت چپکے سے اسود کی محبت نے اس دل کے کونے کونے کو آباد کر دیا تھا۔ پہلی بار اپنی ذات کے علاوہ بھی اس نے کسی کو اس حد تک سوچا تھا۔ پہلی بار اس کا دل کسی کے سامنے جھکا تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے اپنی ہار کی خوشی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کچن میں داخل ہوئی تو ردا بھابھی کو کاموں میں الجھے ہوئے دیکھا۔

"آج کا دن تو حیرت انگیز ہے۔" اپنی پلیٹ میں گاجر کا حلوہ ڈالتے وہ با آواز بلند بولی۔

"کیوں۔" پتیلی کو سنک پر پٹختے وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"بھئی' آج ثمن بھابھی کے میکے والوں کی آمد پر آپ خاطر مدارات میں جو لگی ہوئی ہیں۔" جوہی نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

"تم سے یہ کس نے کہا کہ میں ثمن کے میکے والوں کی خاطر مدارات کر رہی ہوں۔" ان کے لہجے میں کچھ بات تھی جس نے جوہی کو ٹھٹکا دیا۔

"کیا مطلب؟"

"بھئی میں اس کے میکے والوں کی نہیں' تمہارے ہونے والے سسرالیوں کی خاطر میں لگی ہوں۔ سمجھیں!" ان کے چہرے بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"کون سے سسرالی۔ اور مجھے کسی نے بتایا نہیں۔" اس کے تیور بگڑ گئے تھے۔ پلیٹ ایک طرف کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھابھی بوکھلا گئیں۔

"کیا تمہیں پتا نہیں ہے۔ مجھے لگا ثمن نے یا ... نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ ثمن کی پھپھو اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ مانگنے آرہی ہیں۔" ان پھپھو کا نام سنتے ہی جوہی کچھ دھیمی سی پڑ گئی۔

"ہاں۔ بھابھی نے ایک بار سرسری سا ذکر کیا تھا۔"

"میں نے سرسری ذکر تو نہیں کیا تھا جوہی!" ثمن بھابھی نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے اس کی بات سن لی تھی اس لیے جواب دینے میں بھی تامل نہیں کیا تھا۔

"میں نے تمہیں کافی تفصیل سے بتایا تھا ان کے بارے میں۔"

"ہاں۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ رشتہ لے کر آنے والے ہیں۔" اس سے اپنی کوفت چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔

"اب تو تمہیں پتا چل گیا نا۔ تمہیں اتنی پرواہ کس بات کی ہو رہی ہے۔"

وہ ناراضی سے دریافت کر رہی تھیں۔ وہ انہیں اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتا سکتی تھی اس لیے منہ سے کچھ کہے بنا ہی باہر نکل آئی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ تائی جی کی واپسی کتنے دنوں میں ہوگی۔ اب وہ کیا کر رہی تھی کہ اگر بابا نے اس رشتے کو اوکے کر دیا تو وہ کیا کرے گی۔ ایک ایسی محبت جسے اس نے ٹھیک طرح سے محسوس کرنا بھی شروع نہیں کیا تھا' سے چھن جائے گی۔ جبکہ اس نے اسود کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

شام ہوتے ہی بھابھی کے میکے سے ان کے امی اور ابو آئے تھے۔ پھپھو بھی تھیں اور ان کے ساتھ ان کے شوہر تھے۔ ادریس انکل جو آرمی کے ریٹائرڈ کرنل تھے۔ کافی خوش مزاج سے تھے اور جس بے تکلفی سے بابا سے گپ شپ کر رہے تھے' لگتا تھا کہ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ یہ سب دیکھ کر جوہی کے دل میں کہیں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ وہ لوگ رشتہ مانگنے آئے تھے مگر اس روایتی انداز میں بالکل نہیں' جیسا جوہی نے سوچا تھا۔ جیسا وہ اب تک دیکھتی آئی تھی۔ بھابھی کی پھپھو بہت پرخلوص سی تھیں اور اسے تو خصوصی توجہ دے رہی تھیں۔ بار بار اپنے پاس بٹھاتیں' باتیں کرتیں۔ جوہی الجھن محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کا دل لرزیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"جوہی! آکر کھانا کھالو۔" اسے اپنے کمرے میں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی جب ثمن بھابھی کا نزول ہوا۔

"بھوک نہیں ہے۔" چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اپنے اعصاب سمیٹنے کی کوشش کی۔

"ارے کیسے بھوک نہیں ہے۔ آج تو ساری تمہاری پسند کی ڈشز بنی ہیں۔" بھابھی مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "پتا ہے پھپھو بھی کہہ رہی ہیں اپنی ہونے والی بہو کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گی۔ اب چلو اٹھو۔" بھابھی کے آخری جملے پر اس کا ضبط جواب دے گیا۔

"نہیں کھانا ہے مجھے کھانا' کتنی بار بتاؤں یہ بات۔" وہ چلا اٹھی' اعصاب کشیدہ تھے اور جوہی اتنا برداشت کرنے کی عادی نہیں تھی۔ "مر گئی ہے میری بھوک آپ کے ان رشتے داروں کے رہتے نہیں کھا سکتی میں کھانا۔"

غصے میں وہ لحاظ و مروت بالکل بھول گئی۔ بھابھی کا چہرہ تاریک پڑ گیا تھا اس کے کاٹ دار لفظوں پر لیکن اسے اپنے رویے کی بدصورتی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ کمرے سے نکل گئی تھیں اور جوہی سر تھامے رونے بیٹھ گئی۔ ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا تھا پھر بھی ایک انجانا سا خوف تھا جو اس کے دل کو ہولائے دے رہا تھا۔ جب وہ لوگ جا رہے تھے تب امی اسے بلانے آئی تھیں اور اسے باہر آنا پڑا۔ وہ سب لوگ ہال میں موجود تھے۔

"ماشاء اللہ ہماری بیٹی بہت پیاری ہے۔" پھپھو نے محبت سے کہتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

"بھائی صاحب' بہن جی!" وہ باری باری امی' بابا سے مخاطب ہوئیں۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنی بہو کو انگوٹھی پہنا دوں۔ یہ صرف ایک شگن ہے۔ منگنی کے لیے ہم ان شاء اللہ بعد میں کوئی تاریخ رکھ لیں گے۔" وہ نرم لہجے میں کہتی جوہی کے دل پر آرے چلا رہی تھیں۔ اس کا دماغ سن ہوتا جا رہا تھا اور آس پاس دکھائی دیتے چہرے دھندلے پڑنے لگے تھے۔

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔" بابا نے بڑی خوش دلی سے اجازت دی تھی۔

انہوں نے زیر لب بسم اللہ کہتے ہوئے انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی تو سب ہی ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے تھے۔ جوہی غیر محسوس انداز میں ان سے دور ہٹ گئی تھی۔

"لیجیے احسان صاحب! آپ کی بیٹی اب ہماری ہوئی۔" ادریس انکل بابا سے مخاطب تھے۔

وہ وہاں سے چلی آئی تھی۔ سب کے سامنے تو کچھ نہیں کہہ پائی تھی لیکن اپنے کمرے میں آتے ہی اس پر دورہ سا پڑ گیا تھا۔ پہلے تو اس نے انگوٹھی اتار کر ایک طرف پھینکی۔ اس کے بعد دوسری چیزوں کی باری آئی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر موجود اس کا سارا امپورٹڈ میک اپ' اس کے پرفیومز' ایک طرف سجے اس کے بچپن کے کھلونے جسے اس نے ابھی تک سنبھال رکھا تھا۔ جو کچھ بھی اس کے ہاتھ لگ رہا تھا' تباہ ہو رہا تھا۔ اسے

کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ پڑتے ہی اس کی نظر تصویر پر پڑ گئی۔ وہ اس کی اور علی کی تصویر تھی۔ دونوں کافی خوش تھے' مسکرا رہے تھے۔ نجانے کس لمحے میں کھینچی گئی تھی یہ فوٹو۔ اس وقت اس کے ذہن میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بے تحاشا تھکن اچانک ہی اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ تصویر وہیں رکھ کر جوہی بیڈ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"میں مر جاؤں گی لیکن کبھی یہ شادی نہیں کروں گی۔" گھٹنوں میں سر دے کر روتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگی تھی۔

"میں علی نہیں ہوں۔ یہ لوگ میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتے۔ مجھے بتائے بغیر میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتے۔" وہ اب بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ اپنی نئی نویلی نوخیز محبت سے دستبردار ہونے کا تصور بھی اس کے لیے جان لیوا تھا۔ ایسی محبت' جسے اس نے ابھی ابھی محسوس کرنا شروع کیا تھا۔ جس کا نشہ' جس کی خماری دھیرے دھیرے جسم و جان میں سرایت ہونا شروع ہوئی تھی کہ یکدم ہی جیسے کسی نے اس پر یخ ٹھنڈا پانی پھینک کر اس کا سارا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ اس کے ارمان ڈوب رہے تھے۔ اس کے سپنے ٹوٹ رہے تھے۔ وہ رو رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔

"جوہی!" اس کے کانوں میں امی کی آواز آئی تھی بہت ہلکی سی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ دروازے میں کھڑی تھیں۔ کمرے کی بکھری ہوئی حالت دیکھ کر وہ اتنا نہیں گھبرائیں' جتنا جوہی کی حالت نے انہیں بدحواس کر ڈالا۔

"میرے اللہ!" وہ سینے پر ہاتھ رکھے اس کے قریب آئیں۔ راستے میں ان کے پیر کس کس چیز پر پڑے' کتنے زخمی ہوئے انہیں کچھ احساس نہیں تھا۔

"یہ سب کیا ہے جوہی۔ کیوں کیا یہ سب۔" امی نے تاسف سے کہتے ہوئے اس کے بال سمیٹے وہ فوراً ان کے ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہوئی۔ اس کی نظروں میں عجیب سی کاٹ تھی اور انداز میں مکمل اجنبیت۔

"آپ جانتی تھیں نا۔ آپ کو سب پتا تھا؟ یہ سارا سلسلہ آج کا نہیں ہے۔ آپ جانتی تھیں کہ بابا بہت پہلے یہ رشتہ طے کر چکے ہیں؟"

"میں پہلے سے نہیں جانتی تھی جب تمہارے بابا نے یہ رشتہ طے کر دیا' تب مجھے بتایا تھا۔" امی کہہ رہی تھیں جو یقیناً "جھوٹ نہیں تھا۔ پاپا ہمیشہ ایسا ہی کرتے تھے۔ اپنے کسی بھی فیصلے پر' بے شک وہ ان کی اولاد کی زندگی سے متعلق ہی کیوں نہ ہوتا' امی کی رائے لینا کبھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

"اور مجھے بہت دکھ بھی ہوا تھا لیکن جب مجھے یہ پتا چلا کہ انہوں نے تمہارا رشتہ کہاں طے کیا ہے تو یقین کرو میری ساری افسردگی ختم ہو گئی تھی۔ واثق بہت ہی ہونہار اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ میں ملی ہوں اس سے اور اس کے ماں باپ سے۔ تم نے دیکھا نا آج' کتنے سادہ اور پرخلوص سے ہیں۔ تم وہاں بہت خوش رہو گی۔" وہ اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ اپنی مرضی نہ پوچھے جانے پر جوہی اتنی برہم ہے۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ چلا کر بولی تھی۔ "میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ بابا نے پہلے علی کی زندگی تباہ کی اور اب میری برباد کر رہے ہیں۔ تماشا بنا کر رکھ دیا ہے ہماری زندگی کا۔ علی کو تو پھر بھی بٹھا کر پوچھ لیا لیکن مجھ سے۔ مجھ سے تو انہوں نے ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا' کہ میری مرضی کیا ہے۔ میں خوش ہوں یا نہیں۔ میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا مجھ سے پوچھے بغیر۔ جیسے میں ان کی دکان میں پڑی کوئی بے جان سی چیز ہوں۔ اٹھایا اور بیچ ڈالا۔"

اس کی آواز لحہ بہ لحہ بلند ہو رہی تھی۔ اس کے سرخ چہرے اور آنکھوں کی وحشت نے امی کا دل دہلا دیا تھا۔ وہ حیران تھیں جوہی کے مزاج میں اتنا جنون کیسے آیا کب اور وہ اس سے بے خبر کیسے رہیں۔

"لیکن آپ یہ کہہ دیجیے گا بابا سے۔ میں کبھی یہ شادی نہیں کروں گی اور اگر انہوں نے مجھ پر کوئی دباؤ

ڈالا تو میں مر جاؤں گی نہیں۔ کیونکہ اس سے ان کا کوئی نقصان نہیں ہو گا چند دن سوگ منائیں گے اور پھر بس جی لیں گے اور میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے بھول جائیں۔" نجانے کیا بات تھی جوہی کے لہجے میں کہ ان کا پورا وجود کپکپا اٹھا۔

"بلکہ۔ اس لیے میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔" اس نے سفاکی سے اپنی بات پوری کی تھی۔ امی کو یوں لگا جیسے کسی نے ان کا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ بات معمولی نہیں تھی۔ جوہی کا غصہ کہیں سے بھی معمولی نہیں لگ رہا تھا۔

"تاکہ وہ اگر کبھی مجھے بھولیں بھی تو دنیا والے انہیں میری یاد دلاتے پھریں۔ دیتے رہیں پھر زمانے بھر کو صفائیں کہ ان کی بیٹی گھر چھوڑ کر کیوں بھاگی اور کس کے ساتھ۔"

وہ اپنے دل کا زہر اگل کر واش روم میں بند ہو گئی۔ اس نے ایک بار بھی ماں کی زرد رنگت اور بکھرتی حالت نہیں دیکھی۔ کچھ دن پہلے تک علی اور بابا پر ناراض ہوتے ہوئے آج جوہی نے خود بھی انہیں کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

علی کی شادی کی تاریخ رکھی جا چکی تھی اور اس سے ایک ہفتے پہلے جوہی کی منگنی کی۔ بابا نے اس کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی حالانکہ امی نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی جوہی کی ناراضی اور انکار کو مناسب الفاظ میں ان تک پہنچانے کی لیکن انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ جب انہوں نے علی کی خواہش اور خوشیوں کی پروا نہیں کی تھی تو جوہی کی کیسے کر سکتے تھے۔

اس دن اپنے دل کی بھڑاس نکال کر جوہی نے پھر کوئی ہنگامہ نہیں کیا تھا۔ وہ چپ چاپ ہو گئی تھی۔ کسی سے بات نہ کرتی۔ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی۔ وہ اسی کا ردعمل جاننا چاہتی تھی لیکن اس کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ یہ اس کی تکلیف میں اضافہ کر رہا تھا۔

اس دن اس کے کمرے میں علی آیا اور وہ چونک گئی۔ نجانے کتنے دنوں بعد وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ پہلے تو علی ہی پورا دن گھر سے غائب رہتا تھا اور اب وہ گوشہ نشین ہو گئی تھی سو اسے دیکھتے ہی جوہی کا دل بھر آیا۔ ایک وہی تو تھا جو اسے سمجھتا تھا' اس کا بھائی' اس کا دوست۔

"کیا بات ہے مائی ڈیر سسٹر! نہ صبح دکھائی دیتی ہو' نہ شام میں۔ منگنی سے پہلے بھی مایوں جیسی کوئی رسم ہوتی ہے کیا؟"

وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ جوہی کے لیے بس اتنا کافی تھا' دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں دریا امڈ آیا تھا۔ علی کی آنکھیں جل اٹھیں۔ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کے پاس آ کر اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"جوہی! خوش نہیں ہو؟" اس نے بھاری لہجے میں پوچھا تو اس کے رونے میں مزید شدت آ گئی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کا سر تھپکنے لگا۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ ہونٹ بھینچے وہ بمشکل اپنے اندر کے بھونچال پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جوہی اس رشتے سے کیوں خوش نہیں تھی۔ اس نے اس کی وجہ نہیں بتائی تھی مگر علی جان گیا تھا اور اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنے دن اپنی ناکام محبت کا سوگ مناتے ہوئے وہ گھر سے یوں لاتعلق نہ رہتا تو اس وقت جوہی اس طرح اس کے سامنے نہ رو رہی ہوتی۔

"تم نے بابا کے پاس جا کر اس رشتے سے انکار کیا؟" علی نے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا۔

"نہیں" وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم نے تو کیا تھا نا انکار' کیا ہوا؟" اس نے تلخی سے پوچھا تو وہ نگاہیں چرا گیا۔

"میری بات الگ ہے جوہی! تم ان کی لاڈلی بیٹی ہو۔"

"پتا نہیں وہ لاڈ مجھے کبھی نظر کیوں نہیں آیا۔" وہ روتے روتے ہنس پڑی علی کے اس لطیفے پر۔

"ان کے لیے سب سے اہم ان کی زبان ہے جو وہ

دے چکے ہیں ان لوگوں کو۔ میں خوش نہیں ہوں۔ اس بات سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم ایک بار بابا سے بات کرو نا جوہی! خود جاؤ ان کے پاس۔ ہو سکتا ہے وہ مان جائیں۔" علی خوش فہم تھا نہ پاگل' پھر بھی جوہی کو اس حالت میں دیکھ کر ساری حقیقتیں پس پشت ڈال گیا۔

"نہیں۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ تو شاید میری بات سننے سے ہی انکار کر دیں' مانیں گے کیسے۔"

"میں کہہ رہا ہوں جوہی! میرے کہنے پہ چلی جاؤ۔" وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر کہنے لگا۔ "یہ ایک دو دن کی بات نہیں ہے تمہاری پوری زندگی کا سوال ہے۔ بعد میں کم از کم تمہیں یہ کسک تو نہ ہو کہ تم نے اپنی طرف سے پوری کوشش نہیں کی تھی۔"

علی کو نجانے کیوں لگا کہ جوہی کے رونے تڑپنے پر شاید بابا کا دل پگھل جائے۔

"اور۔۔۔ اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو۔۔۔؟" وہ آنکھوں میں ہزار اندیشے لیے اس سے پوچھ رہی تھی۔ علی چپ سا رہ گیا۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس سے کوئی جھوٹا وعدہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ جب وہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا تو جوہی کو کیسے کوئی جھوٹی امید دے دیتا۔ اس لیے اس نے وہاں سے اٹھ آنے میں ہی بہتری سمجھی اور جوہی جو امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر رو دی تھی۔

☼ ☼ ☼

خوشبو سے' ہواؤں سے بھی ملتے نہیں کچھ لوگ

موسم کی اداؤں سے بھی ملتے نہیں کچھ لوگ
مل جائیں تو جیون کو سجا دیتے ہیں لیکن
بچھڑیں تو دعاؤں سے بھی ملتے نہیں کچھ لوگ

وہ موبائل ہاتھ میں لیے گم صم بیٹھی تھی۔ اسود کا یہ ایس ایم ایس کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کیا وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا ہے حالانکہ ابھی [illegible] وہ خود بھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ بابا سے بات کے بعد بھی نہیں۔ جتنے بے [illegible] چہرے سے انہوں نے اس کی بات سنی تھی اور جتنی سرد مہری [illegible] انہوں نے اس کا انکار رد کیا تھا اور اب۔۔۔ جب میں محض چار دن رہ گئے تھے۔ اب بھی اس [illegible] امید کی انجانی سی ڈور نے باندھ رکھا تھا۔ [illegible] واپس آ چکی تھیں۔ صبح ہی ان سے ملنے گئی تھی تب ہی انہوں نے بتایا تھا کہ اسود بخار کی وجہ سے [illegible] پڑا ہے۔ اس کا دل تڑپ اٹھا تھا اسے دیکھنے [illegible] لیکن وہ جا نہیں پائی تھی۔ ابھی اسے ایک بہت ضروری کام کرنا تھا۔

اس نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑی چٹ پر ڈالی اور اس پر لکھا ہوا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ ہاتھ الگ کپکپا رہے تھے مگر جوہی جانتی تھی آج اگر وہ یہ کام نہیں کر پائی تو پھر کبھی نہیں کر پائے گی۔ بیل جا رہی تھی۔ جوہی سیل کان سے لگائے اضطراب کی حالت میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"ہیلو" تیسری بیل پر ایک بھاری گمبھیر آواز اس کے کان میں گونجی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل [illegible] سا گیا۔

"کون بات کر رہا ہے۔" نمبر اس کے لیے اجنبی تھا اس لیے وہ یہ سوال کر رہا تھا۔ جوہی نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر لفظ اس کے حلق میں ہی اٹک گئے۔

"آپ کون ہیں؟ فون کیا ہے تو اب بات کیجیے۔"

"آپ۔۔۔ آپ واثق بات کر رہے ہیں'" اس نے نجانے کتنی دقتوں سے یہ جملہ ادا کیا تھا اور دوسری طرف واثق چونک گیا۔ "جی۔۔۔ مگر آپ کون؟"

یہ جوہی کے لیے بہت کڑا وقت تھا۔ اس نے فون تو کر لیا تھا مگر اب بات کرنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھی۔ ایک پل کے لیے اس کا دل چاہا فون بند کر دے۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔" وہ الجھ کر بے چینی سے پوچھ رہا تھا۔

"میں۔۔۔ میں جوہی بات کر رہی ہوں۔ ثمن بھابھی کی نند۔" اس نے گھبراہٹ میں کچھ زیادہ ہی لمبا تعارف دے ڈالا۔ جس پر واثق نے دھیان بھی نہیں دیا تھا۔ بس اس کا نام سن کر ہی سرشار ہو اٹھا تھا۔

"آپ۔۔۔ آپ جوہی بات کر رہی ہیں'" اس کے لہجے میں مسرت انگیز حیرت تھی۔ واثق کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مغرور لڑکی اسے خود سے بھی فون کر سکتی ہے۔

"کیسی ہیں آپ؟" اس کی آواز سے چھلکتی وارفتگی جوہی کو عجیب سے احساس سے دوچار کر گئی۔ اچانک ہی اسے یاد آیا۔ بھابھی نے بتایا تھا۔ وہ تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟" مروت تو نبھانی تھی۔ "اپنی زندگی کے انمول ترین لمحے جیتے ہوئے کوئی کیسا ہو سکتا ہے۔" اپنے گمبھیر لہجے کو مزید پرفسوں بنا تا وہ اس کی دھڑکنیں بڑھا گیا۔ جوہی چند لمحے کچھ بول ہی نہ سکی۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے واثق سے بالکل بھی اس طرز عمل کی توقع نہیں تھی۔

"اصل میں۔۔۔ میرے کال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" اس مشکل ترین بات کی تمہید باندھتے ہوئے وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

"ضروری بات۔" واثق نے پرسوچ انداز میں دہرایا۔ "کیا یہ ضروری بات ڈسکس کرنے کے لیے ہم مل نہیں سکتے تھے جوہی!" اسے دوبارہ دیکھنے کی خواہش' اس کی آواز سنتے ہی واثق کو بے چین کر گئی تھی۔

"نہیں۔ میں آپ کا سامنا نہیں کر سکتی۔" جوہی کا دل بے اختیار کہہ اٹھا۔ صد شکر تھا اس کا یہ خیال لفظوں کے اظہار تک نہیں پہنچا تھا۔ "آپ۔۔۔ آپ ایسے ہی میری بات سن لیں نا پلیز۔" وہ ملتجی لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ "میری ریکوئسٹ سمجھ کر۔"

"میں آپ کی ہزار باتیں سننے کے لیے تیار ہوں مگر پلیز آپ اس طرح تو بات مت کیجیے۔" واثق کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ جوہی سے کیسے کہے کہ جو مقام وہ اسے اپنے دل میں دے چکا ہے اس کے بعد تو جوہی کی ہر بات اس کے لیے حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے اس کا عاجزی بھرا انداز اور التجائیہ لہجہ۔

"م۔۔۔ مجھے۔۔۔ سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔ میں کیسے کہوں۔" جذبات کی شدت سے اس کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ "اگر۔۔۔ اگر۔۔۔ آپ۔۔۔ میرے لیے۔۔۔ پلیز۔۔۔ پلیز۔۔۔ یہ رشتہ توڑ دیں۔"

کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس لمحے جوہی اگر یہ جان جاتی کہ وہ اس شخص کے لیے کیا ہے تو بنا اسے کسی تلخ سچائی سے روشناس کروائے فون بند کر دیتی۔

"یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہو گا۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ زندگی بھر آپ کی مقروض رہوں گی۔"

وہ کہہ رہی تھی اور دوسری طرف خاموشی تھی۔ بے حد خاموشی۔۔۔ کئی لمحے سرک گئے۔ جوہی جو اس کے جواب کے انتظار میں تھی گھبرا کر سیل کے اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ فون بند نہیں ہوا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ آپ سن رہے ہیں نا۔۔۔ دیکھیے میں جانتی ہوں۔ آپ کو حیرت ہو رہی ہو گی اور۔۔۔ شاید کچھ افسوس بھی۔۔۔ لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔۔۔ پلیز آپ۔۔۔ آپ کچھ تو بولیے۔"

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ آپ۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں۔" کچھ دیر بعد واثق بولا تو اسے خود اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔

"میں جو کہہ رہی ہوں سچ ہے۔۔۔ میں۔۔۔ اس رشتے سے خوش نہیں ہوں۔ اگر میرا ذرا سا بھی اختیار ہوتا تو میں کبھی اس طرح آپ کو فون کر کے انکار کرنے کے لیے نہ کہتی۔۔۔ لیکن یہاں کوئی میری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مجھ سے کسی نے میری مرضی تک نہیں پوچھی۔ میں۔۔۔ بے حد مجبور ہوں واثق۔۔۔ پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔" بات کرتے کرتے

وہ رو پڑی۔
واثق ساکت بیٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک اسے یہ سب خواب سا لگ رہا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا۔ کاش یہ سب واقعی ایک خواب ہو، آنکھ کھلے اور یہ بھیانک خواب ایک پل میں ٹوٹ جائے۔
"میں مانتی ہوں آپ کے لیے یہ کرنا بے حد مشکل ہو گا۔ آپ نہیں جانتے اس سے بڑی مشکل میں تو میں پھنسی ہوں۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں... یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔"
اس کی خوشیوں، اس کی امنگوں کا خون کر کے وہ اس کے انکار کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ قرار دے رہی تھی۔
"آپ کو شاید پتا نہیں جوہی! میں نے اس رشتے کے لیے گھر والوں کو کتنا فورس کیا ہے۔ آپ شاید... میرے لیے... میرے لیے یہ ناممکن ہے۔" اس کے دل کا سارا زور لہجے میں سمٹ آیا تھا۔
"پلیز... واثق پلیز۔" وہ رو رہی تھی۔ التجائیں کر رہی تھی۔ واثق کے لیے سانس لینا دوبھر ہونے لگا۔
"مجھ پر یہ احسان کر دیجیے... یہاں کوئی میری بات نہیں سن رہا۔ کوئی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ میں... تھک گئی ہوں اپنے گھر والوں کو یہ بتاتے بتاتے کہ میں... اس رشتے سے خوش نہیں ہوں۔ انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا... لیکن... لیکن... آپ کو تو فرق پڑتا ہے نا... آپ کیسے ایسی لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں جو... آپ سے پیار نہیں کرتی۔"
جوہی کی کیفیت ہذیانی سی ہو رہی تھی۔ اسے ہوش ہی نہیں تھا کہ اس کی یہ التجائیں اس کے مخاطب پر اثر کر بھی رہی ہیں یا نہیں... اور اگر اثر کر رہی ہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔
"آپ کو نہیں پتا جوہی... آپ کیا کھو رہی ہیں۔" باوجود کوشش کے وہ اپنے لہجے کی لرزش پر قابو نہ پا سکا اور جوہی کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔
آج وہ پہلی بار اس سے بات کر رہی تھی۔ اس سے پہلے اگر وہ واثق سے ملی بھی تھی تو اسے کچھ یاد نہیں اور اب خود پر منکشف ہوتے واثق کے احساسات نے اس کے دل کی عجیب سی حالت کر دی تھی۔ [illegible] اس کی صورت تک یاد نہیں تھی اور وہ اسے اپنی [illegible] بنائے بیٹھا تھا۔ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ [illegible] کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ "میں اپنے ایک کزن [illegible] کرتی ہوں اور... وہ مجھ سے... مجھے بالکل نہیں [illegible] بابا اتنی جلدی میرا رشتہ طے کر دیں گے اور مجھ سے پوچھیں گے بھی نہیں۔ میں... میں... اس سے [illegible] پیار کرتی ہوں واثق! آپ کو نہیں پتا وہ میرے لیے [illegible] ہے۔" اس کی آواز میں ایک بار پھر آنسوؤں کی [illegible] گھلنے لگی۔ واثق کے دل میں پھانبڑ جل اٹھے۔
"تم میرے لیے کیا ہو جوہی... کاش یہ میں تمہیں سمجھا سکتا۔"
آپ کو... آپ کو اس محبت کا واسطہ مجھے میری محبت سے دور مت کیجیے۔ مجھے میری زندگی سے [illegible] مت کیجیے۔ میں آپ سے بھیک مانگتی ہوں اپنی محبت کی، اپنی خوشیوں کی... مجھے مایوس مت کیجیے۔"
واثق کے اردگرد اندھیرا چھاتا جا رہا تھا اور [illegible] اندھیرے میں اسے اپنا ہر احساس ڈوبتا محسوس ہوا۔
"آپ... آپ مجھ پر یہ احسان کریں گے نا؟" [illegible] کی آس و نراس میں ڈوبی آواز اس کے کان میں گونجی۔
"ہاں۔" واثق نے ایک گہری سانس لے کر [illegible] ڈوبتے دل کو سہارا دینے کی کوشش کی۔
"تم نے مجھے میری محبت کا واسطہ دیا [illegible] جوہی... اور میرے لیے میری محبت میری زندگی سے بڑھ کر ہے۔"

☼ ☼ ☼
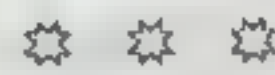
وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ ان چند [illegible] دنوں میں وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ زرد رنگت، ستا ہوا چہرہ، سرخ ہوتی آنکھیں... ایک لمحے کے لیے جوہی کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"کیسے ہو؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔
"تمہیں کیسا لگ رہا ہوں۔" اس کی نظریں سامنے [illegible] پینٹنگ پر جمی تھیں۔
"کیا تمہیں نہیں پتا کہ تم مجھے کیسے لگتے ہو۔" اس نے بات کو دوسرا رخ دے دیا۔ ہلکی سی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ۔ لیکن وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اس [illegible] دیکھنے سے احتراز کرتے ہوئے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"کیا بات ہے اسود۔ ناراض ہو مجھ سے؟" جوہی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔
"تو کیا تمہاری منگنی کی خوشی میں بھنگڑے ڈالوں۔" اسود تو جیسے بھرا بیٹھا تھا۔ تین دن بعد اس کی منگنی تھی اور وہ پھر آگئی تھی اس کے ضبط کا امتحان لینے۔
"چلی جاؤ جوہی... پلیز یہاں سے چلی جاؤ۔" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ "تمہیں میرے حال پر ترس نہیں آتا۔ کیوں آگئی ہو میرا جینا حرام کرنے۔ اتنی مشکل سے اپنے دل کو سمجھایا ہے۔ پلیز چلی جاؤ۔" متاسف سے کہتے کہتے اس کا لہجہ بے بسی میں ڈھل گیا تھا۔
"مجھے اس راہ پر لانے والے تم تھے، اس طرح ہمت ہار کے ہی بیٹھنا تھا تو کیوں کی مجھ سے محبت۔ خود اندر سے اتنے ہی کمزور تھے تو اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی کیوں گھسیٹا اس آگ میں۔ نہ جیتی ہوں نہ مرتی ہوں۔ صرف تمہاری وجہ سے آج کل میں کس ذہنی اذیت کا شکار ہوں۔ اس کا تمہیں کوئی احساس نہیں ہے اسود! تم صرف اپنا دکھڑا لے کر بیٹھے ہو۔" وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ اسود کو یکایک پشیمانی نے آگھیرا۔
"آئم سوری۔" اس نے جوہی کے ہاتھ تھامنے چاہے مگر اس نے فوراً اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔ اسود نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ سرخ رنگ کے لباس میں اس کا خفا خفا سا چہرہ اور رونے کی وجہ سے سرخ ہوتی اس کی تیکھی سی ناک، اسود کے لیے نگاہیں ہٹانا مشکل ہو گئی تھیں۔
"اب مجھے دیکھنا بند کرو۔ میں تم سے کچھ کہنے آئی تھی۔" اس نے اپنے ریشمی آنچل سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ مگر اسود کی نحوست ابھی تک نہیں ٹوٹی تھی۔
"میں نے کل رات واثق کو فون کیا تھا۔"
"کون واثق؟" اسود چونک گیا۔
"وہی... بھابھی کا کزن۔" ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے وہ مضطرب لہجے میں بولی۔ اسود کے اعصاب ایک دم سے الرٹ ہو گئے۔
"کیوں... کس لیے؟"
"تمہیں کیا لگتا ہے میں نے اسے فون کیوں کیا ہو گا۔" جوہی کو حیرت ہوئی اس کے انداز پر۔ "میں نے اس سے کہا وہ میری مدد کرے۔"
"تو کیا وہ مان گیا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔
"ہاں۔" جوہی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ یہ رشتہ توڑ دے گا۔"
"جوہی! تم پاگل ہو بالکل پاگل۔" اسود یکایک بے چین ہو گیا۔ "اس نے تم سے یہ کہہ دیا تو وہ ایسا کرے گا بھی۔ اس بات کی گارنٹی ہے؟ اس نے تمہیں صرف ٹالا ہے جوہی! سوچو، وہ سارا الزام اپنے سر کیوں لے گا... یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ صرف تم دونوں کے بیچ کی بات نہیں ہے، دو گھروں کا معاملہ ہے۔ اس کے گھر والے کیا کہیں گے۔ تمہارے گھر والوں پر کیا گزرے گی۔ کتنا بڑا ہنگامہ ہو گا اور وہ یہ سب سہے گا اپنی ذات پر۔ صرف تمہارے لیے کیوں...؟"
اسود نے سوال اٹھایا۔ وہ اس کا جواب جانتی تھی مگر کچھ کہا نہیں، نگاہیں چرا گئی۔
"مجھے یہ سب نہیں پتا اسود! مجھے بس اس کی بات پر یقین ہے۔ میری کل رات اس سے پہلی بار بات ہوئی۔ مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کس قسم کا انسان ہے۔ وہ... وہ بہت ہی عجیب شخص ہے اسود! میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ وہ کیسا ہے۔" کھوئے کھوئے لہجے میں کہتے اس کی نظریں خود پر محسوس کرتے ہی اس نے سر جھٹکا۔
"اگر تمہارا یہ یقین جھوٹا ثابت ہوا تو...؟" اس نے پوچھا تھا۔
"تو... تو کیا... کچھ بھی کروں گی لیکن... یہ شادی

ہرگز نہیں کرسکتی۔ تمہاری محبت سے دستبرداری کسی صورت قابل قبول نہیں ہے میرے لیے۔" اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا اس کے ارادوں کی طرح۔

☼ ☼ ☼

واثق نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔ نجانے اس نے اپنے گھر والوں کو کیا کہا تھا لیکن اس کے بعد جوہی کے گھر میں جو طوفان اٹھا، وہ اتنا معمولی بھی نہیں تھا۔ منگنی سے چند دن پہلے اگر کسی لڑکی کا رشتہ ٹوٹ جائے تو یہ کچھ زیادہ خوش گوار صورت حال نہیں ہوتی کسی بھی والدین کے لیے۔ خصوصاً" جوہی کے بابا جو ہمیشہ اپنے کیے گئے فیصلوں کو صحیح مانتے تھے اور انہیں کبھی بھی اس پر پچھتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی لیکن آج واثق نے انہیں اپنے فیصلے پر پچھتانے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ تو ابھی تک حیران سے تھے۔ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ اتنی جانچ پرکھ کے بعد بھی معاملہ اس حد تک بگڑ جائے گا، یہ ان کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ جذبات کی کسوٹی پر کسی کو پرکھنے کے قائل نہ تھے، اس لیے غلطیاں بہت کم کرتے تھے۔ ان کی حقیقت پسند سوچ، ان کی مضبوط قوت ارادی انہیں کوئی غلطی کرنے ہی نہیں دیتی تھی۔ لیکن آج پہلی بار وہ اس سارے معاملے میں اپنی غلطی ڈھونڈ رہے تھے۔ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے لڑکے کا انتخاب کرتے وقت ان کی نظر کہاں چوکی۔۔۔ انہوں نے کہاں دھوکا کھایا۔

ثمن بھابھی کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم تھی۔ کیونکہ یہ جو کچھ ہوا تھا، ایک طرح سے ان کے میکے والوں کی وجہ سے ہی ہوا تھا اور زوار بھائی ان کی یہ خطا معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی اکلوتی بہن کی زندگی کو کوئی اس طرح تماشا بنائے، یہ وہ کیسے برداشت کرسکتے تھے۔ ان کے تمام تر غصے اور غیظ و غضب کا شکار ثمن بھابھی تھیں۔ کیونکہ یہ رشتہ بنانے کی سب سے زیادہ کوشش بھی انہوں نے ہی کی تھی۔ مگر یہ کوئی ان سے پوچھتا کہ انہوں نے یہ کوشش کیوں کی تھی۔ جس طرح واثق نے ان کی منتیں کیں، انہیں اپنی قسم دی، انہیں یہ کام کرنے کی ہامی بھرنی ہی پڑی کہ وہ انہیں بالکل اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ واثق نجانے کس جادو کے زیر اثر منگنی سے محض چند دن پہلے اپنا رشتہ توڑ دے گا، ساتھ ان کی شادی شدہ زندگی کی بنیاد بھی ہلا کر رکھ دے گا۔

وہ تو اس بات کی وجہ جاننے کے لیے پھپھو کے ہاں بھی جانا چاہ رہی تھیں لیکن یہ سنتے ہی زوار بھائی ان پر اتنا گرجے کہ ثمن بھابھی دوبارہ وہاں جانے کا ذکر تک اپنی زبان پر نہ لا سکیں۔

اسی دن شام کو تایا جی آئے تھے تائی کے ساتھ۔

"یہ جو کچھ بھی ہوا اس پر افسوس کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن پھر بھی ایک بات میں تم سے ضرور کہنا چاہوں گا احسان! کہ تم خود کو عقل کل سمجھتے ہو۔ سارے فیصلے خود کرتے ہو اور کسی سے مشورہ لینا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ اس دن جب تم میرے پاس آئے تھے اور واثق کے بارے میں میری رائے لی تھی۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ تم فیصلہ کرچکے ہو۔ مجھ سے مشورہ تو محض اخلاقی طور پر لیا تھا کہ کل کو بڑا بھائی ناراض نہ ہو کہ بیٹی دے دی اور مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ اس لیے میں نے بھی مزید تم سے کچھ نہیں کہا، حالانکہ میں شروع ہی سے جوہی کو اپنی بہو بنانے کا سوچے بیٹھا تھا۔"

ان کی اس بات پر کمرے میں موجود تمام نفوس چونک پڑے تھے۔

"خیر تب نہ سہی اب سہی۔ اچھی طرح سوچ لو پھر جواب دینا۔ انکار بھی کروگے تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ جوہی مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہے اور ہمیشہ رہے گی۔" تایا جی اپنی بات ختم کرچکے تھے لیکن بابا خاموش تھے۔ زوار بھائی نے بے چین ہوکر پہلو بدلا۔

"یہ بابا خاموش کیوں ہیں، تایا جی خود جوہی کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔ بابا کچھ کہتے کیوں نہیں۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خود ہی انہیں مثبت جواب دے دیں۔

"اس میں سوچنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے بھائی جان!" بابا نے بالآخر لب کھولے تھے مگر ان کے لہجے میں وہ مضبوطی وہ گونج مفقود تھی جو ان کے لب و لہجے کا خاصا ہوا کرتی تھی۔

"آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔ آپ کی خواہش میرے لیے مقدم ہے۔ جوہی آپ ہی کی بیٹی ہے آپ جب جیسے چاہیں اسے یہاں سے لے جاسکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں کہہ کر جوہی کو کلی طور پر انہیں سونپ دیا تھا۔ آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ بیٹی کا باپ ہونا بھی کسی بڑی آزمائش سے کم نہیں ہوتا۔

باہر دروازے کی اوٹ میں کھڑی جوہی کو عجیب سے ملال نے آگھیرا تھا۔

"آئم سوری بابا جان! میں نے کبھی نہیں چاہا کہ میں آپ کو اس طرح دل گرفتہ اور ہارا ہوا دیکھوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ یہ میری زندگی کا سوال تھا۔۔۔ اور اپنی زندگی کے لیے اتنی سی خود غرضی دکھانا تو میرا حق بنتا ہے نا۔"

☼ ☼ ☼

"اب تو تم خوش ہونا جوہی! تمہاری دعائیں جو قبول ہوگئیں۔ واثق نے خود ہی یہ رشتہ توڑ دیا۔ اسود کے ساتھ بات پکی ہوجانے پر تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟"

علی اس کے سامنے بیٹھا پوچھ رہا تھا۔ آخری بات پر اس کے لہجے میں شرارت در آئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ویسے مجھے سمجھ میں نہیں آرہا، واثق نے انکار کیوں کیا۔ اسے یہ رشتہ کرنا ہی نہیں تھا تو پہلے کہہ دیتا۔" علی الجھ کر کہہ رہا تھا۔ "یہ تو اچھا ہی ہوا کہ تم خوش نہیں تھیں۔ ورنہ اس طرح تمہیں ریجیکٹ کرنے کی اس حرکت پہ تو میں اسے شوٹ ہی کردیتا۔" علی کے لہجے میں ویسے ہی غصہ اور برہمی تھی جو ایسی صورت حال میں کسی بھی فکر مند بھائی کے انداز میں ہوسکتی تھی۔ جوہی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

"غلطی اس کی نہیں تھی علی! اسے میں نے کہا تھا انکار کرنے کے لیے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"کیا۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" علی اچھل ہی پڑا۔

"ہاں! یہاں کسی نے میرے انکار کو اہمیت نہیں دی تو مجبوراً" مجھے اس سے مدد مانگنی پڑی۔"

"اور اس نے تمہاری مدد کر بھی دی؟" وہ حیرت سے دریافت کر رہا تھا۔ "کیا وہ پاگل تھا؟"

"شاید پاگل ہی تھا۔" اس کے احساسات پھر سے بکھرنے لگے۔

"خیر! چھوڑو۔ شاپنگ پر تم لے کے جاؤگے ہمیں۔" اس نے ایک دم بات بدلی۔

"شاپنگ۔۔۔ کیسی شاپنگ؟" وہ حیران ہوکر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہاری شادی کی شاپنگ۔۔۔ یاد ہے یا یہ بھی بھول گئے؟" جوہی نے تیکھے انداز میں اسے یاد دلایا۔ "ہفتے سے بھی کم دن بچے ہیں۔ دو تین دن تو اسی ہنگامے میں نکل گئے ورنہ کافی خریداری ہوجاتی اب تک۔ بابا نے تو زیادہ شو شا کرنے سے منع کیا ہے لیکن ہمیں تو اپنی تیاری کرنی ہے نا۔"

اپنی دھن میں مگن بولتے ہوئے اس نے علی کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں پر غور ہی نہیں کیا۔ اپنی خوشی پالی تھی اس نے۔ وقتی طور پر علی کے دکھ کو بھول ہی گئی۔ پھر اس کی خاموشی نے ہی جوہی کو ٹھٹکایا۔

"کیا ہوا علی! تم ذہنی طور پر تیار تو ہونا اس شادی کے لیے۔" وہ اس کے پاس آکر پوچھنے لگی۔

"نہیں! بالکل نہیں۔ اس شادی کے لیے تو کیا میں زندگی میں کبھی بھی شادی کے لیے اپنے ذہن و دل کو تیار نہیں کرسکتا۔" علی کا انداز بہت عجیب تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پھر تم نے بابا کے سامنے کیوں اپنی رضامندی ظاہر کی؟"

"انہوں نے میری رضا پوچھی کب تھی۔ انہوں نے صرف اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ اب وہ اپنے دل کی کریں اور میں... اپنے دل کی مانوں گا۔"

سپاٹ لہجے میں کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج علی کی شادی کا دن تھا۔ کافی افراتفری کا سا ماحول تھا۔ جوہی اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔ عجیب سی بے چینی نے گھیر رکھا تھا اسے۔ خوشی بھی تھی ذرا ذرا سا ملال بھی تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر باہر آئی تو پہلا ٹاکرا ہی اسود سے ہو گیا۔ وہ عجلت میں لگ رہا تھا مگر اس پر نظر پڑتے ہی رک گیا۔ نیوی بلیو کلر کے کرتا شلوار میں وہ کافی خوب صورت لگ رہا تھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟"

اس کی وارفتہ نگاہیں خود پر محسوس کر کے بھی وہ اس کے منہ سے اپنی تعریف سننا چاہ رہی تھی۔ اسود کی آنکھوں میں شوخیاں مچل گئیں اور ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"میری آنکھوں میں دیکھ لو۔ پتا چل جائے گا۔" دھیرے سے کہتا وہ اس کے قریب ہوا۔ جوہی گھبرا کر بے اختیار پیچھے ہٹی۔

"سوری! مجھے آنکھوں کی زبان پڑھنی نہیں آتی۔"

"صحیح کہا' ورنہ مجھے تمہارے پیچھے اتنا خوار کیوں ہونا پڑتا۔" اسود نے ایک آہ بھری تھی۔ جوہی نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔

"کیا کہا تم نے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔" اس نے پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔

"تھوڑا سا انتظار کرو' سب سمجھا دوں گا۔" الفاظ سادہ تھے مگر اس کے انداز میں جو معنی خیزی تھی' جوہی کا چہرہ تپ گیا۔ جبکہ وہ دلچسپی سے اس کے گلابی روپ کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "پتا ہے جوہی مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا۔ تمہاری یہ سج دھج دیکھ کر میرا یہ دل جو پہلے ہی کچھ کم پاگل نہیں تھا اب مزید مچل گیا ہے اور ... سے ضد کرنے لگا ہے کہ ایک پل بھی ضائع کیے بغیر میں تمہیں اٹھا لے جاؤں۔ ویسے بھی تم تو میری ... چکی ہو نا' پھر یہ اتنے فاصلے کیوں؟" دہکتی نظریں ... کے چہرے پر جمائے اسود کے بوجھل لہجے میں بے ... آن سمائی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" جوہی نے ... سائیڈ سے نکلنا چاہا مگر اسود نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔

"بتاؤ نا جوہی! کروں ابو سے بات؟"

"اسود!" جوہی نے زچ ہو کر اسے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ اسود کچھ کہتا سامنے سے ثمن بھابھی آتی دکھائی دیں۔ وہ بادل نخواستہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹا۔ جوہی نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی۔

"جوہی! سنو ذرا میرا ایک کام کر دینا۔" وہ آتے ساتھ ہی بولیں۔

"اوہو بھابھی! ابھی تو تیار ہوئی ہوں میں۔" اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"کچن میں گھسنے کا نہیں کہہ رہی ہوں۔" انہیں غصہ آ گیا۔ "اوپر اپنے کمرے میں جانے کا کہہ رہی ہوں۔ مجھ سے دوبارہ سیڑھیاں نہیں چڑھی جائیں گی۔"

"اچھا۔ کیا کرنا ہے۔" اس نے بے زاری سے دریافت کیا تھا۔

"اوپر میرے کمرے کی الماری میں نیلے رنگ کا شاپر ہو گا۔ وہ لے آؤ اور امی بھی اوپر ہی ہیں۔ ان سے کہنا' بابا بارات لے کر جلدی نکلنے کا کہہ رہے ہیں اس لیے جلدی نیچے آ جائیں۔" وہ ان کی بات سن کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ پیچھے بھابھی اسود سے ... کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

جوہی اوپر آئی ہی تھی کہ سحر کا فون آ گیا۔ وہ امی کو بھابھی کا پیغام پہنچوا کے اور اپنی ایک کزن کے ہاتھ مطلوبہ شاپر نیچے بھیج کر سحر سے بات کرنے میں مصروف ہو گئی۔ وہ شادی میں نہیں آ پائی تھی کیونکہ ان دنوں وہ اپنے شوہر کے ساتھ دوسرے شہر میں مقیم تھی۔ سحر نے کافی لمبی بات کی۔ جوہی کو دیر ہو جانے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ نیچے اترنے کے ارادے سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ اچانک اسے علی کا کمرا دیکھنے کا خیال آیا۔ جس کی ڈیکوریشن ہو چکی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک مسحور کن مہک نے اس کی سانسوں کو معطر کر دیا۔ بلیو کلر کی دھیمی دھیمی روشنی میں سرخ و سفید گلابوں سے سجی سیج دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار تعریف نکلی تھی۔ وہ اسود کو داد دیے بنا نہ رہ سکی۔

"سمجھ میں نہیں آتا اسود! تم کیوں مجھے اتنے اچھے لگنے لگے ہو' تمہارے بنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہر سوچ تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہوتی ہے۔ ہر چہرے میں تمہارا چہرہ نظر آتا ہے۔"

ایک طرف رکھے تھال میں سے گلاب کی پتیاں اٹھا کر بیڈ پر بکھیرتے وہ اسود کو سوچنے لگی تھی اور تب ہی اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے چونک کر سیل کے اسکرین پر نگاہ کی تو بھابھی کی مس کال تھی۔ اس نے گھبرا کر کال منقطع کی اور کمرے کو لاک لگاتے ہوئے تیزی سے نیچے اتر آئی تھی۔

"جوہی۔ تم نے علی کو دیکھا۔ اس نے تمہیں کچھ بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟" ثمن بھابھی اسے دیکھتے ہی اس کے قریب آئی تھیں اور کافی پریشان لگ رہی تھیں۔ وہ حیران ہو گئی۔

"نہیں تو۔ کیوں۔ کیا ہوا؟"

"بارات لے جانے کا وقت ہو رہا ہے اور علی کا کچھ پتا نہیں ہے۔ نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ ہم تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئے۔"

انہوں نے پریشانی سے بتایا۔ وہ فوراً "بڑے کمرے" کی طرف آئی' جہاں گھر کے سب ہی مرد حضرات موجود تھے۔ نہ جانے کیوں' اچانک ہی کسی انہونی کا احساس ہونے لگا تھا اسے اور دل کی رفتار بڑھ گئی تھی۔

"جانے کس گناہ کی سزا میں ایسی نالائق' ناخلف اولاد ملی ہے۔ احساس ذمہ داری تو نام کو نہیں ہے۔ اپنی شادی کے دن بھی اگر کسی کو آوارہ گردیوں سے فرصت نہ ملے۔ ایسے انسان سے اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔" بابا کافی غصے میں تھے۔

"وقار! ایک بار پھر فون ملاؤ اسے۔" تایا جی' وقار بھائی سے مخاطب ہوئے۔

"ملا رہا ہوں تایا جی! آف جا رہا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"اس کے دوستوں سے پتا کیا؟" چھوٹے چچا پوچھ رہے تھے۔

"ہاں مگر وہ لاعلم ہیں۔"

"کیا بارات علی کے بغیر نہیں جا سکتی۔" زوار بھائی بہت جھلائے ہوئے تھے۔

"جا سکتی ہے لیکن رفیق انکل کو کیا جواب دیں گے اور نکاح کے وقت کیا کریں گے۔"

وقار بھائی نے سوال اٹھایا تو وہ مزید کچھ کہہ ہی نہ سکے۔ عجیب سی صورت حال تھی۔ ایک خدشہ جو سب کے ذہنوں میں سرسرا رہا تھا لیکن زبان پر لانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

"وقت گزرتا جا رہا ہے۔ وہ لوگ بارات کے انتظار میں ہوں گے۔" تایا کے لہجے میں تشویش تھی۔

"میرا خیال ہے علی گھر چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اب ہمیں مزید بے وقوفوں کی طرح اس کا انتظار کرنے کے بجائے رفیق انکل کے سامنے یہ صورت حال رکھ دینی چاہیے۔" زوار بھائی نے گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے ان سب کی سماعتوں پر بجلی گرائی۔

"یہ... یہ کیا کہہ رہے ہو زوار!" تایا جی کا لہجہ لڑکھڑا گیا تھا۔

"میں تو اسی دن کھٹک گیا تھا' جب اس نے بابا کے پوچھنے پر بنا جھجکے اپنی رضامندی دی تھی۔" وقار بھائی زیر لب بڑبڑائے مگر کسی اور کے کچھ کہنے یا پوچھنے سے پہلے ہی زوار بھائی کا سیل بجا اور سب ہی بے چینی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے بنا وقت ضائع کیے کال ریسیو کر کے سیل کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو۔ علی۔ کہاں ہو تم؟" ان کے یہ کہتے ہی

سب کے چہروں پر اطمینان اور اضطراب کی ملی جلی لہر دوڑ گئی تھی۔

"یہاں ہم تمہیں ڈھونڈ کے پاگل ہو گئے ہیں۔" دوسری طرف سے علی نے شاید کچھ کہا تھا۔ انہوں نے ہونٹ بھینچے سیل کا اسپیکر آن کر دیا اور دوسرے پل علی کی آواز کمرے میں گونجنے لگی تھی۔

"آپ سب کو میرے بارے میں پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس وقت جہاں ہوں بہت خوش ہوں۔ میرا اب گھر آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

وہ رُکے بنا سپاٹ لہجے میں بولتا جا رہا تھا اور کمرے میں موجود تمام افراد کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ بابا کی رنگت سفید پڑ گئی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے وہیں صوفے پر بیٹھتے چلے گئے۔ وقار بھائی تیزی سے ان کے پاس آئے تھے اور جوہی، جو دروازے کے ساتھ ہی پتھر بنی کھڑی تھی۔ یکایک ہی اس کے اندر طوفان اٹھنے لگے تھے۔ علی اب بھی کچھ کہہ رہا تھا۔

"یہ شادی صرف اور صرف بابا کی ضد سے ہو رہی ہے۔ انہیں میری خوشی ناخوشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے میرا بھی اس شادی سے کوئی لینا دینا نہیں۔ وہ میرے باپ ہیں۔ میری غیر موجودگی میں بھی میرا نکاح کروا سکتے ہیں۔ انہیں کب اور کہاں اپنے باپ ہونے کا فائدہ اٹھانا ہے۔ یہ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ مجھے صرف ایک بات کا افسوس ہے کہ میری وجہ سے تایا جی کے دوست کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ میں چاہتا تو پہلے ہی اس شادی سے انکار کر دیتا۔ گھر چھوڑ دیتا۔ لیکن میں ایسا کیوں کرتا۔ بابا نے مجھ سے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین لی اور میں نے انہیں اسی بات کا احساس دلانے کے لیے ان سے ان کی سب سے بڑی دولت چھین لی۔ ان کا مان، ان کا وقار اور ان کا غرور۔"

علی فون بند کر چکا تھا مگر کمرے میں موت کی سی خاموشی پھیل چکی تھی اور بابا اس وقت کسی لٹے ہوئے جواری کی طرح بیٹھے تھے۔ جیسے اپنی زندگی کی تمام پونجی ہار چکے ہوں۔ یہ ان کو ان کی پوری زندگی میں پڑنے والی دوسری بڑی چوٹ تھی۔ ان کی اپنی اولاد کے ہاتھوں پڑنے والا طمانچہ۔ علی نے غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی ان کا مان، ان کا غرور خاک میں مل چکا تھا۔

تایا جی رفیق انکل کو فون کرنے کے لیے اٹھ گئے۔ انہیں بھی اس بات کی اطلاع دینی تھی، جو بے چارے بارات کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا علی! یہ تم نے بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔" اس کے خالی کمرے میں آتے ہی اس کے آنسو بے قابو ہو گئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا بھائی اس طرح کسی کی زندگی کے ساتھ کھیل سکتا ہے۔

"تمہیں تمہاری محبت نہیں ملی یہ تمہارا نصیب تھا۔ تم نے اس کا سارا دوش بابا کو دے کر انہیں پوری دنیا کے سامنے ذلیل کر کے رکھ دیا۔ تمہارے دل میں ان کے لیے اتنی شدید نفرت کب آئی علی! کہ تم اس سے اتنا بھیانک انتقام لینے پر اتر آئے۔ تم تو ہر ایک کے مان اور وقار کا خیال رکھنے والے انسان تھے۔ تم اس طرح کسی کی عزت کی دھجیاں کیسے اڑا سکتے ہو۔ اتنے خود غرض، اتنے کٹھور کیسے ہو سکتے ہو علی...!"

دکھ، تاسف اور بے یقینی کے زیر اثر وہ گھٹنوں میں سر دیے سسک رہی تھی اور اسی پل اسے ایک احساس ہوا۔ ایک عجیب سا ادراک، جو کسی عذاب کی طرح اس پر نازل ہوا تھا۔ اپنے بھیگے رخسار صاف کرتے اس نے اپنے اندر کی آواز پر کان دھرے، جو اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔

"علی نے جو کچھ بھی کیا وہ اتنا انوکھا تو نہیں ہے۔ تم نے بھی تو وہی کچھ کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم نے بندوق چلانے کے لیے واثق کا کندھا استعمال کیا اور علی کسی کی آڑ لیے بغیر وار کر گیا۔ علی خود غرض ہے تو تم کیا ہو؟ تم نے ایک بار بھی واثق کے بارے میں نہیں سوچا۔ تم نے ایک بار بھی اپنے بابا کے بارے میں نہیں سوچا۔ علی کی محبت اس کے نصیب میں نہیں تھی تو تمہارے باپ نے بھی تو تمہارا نصیب واثق کے ساتھ جوڑنا چاہا تھا۔ تم صابر کیوں نہ ہوئیں اپنی قسمت پر۔ تمہیں بھی تو صرف اپنی خوشیوں سے مطلب تھا۔ علی تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ تم بھی یہی کرنے والی تھیں۔ اگر واثق تمہارا ساتھ نہ دیتا۔ تم بھی تو اپنے بابا کو رسوا کرنے والی تھیں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ خود احتسابی اتنی آسان نہیں ہوتی۔ خصوصاً جوہی جیسی لڑکی کے لیے، جو ہمیشہ خود کو صحیح مانتی تھی۔ جسے اپنا ہر عمل درست لگا کرتا تھا۔ خود ترسی اور خود ساختہ مظلومیت کا شکار۔

اسے نہ جانے یہاں بیٹھے بیٹھے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ ارد گرد بالکل خاموشی چھا چکی تھی۔ سارے لوگ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ اپنی سوچوں میں گم اسے علم ہی نہ ہو سکا۔

"ارے جوہی! تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔" ردا بھابھی تیز تیز بولتے ہوئے آئیں۔ اس نے جلدی سے خود کو کمپوز کر کے انہیں دیکھا اور تب ہی اسے گھر میں پھیلی خاموشی کا احساس ہوا تھا۔

"یہ ہوا... سب لوگ کہاں ہیں۔ اتنا سناٹا کیوں ہے؟" بھابھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ "بارات لے کر چلے گئے۔" انہوں نے رُخ پھیر کر جواب دیا تھا۔

"بارات لے کر چلے گئے۔" اس نے بھابھی کے تاثرات پر غور نہیں کیا۔ ان کے الفاظ پر الجھ گئی۔

"کس کی بارات؟"

"اسود کی بارات۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

وہ پلک جھپکائے بنا ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ "پلیز بھابھی... میرے ساتھ... ایسا جان لیوا مذاق مت کیجیے۔" اس کا لہجہ بکھرا تھا۔ وہ ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"یہ مذاق نہیں ہے جوہی! حقیقت ہے۔ رفیق انکل کی عزت پر بن آئی تھی۔ تایا جی کو یہ فوری فیصلہ کرنا ہی تھا۔" وہ نگاہیں چرائے بتا رہی تھیں اور ادھر... جوہی کا دل تھم چکا تھا شاید۔ شاید وہ بھی مر چکی تھی۔ لیکن نہیں... اس کی سانسیں تو چل رہی تھیں اور اسے درد بھی ہو رہا تھا بے تحاشا درد۔ رگیں توڑ دینے والا۔ جان نکال دینے والا۔

"وہ تایا جی کے دوست تھے۔ ان کی عزت بچانے کے لیے آج اگر تایا جی یہ قدم نہ اٹھاتے تو ان کی بیٹی شاید عمر بھر کے لیے ان کی دہلیز پر بیٹھی رہ جاتی۔ تایا جی نے بابا سے بھی پوچھا تھا، وہ اعتراض کیسے کر سکتے تھے۔ اب اگر وہ صرف اپنی بیٹی کے بارے میں سوچتے تو خود غرض کہلائے جاتے نا اور پھر رفیق انکل کے ساتھ آج جو کچھ ہوا، وہ ہماری ہی وجہ سے تو ہوا ہے۔ علی نے بابا کو نیچا دکھانے کے لیے ان بے چاروں کو بھی کہیں کا نہیں چھوڑا۔"

بھابھی تاسف بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ اس کے خطرناک حد تک سفید پڑتے چہرے پر نظر پڑی تو ایک دم گھبرا کر اس کے پاس آئیں۔

"جوہی... جوہی... تم ٹھیک تو ہو نا؟" ایک ہاتھ سے اس کا یخ ٹھنڈا ہاتھ تھامے وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"میں... میں ٹھیک ہوں۔" ان کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے اس کے منہ سے بمشکل آواز نکلی تھی۔ "آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں پلیز..."

اس کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔

اس کی محبت اس سے چھن گئی تھی اور یہ ایک ایسا دکھ تھا جس کا ماتم اس نے عمر بھر کرنا تھا۔

اس نے کتنی کوشش کی تھی اس نقصان سے بچنے کی۔ اپنے بکھرتے جذبوں، ٹوٹتے خوابوں کو سمیٹنے کی۔ اپنی عزت نفس، اپنا غرور داؤ پر لگا کر اپنی محبت کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہوا کیا۔ تقدیر نے ایک بار پھر اپنا اٹل فیصلہ اسے سنا دیا تھا۔ وہ اسود کے لیے نہیں بنی تھی اور نہ ہی اسود کے نصیب میں اس کا ساتھ لکھا تھا۔

وہ کب سے بے آواز سسک رہی تھی کہ علی کا فون

آ گیا۔

اس کی پچھتاووں میں گھری آواز سن کر اسے زندگی اور بھی کٹھن لگنے لگی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ بابا نے جو میرے ساتھ کیا اس کے لیے میں انہیں کبھی معاف نہیں کرپاؤں گا۔ لیکن۔۔۔ انجانے میں میں نے تمہارے ساتھ جو کردیا اس کے لیے تو۔۔۔ اس کے لیے تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کرپاؤں گا۔ تم۔۔۔ مجھے معاف کردینا جوہی۔۔۔ تم اپنے بھائی کو معاف کردینا۔"

اس کے ہاتھ سے سیل چھوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆ ☆ ☆
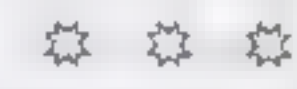
سب واپس آچکے تھے۔ تایا جی اپنی بہو لیے اپنے گھر چلے گئے۔ زوار بھائی' وقار بھائی دونوں بھابھیاں بھی خاموشی سے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ سب کے دل بوجھل ہورہے تھے۔ ایک دوسرے سے نگاہیں چراتا ہر شخص جیسے خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔

امی اسے سیڑھیوں پر اجڑی حالت میں بیٹھے دیکھ کر دہل گئیں۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر وہیں بیٹھتی چلی گئیں اور بابا جو امی کے ساتھ ہی لاؤنج میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اس کی ویران حالت پر نہ آگے بڑھ سکے نہ واپس جاسکے۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ جوہی بھی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بابا کے لیے کوئی شکوہ نہیں تھا' کوئی شکایت نہیں تھی' صرف بے بسی تھی اپنی قسمت پر۔

ایک دم ساکت کھڑے بابا لڑکھڑا سے گئے جوہی چونک اٹھی مگر جب تک سنبھل کر ان کے پاس پہنچتی' وہ سینٹر ٹیبل کے پاس گر پڑے۔ وہ تیزی سے ان کے پاس لپکی۔

"بابا۔۔۔"

"میرے۔۔۔ میرے تکبر کی سزا ملی ہے مجھے۔" ان کے ہونٹ کپکپارہے تھے۔ جوہی کچھ نہیں بول سکی۔

"ساری عمر سر اٹھا کر جینے والا۔۔۔ آج منہ کے بل پڑا ہے صرف۔۔۔ صرف اپنے فیصلوں کی سختی کی وجہ سے میں اپنے پورے قد سے گر گیا آج۔ اپنے بچوں کی خوشیاں اپنے ہاتھوں سے دوسروں کی جھولی میں ڈال دیں۔ اپنے بچوں کو ہمیشہ اپنے تابع رکھنے کی خواہش نے دیکھو۔ کیسے مجھے ان کا مجرم بنادیا۔ میں۔۔۔"

"بس بابا بس کریں۔" جوہی نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے بابا۔۔۔ آپ کے فیصلے ہمارے حق میں ہی تھے۔ ہم نے قدر نہ کی۔" جوہی کے اندر اس کا ضمیر بڑبڑایا۔ "آپ کے فیصلے اب بھی ہمارے لیے معتبر ہیں۔ آپ مجھے معاف کردیں بابا! آپ علی کو بھی معاف کردیں پلیز۔۔۔ بابا۔۔۔"

وہ ان کے ہاتھوں پر سر رکھ کر شدت سے رو پڑی۔ انہوں نے جوہی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور سسک کر رو پڑے۔

☆ ☆ ☆
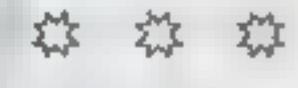
بابا حیران بھی تھے اور غصے میں بھی مگر خاموش رہے۔ ادریس انکل ان کے چہرے کے تاثرات سے متوقع جواب کا اندازہ لگا رہے تھے۔ کمرے میں موجود سارے نفوس عجب گومگو سی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ صورت حال کچھ اور ہوتی تو بابا ایک سیکنڈ سے بھی پہلے ادریس انکل کو اپنے گھر سے نکال چکے ہوتے مگر ہفتے بھر کے حالات نے ان کے دم خم ڈھیلے کردیے تھے۔

دروازے کی اوٹ میں کھڑی جوہی کی خشک ویران آنکھیں ثمن بھابھی کو دیکھ کر بھیگنے لگیں۔ وہ اس کے ذرا قریب آئیں تو جوہی خود پر قابو نہ رکھ سکی اور ان کے کندھے پر سر رکھ کر بلک اٹھی۔

"بھابھی! میں واثق کے قابل نہیں ہوں پلیز۔ آپ انہیں منع کردیں۔ میں کس طرح۔"

"پاگل ہو جوہی! خوشیاں دروازے پر کھڑی ہیں اور تم انہیں لوٹا رہی ہو۔ اس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اسے اس بات کا احساس ہے۔ وہ اپنی نادانی کو دھونے کی ایک کوشش کرنا چاہتا ہے مگر یقین کرو! وہ بہت اچھا انسان ہے۔ بہت میچور بہت سمجھ دار ہے وہ۔ تم اپنے دل سے ہر خدشے کو نکال دو۔ وہ تمہیں بہت عزت و احترام دے گا۔"

ثمن بھابھی اصل حقیقت سے بے خبر واثق کے دوبارہ رشتہ بھجوانے کو اس کی گزشتہ غلطی کا ازالہ قرار دے رہی تھیں۔ جبکہ جوہی واثق کی اعلا ظرفی کو سوچ سوچ کر شرمندگی سے زمین میں گڑی جارہی تھی۔

ثمن بھابھی کی زبانی سارے حالات سن کر اس نے فون کرکے جوہی کا حال احوال دریافت کیا تھا اور ڈھکے چھپے لفظوں میں اٹکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھامنے کی دوبارہ خواہش ظاہر کردی تھی اور جوہی اس کی بات پر ایک بار پھر سسک اٹھی تھی۔

"میں آپ کے قابل نہیں ہوں واثق! مجھے میری ناشکری کی سزا ملی ہے شاید۔"

"اس بات کا فیصلہ آپ رہنے دیں جوہی! آپ میرے دل میں جو مقام رکھتی ہیں اگر آپ اس سے واقف ہوتیں تو کبھی یہ بات نہ کہتیں۔ آپ نے جو کچھ کیا' اپنی محبت کو پانے کے لیے کیا اور میں جو کررہا ہوں' اپنی محبت کے لیے کررہا ہوں۔ اس ساری صورت حال میں میرے لیے ایک بات خوش آئند بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ اپنی محبت کے لیے بہت پوزیسو ہیں اور مجھے یقین ہے آپ بہت جلد مجھ سے بھی اتنی ہی شدید محبت کرنے لگیں گی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

وہ گمبھیر آواز میں بولتا ہوا آخر میں تھوڑا سا شوخ ہوا تھا اور جوہی کے اتھل پتھل ہوتے دل نے اس کی تصدیق کردی تھی۔

اور آج اس نے اپنے دوسرے وعدے کے عین مطابق اپنے والدین کو دوبارہ اس کے گھر بھیج دیا تھا۔

"جوہی! بابا نے تمہاری مرضی پوچھی ہے۔" وہ ثمن بھابھی کے کندھے سے لگی تھی جب روا بھابھی نے آکر کہا۔

"بھابھی! " اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ "بابا سے کہیے۔ جو جواب پہلے دیا تھا ادریس انکل کو وہی جواب دے دیں۔"

اس کی ڈھکی چھپی ہاں پر دونوں بھابھیاں مسکرادیں۔ وہ خود بھی مسکرادی کیونکہ آنے والی زندگی بھی مسکرا رہی تھی۔

☆

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مشال

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو..... ہیپی برتھ ڈے ڈیئر مشال..... ہیپی ہیپی برتھ ڈے۔" تالیوں اور آوازوں کے شور میں سات سالہ گلابی خوب صورت باربی فراک میں ملبوس مشال نے کیک کاٹا۔ بشریٰ اور عدیل نے خوب گلے لگا کر اسے پیار کیا۔ اس نے بھی دونوں کے پیار کا جواب خوب خوش ہو کر دیا۔ ذکیہ بیگم کے صبر کا پیمانہ جیسے لبریز ہو گیا۔

"ارے کیا اماں باوا ہی سارا پیار لٹا دیں گے بچی پر۔ کچھ نانی' دادی کا بھی حق ہے یا نہیں؟" ذکیہ نے کھینچ کر مشال کو سینے سے لگایا۔ پھر دادی کی باری آئی۔ پھوپھی اور ماموں کیوں پیچھے رہتے۔

مشال تو دونوں گھروں کا وہ خوب صورت کھلونا تھا' جس سے کوئی بھی سیر نہیں ہوتا تھا۔ دونوں گھروں میں بھلے ہر معاملے میں اختلاف ہوتا مگر مشال کے نام پر سب ایک ہو جاتے تھے۔ وہ بچی تھی ہی کچھ اتنی پیاری' من موہنی صورت والی کہ جو کوئی دیکھتا' بے اختیار اسے پیار کرنے لگتا۔ پھر اس کی عادت اتنی اچھی تھی۔ ادب اور تمیز سے بات کرنے والی۔ نانی کے گھر جاتی۔ دادی کی برائی کرتی نہ پھوپھی کی۔ ماموں نانو کے پاس ایک رات رہ کر آتی یا پورا ہفتہ' کبھی ان کی باتیں دادی پھوپھی کے پاس گھس گھس کر نہ کہتی۔ اگرچہ نسیم بیگم کئی بار اسے ٹٹولنے کی کوشش کرتیں مگر مشال پیاری سی شکل بنا کر فوراً "ہی کہہ دیتی۔

"نہیں دادو! نانو نے تو آپ کی اور فوزیہ پھوپھو کی ایسی کوئی بات کی ہی نہیں' بلکہ وہ مجھے کہہ رہی تھیں' تمہاری دادی پر ہے' خوش اخلاق اور نفیس تھہ۔"

اور دادی چاہتے ہوئے بھی کوئی برا جواب نہ دے پاتیں۔ الٹا ہنسی سے کہتیں۔

"ذکیہ میں یہ اچھی عادت ہے' دوسرے سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو' اس کی برائی نہ پیٹھ پیچھے کرتی ہے' بلکہ اس کی اچھائیاں ہی بیان کرتی ہے۔" اور فوزیہ کا موڈ آف ہو جاتا۔

"خوب سمجھتی ہوں میں مشال کا پکا پن۔ بی بی! یہ کبھی نانی ماموں کی برائی نہیں کرے گی۔ ماں نے بڑا چھا رنگ رکھا ہے۔ پورا تھالی کا بینگن ہے۔ جانتی ہوں میں اسے۔"

اور مشال معصوم سی شکل بنائے بڑی بڑی آنکھیں مٹکاتی پہلے تو نا سمجھی سے دونوں کو دیکھتی رہتی' پھر پھوپھو کے کندھے سے جھول کر بھول پن سے پوچھتی۔

"پھپھو! یہ تھالی کا بینگن کیا ہوتا ہے؟" فوزیہ جل کر کباب ہو جاتی۔

"بھئی! یہ میری مشال کے لیے سونے کی بالیاں اور پانچ سوٹ ہیں۔ ماموں نے تو بھانجی کے لیے خدا جانے کون سی ویڈیو گیمز اور کھلونے اکٹھے کر دیے ہیں۔ ان گفٹ بکس کو خود ہی بشریٰ اور عدیل کے ساتھ کھول کر دیکھ لینا اور یہ بشریٰ اور عدیل کے جوڑے ہیں اور یہ مٹھائی بھی۔"

ذکیہ نے کیک کٹنے کے بعد تحائف کا ڈھیر میز پر رکھنا شروع کر دیا۔

بشریٰ کا چہرہ فخر سے چمکنے لگا۔

عدیل بھی سسرال سے آئے بھاری تحفوں پہ بیٹی کی خوش قسمتی کو دل میں سراہنے لگا۔ جب سے پیدا ہوئی تھی ننھیال' ددھیال کے ہاتھ کا چھالا بنی ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے نہ پیار میں کمی تھی' نہ اس کے لیے چیزوں میں۔

"اور یہ میری اور فوزیہ کی طرف سے گولڈ کی چین ہے۔ یہ اس کے کپڑے اور کھلونے۔ خاص فرمائش کر کے فوزیہ سے مشال نے یہ ناچنے والی باربی ڈول لی ہے اور ساتھ میں ڈول ہاؤس کا پورا سیٹ بھی۔ مشال پھوپھی سے کوئی فرمائش کرے اور فوزیہ اسے ٹال دے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تھینک یو نانو اینڈ ماموں! اور بہت سا تھینک یو دادو اور پھوپھو کے لیے اور مشال کا پیار بھی۔" مشال باری باری سب سے گلے لگ کر سب کو پیار کرنے لگی۔ اس کی یہ ہی ادائیں تو سب کو بھاتی تھیں۔

"میرے خیال میں پہلے سب کے لیے کھانا نہ لگا دیا جائے؟ چائے' کولڈ ڈرنکس بعد میں ہو جائیں گی۔" بشریٰ ساس کے پاس آ کر بولی۔

ساس نے باہر سے آئے مہمانوں اور خاندان کے لوگوں کا حساب نظروں ہی میں لگا لیا۔

"فی الحال چائے' کولڈ ڈرنک اور مٹھائی رکھو۔ یہ ادھر ادھر کے لوگ جنہوں نے پانچ پانچ سو کے لفافے دیے ہیں۔ ان کو جانے دو۔ کھانا تو خاندان والوں کو ہی پورا پڑے گا بمشکل۔"

"نہیں امی! آرڈر تو سب کے حساب سے دیا تھا عدیل نے۔ کم تو نہیں پڑے گا۔ یوں بھی برا لگتا ہے کہ محلے والوں کو یوں ہی جانے دیں اور بعد میں آدھے لوگوں کو کھانا کھلائیں۔" بشریٰ نے ساس سے آہستگی سے کہا۔

"تو بھابھی! پھر امی کی صلاح کیوں لے رہی ہیں؟ اپنی مرضی کریں نا جو آپ نے پہلے سے طے کر رکھا ہے۔" فوزیہ اپنے مختصر سے جسم کو ذرا سا اچھال کر بولی۔

"اور میں نے تو بی بی! مشورہ اس لیے دیا تھا کہ کچھ تو بچت ہو سکے۔ عدیل کا کوئی بانڈ تو نہیں کھل گیا جو پوری بارات کو کھانا کھلانے بٹھا دو۔ آگے تمہاری مرضی' ورنہ بعد میں عدیل سے کچھ کا کچھ بول کر ماں کو بے عقل ٹھہراؤ گی۔ جو تمہارا جی چاہے' وہ کرو۔" نسیم بیگم نے نروٹھے پن سے کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دی۔

بشریٰ متذبذب سی اٹھ کر چلی گئی۔ عدیل سے مشورے کے بعد سب کو کھانا کھلا کر ہی بھیجا گیا۔

اور یہ بات نسیم بیگم اور فوزیہ دونوں ہی کو تپا گئی۔ اول تو انہیں یہ پہلے سے نہیں پتا تھا کہ سالگرہ اتنے بڑے

پیمانے پہ منائی جائے گی۔ اگرچہ تیاریاں تو بہت دنوں سے ہو رہی تھیں' مگر ہوٹل سے کھانے کا آرڈر وہ بھی تین ڈشز کا ۔۔۔ بیٹے کی کمائی یوں بے دریغ لٹنے پر نسیم بیگم کیوں نہ خفا ہوتیں اور فوزیہ جس نے چند دن پہلے عدیل سے دس ہزار مانگے تھے۔ اسے ایمبرائیڈری کا سیٹ پسند آ گیا تھا۔ اس نے اگلے ماہ لینے کا کہہ کر منع کر دیا تھا۔ وہ بھی اسی دن میں بھائی سے خفا ہو گئی کہ بیٹی کے فنکشن پر ہزاروں لٹا دیے اور بہن کے لیے صرف دس ہزار نہیں تھے ان کے پاس۔

ہنسی خوشی ختم ہوا۔ سب سے آخر میں ذکیہ اور عمران روانہ ہوئے اور جاتے جاتے بشریٰ اور عدیل کو اگلے ویک اینڈ پر اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئے۔ دعوت تو خیر انہوں نے نسیم بیگم اور فوزیہ کو بھی دی تھی' جسے نسیم بیگم نے تو اپنی گھٹنوں کی تکلیف اور فوزیہ نے اپنی دوست کی شادی کا بہانہ کر کے رد کر دیا۔ یوں بھی ذکیہ نے کون سا دل سے دعوت دی تھی ان دونوں کو "رسماً" یوں کہا کہ کہیں وہ بشریٰ کو باتیں نہ سنائیں یا اسے آنے سے روک نہ دیں۔ ان دونوں کے انکار پر مطمئن ہو کر چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

عمران گھر جا کر لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔

"امی! ایک کپ چائے ملے گی؟" کچن کی طرف جاتی ذکیہ کی طرف دیکھ کر اس نے آواز لگائی۔

"ابھی تو پی کر آ رہے ہو بشریٰ کی طرف سے۔"

"آپ تو جانتی ہیں' آپ کے ہاتھ کی چائے پیے بغیر مجھ سے کام نہیں ہوتا۔"

ذرا دیر میں وہ دو کپ لیے اس کے پاس ہی آ بیٹھیں۔

"اب کیا کام کرنا ہے' تمہیں' ٹائم تو کافی ہو گیا ہے۔" ذکیہ نے اسے مصروف دیکھ کر پوچھا۔

"ہوں! کام تو کافی ہے' مگر ایک آدھ گھنٹہ ہی کروں گا۔ کافی تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ دیر تک نہیں بیٹھ سکوں گا اور مجھے منع کر کے آپ خود بھی چائے بنا لائیں اپنے لیے؟" وہ ماں کو ٹوک کر بولا۔

"ہاں! بس سر میں درد سا ہو رہا تھا۔ میں نے کہا کچھ سکون ملے گا اور میں تو حیران ہوں ابھی تک۔ یہ نسیم اور فوزیہ نے اتنا جگرا کہاں سے دکھا دیا۔ مشال کے لیے چین' وہ بھی سونے کی۔ بڑی بات ہے۔" ذکیہ کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

"ہاں! وہ تو میں بھی حیران تھا' ورنہ ہر سال تو وہ مشال کو ہزار پانچ سو دے دیا کرتی تھیں یا ایک دو فراکوں پر ٹرخا دیا۔ آج تو واقعی کمال ہو گیا۔" عمران بھی چائے کی چسکی بھر کر بولا۔

"ظاہر ہے! بیٹے کی ترقی ہوئی ہے۔ اسے بیٹے کو خوش نہیں کرنا تھا کیا؟ معلوم تو ہے انہیں کہ عدیل کی جان تو مشال میں ہے' اس کی ہنسی اس کی خوشی تو عدیل کے لیے سب سے بڑھ کر ہے۔ یوں بھی فوزیہ کے لیے جہیز اکٹھا کرنے میں لگی ہے دن رات یہ نسیم بیگم تو بیٹے کو مٹھارنے کا اس سے اچھا موقع اور کون سا ہو گا۔ وہ سمجھتی ہیں لوگ گدھے ہیں' کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتیں ان کی چالاکیاں' ورنہ میری بشریٰ جیسے ان کے ساتھ رہ رہی ہے ہر لڑکی نہیں رہ سکتی۔ حرفوں کی بنی ہیں دونوں ماں بیٹی۔" وہ تنفر سے بولیں۔

"فوزیہ کا رشتہ ہو گیا کہیں؟" عمران لیپ ٹاپ میں مصروف تھا۔ اس نے شاید ماں کی نسیم بیگم کے خلاف کوئی بات سنی بھی نہیں تھی۔

"ابھی کہاں۔ ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی رشتہ دیکھنے چلا آتا ہے۔ کسی میں ان ماں بیٹی کو کیڑے نظر آتے ہیں اور

کسی کو فوزیہ بی بی اچھی نہیں لگتی۔ وہ اور منزہ والے بھی آئے تھے ایک رشتے والی کے توسط سے۔"
"اچھا واقعی!" عمران بے اختیار چونک کر بولا۔
"ہاں! تو اور نہیں۔ بڑا اونچا ہاتھ مارنے کے چکر میں ہے نسیم بیگم بیٹی کے لیے۔"
"پھر کچھ بات بنی؟"
"کہاں... انہوں نے تو صاف منہ پر بول دیا کہ ہمیں تو ذرا کم عمر لڑکی چاہیے۔ فوزیہ کی شکل ہی ایسی پکی ہے۔ پھر عمر بھی تو دیکھو! کم تو نہیں۔ عدیل سے سال بھر تو چھوٹی ہے۔ عدیل کی شادی کو ماشاء اللہ آٹھواں سال ہونے لگا ہے اور ان بی معصومہ کی کہیں بات ہی نہیں ٹھہر رہی۔ اب دوسرا تو بڑی عمر کا کہہ کر چلا جاتا ہے اور جلن نکالتی ہے بشریٰ پر۔"
"کیوں! پھر کوئی جھگڑا ہوا؟" عمران کچھ چونک کر بولا۔
"یہ کون سی نئی بات ہے۔ کوئی نہ کوئی مین میخ تو ماں بیٹی نکالتی رہتی ہیں۔ میں نے بشریٰ ہی سے کہہ رکھا ہے کہ بیٹا! تحمل سے برداشت کرلیا کرو۔ دو چار مہینوں یا سال بھر میں فوزیہ بی بی کا کانٹا بھی کسی نہ کسی طرح نکل ہی جائے گا۔ ماں! آناولی تو خوب ہو رہی ہے۔" ذکیہ کن انکھیوں سے لیپ ٹاپ کی اسکرین کی سائیڈ پر آئی نیم برہنہ لڑکیوں کے اشتہاروں کی تصویروں کو دیکھ کر بولیں۔
عمران بالکل بھی متوجہ نہیں تھا۔ وہ کھڑی ہو گئیں۔ پھر کچھ یاد آگیا۔
"وہ مجھے یاد آیا۔ بشریٰ کے ہمسائے سے جو رضوی صاحب کی دونوں بیٹیاں آئی ہوئی تھیں ابھی مشال کے فنکشن میں بجن کی طرف میں نے اشارے بھی کر کے بتایا تھا۔ تمہیں کیسی لگیں وہ دونوں؟"
"ہوں! کچھ خاص نہیں۔ دونوں نے اتنا میک اپ تھوپ رکھا تھا کہ رنگت کا کچھ ٹھیک سے اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا اور نیلے سوٹ والی تو اچھی خاصی آنٹی لگ رہی تھی۔ ابھی سے ان کا یہ حال ہے تو شادی کے بعد کا سوچیں۔ اور دوسری بالکل سوکھی لڑکی۔ کچھ عجیب سی نہیں لگیں آپ کو؟" عمران منہ بگاڑ کر بولتا چلا گیا۔ ذکیہ کچھ مایوس سی ہو گئیں۔
"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیسے یہ معاملہ حل ہو گا بھلا۔ تمہارے بینک میں ایسی ایسی فیشن ایبل خوب صورت لڑکیاں کام کرتی ہیں ہم کیوں نہیں دیکھ لیتے کوئی اچھی فیملی کی مناسب لڑکی؟"
"امی! میں وہاں کام کرنے جاتا ہوں لڑکیاں تاڑنے نہیں۔ یوں بھی یہ بینکوں، دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں ماں باپ کے ہاتھوں سے نکلی ہوتی ہیں، ان سے گھر نہیں بسا کرتے۔ شتر بے مہار سی ہوتی ہیں۔ سچی بات ہے مجھے ایسی لڑکیاں پسند بھی نہیں۔" عمران بغیر لگی لپٹی رکھے بولا تو ذکیہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔
"یہ تو ہے۔ وہ تو خالہ کلثوم بھی تین چار رشتے ایسے لے کر آئیں کہ لڑکی نوکری کرتی تھی۔ میں نے اسے منع کر دیا کہ بھئی! ان نوکری کرنے والیوں سے گھروں میں بندھ کر نہیں بیٹھا جاتا۔ ہمیں تو ایسی بہو چاہیے جو گھر کو سنبھالے، چلائے۔ اپنی سلیقہ مندی اور سگھڑپن سے شوہر اور ساس کے دل میں جگہ بنائے، نہ کہ اپنی تنخواہ اور نوکری کا رعب ہم پر جمانے لگے۔ شکر ہے کلثوم بی بی سمجھ گئیں۔ دوبارہ ایسا رشتہ نہیں لے کر آئیں۔ چلو اللہ کچھ بہتر ہی کرے گا۔ میں پہلے عشا کی نماز پڑھ لوں۔ آج تو دیر بھی بہت ہو گئی۔ تھکاوٹ سے جی سستی کرنے لگا ہے مگر نماز پڑھے بغیر نیند کہاں آئے گی مجھے۔ سو جانا تم بھی جلدی۔" وہ کہتے ہوئے چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

فوزیہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی اپنا میک اپ اتار رہی تھی۔
نسیم بیگم تسبیح ہاتھ میں لیے منہ میں پڑھتی بستر کی طرف بڑھ گئیں۔
"اپنی سمدھن صاحبہ کی شوبازی دیکھی تھی آپ نے؟" فوزیہ شیشے میں ماں کو دیکھ کر جتانے والے انداز میں بولی۔
"شروع سے عادت ہے اس کی تو کوئی نئی بات تھوڑی ہے یہ۔ کیسے پالا پڑ گیا اس سے۔ جب ہم نے بھی ڈنکے کی چوٹ پہ ٹھکے دیے۔ اس کے تو وہم گمان میں نہیں تھا کہ بازی ہمارے ہاتھ جائے گی۔" نسیم بیگم اپنے سینے پہ پھونک مارنے کے بعد تسبیح مٹھی میں لپیٹ کر ٹھٹھا مار کر ہنسیں۔
"دفع کریں بار کی داری! اچھا خاصا خرچ ہو گیا امی! آپ نے میری چین اٹھا کر دے دی مشال کے لیے۔ میرا تو بہت دل برا ہو رہا ہے۔"
"پاگل ہے تو تو۔ ایک آدھے تولے کی چین دے کر عدیل سے چار تولے کا سیٹ نہ اس مہینے نکلوایا تو میرا نام بدل دینا۔"
"اتنے اچھے بھیا جان... بھابھی بیگم اشارہ کریں گی تو ہی جیب کی طرف ہاتھ جاتا ہے ان کا۔" فوزیہ چڑ کر بولی۔
"بشریٰ بی بی کو جتنے بھی چلتر آتے ہوں۔ ابھی وہ عدیل کی ماں کے برابر نہیں ہو سکتی عقل اور ذہانت میں۔" نسیم بیگم فخر سے بولیں۔
"اچھا امی... وہ کیسے؟" فوزیہ مشتاق سی ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
"تو دیکھتی جا اور مجھے تو سچ میں آگ لگی ہے فوزیہ! عدیل کی ترقی کیا ہوئی بشریٰ نے کیسے بیٹی کی سالگرہ کا فنکشن اٹھا لیا۔ وہ بھی اتنے کھلے ہاتھوں سے۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا ورنہ اس عدیل کو تو میں اچھی طرح سمجھا دیتی بے وقوف کیسے اپنا نقصان کیے جا رہا ہے بیوی کو سیٹ بھی لے کر دیا ہے۔ تجھے معلوم ہے؟"
"کیا؟ آپ کو کس نے بتایا؟" فوزیہ کو جیسے کرنٹ لگا۔
"جانتی تھی میں۔ کل شام میں یوں ہی بشریٰ کو چائے کا کہنے گئی تو عدیل آفس سے آیا ہی تھا اور بشریٰ کو سیٹ کھول کر دکھا رہا تھا۔ دونوں نے مجھے نہیں دیکھا مگر میں نے سب سن لیا، کیسے وہ بیوی کے گن گاتے ہوئے اسے تحفہ دے رہا تھا جیسے قلو پطرہ ہو کہیں کی۔"

"اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔" فوزیہ بے حد رنج سے بولی۔
"میں خود حق دق رہ گئی تھی۔ تمہیں بتاتی تو تم اور رو رو کر برا کرتیں' بلکہ میں نے کچھ دیر بعد خود ہی جا کر دونوں کو مبارک باد دے دی۔" نسیم گہرا سانس لے کر بولیں۔
"امی!" فوزیہ جیسے ابھی رو دینے کو تھی۔
"پگلی! غم نہ کر۔ جو گڑ سے مرے اسے زہر نہیں دیتے۔"
"کیا مطلب؟"
"ابھی ہمارا وقت ہے۔ سمجھا کر۔" نسیم اس کا ہاتھ دبا کر نرمی سے بولیں۔
"میں ابھی بھی نہیں سمجھی۔ کیا مطلب ہے آپ کی اس مصلحت پسندی کا' بلکہ بزدلی کہنا چاہیے مجھے تو۔" فوزیہ تپ کر بولی۔
"تیرا رشتہ کہیں اچھی جگہ ہو جائے۔ دونوں کو رام رکھیں گے تو تیرے رشتے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے رہیں گے۔ آئے دن مہمانوں کی خاطر تواضع کے علاوہ تیرے لیے اتنا اعلا جہیز بنا رہی ہوں تو اسی مصلحت پسندی کی وجہ سے یہ ضروری ہے بیٹا!"
"اچھا! آپ کے خیال میں اگر آپ اس بشریٰ بی بی کے آگے پیچھے نہیں پھریں گی اس کی اور عدیل کی خوشامد نہیں کریں گی تو کیا وہ یہ سب نہیں کریں گے؟"
"کریں گے تب بھی' مگر برے دل اور بگڑے منہ کے ساتھ۔ اس سے آنے والوں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ اس بشریٰ کو ہی آگے بڑھ کر ملنا ہوتا ہے۔ میں کبھی بیمار کبھی کچھ۔ ایسے میں بشریٰ اور عدیل سے بنا کر رکھنا بہت ضروری ہے فوزیہ!" نسیم نے سمجھایا۔
"آپ کریں اس کی خوشامد اور منتیں۔ مجھ سے یہ سب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کروں یہ؟ میرا حق ہے یہ سب وصولنا۔ بشریٰ بی بی کو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اس گھر میں آئے اور وہ مالکن بن جائے اور ہم نوکرانی! ایسا تو میں ہونے نہیں دوں گی۔" وہ غصہ میں بولتی بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ نسیم بیگم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر فوزیہ کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئیں اور لیٹ کر تسبیح پر کچھ پڑھنے لگیں۔

☆ ☆ ☆
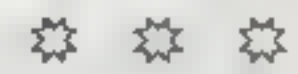
"چلو مشال! رکھو۔ باقی کے گفٹس صبح کھول کر دیکھ لینا۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ صبح پھر اٹھو گی نہیں تم جلدی۔" بشریٰ' مشال کے آگے پڑے گفٹس ہٹاتے ہوئے بولی۔
"نہیں مما! مجھے ابھی دیکھنا ہے سب۔ پلیز مجھے دیکھنے دیں نا!" مشال متجسس نظروں سے پیکٹس کو دیکھتے ہوئے بولی۔
"جان! بولا ہے نا صبح دیکھ لینا۔ اب بہت ٹائم ہو گیا۔ پاپا بھی تھکے ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی آرام کرنا ہے۔" بشریٰ سمجھاتے ہوئے تحفے اٹھا کر الماری میں رکھنے لگی۔
مشال منہ بنا کر بیٹھ گئی۔
"مجھے ابھی نہیں سونا۔ آپ دونوں سو جائیں۔"
"بری بات مشال! اب تم مجھ سے ڈانٹ کھاؤ گی؟" بشریٰ ذرا سختی سے بولی۔
"کوئی میری گڑیا کو ذرا سا بھی ڈانٹ کر دکھائے۔ پاپا اچھی طرح نپٹ لیں گے اس سے۔ کیوں جان پاپا۔" عدیل باتھ روم سے نکل کر مشال کو ساتھ لپٹاتے ہوئے پیار سے بولا۔

"مت عدیل! اور پیار کریں بھی۔ اتنا نہ اسے سر چڑھائیں کہ پھر اتارنا مشکل ہو جائے۔" بشریٰ کچھ چڑ کر بولی۔
"کیوں اتاریں گے اسے ہم۔ ہماری آنکھ کا تارا ہے ہماری بیٹی۔"
"آئی لو یو پاپا۔" مشال باپ سے چمٹ کر پیار کرتے ہوئے بولی۔
"لو یو ٹو جان!" عدیل نے بھی اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔
"بس بھی کریں اب۔ تھک گئی ہوں میں صبح پانچ بجے کی اٹھی ہوئی ہوں' بارہ بجنے کو ہیں۔" بشریٰ کو غصہ آ گیا۔
"بھئی! آپ لیٹ جائیں نا بیگم صاحبہ! آپ کو کس نے منع کیا ہے۔ اب ہم اپنی پیاری سی بیٹی سے دو گھڑی بات بھی نہ کریں۔" عدیل مشال کو اسی طرح ساتھ لگائے بیٹھا تھا۔
بشریٰ بیڈ پر جگہ بنا کر نیم دراز ہو گئی۔
"پاپا! دادو نے کتنی اچھی چین دی ہے۔" مشال نے باپ کو چین دکھاتے ہوئے کہا۔
"اچھا تو کیا نانو کا گفٹ اچھا نہیں تھا؟" بشریٰ نے فوراً ٹوک کر کہا۔
"وہ بھی بہت اچھا ہے' ہے نا پاپا!" مشال جلدی سے بولی۔
"ویسے عدیل! ہماری بیٹی بڑی ہو کر کہیں پالیٹیشن (سیاست دان) تو نہیں بنے گی؟" بشریٰ نے ہنس کر کہا۔
"جی نہیں! میری گڑیا کا دل بہت بڑا ہے' سب سے پیار کرتی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اسے احساس ہے کہ کسی کو ہرٹ نہیں کرنا' اسی لیے تو مجھے اس پر اتنا پیار آتا ہے۔" عدیل نے مشال کو پیار کیا۔
مشال وہیں لیٹ گئی۔
"مشال! جا کر اپنے بیڈ پر لیٹو بیٹا۔ ورنہ یہیں سو جاؤ گی تو تمہیں بیڈ پر کون لٹا کر آئے گا۔" اسے آنکھیں بند کرتے دیکھ کر بشریٰ نے جلدی سے کہا۔
"میں لٹا آؤں گا۔ سونے دو اسے۔ اس کا دل چاہ رہا ہے آج پاپا کے پاس سونے کو۔" عدیل' مشال کے بال سمیٹتے ہوئے بولا۔
"پتا ہے عدیل! وہ آنٹی شاکرہ آج کیا کہہ رہی تھیں۔" بشریٰ کو ایک دم یاد آیا۔
"کیا۔" عدیل نے بے دھیانی سے کہا۔
"کہہ رہی تھیں ان کی نند کی بیٹی نے کسی گائناکالوجسٹ کو دکھایا ہے۔ آٹھ سال ہو گئے تھے پہلے بچے کو۔ اب اس ڈاکٹر کے علاج سے دوبارہ اللہ کی رحمت ہوئی ہے۔ تم بھی اسی ڈاکٹر کو دکھاؤ جا کر۔ میں تمہیں اس کے کلینک کا بتا دوں گی اپنی نند سے پوچھ کر۔ کہہ رہی تھیں' مشال بڑی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا بھائی تو ہونا چاہیے نا کوئی۔"
"ہوں!" عدیل نے جمائی لی۔
"تمہارا دل نہیں چاہتا' اب ہمارا دوسرا بچہ بھی ہو؟"
"کیوں نہیں چاہتا یار! اب اللہ کو منظور نہیں فی الحال تو کیا کریں اور ہمیں جو اللہ نے اتنا پیارا تحفہ دے رکھا ہے' اس کی قدر کیوں نہ کریں۔"
"وہ تو ٹھیک ہے عدیل! مگر اب دوسرا بچہ ہو جانا چاہیے۔ امی بھی آتے جاتے سب کو کہتی ہیں کہ مشال کو پیدا کر کے جیسے بشریٰ نے تو دنیا فتح کر لی۔ دوسرے بچے کا نام نہیں لیتی۔ اب انہیں کیا بتاؤں میں۔ کتنا علاج کروایا ہے میں نے۔" اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔
"جان! تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ اللہ جانتا ہے ہمارے بارے میں سب۔ ہم نے کوئی علاج چھوڑا تو نہیں۔ اب اگر اس کے گھر میں دیر ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔" عدیل اس کی آنکھیں صاف کر کے نرمی سے بولا۔
"ویسے میں نے شاکرہ آنٹی سے ان کی نند کا فون نمبر لے لیا ہے۔ کل کسی وقت فرصت میں فون کر کے ساری

تفصیل پوچھوں گی۔ اب ہمیں اور دیر نہیں کرنی چاہیے ورنہ تو بہت مشکل ہو جائے گا اور پتا ہے 'یہ مشال جو میری اسکول سے آکر جان کھاتی ہے کہ اس کی سب فرینڈز کے بہن بھائی ہیں تو میرے کیوں نہیں۔ ہر بار اسے کہتی ہوں کہ آپ بس دعا کریں اللہ تعالیٰ سے تو وہ آپ کو بہن بھائی ضرور دے گا۔ اب تو الجھنے لگی ہے کہ ماما میں اتنے دنوں سے ہر وقت دعا کرتی رہتی ہوں' پھر اللہ تعالیٰ میرا بھائی کیوں نہیں دے رہا۔" بشریٰ حسرت بھرے لہجے میں بولی۔

"ہو جائے گا بچہ بھی۔ فکر نہیں کرو تم۔ ایک ڈاکٹر کا مجھے سمیع نے بھی بتایا ہے۔ اس سے مکمل معلومات لے کر وہاں بھی چلیں گے۔ اب سو جاؤ۔ بہت وقت ہو گیا ہے۔ صبح پھر اٹھا نہیں جائے گا۔" وہ لیٹتے ہوئے بولا۔

بشریٰ خاموشی سے کچھ سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کتنے پیسے چاہئیں آپ کو امی!" عدیل نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے ماں سے پوچھا۔ بشریٰ' نسیم بیگم کے آگے ناشتا رکھ رہی تھی۔

"کم از کم دس پندرہ ہزار تو ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہے' آج کل کراکری کتنی مہنگی ہوتی ہے۔ ابھی تو ڈنر سیٹ ہی لوں گی۔ باقی واٹر سیٹ' ٹی سیٹ' وغیرہ بعد میں دیکھ لوں گی۔" نسیم بیگم تفصیل بتانے لگیں۔ عدیل بے چارگی سے بشریٰ کی طرف دیکھنے لگا۔

"اب دیکھو نا! تھوڑا تھوڑا کر کے بنا رہی ہوں فوزیہ کے لیے میں' پھر بھی ابھی کچھ نہیں ہوا۔ تھوڑے سے بستر بنے ہیں اور کچھ برتن۔ سونا ہی اتنا مہنگا ہوا جا رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں تم مجھے تھوڑی تھوڑی رقم دیتے جاؤ تو بس ساتھ ساتھ تھوڑا زیور بھی بناتی جاؤں گی۔ ایک دم کہیں رشتہ طے ہو گیا تو فرنیچر اور دوسرے ضروری سامان کے لیے اچھی خاصی رقم چاہیے ہوتی ہے۔ کھانا وغیرہ تو ایک طرف' کیوں بہو؟" نسیم نے بشریٰ سے تائید چاہی۔

"جی امی!" بشریٰ کو سر ہلانا پڑا۔

"امی! ابھی تو دس ہزار نہیں ہیں میرے پاس۔" عدیل بہت مشکل سے بولا۔

"کیوں میں نے تو پچھلے ہفتہ سے تمہیں کہہ رکھا تھا' سالگرہ سے بھی پہلے کا۔" نسیم جتاتے ہوئے انداز میں تحمل سے بولیں۔

عدیل سے فوری طور پر کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"میں تو سمجھی تمہارے نزدیک میری بات کوئی ویلیو رکھتی ہو گی۔ تم سالگرہ کا خرچ نکال کر ماں کی کہی رقم الگ سے نکال رکھو گے مگر شاید تم بھول گئے تھے نا!" نسیم پھر سے جتا کر بولیں۔

عدیل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھو عدیل بیٹے! برا نہیں ماننا۔ یہ سالگرہ جیسی مغربی رسمیں ہماری زندگی کا ضروری حصہ نہیں۔ اگر تم ایک سال بیٹی کی سالگرہ دھوم دھام سے نہیں مناؤ گے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا' لیکن اگر اکلوتی بہن کو تم خالی ہاتھ بھیجو گے تو دنیا ہمیں لعن طعن کرے گی ہی' میری اس یتیم بچی کا جینا حرام کر دے گی۔ آج کو اس کا باپ زندہ ہوتا کیا اس کی شادی کے معمولی خرچوں کے لیے مجھے یوں تمہارے آگے ہاتھ پھیلانے پڑتے۔" نسیم بیگم کی آواز رندھ گئی۔

"تم بھی تو باپ ہو بیٹی کے۔ کس چاؤ سے ہر سال اس کی سالگرہ مناتے ہو۔ آدھا شہر تو اس دفعہ بلا لیا۔ اس یتیم بچی کا باپ اگر زندہ ہوتا تو کیا اس کی خوشیاں نہ مناتا۔" وہ دوپٹا منہ کے آگے رکھ کر رونے لگیں۔ بشریٰ کے چہرے

پر غصہ کے ساتھ ساتھ خجالت بھی تھی۔ وہاں سے چلی گئی۔

عدیل نے والٹ نکال کر کچھ نوٹ نکالے۔

"امی! ابھی یہ سات ہزار ہیں۔ یہ رکھیں۔ باقی میں شام میں دے دوں گا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے آفس سے۔ میں اب چلوں۔"

"تم ابھی یہ بھی اپنے پاس ہی رکھو' بلکہ یوں کرو اپنی بیوی کو دے جاؤ اور اس سے کہو وہ خود جا کر نند کے لیے تھوڑے بہت برتن لے لے۔ جو اس غریب کے نصیبوں میں ہو گا' اسے مل جائے گا۔ یہ نہ ہو میرا ہاتھ کھل جائے اور میں فضول خرچی کر آؤں تو تمہاری بیوی تمہیں خود سے قیمتیں بتانے لگے چیزوں کی اور تمہارا دل مجھ سے برا ہو جائے۔" نسیم نے پیسے اس کے آگے رکھ دیے۔

"امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ میں بشریٰ کی باتوں میں کیوں آنے لگا اور آپ فوزیہ کو ساتھ لے جائیں۔ جو بھی خریدنا ہو' اس کی پسند کا خرید لیں۔ میں کچھ دنوں میں آپ کو اور رقم بھی دوں گا۔ پھر آپ کو جو خریدنا ہو گا' وہ بھی خرید لیجیے گا۔" عدیل ماں کا کندھا دبا کر رقم ان کی جھولی میں رکھتے ہوئے سعادت مندی سے بولا۔

"اور وہ جو میں نے تم سے فوزیہ کے لیے سونے کے سیٹ کا کہا تھا؟" نسیم نے موقع غنیمت جان کر یاد دہانی کروائی۔

عدیل لمحہ بھر کو سوچ میں پڑ گیا۔

"یہ سالگرہ تو اچھی خاصی مہنگی پڑ گئی۔" وہ دل میں جھلا کر رہ گیا۔ "امی کو بھی سارے بھولے بسرے خرچ یاد آ رہے ہیں۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔ آپ بس دعا کریں' فوزیہ کا اچھی جگہ رشتہ ہو جائے۔ پھر دیکھیے گا' میں ہر خرچا کیسے ہنسی خوشی پورا کرتا ہوں۔ میری اکلوتی بہن کی خوشی ہے' میں خیال نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا۔ اور پلیز! آپ اس طرح کی باتیں نہیں سوچا کریں۔ مجھے مشال بعد میں ہے' فوزیہ پہلے ہے۔ ابا نہیں رہے تو کیا ہوا' میں جو ہوں سب کچھ کرنے کے لیے۔ آپ کوئی بھی ٹینشن نہ لیں ورنہ پھر آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" وہ ماں کے پاس بیٹھ کر انہیں تسلی دیتا چلا گیا۔

اور کچن میں کام کرتی بشریٰ جل بھن کر رہ گئی۔

"ایک نمبر کی ڈرامے باز ہیں دونوں ماں بیٹی۔ مل کر بیٹے کو الو بناتی ہیں اور یہ عدیل ایسے بے وقوف بنتے ہیں جیسے ان دونوں کی چال کیوں کو جانتے نہیں۔ دیکھ لوں گی میں بھی' کیسے یہ دونوں ماں بیٹی اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوتی ہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے برتن دھونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"ٹھیک ہے امی! میں کوشش کروں گی شام میں آنے کی۔ اب عدیل کے آنے پہ ہے۔ اگر وہ جلدی آجاتے ہیں تو ہی میں آسکوں گی نا!" بشریٰ فون پہ ذکیہ سے کہہ رہی تھی۔

"تو بیٹا! یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر تم کہو تو میں عمران کو بھیج دیتی ہوں۔ وہ آفس سے آتے ہوئے تمہیں اور مشال کو پک کر لے گا۔ رات کا کھانا میری طرف ہی کھانا۔ عدیل بھی بعد میں آجائے گا۔" ذکیہ محبت سے بولیں۔

"نہیں امی! آپ کو پتا تو ہے ورکنگ ڈیز میں عدیل کو رات دیر تک باہر رہنا بہت ناپسند ہے۔ پھر ان کی اماں جان تو یوں بولا جائیں گی جیسے عدیل دودھ پیتا بچہ ہو اور اسے صبح اسکول جانے سے دیر ہو جائے گی۔" بشریٰ چڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ماں ہے نا۔ یوں محبت نہیں دکھائے گی تو کیا اس عمر میں بیٹے کو ہاتھ سے گنوائے گی۔" ذکیہ تمسخرانہ لہجے میں بولیں۔

"ٹھیک کہتی ہیں امی! یقین کریں جتنے پینترے یہ دونوں ماں بیٹی بدلتی ہیں عدیل کو مٹھی میں کرنے کے لیے، میں آپ کو کیا بتاؤں۔" بشریٰ دکھی لہجے میں بولی۔ اسے صبح والا منظر یاد آگیا تھا۔

"میری بچی! میں جانتی ہوں، تم کیسے ان دونوں چلتروں کے درمیان گزارہ کررہی ہو۔ یہ تمہارا صبر ہی تو ہے جو تمہیں شوہر کے دل کی ملکہ بنائے ہوئے ہے، ورنہ کوئی اور ہوتی تو دوسرے دن عدیل کو ان ماں بیٹی کا اصل چہرہ دکھا کر کہیں الگ گھر لے چکی ہوتی۔" ذکیہ بیٹی سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

"پھر تم آرہی ہو ناں شام میں؟" انہیں پھر سے فون کرنے کا مقصد یاد آیا۔

"دیکھو! بڑی اچھی لڑکی ہے۔ پڑھی لکھی گرہستن اور سب سے بڑھ کر خوب کھاتے پیتے لوگ ہیں اور خاندان بھی نیک، شریف۔ اب بتاؤ اور کیا چاہیے۔ ایسی لڑکی کو تو ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہیے بشریٰ!"

"وہ امی! آپ کی بات ٹھیک ہے مگر مجھے پہلے عدیل کو فون کرلینے دیں۔ پتا نہیں وہ مانتے بھی ہیں یا نہیں۔"

"اتنا بھی عدیل کی مرضی پر نہ چلو کہ تمہاری اپنی کوئی خوشی ہی نہ رہے۔ ظاہر ہے اب بھائی کے لیے تم تھوڑی دوڑ دھوپ نہیں کروگی تو اور کون کرے گا۔ ابھی تو میری ہڈیاں کچھ کام کررہی ہیں تو میں ساتھ لگی ہوں۔ کل کو خدا نخواستہ مجھے کچھ ہوگیا تو۔۔۔"

"امی! پلیز ایسی باتیں نہیں کریں۔ اللہ آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ میں عدیل کو فون کرکے کہتی ہوں کہ میں عمران کے ساتھ جارہی ہوں امی کی طرف۔ وہ رات میں مجھے آکر لے جائیں۔ ٹھیک ہے نا۔" بشریٰ کو شاید ماں کی بات بری لگی کہ عدیل کے آگے اس کی ذرا سی بھی مرضی نہیں چلتی۔

"بالکل صحیح۔ اور سنو! اپنا وہ سالگرہ والا سوٹ پہن لینا اور سیٹ بھی وہی جو عدیل نے تمہیں بنوا کر دیا ہے۔ ذرا لڑکی والوں پر اچھا امپریشن پڑے گا۔ ماشاءاللہ سالگرہ میں میری بچی اتنی پیاری لگ رہی تھی اور وہ فوزیہ۔ جیسے دس سالوں کی بیاہی ہوئی۔ شکل سے ہی پکاپن جھلکنے لگا ہے اب تو۔ کہیں اس کے رشتے کی بات چلی؟" ذکیہ نے کریدا۔

"لگی تو ہوئی ہیں دونوں۔ آئے دن رشتہ کرانے والیوں کی جیبیں گرم کرتی رہتی ہیں۔ پھر بھی بات نہیں بن رہی اس کی شادی تک عدیل کو کنگال کردیں گی دونوں۔"

"اللہ نہ کرے۔ چلو! تم تیاری کرو۔ میں عمران کو فون کرکے کہہ دیتی ہوں۔"

"مشال سو رہی ہے۔ میں اٹھاتی ہوں ابھی اللہ حافظ۔" کہہ کر فون بند کرکے وہ سوئی ہوئی مشال کو دیکھنے لگی۔

"نہیں یار! یہ بہت مشکل کام ہے۔ تمہیں پتا ہے گھر آنے کے بعد میرا کہیں اور جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تم آنٹی سے کہتیں کہ وہ یہ سلسلہ کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھتیں۔" عدیل آفس میں کام کررہا تھا، جب بشریٰ کی کال آئی تھی۔

"عدیل! میں نے پہلے ہی امی سے یہ بات کی تھی کہ آپ کو ورکنگ ڈیز میں اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنا پسند نہیں مگر امی بے چاری بھی مجبور ہیں۔ لڑکی بہت اچھی ہے اور رشتہ کرانے والی آنٹی بتارہی تھیں کہ اس کے دھڑا دھڑ رشتے آرہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ ہمیں دیر ہوجائے۔" بشریٰ نے اسے صورت حال کی سنگینی بتائی۔

"اب ایسی بھی آگ نہیں لگی کہ دو تین دن میں اس کا رشتہ ہی کہیں ہوجائے۔" عدیل بے زاری سے بولا۔

"عدیل! آپ کو میرے ساتھ نہیں چلنا تو صاف انکار کردیں۔ ظاہر ہے، آپ کو آپ کی امی کچھ کہیں گی تو ان کو تو آپ انکار نہیں کرسکیں گے، لیکن جو میں کہوں گی، وہ ایک دم فضول، بیکار، بے معنی ہوتا ہے آپ کے نزدیک۔" بشریٰ پھٹ پڑی اور آواز بھی رندھ گئی۔

"بھئی! میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔۔۔ چلو ٹھیک ہے! تم عمران سے کہو، وہ آکر تمہیں لے جائے۔ ورنہ مجھے آفس میں اور دیر ہوگئی تو۔"

"آپ ٹینشن نہیں لیں۔ وہ غریب ہی مجھے واپس ڈراپ بھی کرجائے گا۔ ظاہر ہے، اس کا کام ہے تو مزا بھی وہ ہی مجھے گا آنے جانے کی۔ آپ اپنا کام کریں۔ میں چلی جاؤں گی، اللہ حافظ۔" اس نے ناراضی سے کہہ کر فون بند کردیا۔

"میری تو کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ ان عدیل صاحب کی نظروں میں۔" بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

بشریٰ نے تیار ہوکر آئینے پر نظر ڈالی اور مطمئن ہوکر مسکرائی۔ تب ہی مشال خوب صورت فراک پہنے اپنی گڑیا ہاتھ میں پکڑے چلی آئی۔

"مما! میں اسکول بیگ بھی لے لوں۔ اگر ہمیں نانو کی طرف رات رہنا ہو تو؟" وہ بھی ماں کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ارے نہیں دادی اماں! ہم رات رہنے نہیں جارہے۔ رات میں ماموں ہمیں واپس چھوڑ جائیں گے۔" بشریٰ جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ چیک کرنے لگی۔

"مما! یو لُک سو پریٹی۔" وہ بے اختیار ماں سے لپٹ کر بولی۔

"میری جان! تھینکس۔ یو ٹو ویری پریٹی مائی لو۔" بشریٰ بھی بیٹی کو پیار کرنے لگی۔

"مما! پاپا نہیں آئیں گے نانو کی طرف؟" اسے ماں کی بات یاد آئی تو پوچھنے لگی۔

"بیٹا! آپ کے بابا کا موڈ ہوا تو آجائیں گے ورنہ ہمیں ماموں ڈراپ کرجائیں گے۔ تم نے ہوم ورک مکمل کرلیا تھا نا مشال؟"

"یس مام! بس ٹیسٹ واپس آکر ایک بار دہرا کرلوں گی۔ میتھس کا ٹیسٹ ہے کل۔" مشال سر ہلا کر بولی۔

"چلو! پھر تو ٹھیک ہے۔" فون بجنے پر اس نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ذکیہ کا فون تھا۔

"عمران ابھی آرہا ہے تمہیں لینے کے لیے۔ اس کا فون آیا تھا کہ امی! میں نکلنے لگا ہوں تو آپ بشریٰ آپی کو فون کرکے بتادیں۔ تم تیار ہوگئی ہو ناں بشریٰ!"

"جی امی! میں بالکل تیار ہوں اور مشال بھی۔ مشال چلے گی نا لڑکی والوں کی طرف ہمارے ساتھ؟" اسے جیسے یاد آیا۔

"ہاں! جیسے اس کا دل کرے گا تو ماموں کے پاس ہی رک جائے گی۔" ذکیہ بولیں۔

"چلیں! پھر میں آتی ہوں تو بات کرتے ہیں اللہ حافظ۔" بشریٰ نے فون بند کرکے آخری بار اپنا جائزہ لیتے ہوئے دوپٹا ٹھیک کیا۔

"ہمیں کہاں جانا ہے نانو کی طرف جاکر؟" مشال ماں کی تیاری کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جارہی تھی۔

"عمران ماموں کی دلہن دیکھنے۔ چلوگی ہمارے ساتھ؟" بشریٰ اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی کاٹ کر بولی۔

"میں تو ضرور جاؤں گی۔" وہ فوراً تیار ہوگئی۔

"اور ماموں کے پاس گھر میں نہیں رکوگی؟" بشریٰ نے کہا۔

"نہ نہیں! میں دلہن دیکھنے جاؤں گی۔ اب چلیں نا مما!" وہ بے چین ہوکر بولی۔

"ہاں! چلو ماموں آتے ہی ہوں گے۔" وہ مشال کو ساتھ لے کر باہر نکلی۔

"ٹھیک ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ دو گھنٹے تو ابھی ہیں نا۔ تم انہیں کھلوا دو۔ میں سب انتظام کر لیتی ہوں۔" نسیم کسی سے فون پر بڑے انہماک سے بات کر رہی تھیں۔

"اچھا۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ تم لے آؤ انہیں۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔" وہ پرجوش لہجے میں بولیں۔

"ہاں ہاں۔ فکر ہی نہ کرو۔ اس بار جو کچھ تم بتا رہی ہو۔ تمہارے منہ میں گھی شکر۔ کمی نہیں ہوگی دیکھنا! میری طرف سے کچھ بھی۔ بس تم پہنچنے کی کرو۔ اللہ حافظ۔" نسیم نے پرجوش انداز میں فون بند کر دیا۔ اور کچھ بولتے ہوئے بشریٰ کے تیار حلیے کو دیکھ کر لمحہ بھر کو جیسے گنگ سی ہو گئیں۔

"دادو! ہم ماموں کی دلہن دیکھنے جا رہے ہیں۔ میں بھی جاؤں گی مما اور نانو کے ساتھ۔ میں اچھی لگ رہی ہوں نا اس فراک میں دادو!" مشال فوراً دادی کی گود میں بیٹھ کر لاڈ سے بولی۔

"دادو کی جان پری لگ رہی ہے کہیں نظر نہ لگ جائے۔" دادی فوراً پوتی کا منہ چوم کر بولیں۔

"وہ امی! میں ذرا امی کی طرف جا رہی تھی۔ عمران مجھے لینے آ رہا ہے۔ عمران کے لیے کوئی لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں ہم۔" بشریٰ نے سنبھلے ہوئے لہجے میں رک رک کر کہا کیونکہ نسیم کی کچھ دیر پہلے ہونے والی فون پر بات چیت اسے کچھ کھٹک سی گئی تھی۔

"کسی سے پوچھنے بتانے یا اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تم نے؟" نسیم کٹیلے لہجے میں اس پر سخت نظریں گاڑ کر بولیں۔

"وہ امی! میں نے عدیل کو بتا دیا تھا۔"

"تمہارے خیال میں اس گھر میں صرف عدیل رہتا ہے؟" وہ کڑے لہجے میں بولیں۔

بشریٰ کچھ لاجواب سی ہو کر رہ گئی مشال کبھی ماں کو دیکھتی کبھی دادی کو۔

"دادو آپ....." اس نے دادی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"جاؤ! تم اندر جا کر کمرے میں کھیلو۔" دادی نے اسے جھڑک دیا۔

مشال کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

"مشال! آپ روم میں چلو۔" بشریٰ اسے اشارہ کر کے بولی۔ وہ سست قدموں سے اندر چلی گئی اور دروازے کے پاس رک کر دیکھنے لگی۔

"امی! میں رات کو جلدی آ جاؤں گی۔ عمران ہی مجھے ڈراپ کر جائے گا۔" وہ لہجے کو کچھ نرم کر کے بولی۔

"اب تم سے واپسی کی کون بات کر رہا ہے؟ میں تو ابھی یہ تمہارے جانے کی بات کر رہی ہوں۔ تم مجھے بتائے بغیر جا رہی تھیں۔ یہ حیثیت ہے تمہاری نظر میں میری؟" نسیم کڑک کر بولیں۔

"نہیں امی! یہ بات نہیں۔ میں نے عدیل....."

"ایک عدیل ہی تمہیں ملا؟ معصوم کاٹھ کا الو، موم کی ناک جدھر چاہتی ہو گھما لیتی ہو۔ ہم تو بھیا نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ تم ہمیں کیوں نہ جوتے کی نوک پر رکھو گی۔ خصم کے سر چڑھو، ساس نند جائے جہنم میں۔" نسیم تو بھڑک ہی اٹھیں۔

بشریٰ گھبرا گئی۔ اسے ساس کے اتنے سخت ردِعمل کی توقع نہیں تھی، بلکہ اسے یقین تھا کہ عدیل پہلے سے فون کر کے ماں کو اس کے جانے کا بتا چکا ہوگا۔

"امی! یقین کریں میں نے عدیل سے پوچھا اور یہ بھی کہا کہ آپ سے اجازت لے لیتی ہوں تو وہ کہنے لگے کہ امی سے میں خود بات کر لیتا ہوں۔ تم چلی جاؤ۔" اس نے اپنے دفاع کے لیے فراٹے سے جھوٹ گھڑا۔

"امی مٹی کی مادھو، اللہ میاں کی گائے جس کو نہ بیٹا کسی شمار میں سمجھے نہ بہو کسی گنتی میں رکھے۔ اٹھے جیب

جیسے تیار ہوئے ——— کپڑے جھٹکے، چوڑیاں چڑھائیں۔ میک اپ تھوپا۔ اور منہ اٹھا کر چل پڑے۔ گھر نہ ہوا سرائے ہو گیا۔ جس کا نہ کوئی طور طریقہ نہ قانون۔" نسیم نے جیسے آج ہی سارے بدلے لینے کی ٹھان لی تھی۔ بشریٰ کو صاف نظر آ گیا، اس کا گھر سے جانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

"امی! میں جاؤں پھر پارلر؟ میں نے شفق کو فون کر کے بلوا لیا ہے۔ وہ آ رہی ہے میرے ساتھ جانے کے لیے۔ مجھے بھی کچھ کام کروانا ہے اپنی اسکن کا۔" فوزیہ تیار حلیے میں عجلت بھرے انداز میں ماں کے پاس آ کر بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"وقت سے ... آ رہے ہیں وہ لوگ۔ تمہیں اس سے پہلے گھر پہنچنا ہوگا۔" نسیم لہجہ بدل کر بیٹی سے متفکر لہجے میں بولیں۔

"امی! فکر نہ کریں۔ 'مائی لک' والی شفق کی دوست ہے۔ وہ پہلے میرا ہی فیشل کرے گی۔ شفق نے اس سے بات کر لی ہے۔" فوزیہ ماں کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"اور یہ جھاڑ جھنکار سے بال بھی سیٹ کروا لینا مگر ٹائم کا خیال رکھنا۔ ثریا انہیں دو گھنٹے میں لے کر پہنچ جائے گی۔ تم یوں کرو ناں اپنے کپڑے بھی ساتھ لے جاؤ۔ وہیں سے تیار ہو کر آ جانا۔" نسیم کو خیال آیا۔

"ہاں! کپڑے تو میں نے رکھ لیے ہیں۔ وہیں سے تیار ہو آؤں گی۔ آپ مجھے پیسے تو دے دیں جلدی سے۔" وہ کچھ کوفت سے بولی۔ اس دوران میں اس نے بشریٰ کی طرف ایک بار بھی نظر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت کی نہ اسے درخورِ اعتنا ہی سمجھا۔

بشریٰ کسی مجرم کی طرح سزا کی منتظر دونوں کی گفتگو ختم ہونے کے انتظار میں کھڑی تھی۔

نسیم نے صبح والے عدیل کے دیے نوٹوں میں سے چار ہزار نکال کر فوزیہ کو دیے۔

"کافی ہیں نا یہ؟" نسیم بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"امی! احتیاطاً پانچ ہی دے دیں۔ آج کل روز تو ہر چیز کا ریٹ بڑھا ہوتا ہے۔"

ماں نے سرہلا کر ہزار روپیہ اور تھما دیا۔ تب ہی باہر ہارن بجا۔

"عدیل اس وقت گھر آ گیا کیا؟" نسیم کچھ تشویش سے بولیں۔

"وہ امی! عمران ہے۔ مجھے اور مشال کو لینے آیا ہے۔"

"تو جاؤ! کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو میرا۔" وہ کر ختگی سے بولیں۔

"وہ امی۔ آپ کی اجازت ہے نا؟"

"جوتی اٹھا کر میرے سر پر مارو۔ میری کیا مجال تمہیں روک سکوں۔" نسیم زور سے بولیں۔ "میں بیوہ، میری بچی یتیم۔ تم میاں بیوی کے ٹکڑوں پر پڑے ہیں۔ اللہ نے خوشی کا موقع دکھایا۔ میری بچی کا رشتہ ہونے جا رہا ہے اور بہو صاحبہ بن ٹھن کر بھیا کے لیے لڑکی پسند کرنے جا رہی ہیں۔ انہیں اس یتیم نند کے رشتے کی کیا پروا۔ دو گھنٹے میں مہمان آنے والے ہیں۔ میں بڑھیا خود ہی اٹھوں گی اور چائے چڑھا لوں گی۔ وہ ہی خالی رکھ دوں گی ان کے سامنے۔ اس کے بعد میری بچی کے نصیب۔ رشتہ ہوتا ہے یا نہیں۔ تم جاؤ بی بی! تمہارے ہاتھ سے بھیا کا رشتہ نہ رہ جائے۔" نسیم دوپٹے کے پلو سے آنکھیں مسلنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"کتنی باتیں سنائی ہیں مجھے عمران نے گھر آ کر۔ غریب دفتر سے جلدی اٹھ کر تمہیں لینے گیا۔ رستے میں زمانے بھر کا رش، دھول مٹی کھاتا گیا اور تم نے دروازے ہی سے اسے موڑ دیا۔ شاباش بھئی! اچھا کیا بہت۔" ذکیہ فون

پر غصے میں بشریٰ کو سنا رہی تھیں۔
"آپ بھی مجھے ہی سنایئے نسیم آنٹی نے جو کسر چھوڑ دی وہ آپ پوری کردیں۔ آج انہوں نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے۔ اگر میں آجاتی آپ کی طرف تو امی! وہ مجھے ہمیشہ کے لیے آپ کے گھر بٹھا دیتیں۔ اتنے غصے اور ... میں میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔" بشریٰ روہانسی ہو کر بولی۔
"بس یوں ہی چوہیا بن کر سسرال والوں کی جوتیاں سیدھی کرتی رہنا۔ مجھے کس شرمندگی سے لڑکی والوں کو منع کروانا پڑا۔ عمران کی باتیں سنیں۔ ماں کی عزت کی کوئی پروا نہیں تمہیں۔"
"امی! بس کریں، میں پاگل ہو جاؤں گی۔ پہلے ساس صاحبہ نے بھگو بھگو کر جوتیاں ماریں مجھے اور اب آپ شروع ہو گئی ہیں۔ ابھی وہ عدیل صاحب آئیں گے تو امی ان کے کان بھریں گی اور وہ آ کر مجھ پر چلانا شروع ہو جائیں گے۔ میں تو جیسے انسان ہی نہیں ہوں۔ نہ میری کوئی عزت نہ عزت نفس جس کا جو جی چاہتا ہے، سنا ڈالتا ہے۔ آپ کو جلدی ہے تو عمران کو لے جائیں ساتھ اور اسی کو لڑکی پسند کروالیں۔ شادی بھی تو اسی کی ہونی ہے۔ اسے ہی لڑکی پسند کروائیں۔ خدا حافظ۔" اس نے روتے ہوئے فون بند کر دیا۔
"مما! دادو کہہ رہی ہیں، کچن کون دیکھے گا آکر۔ مہمان آنے والے ہیں۔" مشال اندر آ کر ماں سے بولی۔
وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے روتی رہی۔
"مما! آپ رو رہی ہیں؟" مشال سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔
"نہیں! قہقہے لگا رہی ہوں۔ اندھی ہو، نظر نہیں آتا تمہیں؟" وہ الٹا اسے جھڑک کر بولی۔ مشال اور بھی سہم گئی۔
"مما... آپ مجھ سے غصہ ہیں؟" وہ بڑی بڑی سنہری آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔
"مما کی جان! میں... آپ سے غصہ نہیں ہوں۔ اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔ اپنی جان سے میں کیوں غصہ ہوں گی۔ مت روئیں آپ۔" وہ فوراً تڑپ کر مشال کو اپنے ساتھ لگا کر بولی۔
"آپ بھی تو رو رہی ہیں۔ دادو نے آپ کو ڈانٹا ہے نا اس لیے۔" مشال چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ماں کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔
"میں پاپا کو بتاؤں گی کہ دادو نے آپ کو نانو کی طرف نہیں جانے دیا۔"
"تمہارے پتھر دل باپ پر کیا اثر ہونا ہے۔ وہ پہلے کون سا راضی تھے کہ میں ادھر جاؤں۔ انہیں تو خوشی ہوتا ہے کہ نہیں گئی۔ اس گھر کے لیے میں اپنی جان بھی دے دوں تو بھی انہیں احساس نہیں ہوگا۔ یہ ہی کہیں گے میری نیت میں کھوٹ ہے۔"
"کیا ہوا بھئی؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بن بادل ساون کیوں برس رہا ہے؟" عدیل خوش گوار موڈ میں کمرے میں داخل ہوا۔ بشریٰ کو روتے دیکھ کر ہنس کر بولا۔
"ارے! تم تو واقعی رو رہی ہو۔ کیا ہوا بشریٰ؟" وہ پاس آ کر اس کا ہاتھ تھام کر تشویش سے بولا۔
بشریٰ نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور باہر نکل گئی۔
"مشال جانو! مما کو کیا ہوا؟" عدیل پریشان ہو کر بولا۔
"دادو نے ڈانٹا ہے۔" مشال کچھ ڈر کر بولی۔
"وہ کیوں؟ لڑائی ہوئی ہے؟" عدیل چونکا۔
"نہیں! مما نے تو لڑائی نہیں کی۔ ہم تو تیار ہو کر نانو کی طرف جا رہے تھے، ماموں کی دلہن دیکھنے۔ ماموں ہمیں لینے بھی آگئے تھے۔"

"... نہیں تم لوگ؟"
"دادو نے ممی کو زور زور سے ڈانٹا اور کہا کہ بے شک چلی جاؤ۔ واپس بھی اپنی مرضی سے آنا اور پتا نہیں کیا ..." وہ رک رک کر بولی۔
عدیل گم صم سا ہو گیا۔
"پاپا! اب ہم نانو کی طرف نہیں جائیں گے کیا؟" وہ باپ کا کندھا ہلا کر بولی۔
"نانو ... تھا؟"
"ہاں! ... فون پر بات کرتے ہوئے رونے لگیں کہ سب ان ہی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ نانو بھی اور دادو بھی۔ سب مما کو کیوں ڈانٹ رہے ہیں پاپا؟" وہ باپ کی پریشان شکل دیکھ کر پوچھنے لگی۔
"نہیں بیٹا! کوئی نہیں ڈانٹ رہا انہیں۔"
"پاپا! آپ پریشان ہیں؟"
"نہیں میری جان! میں کیوں پریشان ہوں گا۔ پھوپھو کہاں ہے تمہاری؟" وہ یوں ہی مسکرا کر بولا۔
"پتا نہیں! شاید اپنی کسی دوست کے ساتھ گئی ہیں۔ تیار ہونے کا کہہ رہی تھیں۔"
عدیل گم صم سے انداز میں جھک کر جوتے اتارنے لگا۔

✿ ✿ ✿

اس بار آنے والے مہمان واقعی مبارک ثابت ہوئے تھے۔
انہوں نے فوزیہ کو پسند کرلیا۔
کمال شاید فوزیہ کے خوب اچھے سے تیار ہونے کا تھا یا واقعی وہ انہیں اچھی لگی تھی۔ فوزیہ کی ہونے والی ساس اور بیاہی نند محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔
"یہ شگن کے پیسے ہیں، بہن جی! انکار نہیں کیجیے گا۔" انہوں نے دو ہزار روپیہ فوزیہ کے ہاتھ پر بخوشی رکھ دیا۔
نسیم اور عدیل پر تو جیسے شادیٔ مرگ طاری ہو گیا۔
کہاں پانچ چھ سالوں سے فوزیہ کا رشتہ ہی نہیں ہو رہا تھا اور کہاں ایک دم سے... نسیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ فوراً کیا بولیں۔
"نہیں بہن جی! یہ ابھی رہنے دیں۔ ہم آئیں گے نا تو..." وہ بدقت کانپتی آواز میں بولیں۔
"آپ آئیں گی تو تب اپنی خوشی پوری کیجیے گا لیکن ہمیں نہیں روکیں۔ ہمیں تو آپ کی بیٹی پیاری ہی اتنی لگی ہے کہ جی چاہتا ہے، ابھی اسے اپنے گھر لے جائیں ہمیشہ کے لیے۔" فوزیہ کی ہونے والی ساس اسے ساتھ لپٹا کر بولیں۔ فوزیہ اور نسیم کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔
"پھر آپ کب آرہی ہیں، ہماری طرف؟" انہوں نے نسیم سے پوچھا۔
"جب آپ کہیں۔ اس ویک اینڈ پر ٹھیک رہے گا عدیل... بشریٰ؟"
ایک دم نسیم کو خیال آیا کہ بہو بیٹے کی شمولیت تو اس معاملے میں سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جس کا نروٹھا چہرہ ... سب تو بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر بھلا ہو فوزیہ کی ساس کی کمزور نظر کا یا اسے فوزیہ کے آگے اور کچھ نظر ہی نہیں ... کہ اس نے بشریٰ کے خفا چہرے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔
"ٹھیک ہے امی! جیسے آپ کہیں۔" عدیل فوراً بولا۔
"ماشاء اللہ بہن جی! بہت سعادت مند بیٹا اور بہو ہے میری۔ میری تو دعا ہے اللہ سب کو ایسی سعادت مند

اولاد دے۔ ایسی نیک طبیعت میری فوزیہ کی بھی ہے۔ سارا وقت یا تو گھرداری کرتی رہے یا پھر نماز قرآن۔ کوئی شغل ہے ہی نہیں اس کا۔ نہ ٹی وی کے بے ہودہ ڈرامے۔ نہ کوئی فیشن کی بیماری۔ میرا تو سمجھو سارا گھر بچی نے سنبھال رکھا ہے۔ بھاوج اور اس میں ایسا دوستانہ ہے، بس! کوئی غیر آئے تو وہ دیکھ کر مانے ہی نہ کہ یہ بھاوج ہیں جیسے دو سہیلیاں ہوں یا دو بہنیں۔ ایسی بھلی مانس طبیعت ہے میری بہو اور بیٹی کی۔" نسیم نے ایک تیر سے دو شکار کیے بلکہ تین شکار۔

بشریٰ کا دل جیتنے کی ناکام کوشش کہ ابھی تو وہ فوری طور پر ساس کے اس دورخے رویے سے سخت بددل تھی مگر شوہر کی وجہ سے بہت سنبھلی ہوئی بیٹھی تھی اور فوزیہ اس کی دوست، سہیلی بہن۔

اس کا جی چاہا زور زور سے ہنسنے لگے۔ اس کی ساس سمجھتی ہے کہ ساری دنیا کی آنکھیں خراب ہیں۔ ان میں موتیا اترا ہوا ہے، جو انہیں اس نند بھاوج کے رشتے میں ایسا پیار دکھے۔

"ہونہہ! بدعقل عورت کے۔" بشریٰ کے دل میں کھولن بڑھتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف فوزیہ کی ہونے والی ساس تو جیسے فوزیہ پر اور بھی والہ و شیدا ہونے لگیں۔ پٹ لپٹ کر اسے خوب پیار کرنے لگیں۔

"منافق عورتیں۔" وہ کڑھتی ہوئی اٹھ کر چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

نسیم اور فوزیہ کی ساس کے درمیان اگلی تفصیلات طے ہونے لگیں۔

رشتہ کرانے والی کے چہرے پر بھی خوشی کے مارے جیسے ہزار واٹ کا بلب جگمگا اٹھا تھا۔ اس کی سات سالہ محنت بر آنے لگی تھی۔ دونوں طرف سے خوب ملنے کی آس جو بندھ گئی تھی۔

"اور میرے بھائی کی خوشیاں کیسے اس عورت نے خاک میں ملادیں۔ ہم لڑکی دیکھنے بھی نہ جاسکے۔ مطلبی، خود غرض بے حس لوگ۔" وہ کچن میں برتن پٹخ پٹخ کر رکھنے لگی۔ مشال ذرا ذرا دیر بعد کبھی آکر ماں کو دیکھ جاتی اور کبھی ڈرائنگ روم میں باپ کے پاس جاکر گود میں چڑھ جاتی۔

"دادی اور پھوپھی کا موڈ خوش گوار ہوتے ہی پاپا بھی کیسے چہکنے لگتے ہیں۔" وہ باپ کی خوشی میں کھنکتی آواز پرشوق انداز میں سننے لگی اور کبھی ٹکٹکی جما کر باپ کا چہرہ دیکھنے لگتی۔ اسے اپنے باپ کو دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"پاپا ایسے بات کرتے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ ہنس بھی نہیں رہے اور لگ رہا ہے جیسے ابھی ہنس پڑیں گے۔ اتنے خوش تو وہ صرف مما کے ساتھ ہوتے ہیں، جب دونوں رات کو ویک اینڈ پر فارغ ہو کر خوش گوار موڈ میں باتیں کرتے ہیں، مگر آج تو لگتا ہے دونوں میں خوب لڑائی ہوگی۔ مما کا موڈ سخت آف ہے۔ وہ آسانی سے تو پاپا سے بات نہیں کریں گی، لیکن پاپا کو بھی انہیں منانا آتا ہے۔ میں پاپا کا ساتھ دوں گی۔ ہم دونوں جلدی سے مما کو راضی کرلیں گے۔" وہ باپ کے چہرے کو دیکھ کر سوچتی چلی گئی۔

"اب غصہ جانے دو بشریٰ! یقین کرو۔ میں ان کو فون کر کے بتانے ہی والا تھا تمہارے جانے کے بارے میں کہ باس نے اچانک اپنے کمرے میں بلالیا۔ وہیں گھنٹے بھر کی میٹنگ ہوگئی اور باہر نکلا ہوں تو آف ہونے ہی والا تھا۔ یقین کرو! میں تو تمہیں لینے کے لیے آنے والا تھا۔" عدیل مسلسل اس کی منتیں کیے جا رہا تھا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ پلیز! مجھے تنگ نہیں کریں۔ سونا ہے مجھے۔"

"اچھا! سو جانا، مگر پہلے مجھ سے بات تو کرو۔" عدیل اس کے اوپر سے چادر کھینچ کر بولا۔

"بات کر تو رہی ہوں اور کیسے بات کروں۔" وہ پھر سے چادر کھینچ کر غصہ میں بولی۔

"اس طرح بات کرتے ہیں کیا؟"

"اور کس طرح بات کرتے ہیں؟ اب آپ بات کرنا سکھائیں گے مجھے؟ آپ کی والدہ صاحبہ نے جی بھر کر میری کلاس لی۔ اب آپ مجھے پڑھائیں۔ چھوڑیں مجھے۔" وہ پھر سے چادر کھینچنے لگی۔

"اچھا! اگر کل میں آفس سے آف کرلوں اور تمہیں صبح ہی آنٹی کی طرف لے چلوں، پھر تو راضی ہو جاؤ گی نا؟" عدیل نے آخری حربہ آزمایا۔

"مجھے اب کہیں نہیں جانا۔ امی کی طرف تو اب کبھی نہیں۔ آپ کو چھٹی کرنی ہے تو سو بار کریں، مگر میری خاطر نہیں۔ میں نہیں جانے والی اور پلیز! اب مجھے سونے دیں۔ سارا دن نوکروں کی طرح کام کیا ہے میں نے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، اگر مجھے اب تھوڑا آرام کرلینے دیں گے تو۔" بشریٰ کے موڈ سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی صورت راضی نہیں ہوگی۔

"مما! پلیز مان جائیں نا۔ دیکھیں تو پاپا کتنے پریشان ہیں۔" مشال ماں سے بولی۔

"تم سوئیں نہیں ابھی تک؟ معلوم ہے نا! صبح اسکول جانا ہے۔" بشریٰ اسے جھڑک کر بولی۔

"جب تک آپ مانیں گی نہیں، نہ میں سوؤں گی، نہ پاپا اور صبح نہ میں اسکول جاؤں گی، نہ پاپا آفس جائیں گے... ہے نا پاپا؟" مشال باپ کی شہ پاکر چہکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آف کورس میری جان!" عدیل اسے ساتھ لپٹا کر بولا۔

"تو پھر بہتر ہے میں اٹھ کر کہیں اور چلی جاتی ہوں۔ یہاں مجھے کوئی سونے نہیں دے گا۔" وہ تکیہ اٹھا کر جانے لگی۔

"تم جہاں جاؤ گی ہم وہیں تمہارے پیچھے آجائیں گے۔ کیوں مشی جان؟" عدیل اسے روک کر بولا۔

"عدیل! چھوڑیں نا مجھے۔" وہ زچ آکر بولی۔

"اتنی آسانی سے تو چھوڑ نہیں سکتا آپ کو ڈارلنگ!" وہ چھیڑ کر بولا۔

"مشال ہے، کچھ تو خیال کریں۔" وہ کچھ جھینپ کر شوہر کو گھور کر بولی۔

"مما! میں نے آئیز کلوز کرلی ہیں۔ پلیز! اب آپ ہنس دیں۔" مشال معصومیت سے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بے ساختہ بولی تو عدیل اور بشریٰ اپنی ہنسی روک نہیں سکے۔

"بھئی! جو کام ہم نہیں کرسکے، ہماری مشال نے کر دکھایا۔ مشال ڈیئر! تھینکس۔" عدیل اسے پیار کر کے بولا۔

"پاپا! خالی تھینکس نہیں چلے گا۔" وہ دونوں کے درمیان بیٹھ کر اٹھلا کر بولی۔

"تو پھر کیا چلے گا جانو!"

"کل کی چھٹی اور مزے۔ مما کو ڈھیر ساری شاپنگ۔ مما اور کیا کنڈیشن لگاؤں، جلدی سے بتادیں۔ اس وقت پاپا سب کچھ مان لیں گے۔" وہ ماں سے رازداری سے بولی تو دونوں ہنسنے لگے۔

"آپ زیادہ دیلی جمالو نہیں بنیں۔ ہمیں اپنی ٹرمز اور کنڈیشنز طے کرنی آتی ہیں۔" عدیل اس کے ریشمی بال بکھرا کر بولا۔

"آپ خوش نہیں ہوں مما! ابھی مانیں نہیں..... ہے نا مما؟" وہ جلدی سے بولی تو بشریٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر کیسے مانیں گی آپ کی مما؟" عدیل بشریٰ کو شریر نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"ہم تو جانتے ہیں، یہ کیسے مانیں گی۔"

بشریٰ نے عدیل کو زور سے چٹکی کاٹی۔ اور مشال کو کھینچتے ہوئے لے جانے لگی۔

"کچھ پتا نہیں کہ صبح اسکول بھی جانا ہے۔ دیر سے سوؤ گی تو اٹھو گی کیسے صبح؟"

☆ ☆ ☆

"آپ سچ کہہ رہی ہیں امی۔" عدیل ابھی آفس سے آیا تھا۔ بیگ رکھا ہی تھا کہ ماں کی بات سن کر بے یقینی سے دیکھنے لگا۔

"تو تو اتنی بڑی بات میں کیا جھوٹ بولوں گی۔ بشریٰ بیٹی! آ کر ذرا بتاؤ تو عدیل کو کہ کیا تھا نا ابھی فوزیہ کی ساس کا فون؟"

بشریٰ مسکراتے ہوئے کچن سے نکل کر آئی۔

"جی! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں عدیل۔ آنٹی تو اتنی بے قرار ہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آج ہی بارات لے کر آ جائیں۔ امی نے جب انہیں فون کر کے بتایا کہ ہمیں آپ کا بیٹا بہت اچھا لگا ہے اور واقعی ظہیر میں ایسی کوئی بات ہے بھی نہیں کہ بندہ انکار کر سکتا۔ فیملی بھی اچھی ہے' جاب بھی ٹھیک ہے اس کی پھر اپنی فوزیہ کا رشتہ چاہ سے مانگ رہے ہیں تو اور کیا چاہیے۔ آپ بتائیں کیا کہتے ہیں؟" بشریٰ ساس کے پاس جا کر بشاشت سے بتانے لگی۔

عدیل کچھ متذبذب سا ہوا۔

"کیوں عدیل! چپ کیوں ہو گئے؟" نسیم بیٹے کو دیکھ کر کچھ پریشان ہو کر بولیں۔

"نہیں امی! ایسی بات نہیں۔ اگر آپ کو یہ رشتہ پسند ہے۔"

"تجھے پسند نہیں کیا؟ لڑکے کے بارے میں ساری معلومات بھی تو تو نے ہی کرائی ہیں۔" نسیم پریشان سی ہو گئیں۔

"نہیں امی! وہ سب ٹھیک ہے' لیکن خالی نکاح کرنا۔ میرا مطلب تھا' ہماری تیاری ہے تو سہی۔ تو کیوں نہ انہیں کہیں کہ مہینے دو مہینے میں شادی رکھ لیتے ہیں۔" عدیل بیوی کی طرف دیکھ کر بولا۔ بشریٰ کی منشا بھی یہ ہی تھی کہ رخصتی بھی ہو جائے۔

"میں نے بھی یہ ہی بات کی تھی تو نسرین بہن کہنے لگیں کہ انہیں گھر میں کنسٹرکشن کچھ کا کام کروانا ہے۔ اس میں کافی ٹائم لگے گا اور انہوں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ ان کی نند اپنی بیٹی دینا چاہ رہی ہے اپنے بیٹے کو تو اس چخ چخ سے بچنے کے لیے وہ نکاح کرنا چاہ رہی ہیں۔" نسیم نے تفصیل سے بتایا۔

"تو بس ٹھیک ہے' پھر آپ انہیں کہہ دیں اور بیٹھ کر نکاح کی کوئی تاریخ طے کر لیتے ہیں۔" عدیل سر ہلا کر بولا۔

"لا بشریٰ! فون دے۔ میں انہیں بتا دوں۔ بے صبری سے انتظار کر رہی ہوں گی۔" نسیم فوراً ہی بولیں۔ بشریٰ نے اٹھ کر ساس کو فون دیا۔ وہ نمبر ملا کر بات کرنے لگیں۔ بشریٰ اور عدیل بھی وہیں بیٹھے رہے۔

☼ ☼ ☼

فوزیہ دلہن بنی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اگرچہ اس کے نقوش بہت عام سے تھے مگر دلہناپے کا روپ تو عام سے چہرے کو بھی خاص بنا دیتا ہے نکاح ہوتے ہی سب ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ یوں بھی زیادہ لوگ نہیں تھے۔ صرف سترہ لوگ لڑکے والوں کی طرف سے اور ان کے بھی قریبی عزیز ہی مدعو تھے۔ ظہیر کو فوزیہ کے ساتھ لا کر بٹھا دیا گیا۔ سب دونوں کو دیکھنے لگے۔ بشریٰ ظہیر کو دیکھتے ہوئے کچھ ٹھٹک سی گئی۔

(باقی آئندہ)

مصباح خادم

وہ ایک خوددار اور اصول پرست لڑکی تھی۔ سچائی اپنا منشور ماننے والی۔ جھوٹ اور دھوکے سے کچھ بھی حاصل کرنا خواہ وہ محبت ہو یا کامیابی' اس کے لیے قابل نفرت تھا۔ کیونکہ اس کی اپنی نظر میں بھی اس کی ذات کی کوئی عزت تھی' وقار تھا جو اس کے لیے سب سے زیادہ اہم تھا اور جسے نقصان پہنچانے کی اجازت وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دے سکتی تھی۔ لیکن آج اسی شخص نے کہ جسے اس کا سرپرست مقرر کیا گیا تھا۔ اس کی خودداری اور وقار کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

وہ جو دو سال سے اسے جانتا تھا۔ اس کے مضبوط کردار اور سچائی کا گواہ۔ اس کی اصول پسندی کا شیدائی۔ آج کس یقین سے بولا تھا۔

"ثمن... یہ اچھا نہیں کیا تم نے۔" اور وہ ساکت سی کتنی دیر بے یقین نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر بنا اپنی صفائی میں کچھ کہے زور زور سے نفی میں سر ہلاتی واپس اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی تھی۔ یہ کہتی وہ اپنی صفائی میں اور کیوں... وہ رشتوں میں محبت سے پہلے عزت اور اعتبار کو مقدم رکھتی تھی۔

عزت اور اعتبار... جو رشتوں کے وجود میں اس کے لیے سانسوں کی طرح اہم تھے جنہیں آج اس کی ذات پر اٹھی ارسلان کی ایک بے اعتباری نظر نے ہمیشہ کی نیند سلا دیا تھا اور جب کسی رشتے میں یہ دونوں چیزیں ختم ہو جائیں تو اس کی حیثیت اس کھوکھلے مکان کی سی ہو جاتی ہے جسے بے اعتباری کی ہلکی سی ضرب بھی ڈھا دیتی ہے۔

ثمن ملاوٹ سے پاک پُر خلوص رشتے نبھانے پر یقین رکھتی تھی' امتحان بن جانے والے مجبوری کے تعلق نہیں... جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ آپ کے دامن کو صرف پچھتاوے دان کرتے ہیں وہ پچھتاووں سے بھرا مستقبل نہیں جینا چاہتی تھی' اسی لیے اس نے اپنی زندگی کا مشکل اور تلخ ترین فیصلہ کیا اور آنسو صاف کرتے ہوئے مضبوط قدموں سے الماری کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ نئی نئی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے فارغ ہوئی تھی جب اسے رزاق اینڈ کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ حالانکہ اس کی تعلیم کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتی اس فرم سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا' مگر بزنس سے متعلق اس کی معلومات اور خود اعتمادی نے ایم ڈی رزاق صاحب کو اس کا انتخاب کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور وہیں اس کی ملاقات ارسلان سے ہوئی۔

اسے ہفتہ ہوا تھا اس کمپنی میں ملازمت اختیار کیے جب ایک دن رزاق صاحب نے اسے کچھ فائل تھمائیں۔ یہ ان کی کمپنی کے پچھلے پانچ سال کا ریکارڈ تھا۔ کن کمپنیوں کے ساتھ کاروبار کیا... کتنا مال سپلائی کیا' کتنی رقم وصول کی... کس سال کتنا فائدہ ہوا اور کتنا نقصان... یہ تمام معلومات ان فائلز میں درج تھیں' جنہیں اسے ایک فائل میں مختصراً ترتیب سے لکھنے کا کام سونپا گیا تھا اور جو اسے سہ... تک مکمل بھی کرنا تھا۔

اب صبح سے ہی اس کے سر میں شدید درد تھا اور کسی طور خود کو اس ذہنی مشقت کا متحمل نہیں پا رہی تھی' لیکن کام بھی ضروری تھا اس نے ... آفس کو بیگ اور نئی نئی دوست بنی آسیہ سے درخواست کی کہ وہ اس کی مدد کرے۔

آسیہ پُر خلوص اور احساس کرنے والی لڑکی تھی۔ اس کی تکلیف دیکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر فائلز لیں اور کام میں جت گئی... نتیجتاً سہ پہر تک فائل مکمل تھی۔ وہ اس کا بہت بہت شکریہ ادا کرتی فائل لے کر رزاق صاحب کے آفس چلی گئی' جہاں ان کے ساتھ ارسلان پہلے سے موجود تھا۔ وہ ثمن سے سال سے اس کمپنی میں ملازم تھا اور ترقی کے زینے طے کر کے خاصی اہم پوسٹ پر پہنچ چکا تھا۔

"سر... یہ فائل۔" اس نے فائل رزاق صاحب کے سامنے رکھی تو وہ جو ارسلان سے کسی دفتری معاملے پر بحث کر رہے تھے فائل کی طرف متوجہ ہو گئے... اور پھر جوں جوں وہ صفحات پلٹتے گئے ان کے چہرے پر ستائش ابھرنے لگی۔

"ارے واہ مس ثمن... آپ نے تو بہت اچھا کام کیا ہے اور وہ بھی اتنے کم وقت میں... اٹس رئیلی امیزنگ۔"

فائل بند کر کے وہ جب اس کی جانب متوجہ ہوئے تو الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کی نگاہیں بھی بھرپور توصیفی انداز لیے ہوئے تھیں۔ وہ متانت سے مسکرا دی۔

"بہت شکریہ سر... مگر اس تعریف کی اصل حق دار میں نہیں' بلکہ آسیہ ہے' کیونکہ یہ فائل اسی نے تیار کی ہے۔"

سچائی کا عکس چہرے پر لیے اس نے انہیں حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ ساتھ بیٹھے ارسلان نے بے اختیار چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے تھے جبکہ رزاق صاحب کے چہرے پر [illegible] کے۔

"مگر میں نے تو یہ فائل آپ کو تیار کرنے کے لیے دی تھی پھر آپ نے مس آسیہ کو یہ کام کیوں دیا؟"

"سوری سر... میں معافی چاہتی ہوں مگر یقین کریں صبح سے میرے سر میں اتنا درد تھا کہ میں باوجود کوشش کے یہ کام نہیں کر سکی' اسی لیے مجھے آسیہ کی مدد لینی پڑی۔"

"اگر آپ کے سر میں اتنا درد تھا تو آپ مجھے صبح ہی بتا دیتیں۔ میں یہ کام کسی اور کو سونپ دیتا۔" اس کی خرابی طبیعت کا سن کر انہوں نے نرم لہجے میں کہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"بتا تو دیتی سر... مگر اپنی جاب کے پہلے ہی ہفتے اپنے باس کو انکار کر کے مجھے اپنی شامت نہیں بلوانی تھی۔ اسی لیے خاموش رہی۔" اس کے لہجے سے جھلکتی شرارت پر رزاق صاحب خود بھی مسکرا دیے تھے۔

"نہیں مس ثمن... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بہرحال آپ جا کر مس آسیہ کو بھیجیے... اور آئندہ ایسا کوئی بھی مسئلہ ہو تو بلا جھجک مجھ سے کہیے گا' آپ کی شامت نہیں آئے گی۔"

"جی سر۔" وہ مسکراتی ہوئی اپنے کیبن کی طرف گئی اور آسیہ کو رزاق صاحب کا پیغام پہنچا دیا۔ جونہی آسیہ وہاں سے گئی' ارسلان فوراً اس کے نزدیک آیا۔

"آپ کو پتا ہے... آپ بہت عجیب ہیں مس ثمن... آج کل کے دور میں کہ جب لوگ با آسانی اور بڑی خود اعتمادی سے دوسروں کی محنت اپنے کھاتے میں ڈال کر ترقی کے زینے طے کرتے جاتے ہیں اور اس پر برملا فخر بھی کرتے ہیں' آپ نے بغیر کسی پس و پیش کے خود وہ کریڈٹ کسی اور کی جھولی میں ڈال دیا... کیا آپ کو ترقی سے کوئی سروکار نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے مسٹر ارسلان... بالکل ہے' مگر صرف ایسی ترقی سے جو میری محنت کے بل بوتے پر ملے۔ ایسی ترقی سے مجھے واقعی کوئی سروکار نہیں ہے جس میں کسی اور کی محنت مجھے اپنے ریکارڈ میں درج کرانی پڑے۔ کیونکہ میرے لیے میرے ضمیر کا اطمینان سب سے زیادہ اہم ہے... اور جس چیز کے لیے مجھے خود اپنی ہی نظروں سے گرنا پڑے' میں اس کا انتخاب کبھی نہیں کروں گی۔ خواہ اس کے لیے مجھے کامیابی سے ہاتھ دھونا پڑے یا زندگی سے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوطی سے بولی تھی۔ اس کا لہجہ ٹھوس تھا' بغیر کسی کمزوری کے... اور اس کا یہی انداز ارسلان کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ آج کل جب مردوں میں بھی مضبوطی نام کو رہ گئی تھی' ایک عورت کا اپنے اصولوں کے لیے اتنا بے لچک رویہ... اس کے دل میں محبت کی قندیلیں روشن کر گیا تھا اور اس کے کردار کی پختگی اور بے نیازی ہر بار انہیں مزید جگمگا دیتی تھی۔

یونہی ایک سال گزر گیا... ارسلان نے اسے ہمیشہ اور ہر قسم کے حالات میں اپنے اصولوں پر ایسا ہی مستحکم پایا تھا جیسا پہلے دن... اور تب ہی اس نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا... ثمن کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا' یوں ایک سہانی شام وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔

☼ ☼ ☼

ارسلان بہت خوش تھا۔ اس نے ثمن کو منہ دکھائی کا کنگن پہناتے ہوئے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ پوچھا تھا۔

"ہاں تو مسز ارسلان اطہر صاحبہ... ہمارے اس نئے تعلق کے بارے میں آپ کے کوئی اصول و ضوابط نہیں ہیں کیا...؟" وہ اس کی شرارت سمجھ کر دھیرے سے مسکرائی۔

"کیوں نہیں ہیں... بالکل ہیں۔" پھر پُر سوچ نظروں سے اپنے حنائی ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

"لیکن مذاق سے قطع نظر ارسلان! میں رشتوں کو

کبھی وہ بزور نہیں بلکہ دل کی خوشی سے نبھانے پر یقین رکھتی ہوں اور میرے لیے دل کی خوشی کے تمام سرے عزت اور اعتبار کی ڈور سے بندھے ہیں۔ اس لیے میری آپ سے صرف یہی ریکویسٹ ہے کہ ہمارے تعلق کی مضبوطی اور پائیداری کے لیے اس ڈور کو کبھی ٹوٹنے مت دیجیے گا۔ محبت بھلے مجھے کم دیں۔۔۔ مگر میری ذات کی عزت اور ہمارے رشتے کا اعتبار کم نہ ہونے دیجیے گا' میرا وعدہ ہے۔ میں آپ سے کبھی کوئی شکایت نہیں کروں گی۔"

"اور کیا میں تمہیں شکایت کا موقع دوں گا؟" وہ نرمی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا تھا۔

"میں بھی تم سے وعدہ کرتا ہوں ثمن۔۔۔ کہ خود کو تمہاری ذات کا فخر بناؤں گا اور کبھی تمہاری عزت اور اعتبار پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میں نے تم سے تمہارے اصولوں سمیت محبت کی ہے اور میں ان دونوں چیزوں کی حفاظت کروں گا۔۔۔ تمہاری بھی۔۔۔ اور تمہارے اصولوں کی بھی۔۔۔"

اس کے ہاتھ کو دھیرے سے دباتے ہوئے ارسلان نے اسے یقین دلایا تھا اور اس نے بھی یقین کرلیا تب ہی تو اس کے کہنے پر کہ اسے گھریلو عورتیں پسند ہیں' اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر گھر کا انتظام سنبھال لیا۔

☆ ☆ ☆

کام کاج سے فراغت کے بعد بھی ثمن کے پاس وقت کی فراوانی ہوتی تھی۔ جو وہ کبھی ٹی وی دیکھ کر تو کبھی مطالعہ کرکے پاس کرتی تھی۔ حالانکہ گھر میں ارسلان کی اماں فاخرہ بیگم بھی موجود ہوتی تھیں لیکن وہ ثمن سے بالکل الگ تھلگ اور کٹی کٹی رہتیں۔ ایک دوبار ثمن نے ان کے پاس بیٹھنے کی کوشش کی مگر ان کا سرد اور اجنبی رویہ دیکھ کر خاموشی سے اٹھ گئی۔

ان کا بھی وہی روایتی مسئلہ تھا کہ وہ ارسلان کی شادی اپنی بھانجی سے کروانا چاہتی تھیں۔ وہ اپنی بہن کو زبان بھی دے چکی تھیں مگر ارسلان نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اور ماں سے لڑ کر زبردستی ثمن سے شادی کرلی۔ تب ہی وہ ثمن کو پسند نہیں کرتی تھیں۔۔۔ مگر انھوں نے ثمن کے خلاف محاذ بھی نہیں کھولا تھا۔

وہ جیسے ارسلان کی غیر موجودگی میں اس سے لاتعلق رہتی تھیں ایسے ہی اس کے آنے پر بھی اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ مگر ان کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ ارسلان کو اس کے خلاف بھڑکاتی نہیں تھیں اور نہ ہی جھوٹے سچے قصے سنا کر اسے ان سے متنفر کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔

اس لیے ان کی بے ضرر سی خاموشی کے ساتھ ثمن نے سمجھوتا کرلیا تھا اور ویسے بھی وہ زبردستی ان کے سر پر مسلط نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ انھیں پوری رضامندی کے ساتھ خود کو قبول کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی اس لیے خاموشی سے ان کی ضروریات کا خیال رکھتی رہی۔۔۔

اسی دوران عید کا مبارک موقع بھی آگیا۔ ارسلان اچانک ہی اس کے لیے عید کی شاپنگ کر لایا تھا۔ بے حد خوب صورت اور اسٹائلش سی انارکلی فراک، ہم رنگ چوڑیوں اور سینڈلز کے ساتھ۔۔۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ارسلان اتنی اچھی خواتین کی شاپنگ کرلیتا ہے۔ ساتھ اماں کا سوٹ بھی تھا۔ انگوری رنگ کا بے حد نفیس کام والا وہ اس کی تعریف کر رہی تھی جب ارسلان نے اچانک کہا۔

"میں چاہتا ہوں ثمن۔۔۔ کہ یہ سوٹ تم اپنی طرف سے اماں کو دو۔ شاید اس بہانے ان کا دل تمہاری طرف سے نرم ہو جائے۔" ثمن نے سنجیدگی سے اسے دیکھا' پھر گہرا سانس بھر کر بولی۔

"نہیں ارسلان۔۔۔ میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں کبھی بھی ان کو دھوکا دے کر یا جھوٹ بول کر ان کی محبت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ یہ سوٹ آپ ان کے لیے لائے ہیں اور آپ ہی انھیں دیں گے۔ اگر ان کا دل میری طرف سے نرم ہونا ہوا تو اس خدمت سے ہی ہو جائے گا جو میں واقعی خلوص سے ان کی کرتی ہوں۔۔۔ ورنہ مجھے ایسے حالات سے بھی کوئی شکوہ نہیں۔۔۔"

اس نے آہستگی سے اپنی بات مکمل کی اور ارسلان جانتا تھا کہ وہ واقعی ایسا ہی کرے گی۔ اس نے سراہتے ہوئے فخریہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"تم بالکل نہیں بدلی ثمن۔۔۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم کبھی بدلو بھی نہیں' کیونکہ خالص پن تمہاری اصل خوب صورتی ہے۔"

وہ تو واقعی نہیں بدلی تھی' مگر وہ خود کو بدلنے سے نہ روک سکا۔ وہ جو اسے اس کے اصولوں سمیت چاہنے کا دعوا کرتا تھا۔ جس نے ہمیشہ اس کی عزت اور اعتبار کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔۔۔ پہلے ہی امتحان میں ایسا ناکام ہوا کہ ثمن ششدر رہ گئی۔ اس کی ذات کا فخر بننے کا عہد کرنے والا ہی اس کی اٹھی ہوئی گردن جھکا گیا تھا۔

یہ کیسی محبت تھی اس کی۔۔۔ جس نے اسے مجرم ٹھہراتے ہوئے کسی ثبوت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

وہ ہفتے کا دن تھا۔ ارسلان حسب معمول آفس جا چکا تھا جب اماں کافی دنوں بعد اپنی بہن کے گھر جانے کے لیے کمرے سے نکلیں۔ وہ ٹی وی لاؤنج سے گزر کر دروازے کی طرف جا رہی تھیں' جب صفائی کرتی ثمن نے انھیں پکار لیا۔

"اماں! آپ کب تک لوٹیں گی؟" ارسلان صبح ہی اسے ان کے جانے کے متعلق بتا چکا تھا اسی لیے اس نے تمہیداً پوچھا۔

"شام تک۔۔۔" ان کا جواب ہمیشہ کی طرح مختصر تھا۔ وہ ثمن سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتی تھیں' مگر وہ پھر بھی ان سے کچھ کہنے یا پوچھنے میں ہچکچاتی نہیں تھی۔۔۔ اب بھی فوراً ہی مطلب کی بات پر آگئی۔

"وہ دراصل میں گھر کی صفائی کر رہی تھی تو سوچا آپ کی الماری بھی صاف کر دوں۔۔۔ کافی دن ہو گئے۔" اس نے حسب معمول ہفتہ وار صفائی کے دن ان سے پوچھا تھا۔ کبھی وہ اجازت دے دیتیں اور کبھی منع کر دیتیں۔ آج بھی انھوں نے اپنی رضامندی دے دی تھی۔

"ٹھیک ہے' کر دو۔" وہ چلی گئیں اور ثمن اپنے کاموں میں مگن ہو گئی۔ سارے گھر کے ساتھ اماں کا کمرا بھی صاف کیا۔ الماری میں ان کی چیزیں ترتیب سے رکھیں اور اندر باہر سے اسے بھی چمکا کر رکھ دیا۔ اماں واپس آکر حسب معمول خاموشی سے کمرے میں گھس گئیں۔

کوئی بات' نہ تعریف اور نہ ہی تنقید۔ وہ بھی اپنے کاموں میں جتی رہی۔ دن یونہی بیت گیا اور وقت کے بے دریغ لٹتے خزانے میں سے ایک نئی صبح ان کی جھولی میں آگری۔۔۔ اور نئی صبح ہمیشہ ہی امید اور خوشی کا پیغام نہیں لاتی۔ بعض اوقات نئی صبحیں اماوس کی رات سے بھی زیادہ تاریک ثابت ہوتی ہیں' جو آپ کی زندگی سے تمام روشنی' تمام اجالے نوچ کر لے جاتی ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی صبح تھی۔ وہ ارسلان کی فرمائش پر آلو کے پراٹھے بنا رہی تھی کہ اماں کے کمرے سے اٹھتی چیخ و پکار نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔

وہ زور زور سے ارسلان کو آوازیں دے رہی تھیں۔ ثمن ہڑبڑا کر جلدی سے کمرے کی طرف بھاگی اور گہری نیند سوئے ارسلان کو اٹھایا۔ پہلے پہل تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے مگر اس کے دوبارہ بتانے پر وہ بھی کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھا۔

بھاگتے دوڑتے۔۔۔ دونوں جب ان کے کمرے میں پہنچے تو وہ الماری کا پٹ تھامے پریشان کھڑی تھیں۔ ارسلان تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔

"کیا بات ہے اماں۔۔۔ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں لگ رہی ہیں؟ خیریت تو ہے ناں۔۔۔؟" ارسلان کے پوچھنے کی دیر تھی ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"خیریت کہاں کی بیٹا! میں تو خالی ہاتھ رہ گئی۔۔۔ تمہاری نانی کی آخری نشانی۔۔۔ وہ دو تولے کا کنگن تھا ناں' وہ کہیں کھو گیا ہے۔"

"کھو گیا ہے؟" ارسلان نے حیرت سے سنا۔

"کہاں کھو سکتا ہے اماں! آپ نے اچھی طرح دیکھا تھا' یہیں کہیں ہو گا۔" وہ آگے بڑھ کر چیزیں الٹ پلٹ کر

دیکھنے لگا۔ اماں نے مایوسی سے سر ہلایا۔
"نہیں ہے ارسلان۔۔۔ میں صبح سے الماری کا کونا کونا چھان چکی ہوں، کہیں نہیں ہے۔ سارا زیور تمہاری شادی پر چڑھا دیا تھا۔ ایک وہی تو بچا تھا میرے پاس۔۔۔ وہ بھی۔" وہ شدت جذبات سے بات مکمل نہ کر سکیں اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دیں۔
"اماں۔۔۔!" ارسلان نے الماری چھوڑ کر انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔
"پلیز روئیں تو نہیں۔۔۔ ہم ڈھونڈ رہے ہیں ناں! ابھی مل جائے گا۔ اچھا یہ بتائیں آپ نے اسے آخری بار کہاں دیکھا تھا؟" ارسلان نے تسلی دیتے ہوئے پوچھا تو وہ آنسو پونچھتے ہوئے پژمردہ سی بولیں۔
"ارے آخری بار کیا بیٹا! ابھی کل صبح ہی تو دیکھا تھا۔ تمہیں تو پتا ہے مجھے شروع سے ہی عادت نہیں ہے زیور تالے میں رکھنے کی۔۔۔ اپنا گھر ہے، اعتبار والے شوہر اور بچے۔۔۔ کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ یہیں لکڑی کے ڈبے میں پڑا رہتا تھا۔ کل کرایہ نکالتے ہوئے نظر پڑی۔ پھر میں تو تمہاری خالہ کے گھر چلی گئی اور پیچھے سے ہی کوئی ہاتھ صاف کر گیا۔ آج صبح دیکھا تو غائب۔۔۔ سارا گھر کھنگال مارا، پر ہوتا تو ملتا ناں! خدا جانے کس بدنیت کی نظریں تھیں، میری ماں کی آخری نشانی کو بھی نہ چھوڑا۔"
"کون ہو سکتا ہے جو اماں کی غیر موجودگی میں ان کے کمرے تک آیا ہو؟ کوئی قریبی عزیز۔۔۔؟" اس کا انداز پُرسوچ تھا پھر وہ ثمن کی طرف متوجہ ہوا۔
"ثمن! کل اماں کے جانے کے بعد کوئی گھر آیا تھا؟ کوئی رشتے دار یا پڑوس سے۔۔۔؟"
"نہیں ارسلان! کوئی نہیں آیا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ کوئی آتا تو میں ہی کھولتی ناں۔۔۔"
"تو پھر کہاں غائب ہو گیا وہ کنگن۔۔۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔" وہ غصے میں بولا تو اماں بھی جھنجلا گئیں۔
"ارے! مجھے کیا پتا کہاں گیا۔۔۔ نقصان میرا ہوا ہے، تم سے کہیں زیادہ پریشان ہوں میں۔۔۔ پر کچھ پتا ہو تو بتاؤں ناں۔ تمہارے جاتے ہی میں بھی نکل گئی تو گھر سے۔۔۔ کمرے کا دروازہ بھی بند نہیں کیا۔۔۔ کس نے جانا ہوتا ہے میرے کمرے میں۔۔۔ پر کل [illegible] نے صفائی کرنی تھی تو۔۔۔" وہ تیز تیز بولتے ہوئے اچانک چونک کر رک گئیں۔ چہرے پر ایسے تاثر تھے جیسے کوئی سرا ہاتھ آگیا ہو یا کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں اور پھر جیسے ساری گتھی سلجھتی چلی گئی۔ انہوں نے بے تحاشا حیرت بھری نظروں سے [illegible] دیکھا تھا۔
"بہو تم نے۔۔۔؟" بے یقینی سی بے یقینی تھی۔
"تم ہی نے کل میری الماری کی صفائی کی تھی۔۔۔ اور وہ بھی خود سے اجازت مانگ کر۔" ان کے الفاظ کچھ نہیں تھے مگر لہجہ۔۔۔ سب واضح کرتا ہوا۔ اس کے بعد کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ ثمن ساکت سی جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ ارسلان ہکا بکا۔۔۔ اماں کے لہجے میں اب حیرت کی جگہ تأسف گھل گیا تھا۔
"بہت افسوس کی بات ہے بہو۔۔۔ کم از کم مجھے تو تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تمہیں اگر چاہیے تھا تو مانگ لیتیں۔۔۔ میں کبھی منع نہ کرتی، مگر اس طرح۔۔۔" وہ دکھ سے سر ہلاتی اسے دیکھ رہی تھیں، جب ثمن کا سکتہ ٹوٹا۔۔۔ اور اس نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے ان کی تردید کرنا چاہی۔
"نہیں اماں۔۔۔ پلیز، آپ کو یقیناً کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کی الماری سے کچھ نہیں چرایا۔ میں نے تو صرف صفائی کی تھی اور وہ تو میں پہلے بھی کئی بار کر چکی ہوں۔ کیا پہلے کبھی آپ کی الماری سے کچھ غائب ہوا؟"
"پہلے کی بات اور تھی بہو۔۔۔ اور اگر تم نے کنگن نہیں چرایا تو وہ گیا کہاں۔۔۔ جبکہ تمہارے سوا کوئی گھر میں نہ تھا۔" وہ اس پر نظریں جمائے سنجیدگی سے پوچھ رہی تھیں۔
ان کے سوال میں دم تھا اور ارسلان کے چہرے پر الجھن۔۔۔ کیونکہ تمام شکوک ثمن پر ہونے کے باوجود دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ مگر ثمن کے چہرے پر دکھ کے سوا اور کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ گھبرائی نہیں تھی کیونکہ اس کا دل مطمئن تھا اس [illegible] طرح مضبوط سچے میں ہوں۔
"میں نہیں جانتی اماں! کہ آپ کا کنگن کہاں گیا۔۔۔ لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ وہ ایک کنگن ہو یا اس [illegible]۔۔۔ میں ایسی گھناؤنی حرکت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ چاہیں تو میری تلاشی لے لیں۔۔۔ میرے دل میں کوئی چور نہیں ہے۔"
"فطرت تو میری بھی نہیں ہے بہو۔۔۔ کہ جھوٹی بچی باتیں کر کے تم پر الزام لگاؤں۔ ایک سال تو ہو گیا ہے تمہاری شادی کو۔۔۔ کبھی پتا چلا کہ میں نے اس کے کان بھرے ہیں اور اب بھی میں ایسا نہیں کر رہی۔۔۔ لیکن تم بھی انسان ہو اور میرا ماننا ہے کہ مجبوری میں انسان ایسا کچھ بھی کر سکتا ہے جو عام حالات میں کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے تم نے بھی یہ سب خوشی سے نہیں بلکہ کسی مجبوری کے تحت کیا ہو۔"
ارسلان جو بغور ان کی سب باتیں سن رہا تھا، بے اختیار ٹھٹک گیا۔ ان کی سب باتیں سچ تھیں۔ واقعی انہوں نے ناپسندیدگی کے باوجود کبھی ثمن پر کوئی الزام لگایا تھا اور نہ ہی ارسلان کو اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تھی مگر مجبوری۔۔۔
پچھلے کچھ دنوں سے ثمن کے والد کی طبیعت کافی خراب تھی۔ انہیں دوسری بار دل کا دورہ پڑا تھا اور ڈاکٹرز نے انہیں فوری طور پر ہارٹ سرجری کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ پانچ سے سات لاکھ تک کا خرچہ تھا۔ جس کا کافی بڑا حصہ تو اس کے بھائیوں نے جمع کر لیا تھا مگر ایک لاکھ ابھی بھی کم تھا، جس کا باوجود انتہائی کوشش کے بندوبست نہیں ہو پا رہا تھا۔ حالانکہ ثمن نے اپنا زیور بیچنے کی بھی پیشکش کی تھی مگر ان کی غیرت نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔ ہاں مگر انہوں نے اتنا ضرور کہا تھا کہ اگر ارسلان انہیں کہیں سے ایک لاکھ روپے کا بندوبست کر دے تو وہ بطور ادھار ضرور قبول کر لیں گے۔۔۔ اور اس سلسلے میں ثمن نے اس سے بات بھی کی تھی مگر وقت اتنا غیر مناسب تھا کہ وہ ان کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکا تھا۔
دراصل اس نے کچھ ہی دن قبل مکان کے باقی ماندہ کاموں کے لیے کمپنی سے ایک لاکھ روپے کی رقم ادھار لی تھی۔ جو ہر ماہ اس کی تنخواہ میں سے کٹنا تھی۔ اس لیے کمپنی سے تو اسے کسی مدد کی امید نہیں تھی اور باقی بچے اس کے جاننے والے۔۔۔ تو ان میں سے کوئی بھی اتنا خوش حال نہیں تھا کہ یکمشت ایک لاکھ روپے اسے ادھار دے دیتا۔ یوں وہ بھی فوری طور پر کچھ نہیں کر پایا تھا جس کی وجہ سے انکل کے علاج میں مزید تاخیر کا اندیشہ تھا۔۔۔ جو یقیناً ان کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں تھا اور اسی بات نے ثمن کو بھی ان دنوں خاصا فکر مند رکھا ہوا تھا۔
"شاید اسی وجہ سے اس نے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا ہو۔۔۔ انہیں انکل کی زندگی کو خطرہ۔۔۔ آخر ان کی زندگی سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں ہے، لیکن پھر بھی۔۔۔" یہ اور اسی طرح کی کئی گڈمڈ ہوتی سوچوں نے اس کے ذہن کو ایسے منفی رخ پر الجھایا کہ وہ بے اختیار کہہ بیٹھا۔
"ثمن۔۔۔ یہ اچھا نہیں کیا تم نے۔ میں مانتا ہوں کہ تمہاری مجبوری ہے۔۔۔ مگر ہم انکل کے علاج کے لیے پیسے جمع کر رہے تھے ناں، ایک در بند تو سو در کھلے۔۔۔ لیکن اس طرح نہیں پلیز۔"
الفاظ تھے یا زہریلے ناگ۔۔۔ اسے لگا کہ صرف اس مکان کا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کا ملبہ اس پر آن گرا ہے۔ وہ سانس تک نہ لے سکی۔۔۔ بس پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ اس پورے معاملے میں پہلی بار کچھ بولا تھا اور کاش۔۔۔ کہ وہ کچھ نہ بولتا، خاموش رہتا۔۔۔ چاہے اماں اسے مارتیں، کوڑے لگاتیں، وہ اسے نہ چھڑواتا۔۔۔ ثمن ساری زندگی اس سے شکوہ نہ کرتی لیکن بس وہ بولتا نہیں۔ ایک کرب کا سمندر تھا، جو اس کے پورے وجود میں بہتا اس کی رگوں کو کاٹ رہا تھا۔
بہت بڑی غلطی ہوئی تھی اس سے اسے سمجھنے میں،

وہ صرف کمزور، کانوں کا کچا اور عقل کا اندھا ہی نہیں ..... بلکہ جھوٹا اور وعدہ خلاف بھی تھا۔ ثمن اب زندگی میں کبھی اس پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی..... اور اعتبار کے بغیر وہ دنیا کے کسی رشتے کو نہیں مانتی تھی۔ اس نے لب بھینچے خاموشی سے کچھ دیر اسے دیکھا اور پھر بنا کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور اس کے جاتے ہی ارسلان کو ایسا لگا، جیسے کسی گہری نیند سے جاگ گیا ہو..... وہ کیا کہہ گیا ہے، اس احساس نے جیسے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کچھ بھی کر کے وہ لمحہ واپس لے آئے اور اپنے یقین سے اسے معتبر کر دے، لیکن وہ لمحہ گزر چکا تھا اپنی تمام تر سفاکیوں کے ساتھ، کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔

اور جب تک وہ ہمت مجتمع کر کے کمرے تک پہنچا وہ اپنا سامان باندھے تیار کھڑی تھی۔ ارسلان کو کچھ دیر صورت حال کی سنگینی کو سمجھنے میں لگی اور پھر وہ ہڑبڑا کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"پلیز ثمن..... پلیز، مجھے معاف کر دو۔ میں جانتا ہوں میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے، لیکن یقین کرو میں یہ سب نہیں کہنا چاہتا تھا..... پتا نہیں کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔" وہ لجاجت سے اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا جسے اس نے دھیرے سے چھڑا لیا۔

"ایسے ہی کسی کے منہ سے کچھ نہیں نکلتا ارسلان ..... جب تک کہ وہ اس کے دل یا دماغ میں نہ ہو..... ہاں مگر اس بے اختیاری کا یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ مقابل کو اپنی اوقات کا پتا چل جاتا ہے۔"

وہ اجنبی سے انداز میں بولی تھی۔ چہرہ ایسے چپ تھا جیسے مدت سے ویران، پتھرائی ہوئی کوئی بنجر زمین..... اس نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے اسے دیکھا اور تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔

"پلیز ثمن..... جو چاہے سزا دے لو، لیکن پلیز چھوڑ کر مت جاؤ..... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، آئندہ زندگی بھر یہ کم ظرفی نہیں دکھاؤں گا۔ کٹ مروں گا، سارے الزام اپنے سر لے لوں گا..... لیکن تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میرا یقین کرو ثمن..... پلیز جاؤ مت۔"

وہ کچھ بھی کر کے اسے روکنا چاہتا تھا۔ اس کو پھر سے اپنا بنانا چاہتا تھا۔ کچھ ایسا کہنا چاہتا تھا جو اس کے ارادے کو بدل دے لیکن ناکام رہا..... کہ اس کے لفظ بھی اس کے دعووں کی طرح بودے نکلے اور ثمن کا فیصلہ اس کے کردار کی طرح مضبوط..... جس نے بار بار ارسلان اطہر کو اس کے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بولی تھی۔

"یہ آپ پر کیے یقین کی ہی دی ہوئی ذلت ہے ارسلان..... آپ ایک کمزور مرد ہیں۔ میں اب آپ پر یقین نہیں کر سکتی یہ تو ایک سنگین جرم کا معاملہ ہے، اگر کل کو کوئی میرے کردار پر انگلی اٹھائے تو میں کیا کروں گی؟ نہیں ارسلان..... میں ایک ایسے شخص کو صفائیاں دینے میں اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتی ..... جس کے دل میں میرے لیے عزت ہے اور نہ ہمارے رشتے پر اعتبار....."

اس کی آواز میں صدیوں کا ٹھہراؤ تھا، پہاڑ جیسی مضبوطی۔ وہ اس کے ایک بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔ بس بے بسی سے کھڑا دیکھتا رہا..... اور وہ چلی گئی۔

وہ جانتی تھی کہ سب اس کے فیصلے پر انگلی اٹھائیں گے۔ اسے برا بھلا کہیں گے، صبر و برداشت کی تلقین کریں گے..... لیکن سب کی طرح وہ بھی اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ جس نے ساری زندگی نخرے سے، عزت اور محبت کے سائے میں گزاری تھی..... کیسے بے اعتباری کی فضا میں شرمندگی سے جی پاتی۔ جسم کی تنہائی اسے روح کی ویرانی سے کہیں سہل لگتی تھی..... سو اس نے اپنے لیے بہتر راستہ منتخب کیا اور مضبوط قدموں سے گھر کی دہلیز پار کر گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر سر ہاتھوں میں گرائے تنہا بیٹھا تھا جب اماں، یعنی فاخرہ بیگم نے کمرے

میں قدم رکھا۔ ایک نظر پریشان بیٹھے بیٹے پر ڈالی اور پلٹ کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ اب ان کا رخ الماری کی جانب تھا..... جس کے نیچے دھرا جوتوں کا ڈبا انہوں نے اپنی طرف کھسکایا اور کھول دیا۔ سامنے ہی ان کی مطلوبہ چیز پڑی تھی۔

سونے کا کنگن، جو ان کی ماں کی واحد اور آخری نشانی تھی۔ فاخرہ بیگم نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے اسے اٹھایا اور بڑی فرصت سے دیکھنے لگیں۔ ان کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں جیت کا غرور تھا۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ ثمن کو اس گھر سے نکالنے کے لیے وہ پچھلے ایک سال سے کوشاں تھیں اور آج ان کی کاوشیں رنگ لے آئی تھیں۔

اس کامیابی کا سارا کریڈٹ انہی کو جاتا تھا۔ کیونکہ ارسلان بھلے اپنی بیوی کو سمجھنے میں غلطی کر گیا ہو مگر انہوں نے اپنی بہو کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ بہت شروع میں ہی جان گئی تھیں کہ ثمن عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ لہٰذا وہ روایتی ساس بن کر جو کچھ بھی کریں، اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

کیونکہ وہ یہاں ارسلان کے بھروسے آئی تھی اور جب تک اس کا وہ بھروسا نہ ٹوٹتا، وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے پینترا بدلا اور ارسلان کا اعتماد جیتنے کے لیے ایک بالکل بے ضرر ساس کا لبادہ اوڑھ کر مناسب وقت کا انتظار کرنے لگیں، جو انہیں کچھ ہی دن پہلے ملا..... جب انہوں نے ثمن کے والد کے علاج کے سلسلے میں دستیاب رقم سے متعلق ان دونوں کی باتیں سنیں۔

انہیں لگا کہ شاید اس سے اچھا موقع انہیں پھر کبھی نہ ملے، لہٰذا انہوں نے اپنی چال چل دی جو کامیاب ٹھہری..... نہ چاہتے ہوئے بھی ایک کمزور لمحے کی گرفت میں آ کر ارسلان ساری بازی ان کے نام لکھ دی تھی۔

ثمن نام کا کانٹا ان کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اب چاہے ارسلان ناک سے زمین پر لکیریں کیوں نہ کھینچ ڈالے، وہ اس پر اعتبار کر کے گھر واپس آنے والی نہیں تھی..... اور رہا ارسلان تو وقت بڑے بڑوں کے گھاؤ بھرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، لہٰذا جلد یا بدیر وہ بھی سنبھل ہی جاتا.....

سارے منصوبے پر غور کرتے ہوئے انہوں نے طمانیت سے کنگن دوبارہ لکڑی کے ڈبے میں محفوظ کر دیا۔ آخر کو وہ ان کی لاڈلی بھانجی کی امانت جو تھا۔ لاڈلی بھانجی جو تاحال کنواری تھی اور جسے اب ان کی چہیتی بہو بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے فاخرہ بیگم کی طرف چائے کی پیالی بڑھائی۔ انہوں نے چپ چاپ مگر گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پیالی تھام لی۔ ارسلان بھی خاموش جانچتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ثمن کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری چھاپ انہیں کچھ بھی کہنے سے روک رہی تھی۔

ثمن جس طرح گئی تھی۔ پندرہ دن بعد اسی طرح واپس آ گئی تھی۔ اور معمول کی طرح گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا مگر اس کا چہرہ اس کا اعتبار چھن جانے کی غمازی کر رہا تھا۔ ارسلان بے حد خوش تھا مگر فاخرہ بیگم کا سارا منصوبہ تلپٹ ہو گیا تھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اصولوں پر جان دینے والی ان کی بہو کیسے واپس آ گئی۔ ان کے روم روم سے اضطراب جھلک رہا تھا مگر بیٹے کی خوشی اور بہو کی سنجیدگی کے سامنے کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھیں۔ یوں بھی وہ ثمن کی سچائی سے واقف تھیں۔ انہوں نے اس کی خوبی کو اسی کے خلاف ہتھیار بنا کر استعمال کیا تھا مگر یہ بھول گئی تھیں کہ ممتا کے جذبے کے آگے کوئی اصول نہیں ٹھہرتا۔ جب ماں کا جنم ہوتا ہے تو عورت مر جاتی ہے۔

ثمن ماں بننے والی تھی۔

☼
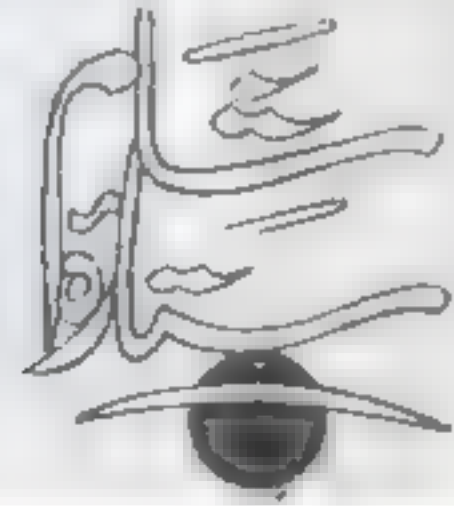
چھ ماہ بعد۔۔۔

شام کا منظر ابر آلود تھا اور خزاں کی تیز ہوا کے جھونکے شاہ بلوط کے خشک پتوں کو اڑائے پھرتے تھے۔ یہ ذیلی ایک رہائشی کالونی کی سنسان سڑک تھی جس پر اکا دکا لوگ دکھائی دے رہے تھے ان ہی میں سے ایک ماوی تھی۔ اس نے گرم چادر کندھوں پر پھیلا رکھی تھی اور اس کے کھلے ہوئے بال ہوا سے بار بار اس کے چہرے پہ بکھر رہے تھے۔ وہ سر جھکائے صاف ستھری سڑک پر نظریں مرکوز کیے بے مقصد کی چلی جا رہی تھی۔

ہوا اس کو چھو کر۔۔۔ کبھی تیز تیز بھاگتی تھی اور درخت اس پر اپنے پتے گرا رہے تھے۔

پھر وہ تھک کر ایک گھر کے سامنے نصب لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گئی۔ سامنے والی لین میں ایک گھر کے باہر چھوٹی سی بچی کھیل رہی تھی۔ ماوی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کا ذہن ہر سوچ سے عاری تھا۔ معاً کوئی آہستگی سے آکر اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ ماوی نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ شہروز تھا اور گرم کوٹ کے کالرز میں گردن دھنسائے خاموش بیٹھا تھا۔

ماوی نے دوبارہ اپنی نظریں بچی پر مرکوز کر دیں۔

"کس دن کی روانگی ہے؟" ان دونوں کے درمیان حائل خاموشی کو شہروز نے توڑنے میں پہل کی تھی۔

۳۰

تیسویں اور آخری قسط

"پانچ روز بعد۔"
"کتنے بجے کی فلائٹ ہے؟" شہروز نے اگلا سوال کیا۔
"شام سات بجے کی۔" ماوی نے جواب دیا۔
"بہتر تھا، تم نہ جاتیں۔ ثمینہ پھپھو کی حالت تمہارے بغیر مزید بگڑ سکتی ہے۔"
"مجھے ان کی فکر ہے لیکن میرا پاکستان جانا بھی ضروری ہے۔ وہاں کچھ ایسے معاملات ہیں جنہیں میں ادھورا چھوڑ آئی تھی۔ انہیں مکمل کرنا ضروری نہ ہوتا تو ابھی بالکل نہ جاتی۔" ماوی نے جواب دیا۔
"تم وہاں جلال کے لیے جا رہی ہو ناں؟" شہروز نے جیسے اس کا امتحان لیا تھا۔
"ہاں۔" ماوی نے ایک بھی پل ضائع کیے بنا کہا۔ شہروز کے دل میں چبھن سی ہوئی۔ کیا تھا جو وہ انکار کر دیتی۔
"ماوی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے معاف کر دو؟"
"اوہ پلیز شہروز! اب پھر سے وہی چیپٹر کھول کر مت بیٹھ جانا۔" ماوی نے بے زاری سے کہا۔ "میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ کوئی شکایت بھی نہیں ہے مجھے تم سے۔ پھر معافی کس بات کی؟"
"ماوی! وہ لڑکی میری گرل فرینڈ تھی۔ اس نے شرارتاً کہہ دیا کہ وہ میری بیوی ہے اور میں تمہاری آواز سن کر کنفیوژ ہو گیا تھا۔ فوری طور پر مجھے یہی سمجھ میں آیا کہ مجھے اس لڑکی کو اپنی بیوی مان لینا چاہیے۔ ایک غیر لڑکی کو اپنے ساتھ رکھنا معیوب بات تھی تو میں نے اسے اپنی بیوی کہہ دیا۔ بیوی ماوی! میں تمہیں ہرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا۔"
"کاش! تم نے اس لڑکی سے نکاح ہی کر لیا ہوتا۔ گناہ تو نہ کرتے۔" ماوی نے پہلی بار رکھائی سے کہا تھا۔
"بہرحال یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے خود ہی نمٹنا۔ میں کون ہوتی ہوں کچھ کہنے والی۔"
"میں جانتا ہوں، تم ایسا صرف اس جلال کے لیے کہہ رہی ہو جو کسی طرح بھی تمہارے قابل نہیں ہے۔ پھپھو نے مجھے بتایا تھا وہ کس قدر احمق ہے۔"
"تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ میرے شوہر کے بارے میں اس طرح کے الفاظ استعمال کرو۔" ماوی نے تیز لہجے میں کہا۔
"وہ جیسا بھی ہے، تم سے کم بدکردار نہیں ہے۔ کسی کو دھوکا نہیں دیا اس نے۔ اُلٹا میں اسے دھوکا دیتی رہی، ممی کے کہنے پر اور یہ بات میرے لیے بہت شرمندگی کا باعث ہے۔ تم نے صحیح کہا، میں جلال کے لیے ہی پاکستان جا رہی ہوں۔ چھ ماہ پہلے مجھے ایمرجنسی میں ڈبلن آنا پڑا تھا کیونکہ ممی کی ذہنی حالت بگڑ گئی تھی اور اتنا عرصہ علاج کے باوجود ان کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آ رہی تو میں واپس جا رہی ہوں۔ مجھے جلال سے معافی مانگنا ہے، اُسے منانا ہے۔"
"یوں کہو کہ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہو، تب ہی ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔" شہروز نے اس کی ذہنی حالت کا بالکل درست تجزیہ کیا تھا۔
ماوی ہنس دی۔
"تم اپنی تسلی کے لیے جو بھی کہہ لو شہروز! مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ اسے اللہ نے میری قسمت میں لکھا ہے اور میں جانتی ہوں وہی میرے لیے بہترین ہے۔ اگر وہ میرے لیے بہترین نہ ہوتا تو آج میں اس کے بجائے تمہاری بیوی ہوتی۔۔۔ ہم انسانوں سے لڑ سکتے ہیں، قسمت سے ہرگز نہیں۔ جو بھی ہوا اگر تم اس پر غور کرو تو تمہیں قسمت کے ہیر پھیر سمجھ میں آنے لگیں گے۔ میرا اور ممی کا پاکستان جانا، وہاں پہلے ثروت آنٹی سے ملنا، پھر جلال اور شبیہہ سے ملاقات۔۔۔ تم پہلے بھی تو اپنی گرل فرینڈز کو اپنے فلیٹ پر لاتے ہوگے لیکن مجھے اس بارے میں تب ہی کیوں پتا چلا جب میں جلال سے نکاح سے بچنا چاہ رہی تھی۔۔۔ یہ سارا کچھ اسی لیے تو تھا شہروز! تاکہ مجھے جلال سے رشتے میں باندھا جا سکے۔۔۔ میں قسمت سے لڑنا نہیں چاہتی، اسی لیے پاکستان جا رہی ہوں۔۔۔ شاید جو کچھ ممی کی ضد کی وجہ سے بگڑا، میں اسے سنوار سکوں۔"
اس نے بات مکمل کی اور اٹھ کر مخالف سمت میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چلی گئی۔ شہروز کی مایوس نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔
سرد ہوا کی بازگشت اسے اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

مستقیم بھٹی اور جلال آگے پیچھے اسپتال کے اس کمرے سے نکلے تھے جس میں شبیہہ کو رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں کمرے کے سامنے لگی جالی سے نیچے اسپتال کے لان میں دیکھتے رہے۔ ان کے درمیان محسوس کن خاموشی پھیلی تھی، پھر اس خاموشی کو جلال نے توڑنے کی ہمت کی۔
"ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں بڑے ابا!"
مستقیم بھٹی کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ اس سوال پر وہ مزید مضمحل دکھائی دینے لگے۔
"ڈاکٹرز کے پاس بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔ وہ کہتے ہیں دعا کرو اور بس۔" بات کے اختتام تک وہ رو پڑے۔ جلال کو ان پر ترس آنے لگا۔
"مت روئیں بڑے ابا! اللہ ضرور شبیہہ کو صحت یاب کر دے گا۔ مایوسی تو کفر ہے اور آپ اس طرح رو کر مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں۔" اس نے پیار سے انہیں ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ مستقیم بھٹی کو اس کی تسلی کے باوجود خود کو سنبھالنے میں کچھ وقت لگا۔
"تو ی کیسی ہے؟" اس بار جلال نے قدرے مایوسی سے لیکن اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔
"اس کی حالت میں کافی بہتری آئی ہے لیکن اب بھی جب اکثر اسٹریس کا شکار ہو جاتی ہے تو اوٹ پٹانگ بولنے لگتی ہے۔"
"یہ کیا ہو گیا ہمارے ساتھ۔ چند سال بلکہ چند مہینے پہلے بھی کسی نے نہ سوچا تھا کہ ہم سب اس طرح کے کرائسس سے گزریں گے۔" مستقیم بھٹی کہہ رہے تھے۔ جلال کا دل اور بھی بوجھل ہو گیا۔ بات تو سچ ہی تھی۔ ان چھ مہینوں میں جیسے ان کے خاندان کا شیرازہ ہی بکھر گیا تھا۔ سب جیسے اپنی بقا کی جنگ لڑنے میں مصروف ہو گئے تھے۔
"بڑے ابا! آج ایک جگہ انٹرویو دینے جانا ہے۔ دعا کیجیے گا۔"
"انٹرویو۔۔۔ پہلے والی جاب کا کیا بنا؟"
"وہاں کا سیلری پیکج کچھ خاص نہیں ہے، میں کسی بہتر جاب کی تلاش میں ہوں۔"
جلال نے بتایا اور انہیں خدا حافظ کہتا دوسری سمت چل دیا۔

☼ ☼ ☼
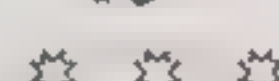
وہ اپنے ڈاکومنٹس لینے حویلی آیا تھا اور حلیمہ کے اصرار پر رات بھر ٹھہرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"اماں تو اپنے کمرے سے نکلتی ہی نہیں ہیں۔ بہت ضرورت ہوئی تو گھنٹی بجا کر کسی ملازم کو بلا لیتی ہیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔" حلیمہ (جنت بیگم کی خاص ملازمہ) بتا رہی تھی۔ "ان کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی۔"

"آپ کو ان کے کمرے میں جا کر دیکھنا تو تھا۔"

"ہمیں تو اندر جانے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ گھر کا کوئی فرد اندر چلا جائے تو چیخنے چلانے لگتی ہیں' جو چیز ہاتھ میں آئے اٹھا کر مار دیتی ہیں۔"

"ہاں وہ بہت ضدی ہیں۔ ان ہی کی ضد تو ہم سب بھگت رہے ہیں۔"

"شبیہہ اور تنوی کیسے ہیں؟"

جلال انہیں ان دونوں کے متعلق بتا کر اپنے کمرے میں جانے لگا تو حلیمہ نے ماوی کے متعلق پوچھ لیا۔ "ماوی بی بی کا کچھ پتا چلا؟"

"مجھے نیند آ رہی ہے اماں! اور ابھی کام بھی کرنا ہے۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ حلیمہ کو تاسف نے گھیر لیا۔ کیا حال ہو گیا تھا ان کے بیٹے کا۔

جلال الدین نے فائل بند کر کے میز پر کھسکا دی اور دائیں ہاتھ سے آنکھیں مسلتا ٹانگیں پھیلا کر نیم دراز ہو گیا۔

آج کا سارا دن ہی بے حد تھکا دینے والا تھا۔ نئی نئی ملازمت' کم تنخواہ لیکن ترقی کے لالچ نے دن رات کولہو کے بیل کی طرح جتے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ (جنت بیگم نے ان سب کو عاق کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا) پھر روز چیمبر کے دھکے اور آخر میں پراپرٹی ڈیلر کے ساتھ مغز ماری اور پھر چار گھنٹے کا سفر کر کے گاؤں پہنچنا۔ کبھی کبھار اسے اپنا وجود دیمک لگی لکڑی کی طرح بھربھرا ہوتا محسوس ہوتا تھا۔

کتنے دن گزرے وہ سکون سے سو بھی نہیں سکا تھا۔

جو ان سب پر گزرا' وہ دہرانے کی ضرورت تو نہیں لیکن وہ سب سے زیادہ مصیبت میں تھا' جب دل اور دماغ کی جنگ چھڑ جاتی ہے تو انسان سب سے زیادہ مصیبت میں آ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ غم روزگار بھی کم نہ تھے اس پر مستزاد یہ کہ ماوی کو جتنا بھولنے کی کوشش کرتا' وہ اتنا ہی اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتی تھی۔ وہ جسے محض محبت سمجھا تھا' وہ دراصل عشق نکلا تھا اور عشق بڑا مہلک ہوا کرتا ہے۔

اسے کل صبح دوبارہ لاہور روانہ ہونا تھا لیکن تھکن جیسے سارے وجود پر پھیلی ہوئی تھی۔

کئی دن سے وہ سکون سے سو بھی نہیں سکا تھا۔ ابھی بھی نیند نے پوری طرح اس کے ذہن پر غلبہ نہیں پایا تھا کہ کوئی چیز اس کے ہاتھ سے ٹکرائی اور وہ ہڑبڑا کے سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کا دل بے حد بے ہنگم طریقے سے دھڑکنے لگا تھا۔ آنکھیں پھاڑ کر اس نے اس چیز کو تلاش کرنا چاہا جو اس کے ہاتھ سے ٹکرائی تھی مگر ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ کوئی بھی ایسی چیز جو کسی غیر معمولی چیز کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ وہ کچھ دیر متلاشی اور خوف زدہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس کے خوف میں بتدریج کمی واقع ہونے لگی اور بالآخر اس کے لبوں پر جھینپی ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی نیند میں ڈر جانا' کچھ ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں' وہ بھی تب جب آپ پچھلے سترہ دنوں سے سو نہ سکے ہوں۔ اب بھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

یعنی بے آرام راتوں میں ایک اور بے آرام رات کا اضافہ۔

کبھی کبھی اسے لگتا تھا ماوی اس کے پاس ہی ہے اور یہ بات ہر بات سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑکی تک آیا اور پردے ہٹا دیے پھر چونک سا گیا۔ شیشے پر بارش کی بوندیں جلترنگ بجا رہی تھیں اور تیز ہوا میں یوکلپٹس کے پتے پھڑپھڑا رہے تھے۔

اس کھڑکی سے حویلی کا باغ صاف دکھائی دیتا تھا' جو اس وقت گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بڑے پھاٹک کے سب پوسٹ روشن تھے۔ جن کی روشنی بارش کی بوندوں کے ساتھ گھل مل کر ڈرائیو وے کے کچھ حصے کو روشن کر رہی تھی۔

اسے خیال آیا اگر سفیدے کے درختوں میں گھری ہوئی اس عمارت کو بالکل سامنے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو اپنے ملے جلے تاثر میں بالکل آسیب زدہ لگے گی۔

بالکل چپ چاپ' پُرشکوہ مگر پُرہیبت۔

اسے ایک اور خیال بھی آیا کہ اس حویلی میں بسنے والے بھی تو نارمل نہیں تھے۔ سب کے سب عجیب و غریب رویوں کے مالک تھے۔

اسے یاد آیا ماوی بھی یہی کہتی تھی کہ "کہ یہ حویلی نہیں بھوت بنگلہ ہے یا پاگل خانہ... کوئی بھی یہاں نارمل نہیں لگتا مجھے۔" اس کی یاد آئی تو لبوں پر مسکراہٹ بھی آ گئی لیکن اس نے اپنا دھیان بٹا لیا۔

"اب سو جانا چاہیے۔" وہ اپنے بیڈ کی طرف بڑھا۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا سو وہ بھی گل ہوا مگر دل روشن تھا یادوں سے باتوں سے۔

"کیا خوب ہوتا اگر میں محبت نہ کرتا... سو یہ سارا فساد اسی محبت کا پھیلایا ہوا ہے۔"

آج پژمردہ خیالات کی رات تھی' سو ایک اور بے کار خیال چپکے سے چلا آیا۔ دل کو رات بھر فراغت ہی فراغت تھی' اس نے فوراً "دل" کو ڈپٹا۔

"پگلے! محبت کی نہیں جاتی' ہو جاتی ہے۔"

"اونہہ..." افسردگی پر بدمزگی چھا گئی۔

"بڑی پرانی بات ہے' دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔"

"لیکن میرے تو ابھی بھی چار ہی خانے ہیں اور میں تمہارے بائیں جانب رہتا ہوں۔" دل نے اچھل کر اطلاع دی۔

"میں تم سے باتوں میں کبھی نہیں جیت سکتا۔"

"میرے معاملات میں دخل اندازی ترک کر دو۔ جیت تمہارا مقدر ہو گی۔"

"اونہہ... ایک ہی بار تمہاری بات مانی تھی۔ آج تک بھگت رہا ہوں۔"

بحث اور طول پکڑتی لیکن اسی وقت اس کے موبائل کی بپ بجنے لگی۔ موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا' جلال نے جھپٹ کر فون اٹھایا اور نمبر دیکھے بنا کان سے لگا لیا۔

"کیا آپ جلال الدین صاحب بات کر رہے ہیں؟" اجنبی مردانہ آواز تھی۔

جلال چونکا۔ "جی... جی ہاں۔"

"دیکھیے... میں انسپکٹر خورشید نواز بات کر رہا ہوں۔ جنت بی بی سے آپ کا کیا تعلق ہے؟" انسپکٹر کی آواز بے حد کرخت تھی۔

جلال الدین کی چھٹی حس نے کوئی سگنل دیا تھا۔

"جی وہ میری..." انسپکٹر نے بدتمیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"وہ آپ کی کوئی بھی ہو۔ ہم نے صرف یہ بتانا تھا کہ جنت بی بی (تنوی) ہماری حراست میں ہے۔ تھوڑی دیر پہلے

ہم نے اسے فتح شیر کالونی سے اس کے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔ ہمیں خبر ملی تھی کہ آپ جنت کے رشتہ دار ہیں۔۔۔ مہربانی فرما کر آپ تھانے تشریف لے آئیے تاکہ کچھ ضروری نوعیت کی کارروائی پوری ہو سکے۔"

بات ختم۔ فون بند۔

جلال کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ گویا یہ تھی وہ بات جس کے قبل از وقت اندازے نے اسے سونے نہیں دیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ صدمے نے اس کی ہمت چھین لی تھی۔ بدقت اٹھا اور ڈریسنگ میں گھس گیا۔ چند منٹ بعد جب اپنی برساتی پہن کر وہ بڑی خاموشی سے باہر نکل رہا تھا تو اس کا دل چاہ رہا تھا' خوب چیخ چیخ کر روئے کیونکہ آسمان پر امید کا ایک ستارہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

جلال نے مایوسی اور بے بسی سے اپنے کندھوں کو جھکتا محسوس کیا تھا۔ ابھی بھی سکون سے گزر رہی تھی۔ پتا تھا کبھی ایسی صورت حال کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔

ایک تو رات گئے ملنے والی بری خبر نے یوں بھی اسے ذہنی طور پر ناتواں کر چھوڑا تھا' دوسرے مقامی پولیس اسٹیشن کے عملے کا رویہ انتہائی حوصلہ شکن تھا۔

اللہ جانے وہ کیوں بھول گیا کہ وہ ملزمہ کے رشتہ دار کی حیثیت سے یہاں آ رہا ہے۔ ذہنی طور پر تیار ہو کر آتا تو یقیناً "اتنی کوفت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

"دیکھیے محترم۔۔۔" بڑی منتوں کے بعد اس کی بات سن لینے پر راضی ہوئے ایس ایچ او نے اپنے اسٹاف کی طرح بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ آپ کا ملزمہ سے کیا رشتہ ہے۔ آپ اس کے بھائی ہیں' باپ ہیں یا کچھ بھی۔۔۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اہم بات یہ ہے کہ جنت بی بی نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے اور آپ نے ملزمہ کو چھپا کر اس جرم میں اس کا ساتھ دیا ہے۔۔۔ اس حساب سے تو آپ کو بھی اس وقت سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے تھا۔ شکر کریں کہ ہم نے آپ کو کرسی پر بٹھایا ہوا ہے۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں' میں نے اس کو چھپا رکھا تھا۔" جلال نے جھنجلا کر کہا۔

"آپ کا ملازم گواہ ہے۔" ایس ایچ او مسکرایا۔ جلال کے دماغ کے دل و دماغ میں غصے کی شدید لہر اٹھی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا' اس کے وکیل نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ میرے کلائنٹ پر بے بنیاد الزامات لگا رہے ہیں۔" پھر اس نے ایک فائل ایس ایچ او کے سامنے رکھ دی۔

"یہ جنت بی بی کی رپورٹس ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنت شیزوفرینک (دوہری شخصیت) ہے اور آج سے نہیں بلکہ پچھلے چار سالوں سے زیر علاج ہے۔ وہ جو بھی بولتی ہے یا کرتی ہے اس کی صداقت کو جانچنے کے لیے اس کی بیماری کو مدنظر رکھا جانا ضروری ہے۔" وکیل صاحب تحمل سے وضاحت کر رہے تھے۔

ایس ایچ او نے چونک کر فائل پکڑلی۔ کچھ صفحات پلٹے پھر باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

"یعنی لڑکی پاگل ہے؟؟"

جلال نے شدت کرب سے آنکھیں بھینچ لیں۔

"کوئی عام انسان جو اس بیماری سے واقف نہیں ہے' اس کے لیے شیزوفرینیا پاگل پن ہی ہوتا ہے لیکن درا صل

یہ نفسیاتی بیماری ہے جس کی علامات ہر انسان میں الگ ہوتی ہیں۔ جیسے جنت۔۔۔ اسے چار سال پہلے یہ لگنے لگا تھا کہ اس نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے جب کہ وہ تو شادی شدہ ہی نہیں ہے۔"

جلال کی رنگت خطرناک حد تک زرد ہو رہی تھی۔

"تم باہر جا کر بیٹھو۔۔۔ میں معاملات نمٹا کر آتا ہوں۔" وکیل نے جھک کر جلال سے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

جلال خاموشی سے اٹھا اور باہر آ گیا۔ برآمدے کے آگے متوازی چھت سے پانی کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ بارش تھم چکی تھی۔

وہ ریلنگ پر مٹھیاں جما کر اندھیرے کو گھورنے لگا۔

کیسی تھی زندگی۔ اب تو تیز ہوا سے بکھرے پتوں کی مانند لگتی تھی۔ جس روز اس نے رحمت اللہ اور اس کی بیوی کو تنوی کی ذمہ داری سونپی تھی' کس قدر مطمئن ہو گیا تھا کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت سے بڑا مرہم بھی بھلا کوئی ہے؟ گردش دوراں تو نہ جانے کس کس چیز پر گرد جما دیتی ہے۔

اسے لگا تھا تنوی اب محفوظ ہے۔

لیکن آج کی رات قیامت کی رات تھی۔ اس کی آنکھوں میں کرچیاں سی بھرنے لگیں تب ہی ایک ہاتھ اس کے کندھے پر آ رکا۔

"فکر مت کرو جلال! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" مسعود عرف سعدی نے خفیف سا مسکرا کر کہا تھا۔

جلال کو لگا اس کا دوست مسکراہٹ کے چھینٹے ڈال کر اس کی دم توڑتی امید تازہ کر رہا ہے۔ مگر وہ خود مسکرا بھی نہ سکا۔

"کیا کہتے ہیں؟" مبہم سا سوال تھا۔

"ضمانت کروانا پڑے گی اور ضمانت کے لیے صبح تک کا انتظار کرنا پڑے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ تنوی کا بیان ریکارڈ کیا جا چکا ہے۔ اس نے اقبال جرم نہ کیا ہوتا تو معاملہ نمٹانا آسان تھا۔ اب اس کیس پر محنت کرنا پڑے گی۔"

"ہم صبح کا انتظار کر لیتے ہیں۔"

"پاگل مت بنو۔ باقی رات یہاں بیٹھ کر نہیں گزاری جا سکتی۔ ہمیں یہاں سے جانا ہی ہو گا۔"

"تنوی یہاں کیسے رہے گی؟" جلال خائف ہوا۔ "نہیں سعدی! میں اسے یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

وہ رو دینے کو تھا۔ تنوی بھلے ہی اس کی سگی بہن نہ سہی لیکن ان کے مابین ہمیشہ بہن بھائیوں والا حساب رہا تھا۔ سعدی نے اس کا کندھا مضبوطی سے تھام لیا۔

"مجبوری ہے جلال! یہاں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملے گی اور تنوی کی فکر نہ کرو۔ لیڈیز اسٹاف بھی ہے یہاں۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ صبح عدالت کھلتے ہی ضمانت کے کاغذات تیار کروالوں گا۔" جلال اسی طرح کھڑا رہا پھر اس نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

"میں پہلے ہی پوچھ چکا ہوں مگر ایس ایچ او بڑا خرانٹ ہے۔ پرمیشن نہیں دے رہا۔ اس کے لیے بھی صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

"مسعود۔۔۔" بے بسی نے جیسے اسے پاگل کر دیا تھا۔ سعدی نے ترحم سے اسے دیکھا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا اسے یوں چھپا کر رکھنا زیادہ بڑا رسک ہو گا۔ تمہیں اسے پہلے ہی فاؤنٹین ہاؤس بجھوا دینا چاہیے تھا۔" سعدی کی آواز دھیمی تھی۔

"تنوی پاگل نہیں ہے سعدی! وہ صرف صدمے کے زیر اثر ہے۔ جوں ہی شبہہ کو ہوش آئے گا اور تنوی اسے

دیکھیے نا... غیب ہو جائے گی۔ اب تک تو وہ یہی سمجھ رہی ہے کہ اس نے شبیہہ کو قتل کر دیا ہے۔"

"اور اگر شبیہہ کو ہوش نہ آیا تو۔۔۔" سعدی نے کہا تھا اور جلال چپ کا چپ رہ گیا۔ یہ وہ ناپسندیدہ پہلو تھا جس پر اس نے شاید کبھی نے بھی نہیں سوچا تھا۔

"ایسا مت ہو۔"

"اچھا تو گھر چلتے ہیں۔" ایک لمبی چوڑی بحث کے بعد مسعود عرف سعدی نے کہا تھا۔ جلال نے اس بار اس کی بات مان لی تھی لیکن اس کی آنکھیں جل رہی تھیں، اس نے بنا کچھ کہے گاڑی بڑھا دی تھی اور بے مقصد ما تے سے بھیس سڑکوں پر دوڑاتا رہا۔ اسے بار بار رحمت اللہ کا ملتجی لہجہ یاد آ رہا تھا۔

"میری نانی کی غلطی ہے صاحب! بچوں کی لڑائی میں خود کود پڑی۔ پڑوسیوں نے غصے میں آ کر پولیس کو اطلاع دے دی کہ فلیٹ نمبر بارہ میں کوئی عورت چیختی رہتی ہے۔ پولیس آئی تو بی بی صاحب نے انہیں سب سچ بتا دیا۔ معاف کرو صاحب! ہم سے آپ کا نقصان ہوا مگر آپ تو مائی باپ ہو۔ آپ نے ہی سر سے ہاتھ اٹھا لیا تو کسی عورت کو گھر میں چھپا کر رکھنے کے الزام میں ہم غریب دھر لیے جائیں گے۔"

وہ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ جلال نے زور زور سے آنکھیں جھپک کر آنسوؤں کو دھکیلنا چاہا مگر سینے میں کرب کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ حلق میں سسکیاں اودھم مچا رہی تھیں۔ آنکھوں میں کرچیوں کی چبھن بڑھنے لگی تھی۔

شبیہہ اور تنوی دونوں ہی اسے بہت عزیز تھے۔ خدانخواستہ شبیہہ کو کچھ ہو جاتا تو تنوی کا بچنا مشکل تھا، وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ اقبال جرم کر چکی تھی۔ کچھ مہینہ پیشتر جب شبیہہ کو گولی لگی تو ان سب کے منع کرنے کے باوجود جنت بیگم نے پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ اس وقت سے اب تک وہ سب تنوی کو چھپاتے پھر رہے تھے کیونکہ اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ وہ ہر ایک کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرنے بیٹھ جاتی تھی۔ اس نے شبیہہ کو خون میں لت پت زمین پر پڑا دیکھا تھا اور یہ تصور کر لیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ سارے فساد کی جڑ بس یہی ایک خیال تھا۔

✡ ✡ ✡

جس وقت اس کی آنکھ کھلی، کمرے کے چھوٹے سے روشن دان سے اندر آتی مٹھی بھر روشنی اپنی چمک بتدریج کھو رہی تھی اور آسمان کا وہ ٹکڑا جو اس روشن دان سے دن بھر کسی وقت کے دکھائی دیتا رہتا تھا، سیاہ پڑنے لگا تھا۔

یکایک اسے احساس ہوا۔ آنکھیں پوری کھلی ہونے کے باوجود سامنے کا منظر واضح نہیں ہے۔ وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی۔ سامنے رکھا ہوا ٹی وی، میز پر دھرا گل دان۔ دیوار پر لگی اس کے شوہر کی تصویر، کھڑکی کے پردے۔۔۔ ہر منظر۔۔۔ ہر منظر دھندلا تھا۔

اسے کچھ بھی واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید۔۔۔ شاید وہ اندھی ہو رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس کے دل میں دہشت پیدا ہوئی۔ اس نے پوری طاقت کے ساتھ اپنی آنکھوں کو جھپکا تھا۔

بصارت لوٹ آئی، دھند چھٹ گئی۔ تصویر کے نقوش، ٹی وی اسکرین اس کے بٹن، گل دان میں لگے پھولوں کا رنگ، پردوں کا پرنٹ۔۔۔ اب اسے سب کچھ صاف صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ جنت نے اپنے دل میں سکون و اطمینان کی لہر اترتی محسوس کی۔ وہ چند لمحے اسی طرح لیٹی چھت کو دیکھتی رہی، پھر اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ پانی کے گلاس کی تلاش میں اس نے دائیں طرف دیکھا جہاں گلاس اور جگ کی موجودگی کا اسے واثق یقین تھا تب ایک اور تکلیف دہ حقیقت کا انکشاف ہوا۔ اس کا ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔

اپنے بدن کی پوری طاقت لگا کر اس نے اس لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی مگر اس کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کا ہاتھ ہنوز لرزتا رہا۔ پھر اس نے اپنا دوسرا ہاتھ آنکھوں کے سامنے کیا۔ اس ہاتھ کی حالت بھی پہلے سے مختلف نہیں تھی۔

معاً اسے یاد آیا۔ پچھلے کچھ روز سے اس کا سارا جسم رعشہ زدہ ہو رہا ہے۔ وہ چلتی تھی تو اس کی ٹانگیں کانپنے لگتی تھیں۔ پلنگ سے اٹھ کر باتھ روم جانے تک اسے کئی منٹ لگ جاتے تھے۔

اپنی حالت کا احساس ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کیا وہ اسی طرح تنہائی میں مر جائے گی؟

کیا کوئی اس کا حال پوچھنے نہیں آئے گا؟

وہ جو ایک بھرے پرے گھر میں رہتی تھی۔۔۔ سب اس سے کتنی محبت کرتے تھے۔۔۔ وہ سب لوگ کہاں چلے گئے؟

کوئی اس کا حال نہیں پوچھتا۔ کوئی اس کے پاس نہیں آتا؟ وہ کتنی تنہا ہے۔

"تم اکیلی نہیں ہو جنت۔۔۔ میں تمہارے پاس ہوں۔"

ایک مردانہ آواز اسے چونکا گئی تھی۔ اس نے سرعت سے گردن موڑی۔ اس کا شوہر پلنگ کے داہنی جانب پڑی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جنت خوف و دہشت سے کانپتی اٹھ بیٹھی۔

دیوار پر لگی تصویر خالی ہو چکی تھی۔ کرسی آباد تھی۔

جنت خوف زدہ نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

"تت۔۔۔ تم۔۔۔ تم کیسے آ گئے؟"

"میں تو یہیں تھا جنت!" وہ اس کی معصومیت پر مسکرانے لگا۔ "میں تو کبھی گیا ہی نہیں۔۔۔ بھلا میں تمہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا جنت!"

"میں تو میں گئی تھی۔۔۔ واپس تو میں آئی ہوں۔" باریک سی آواز تھی، جو بائیں طرف سے آئی تھی۔

جنت کو یاد آیا۔ وہ اس بچی کو دیکھ چکی ہے مگر کہاں؟۔۔۔ اسے یاد نہیں آیا۔

"آپ نے میرے بھائی کو مار دیا۔۔۔ مجھے مار دیا۔۔۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟" اس کے بال لمبے تھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔

جنت کو یاد آیا۔ وہ اسے کہاں دیکھ چکی ہے۔ یہ یاد آتے ہی وہ ایک بار پھر خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"تم۔۔۔ میں نے کسی کو نہیں مارا۔۔۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔" جنت نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔۔۔ تم نے ہمیں قتل کیا ہے۔" اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے لہو ٹپکنے لگا تھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" جنت نے کہنا چاہا لیکن کمرے کی دیواروں سے کافی ساری آنکھیں جھانکنے لگی تھیں۔ جنت نے دیکھا سفید لباس میں ملبوس کئی وجود اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

جنت خوف سے کانپتی پلنگ پر کھسکنے لگی۔

"میں نے کسی کو نہیں مارا۔۔۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" معاً وہ حلق کے بل چلائی۔ ساتھ ہی اپنی طرف بڑھتے ہاتھوں سے بچنے کی کوشش کرتی نیچے گر گئی۔ اس کا سر پلنگ کی پٹی سے ٹکرایا۔ اور سر سے خون کا فوارہ سا پھوٹ نکلا۔

"میرے ساتھ چلو جنت!" جنت کا شوہر اس پر جھکا کہہ رہا تھا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔"
"نہیں۔" وہ ادھر ادھر سر مارنے لگی۔ تکلیف اور خوف نے اسے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔
"میرے ساتھ چلو جنت!"
"تم نے قتل کیا ہے... تم نے ہمیں مروا دیا۔"
"یہ دنیا ہمارے لیے اچھی نہیں ہے... ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"
"نن... نہیں۔"
"آؤ جنت!... میرے ساتھ آؤ۔"
"تم نے قتل کیا۔"
"نن... نہیں۔"
اس کا شوہر وہ پہلا شخص تھا، جس نے اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ اگر جنت ہوش میں ہوتی تو ضرور اس کی آنکھوں سے جھانکتی نفرت کو دیکھ لیتی مگر اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ سانس کھینچنے کے لیے پورا طاقت لگا رہی تھی۔ اسے اپنی گردن بھی آزاد کروانی تھی۔ اپنی زندگی کی بقا کے لیے اسے شدید جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔
لیکن اتنی مزاحمت ناکافی تھی۔ گردن پر بڑھتے دباؤ کے ساتھ اس کے سانس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں باہر کی طرف ابل رہی تھیں۔ شور بڑھ گیا تھا۔ الزامات کی سنگ باری شدید ہو رہی تھی پھر اچانک ہر طرف سناٹا چھا گیا۔
اور جس وقت دروازہ توڑا گیا، جنت کے جسم سے روح کو آزاد ہوئے دو دن گزر چکے تھے اور اس کے دونوں ہاتھ اس کی اپنی گردن میں گڑے ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼
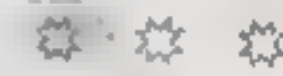
"ہادی! ثمینہ آپا بہت دیر سے تمہارا پوچھ رہی ہیں؟" وہ گھر میں داخل ہوئی تو ممانی نے اس سے کہا۔
"میں پیکنگ مکمل کر لوں تو دیکھتی ہوں۔" اس کے انداز میں تھکن تھی۔
"بہتر ہو گا کہ پہلے مل لو۔ انہوں نے بہت دیر سے شور مچا رکھا ہے کہ ہادی کو لاؤ۔ وہ مجھے چھوڑ کر پاکستان چلی گئی ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ جاؤں گی۔" ممانی بے زاری سے بتا رہی تھیں۔ وہ لاکھ اچھی سہی لیکن تھیں تو انسان اور اکتاہٹ بھی انسانی فطرت کا حصہ ہے۔
ہادی نے آہستگی سے سر اثبات میں ہلایا اور ثمینہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اسی وقت سیڑھیوں کے قریب رکھا فون بجا تھا ہادی قریب تھی تو اس نے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔
"ہیلو..." دوسری طرف سے جو خبر دی گئی اسے سن کر ایک پل کے لیے ہادی نے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔
"اچھا... کب؟"
اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ممانی ٹھہر کر اس کی بات سننے لگیں۔
"کیا بات ہے ہادی! سب خیریت تو ہے ناں؟"
"پاکستان سے فون تھا۔" ہادی نے آہستگی سے کہا۔ ممانی کو پاکستان سے آئے ہوئے کسی فون کال میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔
وہ سرسری سا اثبات میں سر ہلا کر اپنی کی طرف چلی گئیں۔

ہادی ثمینہ کے کمرے میں آ گئی۔ ثمینہ بیڈ پر بیٹھی اپنے الجھے بالوں سے کھیل رہی تھیں۔ ان کا حلیہ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ ہادی کو افسوس سا ہوا۔ اس کی ماں ہمیشہ اپ ٹو ڈیٹ حلیے میں رہتی تھی۔ کھڑکی سے آنے والی ابر آلود روشنی نے انہیں گھیرے ہوئے تھی۔
"ممی!" ہادی نے آہستگی سے پکارا۔
انہوں نے فوراً گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
"تم گئیں نہیں۔" ان کی آنکھوں میں روشنی سی کوندی تھی۔ "مجھے پتا تھا تم مجھے چھوڑ کر پاکستان نہیں جا سکتیں۔"
"ممی! میں پاکستان جا رہی ہوں۔" اس نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے آہستگی اور نرمی سے کہا۔
"ہم دونوں پاکستان جا رہے ہیں۔" ثمینہ نے سرعت سے کہا تھا۔
"ہم دونوں نہیں ممی! صرف میں جا رہی ہوں۔ آپ یہیں رہیں گی۔" اس نے نرمی سے کہا۔
"نہیں ہادی! ہم دونوں جا رہے ہیں۔ میں نے تو اپنا سامان بھی پیک کر لیا ہے۔" ثمینہ بضد تھیں۔ "ہم دونوں جائیں گے اور جنت بیگم کو سزا دلوائیں گے۔"
"ممی! اب یہ ممکن نہیں ہے۔ ابھی پاکستان سے کال آئی تھی۔ پرسوں رات جنت بیگم کا انتقال ہو گیا ہے۔"
ثمینہ چپ ہو کر کچھ دیر اس کی شکل دیکھتی رہیں، جیسے اس کے لفظوں کو تول رہی ہوں پھر انہوں نے کہا۔
"کیسے؟"
"ہارٹ فیل... آپ کو پتا ہے ناں، ان کے بچوں نے ان سے قطع تعلق اختیار کر لی تھی۔ حویلی میں اگرچہ وہ تنہا نہیں رہتی تھیں لیکن انہوں نے خود کو ایک ہی کمرے تک محدود کر لیا تھا... ملازم کہتے ہیں۔ اکثر کمرے میں ہی بند رہتی تھیں۔ کسی ملازم کو بھی آنے کی اجازت نہ تھی، ہاں ضرورت کے وقت ملازم کو بیل بجا کر بلا لیتی تھیں۔ دو روز تک کسی کو نہیں بلایا تو ملازمین نے اندر جا کر دیکھا۔ وہ زندہ نہیں رہی تھیں بلکہ ڈاکٹرز کا کہنا ہے، وہ دو روز پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں۔"
"یہ بھی اس عورت کا کوئی ڈراما ہے ہادی! تم مانو یا نہ مانو۔" اس کے خاموش ہوتے ہی ثمینہ نے تیزی سے کہا۔
"ایسے سخت دل لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔ تم نے دیکھا نہیں جنت بیگم کی عمر کتنی لمبی ہے، کئی سالوں سے لگاتار جیسے چلی جا رہی ہے۔" ہادی ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔
"تم میری بات مانو۔ وہ ابھی بھی زندہ ہے، اس نے خود اپنی موت کا جھوٹ بولا ہے تاکہ سزا سے بچ سکے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں وہ عورت بہت چالاک ہے۔ تم اس کی چالاکیاں نہیں سمجھ سکتیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔"
ثمینہ کا اصرار تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا، ہادی نے گہری سانس بھر کر تاسف سے ماں کو دیکھا۔ ایک نہ ایک دن انسان کو مر ہی جانا ہوتا ہے۔ دوسروں کی زندگیوں کے فیصلے کرتے ہوئے پتا نہیں وہ یہ بات سوچتا کیوں نہیں ہے۔ کاش جنت بیگم نے کبھی تو سوچا ہوتا کہ کتنی زندگیاں اس کی سفاکیوں کی نذر ہو رہی ہیں۔ اگر وہ ایسا سوچتی تو بہت بڑے بڑے نقصان ہونے سے بچائے جا سکتے تھے۔
اور خود ہادی کی بھی وہ کتنی بڑی مجرم بن گئی تھی۔ اس کے باپ نے جنت بیگم کی وجہ سے خودکشی کی تھی اور اس کی ماں جنت بیگم کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی۔ نقصان بڑا تھا اور افسوس کی بات یہ کہ اس نقصان کا ازالہ بھی ممکن نہ رہا تھا۔
ہادی خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔

✡ ✡ ✡

یہ ایک چمچماتی روشن صبح تھی' جب ماوی لاہور پہنچی۔ اس کے ساتھ مختصر سا سامان تھا۔ فیضان اسے لینے ایئرپورٹ آئے تھے۔

"بہت کمزور ہو گئی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" فیضان نے فکر مندی سے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ان تک جنت بیگم کی وفات کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔

"میں تو خیر ٹھیک ہوں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے ...... خیر سے منگنی کروا کے تو آپ پر روپ آ گیا ہے۔" اس کی طبیعت کی شوخی ابھی بھی ماند نہ پڑی تھی یا وہ دانستہ خود کو فریش ظاہر کرنے کی کوشش میں تھی بہرحال فیضان قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

"تم نہیں سدھر سکتیں ماوی!" وہ اس کا سامان گاڑی میں رکھنے لگے تھے۔

"انبیا کیسی ہے؟"

"ویسی ہی... خوب صورت۔" فیضان نے مسکراہٹ دبائی۔

"ہاں.... ہاں.... اسے کہتے ہیں دل آئے گدھی پر تو پری کیا چیز ہے۔" ماوی نے آہ بھر کر بظاہر تاسف سے کہا تھا' فیضان ایک بار پھر ہنس دیے۔

"تم چلو ذرا میں بتاتا ہوں انبیا کو۔"

"بتا دیں میں کوئی ڈرتی ہوں اس سے۔" اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے خوش گواریت سے کہا تھا۔

چند منٹ خاموشی سے گزرے' فیضان گاڑی کو پارکنگ سے نکال کر مین روڈ پر لے آئے تھے۔

"ہم کہاں جائیں گے؟ میرا مطلب ہے آپ کے گھر یا انبیا کی طرف؟"

"جیسے تم مناسب سمجھو۔۔۔ میں تو کہتا ہوں گھر چلتے ہیں' تم کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کر لینا' پھر گاؤں کے لیے روانہ ہوں گے۔ ثروت آپا اور دانیال بھائی کا ارادہ بھی ہے جنت بیگم کے جنازے میں شریک ہونے کا۔" فیضان انبیا سے منگنی کے باوجود ثروت کو آپا اور دانیال کو بھائی کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔

"نہیں' کھانا تو میں نے پلین میں کھا لیا تھا اور آرام کرنے کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں گاؤں کے لیے روانہ ہونا چاہیے۔" ماوی نے کہا۔

فیضان نے محض اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"ثمینہ آپا کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"ویسی ہی ہے جیسا آپ چھوڑ کر آئے تھے' کوئی خاص امپروومنٹ نہیں ہے۔" ماوی نے مایوسی سے کہا تھا۔

"ان فیکٹ دن بدن حالت بگڑ رہی ہے۔ میں نے انہیں جنت بیگم کی وفات کا بتایا تو کہنے لگیں' یہ بھی اس عورت کا کوئی نیا ڈراما ہے۔ وہ اتنی جلدی نہیں مر سکتی۔"

"آپا نے اصل میں اس سب کا بہت اثر لیا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی سمجھ ہی نہیں سکا کہ وہ کس ذہنی حالت سے گزر رہی ہیں۔ سب کا خیال تھا جب بھائی کے بعد وہ سنبھل چکی ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ ان کے دماغ میں کچھ اور ہی چلتا رہا اور ہم بے خبر ہی رہے۔"

ماوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اسے وہ دن یاد آ رہا تھا جب وہ پہلی بار پاکستان آئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"یہ سچ ہے کہ جنت بی بی نے ہم سب کی زندگیاں برباد کیں۔" ثروت نے بسکٹ کی پلیٹ اٹھا کر ماوی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں لان میں بیٹھی تھیں۔ دھوپ ڈھل چکی تھی اور اچھی خاصی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ فیضان کو کچھ کام تھا۔ وہ اسے وہاں چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے کہیں باہر گئے تھے۔

"شبینہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" ماوی نے دانستہ موضوع تبدیل کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ اس موضوع سے حتی المقدور دامن بچانا چاہتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ ایسا ہرگز ممکن نہ ہو گا۔ اس کے سوال کے جواب میں ثروت کے چہرے پر افسردہ' متاسف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"کوئی خاص امپروومنٹ نہیں ہے اور ڈاکٹرز کوئی بہت حوصلہ افزا جواب بھی نہیں دیتے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے اتنے سالوں کے بعد جو مجھے اپنے بیٹے کو واپس حاصل کرنے کی امید بندھی تھی' وہ ٹوٹ جائے گی۔" ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ماوی اپنے مگ سے اٹھتی بھاپ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا بوجھل دل اور بھی بوجھل ہو گیا۔

"آپ اتنا مایوس نہ ہوں۔ اللہ آپ کے بیٹے کو تندرست کر دے گا۔" اس نے ایک گہری سانس اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔ اس کے مگ میں ایک آخری گھونٹ باقی تھا اور ماوی سوچ رہی تھی' اب مگ واپس رکھ دینا چاہیے۔

"میں کیسے مایوس نہ ہوں۔ جنت بیگم نے بہت برا کیا ہم سب کے ساتھ۔" ثروت ایک دم رونے لگی تھیں۔

"وہ انسانیت سے عاری عورت تھی۔ جلال نے مجھے بتایا کہ اس نے نہ صرف دانیال کے کان بھر رکھے تھے بلکہ شبینہ کو مجھ سے متنفر کرنے کے لیے ایسی ایسی باتیں اس کے ذہن میں ڈال رکھی تھیں کہ میں سوچتی ہوں تو مجھے خود سے شرم آنے لگتی ہے۔ وہ میرے سامنے زندہ ہو کر آئے تو میں اس عورت کو بتاؤں میں اس سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔"

"آپ یہ سوچ کر مایوس نہ ہوں کہ کائنات میں جنت بیگم سے بڑی بھی ایک ذات ہے' جو ہم سب کے حساب لینے پر قادر ہے۔" ماوی نے یکدم ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"بے شک جنت بیگم نے شبینہ کو آپ سے متنفر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن صرف اللہ تھا جس نے شبینہ کو آپ سے نفرت کرنے نہیں دیا۔ کیا جلال نے آپ کو نہیں بتایا کہ [illegible] تعلقی رشتے کے باوجود آپ سے لاتعلق نہیں رہتا تھا' اسے آپ کی فکر رہتی تھی۔ نہ صرف آپ کی بلکہ اسے آپ کی پوری فیملی کی فکر رہتی تھی۔ ولید کو اسپتال لے کر جانا اس بات کی سب سے بڑی نشانی ہے اور ایک مرتبہ تو اس نے جلال کے ایک دوست کو انبیا کو گھورنے پر بری طرح پیٹ ڈالا تھا......"

"ہاں یہ بھی جلال نے مجھے بتایا تھا۔" ثروت نے ہاتھ میں پکڑے مگ کو دیکھتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"تو یہ سب کس کی مہربانی سے تھا؟ اللہ کی مہربانی سے ناں؟" ماوی نے اگلا سوال داغا۔

ثروت نے قدرے ناسمجھی سے اسے دیکھا پھر بے سوچے سمجھے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو جو اللہ آپ پر اتنی مہربانی کرتا رہا ہے کیا اس کے لیے آپ جنت بیگم کی زیادتیوں کو بھول نہیں سکتیں۔" ماوی نے تحمل سے کہا تھا۔ ثروت کے لیے اس کی بات حیران کن تھی۔ ان کا چہرہ تاثرات کو چھپا نہیں سکا۔

"اس اللہ سے آپ کو یہ امید بھی رکھنا چاہیے کہ وہ آپ کے بیٹے کو تندرست ضرور کردے گا۔" ماوی کہہ رہی تھی۔

"میں کیسے بھول جاؤں۔ اس عورت نے میری پوری زندگی برباد کردی۔" ثروت نے کہا۔

"اور دوسروں کو کسی کو بھول جانے کی تلقین کردینا بہت آسان ہوتا ہے۔ کیا تم بھول سکتی ہو جبکہ تمہارے باپ نے اس کی وجہ سے خودکشی کرلی تھی۔ تمہاری ماں اسی عورت کی وجہ سے اس حال کو پہنچی کہ اب اسے ذہنی طور صحت یاب کرنا مشکل ہو رہا ہے۔" ثروت نے جیسے اس پر چوٹ کی تھی۔

ماوی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"میں انہیں معاف نہ کرچکی ہوتی تو آپ کے سامنے بیٹھی ان کی وکالت نہ کر رہی ہوتی۔"

"عجیب بات ہے۔ یا تو تمہارا دل بہت بڑا ہے یا پھر تمہیں اپنے ماں باپ کی کوئی پروا ہی نہیں ہے۔"

"ماں باپ کی پروا ہی تو مجھے حویلی لے گئی تھی اور ویسے بھی جو دنیا سے چلا گیا اس سے خفا رہ کر یا اس کے لیے دل میں کوئی شکایت رکھ کر میں کیا کروں گی' پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میں اللہ سے مایوس نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ ممی کو ٹھیک کردے گا۔" ماوی نے پریقین لہجے میں کہا اور مگ میز پر رکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہم سب زندگی میں کچھ نہ کچھ غلطیاں کرتے ہیں ثروت آنٹی! جو کسی نہ کسی طرح خود ہم سے ہی وابستہ لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہو رہی ہوتی ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ کس نے کس کو چوٹ پہنچائی تو اللہ اسے سزا دے گا یا نہیں' سوال یہ ہے کہ ہم سب اپنا احتساب کس طرح کرتے ہیں اور خود کو ان غلطیوں سے بچاتے ہیں' جو کسی دوسرے کی زندگی بھی خراب کرسکتی ہیں۔ جنت بی بی کی غلطیاں کچھ زیادہ بڑی اور شدید تھیں اور ان کی غلطیوں نے بہرحال بہت سارے لوگوں کو متاثر کیا۔ لیکن جب ہم اپنی غلطیوں کے لیے خود کو معاف کرسکتے ہیں تو جنت بیگم کو کیوں نہیں۔ اب وہ اللہ کے پاس ہیں۔ انسانوں کو تکلیف پہنچانے کا حساب وہ خود ان سے لے لے گا اور کیا پتا وہ حساب لے بھی چکا ہو۔ ہم نہیں جانتے وہ جان کنی کے وقت کس اذیت سے گزری ہوں گی۔ مرتے وقت اگر انہیں پیاس لگی ہوگی تو حلق سے چند بوندیں بھی اتری ہوں گی یا نہیں۔ مرتے وقت اللہ نے کلمہ ان کی زبان سے جاری ہونے دیا ہوگا یا نہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ ان کی کسی نیکی کے صلے میں انہیں معاف ہی کردے تو میں کون ہوتی ہوں ان پر کوئی فرد جرم عائد کرنے والی۔

ویسے بھی جنت بیگم ان انسانوں میں سے تھیں جن کی جگہ گھروں میں نہیں اسپتالوں میں ہوتی ہے۔ وہ دراصل نفسیاتی مریضہ بن چکی تھیں تکلیف پہنچا کر خوشی حاصل کرنے والی ان کے اردگرد رہنے والے ان کی محبت میں اتنے پاگل ہوگئے' کبھی انہیں بتایا ہی نہیں کہ وہ کتنی غلط ہیں۔ وہ کہاں کہاں غلطیاں کرتی چلی جارہی ہیں۔ پہلے باپ' پھر شوہر' کسی نے بھی انہیں نہیں ٹوکا۔ آپ سوچ رہی ہوں گی۔ میں ان کی حمایت کیوں کر رہی ہوں؟ نہیں میں ان کی حمایت نہیں کر رہی میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جب کسی انسان میں کوئی نفسیاتی بگاڑ پیدا ہو رہا ہوتا ہے تو اس کے لیے صرف وہ انسان قصوروار نہیں ہوتا' بلکہ اردگرد رہنے والے اس کے اپنے بھی اتنے ہی قصوروار ہوتے ہیں۔ جنت بیگم کو اگر صحیح رہنمائی ملی ہوتی تو یقیناً' وہ ایسی نہ ہوتیں۔

میں اگر آپ سے ان کی غلطیوں کو بھولنے کا کہہ رہی ہوں تو صرف آپ کے اپنے ہی ذہنی سکون کے لیے۔ آپ کا نقصان بہت بڑا ہے' لیکن یقین مانیں جب بھول جائیں گی تو بہت اچھا محسوس کریں گی۔ یہ مشکل ضرور ہوگا ناممکن نہیں۔"

وہ اتنی مطمئن لگ رہی تھی کہ ثروت اسے دیکھتی رہیں۔ اس کے خیالات نے جیسے سوچ کا کوئی در کھول دیا تھا۔
"مجھے اچھا لگ رہا ہے تمہارے خیالات جان کر۔" ثروت نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے لیے انیبا جیسی ہی تھی۔

"اتنی چھوٹی عمر میں اتنی اعلا ظرفی کا مظاہرہ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ جلال خوش قسمت ہے کہ اسے تم جیسی اچھی بیوی مل رہی ہے۔"

ثروت کی بات کے جواب میں ہادی کو یکدم شرم ساری محسوس ہوئی تھی۔
"میرا خیال ہے میں زیادہ خوش قسمت ہوں کہ مجھے جلال جیسا اچھا انسان مل رہا ہے۔" اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ ثروت ہنس دیں۔
"اسے کہتے ہیں پرفیکٹ میچ..... ایک روز ہاسپٹل میں میری جلال سے بات ہوئی تو اس نے تمہارے متعلق بھی یہی کہا تھا کہ وہ خود کو زیادہ خوش قسمت سمجھتا ہے کہ خدا نے تمہیں اس کی قسمت بنایا۔"
ہادی کے لیے یہ ایک خوش گوار احساس تھا کہ جلال نے ناراضی کے باوجود اس کا ان الفاظ میں ذکر کیا۔ وہ بھرپور طریقے سے مسکرا دی۔ چلو شکر کہیں نہ کہیں تو گنجائش کا احساس ہوا۔
"میں ذرا انیبا کے پاس بیٹھی ہوں۔"
"اعلا ظرفی بھی کیسی بڑی نعمت ہے خدا کی۔" ثروت نے گرم چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے ہادی کو بے حد مطمئن انداز میں اندر کی طرف جاتا دیکھ کر رشک سے سوچا تھا۔
خنک شام رات کے پردے میں مدغم ہونے لگی تھی اور آسمان پر تھکے ہارے پرندے اڑان بھر رہے تھے۔
"پھر کیا.....؟" انیبا نے شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "فیضان نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولے تمہارے بغیر تو اب زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
اس کے چہرے پر رنگ پھوٹ رہے تھے۔ ہادی نے دلچسپی سے اسے دیکھا پھر چڑانے کو بولی۔
"جھوٹ..... سراسر جھوٹ..... میں مان ہی نہیں سکتی فیضان ماما نے ایسا کہا ہو۔ کہاں ان جیسا خشک مزاج، بورنگ بندہ اور کہاں اتنی رومانٹک بات۔"
"ارے! تمہیں کیا پتا اپنے ماما کا۔ ہیں کو اب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔" انیبا نے خود اپنی ہی بات کا مزا لیتے ہوئے کہا تھا۔
ہادی مسکراتی رہی۔ انیبا کی دائمی خوشیوں کے لیے اس کے دل سے دعائیں نکل رہی تھیں۔
"میں ٹھیک سے وضاحت نہیں کر سکتی ہادی! کہ میں کتنی خوش ہوں۔ جو چاہتی تھی، زندگی میں مل رہا ہے۔ ممی ڈیڈی کے ایشوز ریزولو ہو گئے۔ ولید ٹھیک ہو گیا اور..... اور فیضان کی محبت بھی مجھے مل رہی ہے..... اب تو کبھی کبھی خوف آنے لگتا ہے کہ کہیں یہ سب کوئی خواب تو نہیں۔"
"اللہ نہ کرے کہ یہ خواب ہو..... اللہ تمہیں اتنی خوشیاں دے کہ تم بھول ہی جاؤ غم کیا ہوتا ہے۔" ہادی نے کہا۔
"اور تم خود کیسی چھپی رستم نکلی ہو۔ ہوا تک نہیں لگنے دی کہ جلال بھائی کے ساتھ کیا معاملہ چل رہا ہے۔ بنا انڈراسٹینڈنگ ڈویلپ ہوئی۔ نکاح تک ہو گیا اور ہمیں کان و کان خبر تک نہ ہو سکی۔ بھئی واہ....."
ہادی کے پاس اس سوال کے جواب میں ایک مسکراہٹ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔
"اب خالی خولی مسکرانے سے بات نہیں بنے گی۔ مجھے اول سے آخر ساری بات بتاؤ۔"

"کوئی بات ہے ہی نہیں۔ کیا بتاؤں۔" ہادی نے سستی سے نیم دراز ہوتے ہوئے گویا بات رفع دفع کرنی چاہی۔
"ارے بھئی کچھ تو ہو گا بتانے والا..... کوئی خوب صورت سی فیلنگ..... کوئی ڈھکی چھپی ملاقات....." انیبا نے آنکھیں مٹکا کر کہا تھا۔
ہادی خوب ہنسی۔ اپنی الجھن چھپانے کی ایک لاشعوری کوشش پھر کپڑے جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ارے جا کہاں رہی ہو میری بات کا جواب تو دینا ہی پڑے گا۔"
"کوئی بات ہی نہیں ہے انیبا! تو کیا جواب دوں؟" اس نے سرسری انداز میں کہا تھا۔
"یہ کیسے ممکن ہے..... آخر کچھ نہ کچھ تو ایسا ہو گا جو معاملہ نکاح تک پہنچا۔" انیبا کو جیسے اس کی بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔
"کاش واقعی کچھ ایسا ہوتا۔" ہادی نے سوچا اس کے دل پر بوجھ سا آن رکا تھا۔
"اچھا باہر چلتے ہیں۔ گاؤں جانے کے لیے گاڑی تیار ہو گئی ہو گی۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔
شام اپنے جوبن پر تھی، جب وہ سب گاؤں پہنچے۔ درختوں میں گھری حویلی پر خاموشی کا راج تھا اور ایک عجیب سی سوگواریت چھائی ہوئی تھی۔
ثروت نے سر اٹھا کر حویلی پر جھکے آسمان اور درختوں کو دیکھا۔ اس جگہ ان گنت یادیں جڑی تھیں۔ اچھی بری، کڑوی کسیلی..... مگر یادیں تو یادیں ہوتی ہیں اچھی ہوں یا بری..... جب بھی ذہن کے پردے پر نمودار ہوتی ہیں دل و دماغ بوجھل کر دیتی ہیں۔ جنت بیگم سے کوئی اچھی یاد تو وابستہ نہیں تھی بس صلہ رحمی کی غرض سے جنازے میں شریک ہونے وہ سب آ گئے تھے۔
کچھ ایسے ہی خیالات دانیال حسن کے بھی تھے۔ ان سے جنت بیگم کی کوئی غرض نہ جڑی تھی، سوائے اس کے کہ ان کے بیٹے کی سابقہ بیوی ان کی زوجیت میں آ گئی تھی۔ یہ کوئی ایسی غلطی تو نہ تھی کہ ان کی پوری زندگی کا سکون برباد کر دیا جاتا اور بالفرض محال اگر ایسا ہوتا بھی تو جنت بیگم کو کیا اختیار تھا کہ ان کو سزا دیتی۔
کم و بیش سب کے خیالات کا دھارا ایک ہی سمت بہہ رہا تھا۔ ہادی نے وہاں کسی کو روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا ہاں سب افسردہ ضرور معلوم ہوتے تھے۔ کچھ کسان عورتیں ضرور رو رہی تھیں اور جنت بیگم کی اچھائیاں بیان کر رہی تھیں۔
"اماں نے خود کو تنہا کر لیا تھا۔ شبیہہ سے دراصل محبت بہت تھی انہیں۔ یہ بات برداشت نہیں کر سکیں کہ وہ خدا نخواستہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔" حلیمہ نے اسے بتایا تھا۔
"شبیہہ زخمی ہوا تھا پھر انہوں نے اور تم نے یہ اندازہ کیسے لگا لیا؟"
"بس کیا بتاؤں تمہیں..... جتنے منہ اتنی باتیں بن جاتی ہیں۔ ملازم گھر والے..... اصل بات تو کہیں گم ہی ہو گئی تھی....." ہادی انہماک سے انہیں سن رہی تھی، جب اچانک جلال اندر داخل ہوا۔
"امی! آپ نے معاذ کو....." اس کی نظر ہادی پر پڑی اور لفظوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ہادی جیسے تھم سی گئی تھی۔

"..... [illegible]....." اسے پلٹتا دیکھ کر ہادی نے بے ساختہ پوچھا تھا۔
جلال نے اس کی طرف دیکھا اور بس اثبات میں سر ہلا دیا۔
"امی معاذ کو ذرا باہر بھجوا دیں۔" وہ ہادی کی طرف دیکھے بنا باہر نکل گیا تھا۔
ہادی کا دل اور بھی بوجھل ہو گیا۔

"انسان خدا نہیں ہوتا کہ دوسروں کی زندگیوں کے فیصلے کرتا چلا جائے۔"

جنت بیگم کی بے حس و حرکت میت کو دیکھتے ہوئے ماوی سوچ رہی تھی۔ انسان تھی سینے میں دل تھا سو موت کے فطری احساس سے آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔

انسان پیدا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔ پیدائش اور موت کے اس درمیانی عرصے میں وہ کیا کیا غلطیاں کرتا ہے اگر ایک بار مرنے کا احساس کر لے تو دنیا ہی نہیں اس کی آخرت بھی بدل سکتی ہے۔ موت 'موت اور صرف موت..... زندگی کی سب سے اٹل حقیقت ہے پھر بھی ناسمجھ انسان سبق نہیں سیکھتا اور دوسروں پر عرصہ حیات تنگ کرتا چلا جاتا ہے جیسے جنت بیگم نے پوری تین نسلوں کے سکون کو اپنی خود پسندی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

"آپ جن لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑ کر جا رہی ہیں ان کے کندھوں پر آپ کی زیادتیوں کا بہت بوجھ ہے۔ جب تک یہ بوجھ کم نہیں ہوگا ان کے دل سے آپ کے لیے دعا نہیں نکلے گی اور جب تک وہ دعا نہیں دیں گے اللہ آپ کے حساب کتاب کو ہلکا نہیں کرے گا۔ میں کوشش کروں گی آپ سے خفا لوگوں کو آپ کے لیے راضی کر سکوں۔ مجھے یقین ہے اس نیکی کے بدلے اللہ میری ممی کو بھی ٹھیک کر دے گا اور مجھے جلال سے بھی معافی دلا دے گا۔"

ماوی دل ہی دل میں جنت بیگم سے مخاطب تھی۔

☼ ☼ ☼

دو روز حویلی میں گزار کر آج ان سب نے واپسی کا ارادہ کر لیا تھا۔ حویلی اسی طرح سوگوار تھی۔ ماوی جانے سے پہلے جلال سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ تھا کہ ایسا کوئی موقع دے ہی نہیں رہا تھا۔ پھر نکلنے سے کچھ دیر قبل اسے موقع مل ہی گیا۔ حرم نے بتایا وہ پچھلی طرف گیا ہے۔

ماوی ایک بھی پل ضائع کیے بغیر اس طرف آ گئی۔ وہ سیڑھیوں پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شام کے چہرے پر اداسی کا عکس نمایاں ہو رہا تھا اور خزاں کی خنک ہوا درختوں کے سوکھے پتے اڑا رہی تھی۔ ماوی متذبذب کھڑی تھی۔ اسے جلال کو کس طرح مخاطب کرنا چاہیے۔

اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس کر کے جلال نے ذرا سی گردن موڑی تھی۔ اسے دیکھ کر خفیف سا حیران ہوا۔

"تم لوگ ابھی تک گئے نہیں؟" اس کی دھیمی آواز تھی۔ ماوی خفیف سی ہو گئی۔ وہ اس بات کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"جلال! میں تم سے ایک بار ایکسکیوز کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے جلدی سے اور لجاجت سے کہا تھا۔

"میں خفا ہی نہیں ہوں ماوی! پھر تم کس لیے معذرت کرو گی؟" اس نے پھیکے سے انداز میں کہا۔

"مجھے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کا ایک موقع تو دو جلال! میں جانتی ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا ہے۔"

"تم نے برا نہیں کیا' میری قسمت نے برا کیا۔" جلال نے یکدم بے زاری سے کہا تھا۔

"تم سے وہ سب ثمینہ آنٹی نے کروایا تھا۔ تمہاری تو کوئی غلطی نہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے تمہیں مجھ میں انٹرسٹ نہیں۔ تم جب کہو گی میں تمہیں طل..." اس کی زبان واضح لڑکھڑائی تھی۔ "طل... طلاق دے دوں گا۔"

ماوی چپ سی رہ گئی اس نے تو فوراً فیصلہ سنا ڈالا تھا۔

"اور اگر میں کہوں کہ مجھے طلاق نہیں چاہیے تو...؟" وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اس کے سامنے آئی تھی۔ جلال نے تعجب سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"طلاق نہیں چاہیے تو پھر؟ اس طرح تو گزارا نہیں ہو سکے گا۔ تمہیں کہیں نہ کہیں تو شادی کرنی ہی ہے اور عدت میں تم دو نکاح نہیں کر سکتیں..... مغربی معاشرے میں پلی ہو' میرا خیال ہے یہ بات کسی نے کبھی نہیں بتائی تمہیں۔" جلال نے سنجیدگی سے چوٹ کی۔

"مغربی معاشرے میں پلی ہوں لیکن تربیت میری اسلامی اصولوں کے مطابق ہوئی ہے۔ میرے ویسٹرن کپڑوں سے تم نے میرے ایتھکس (اخلاقیات) کا انتہائی غلط اندازہ لگایا ہے۔" وہ چڑچڑے پن سے بولی۔ "میں اچھی مسلمان ہوں الحمدللہ اور مشرقی بھی۔ اسی لیے تم سے یہ نہیں کہہ پا رہی کہ میں اپنی ساری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔"

"تم نے جو بھی کیا' وہ اپنی ماں کی خوشی کے لیے کیا۔ اپنی غلطی کا اتنا بڑا کفارہ مت کرو۔" چند منٹ بعد جلال نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گی ماوی! کیونکہ تمہیں مجھ سے محبت تھی ہی نہیں۔ اب بھی اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو صرف اس لیے تاکہ اپنی غلطی سدھار سکو۔" وہ کچھ زیادہ ہی حقیقت پسند ہو رہا تھا۔

"بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔ مجھے تمہاری کسی بات سے اختلاف نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں تمہارے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گی۔ یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ شادی سے پہلے محبت کی جائے تب ہی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتی ہوں جنہوں نے پہلے محبت کی پھر شادی..... اور ان کی شادی کامیاب نہ رہی اور میں ایسے لوگوں سے بھی ملی ہوں جنہوں نے شادی کے بعد محبت کی اور..... میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ محبت شادی کے بعد کر لوں گی۔ البتہ تمہیں مجھ سے پہلے بھی محبت کرنا ہو گی اور بعد میں بھی..... محبت لڑکیوں کا پیدائشی حق ہوتی ہے اور تم مجھ سے میرا یہ حق نہیں چھین سکتے۔"

اس کا انداز دھونس بھرا تھا۔ جلال حیران ہوا' پھر ہنس دیا۔ اس ہنسی میں اقرار تھا۔

ماوی ہلکے پھلکے دل اور بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اس کے قریب آئی۔ اس کے بازو میں ہاتھ ڈال اور اپنا سر آہستگی سے اس کے شانے پر ٹکا دیا۔

"میری ایک بات مانو جلال! ماضی میں جو ہوا اسے بھول جاؤ' زندگی آسان ہو جائے گی۔" ماوی کہہ رہی تھی اور اس سے قبل کہ جلال کوئی جواب دیتا اس کی جیب میں رکھا سیل فون بجنے لگا تھا۔

جلال نے فون کان سے لگایا چند منٹ بات کی پھر ماوی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ خوش تھا کچھ بے یقین۔

"اسپتال سے فون تھا..... شبیہہ کو ہوش آ گیا ہے۔"

"اوہ..." ماوی خوش ہوئی۔ "یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے..... میں نے کہا تھا ناں جلال! اللہ خوش ہو تو نوازتا ضرور ہے۔"

جلال نے شکر گزار مسکراہٹ کے ساتھ آسمان کی جانب دیکھا۔ تنوی کی رہائی کا ارمان اور شبیہہ کے ہوش میں آنے کا مژدہ تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس نے ماوی کا اپنے بازو پر رکھا ہاتھ تھپتھپایا اور اپنا سر اس کے سر سے لگا دیا۔

ڈھلتی ہوئی شام کا ستارہ آسمان کے کنارے روشن ہو چکا تھا۔ یہ شام کا ستارہ نہیں امید کا ستارہ تھا اور ان دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

☼

ام مریم

واپسی

چھپھٹاتا ہوا رکشا ایک چھوٹے سے مکان کے آگے آکر رکا تو تب سے اکڑوں بے زار بیٹھی دیا جلدی سے اپنی چادر اور بیگ سنبھالتی نیچے اتر آئی۔ بابا کرایہ دے رہے تھے۔ اس نے ان سے نگاہ ہٹا کے سامنے دیکھا۔ لکڑی کا پرانا بوسیدہ سا دروازہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی دیواروں پر سے جامن کی شاخیں ادھر ادھر جھانک رہی تھیں۔ بابا کے ہمراہ وہ یوں ہی بھڑے ہوئے دروازے کو کھول کر اندر آئی تو جامن کے درخت کے نیچے چارپائی پہ سبزی بناتی دادی نے سرسری سی نظر اٹھائی مگر انہیں پہچانتے ہی ان کے بوڑھے جھریوں زدہ چہرے پر ایک دم رونق اتر آئی۔ سب کچھ یوں ہی چھوڑ کر وہ جلدی سے اٹھیں اور بہت تپاک سے بیٹے اور پوتی کو گلے لگا لیا۔

"چائے پیو گے کہ بوتل منگا لوں؟"

"دادی! پہلے بوتل پھر کھانے کے بعد چائے۔" اس سے پہلے کہ بابا جواب دیتے وہ بول پڑی۔ دادی کو اس کی یہ اپنائیت بھری بے تکلفی بہت بھائی۔ مسکرانے لگیں اور بوتل منگوانے کو گلی کے بچے کو آواز دے رہی تھیں کہ بابا نے روک دیا۔

رہنے دیں اماں! میں لاتا ہوں۔

دادی کے منع کرنے کے باوجود بابا چلے گئے تو دیا اٹھ کر چادر اتار کے تہ کرنے لگی۔ دھیان خود بخود گھر

مکمل ناول

طرف چلا گیا تھا۔ ذیشان اور لائبہ تو امی کے ساتھ کھانا کھا چکے ہوں گے امی تو نماز پڑھ کے حسب عادت قیلولہ کرنے لگی ہوں گی ذیشان اور لائبہ نے ضرور کوئی مووی لگالی ہوگی۔ ابھی تو آزادی نصیب ہوگئی تھی کیونکہ انہیں روکنے ٹوکنے والے تو بابا اور وہ ہی تھے اور اس وقت دونوں وہاں نہیں تھے۔

بابا صرف کولڈ ڈرنک ہی نہیں، گوشت، سبزیاں اور جانے کیا کچھ خرید لائے تھے جنہیں سنبھالتے ہوئے دادی بڑبڑا رہی تھیں۔

"ذرا جو خیال ہو۔ بہت فضول خرچ ہے یہ دلی محمد بھلا مجھ اکیلی جان کا کیا خرچہ؟ جب بھی آتا ہے تھیلے بھر کے چیزوں کے لائے گا۔ تھیلے بعد میں ماں کھائے نہ پڑی سڑتی رہیں۔" اس نے دادی کی تقریر سنی اور ہنسنے لگی۔

"فکر کیوں کرتی ہیں دادی! اب میں آگئی ہوں نا اب یہ ساری چیزیں سڑیں گی نہیں۔" دادی نہال ہوا ٹھیں۔

"ہاں پتری! کیوں نہیں۔" دادی نے پیار سے خود لپٹا لیا۔

"دیا بیٹا! آپ نکال لیتیں کولڈ ڈرنک گلاسوں میں۔" وہ مزے سے بیٹھی تھی، بابا کے ٹوکنے پہ منہ بنا لیا۔

"فکر نہ کریں بابا! مجھے ہی اب دادی کے سارے کام کرنے ہیں۔ بس اس وقت تھکی ہوئی آئی ہوں۔"

"ہاں ہاں تو چپ رہ۔ میں اتنا سا کام اپنی دھی کا کرتے تھکنے کیوں لگی؟" دادی نے بھی بابا کو ڈانٹا، اور اس کی حمایت لی۔

بوتل پی کر بابا نماز کو چلے گئے تو اس نے وہیں لیٹ کر آنکھوں پہ بازو رکھ لیا۔ ذرا سستانے کا موڈ تھا۔ جبکہ دادی گوشت چڑھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ دادی کی پڑھی لکھی شہری پوتی کی آمد کا سن کر آس پڑوس کی عورتیں باقاعدہ اس کے دیدار کو آرہی تھیں دادی ہر کسی کے سامنے اس کے سگھڑاپے کی بات

تعلیم اور خوب صورتی کے لیے چوڑے قصیدے پڑھتیں تو دیا ایک دم خجل ہو جاتی۔ ایک دو بار انہیں دبے انداز میں ٹوکا بھی مگر ان کا ایک اپنا انداز تھا، وہ مگن رہیں۔ اس روز انہوں نے بڑے شوق سے گڑ کے چاول پکائے تھے جس میں چنے کی دال بھی ڈالی تھی۔

تیرے ابا کو یہ چاول بڑے پسند تھے اور تیرے بہشتی دادا کو بھی۔ انہوں نے پلیٹ بھر کے اسے تھماتے ہوئے اطلاع دی۔ وہ محض مسکرادی مگر اتنی رغبت سے نہ کھا سکی۔ جتنی سے غالباً" دادا اور بابا کھاتے ہوں گے۔ جب ہی تو دادی کا چہرہ اتر گیا تھا۔

دادی نے چار مرغیاں پال رکھی تھیں۔ اس وقت اس نے دادی سے انڈوں کے حلوے کی فرمائش کی تھی جب ہی دادی ایک دم پُرجوش ہو کر حلوہ بنانے لگیں۔

ابا اسے دادی کے پاس چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ وہ شہری ماحول کی عادی تھی۔ اسے یہاں وقت بہت سست روی سے گزرتا محسوس ہوتا تھا۔ ماحول کی تبدیلی نے اس پر بہت بے زاری اور کسل مندی سی طاری کررکھی تھی حالانکہ تقریباً" روز ہی اس کی گھر پہ سب سے فون پر بات ہوتی تھی مگر پھر بھی وہ ایڈجسٹ نہیں کرپارہی تھی۔ زندگی پہ چھایا جمود اسے اب بے زار کرنے لگا تھا مگر دادی کے خیال سے چپ تھی کہ دادی کا دل نہ ٹوٹ جائے اس کی واپسی کا سن کر۔ جب سے دادا کی وفات ہوئی تھی وہ [illegible] ہوگئی تھیں۔ بابا کو ان کی بہت فکر رہتی تھی۔ [illegible] وہ منت سماجت کے باوجود بھی یہاں شہر [illegible] نہیں تھیں۔

[illegible]

کو ان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔

"اچھا ہے اماں! آپ اسے اپنے پاس رکھیں۔ ذرا اس کی تربیت بھی کر دیجیے گا۔ ورنہ اس کے باپ نے تو اسے بس لاڈ پیار کرکے بگاڑ دیا ہے۔ یہ نہیں پتا بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے اس کی شادی بھی کرنا ہے۔" امی نے فون پر دادی سے کہا تھا اور دادی جی جان سے تیار ہوگئی تھیں۔

"بسم اللہ! کیوں نہیں پتری! میں اپنی دھی کو سینا، پرونا، گھرداری سب سکھاؤں گی۔ بس اللہ سوہنا میری دھی کا نصیب بہت اچھا کرے۔"

اور یقیناً" اب دادی اس کی تربیت کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھیں کہ ہر کام اس سے کرایا کرتیں۔ صبح خود نماز کو اٹھتیں تو اس وقت تک ان کی پکاریں نہ تھمتیں جب تک اسے بھی وضو کے لیے ہاتھ روم روانہ نہ کر دیتیں۔ پھر بس یہ اکتفا نہیں تھا۔ قرآن کی تلاوت اور تسبیحات بھی ضروری تھیں۔ یہاں آنے کے بعد شاید ہی ان پندرہ بیس دنوں میں کوئی نماز چھوڑنے پائی ہو۔ ورنہ گھر پہ تو وہ مرضی کی مالک ہوا کرتی تھی۔ کبھی پڑھ لی کبھی چھوڑ دی۔ نہیں تو نہ سہی۔ بابا کی تاکید اور امی کی سرزنش پہ وہ کہاں اتنا کان دھرنے کی عادی تھی مگر دادی کی تو بات ہی اور تھی وہ صرف کہتا ہی نہیں منوانا بھی جانتی تھیں۔

دادی اسی وقت انڈوں سمیت اندر آئی تھیں۔ اس نے کپڑوں کا ڈھیر چارپائی پہ پھینک دیا۔ دادی کے کچن میں جانے کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر کپڑوں کو تہہ لگانے لگی۔

اس شام چپکے چپکے درودیوار سے جھانکتی رہی۔ صحن سے آنگن میں بکھری اکتائی سی دھوپ نے [illegible] اپنے پر سمیٹے اور واپسی کا سفر [illegible] تو نیل خاموش، عنبر پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ [illegible] سے بھرنے لگا۔ جامن کی شاخوں پر پڑے [illegible] ننھی سی چڑیا شاید راستہ بھول کر

آبیٹھی۔ نرم دھوپ میں اونگھتے پتوں نے آنکھیں کھول کر اس اجنبی مگر مانوس مسافر کو خوش آمدید کہا۔ اس کے ننھے وجود سے جھولا دھیرے دھیرے ہلنے لگا۔ دیا کپڑے تہہ لگا کر اٹھی تو چڑیا پر پھڑپھڑا کر پھر سے اڑ گئی۔ وہ کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی جب اس کے سیل پہ بیپ ہونے لگی۔ کچن سے دادی بھی مسلسل پکار رہی تھیں۔

"دادی کو کیا فرق پڑا میرے آنے سے۔ وہ اکیلی تھوڑا ہی تھیں۔ یہاں کی ہمسایہ عورتیں دن بھر چکر لگاتی ہی رہتی تھیں مگر میری زندگی کیسی اکتاہٹ سے بھر گئی ہے۔" وہ واقعی بے زار ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے وہاں آئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ اس دوران ایک چکر بھی بابا کے ساتھ امی اور ذیشان، لائبہ وغیرہ لگا چکے تھے شروع دنوں میں بے زار رہنے کے بعد اب جیسے تیسے ایڈجسٹ کرچکی تھی۔ گرمیاں مکمل طور پہ رخصت ہو چکی تھیں۔ سردیوں کی آمد تھی، ایسے میں دادی کو ہزاروں کام تھے۔ سب سے زیادہ الجھن دیا کو اس وقت ہوئی جب وہ لحاف ادھیڑ کر بیٹھ گئیں۔

"صاف ستھرے تو تھے دادی! کیوں پھیلاوا ڈال لیا؟" وہ جھنجلا گئی۔

"بیٹا! دوبارہ سے بھرائی کرانی تھی نا۔ میں تمہیں ان میں ڈورے ڈالنے سکھاؤں گی۔" انہوں نے بڑے چاؤ سے کہا اور وہ بے ہوش ہونے والی ہوگئی۔

"پلیز دادی! مجھے نہیں سیکھنے۔" اس نے منہ لٹکایا تھا دادی ہنسنے لگیں۔

"نہ پتر! سب کچھ والدین کے گھر سے سیکھ کر اپنے گھر جاؤ گی تو شوہر کے دل پہ راج کرو گی۔ کوئی تنگی نہیں ہوگی تمہیں کسی بھی نئے کام میں ہاتھ ڈالتے۔ اور کام کرنا تو پڑتا ہے یہ تو طے ہے۔" دادی نے مخصوص انداز میں سمجھایا۔

"ہر کام میں خود جان مارنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی دادی! جو کام پیسے دے کر ہو جائے اسے۔"

"نہ کرنا ہر کام میری دھی۔ مگر سیکھنے میں کوئی حرج ہے؟" دادی نے کہا اور وہ ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئی۔

"پتر! عورت کو ہر کام آنا چاہیے۔ مشکل اور آزمائش میں فائدہ رہتا ہے۔"

"آپ کو الہام ہوا ہے دادی کہ میری قسمت میں مشکل یا آزمائش آئی ہے۔" وہ ایک دم شوخ ہو گئی دادی نے سنجیدگی و رسانیت سے اسے دیکھا۔

"پتر! ہماری تو دعا ہے کہ تیرا نصیب شہزادیوں سے بھی زیادہ اچھا ہو۔ مگر آنے والے وقت کا تو صرف اللہ کو ہی علم ہے نا۔ اللہ سے تو بہتری کی ہی امید اور دعا کرتے ہیں۔"

وہ سر ہلا کے رہ گئی۔

☆ ☆ ☆
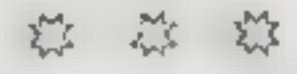
اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا' دادی کمرے میں نہیں تھیں۔

کھلے بالوں کو سمیٹتے ہوئے وہ بستر سے اٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ باہر نکلتی دادی اس کے لیے ناشتا لیے چلی آئیں۔ وہ ایک دم شرمندہ ہوئی۔

"دادی! آپ نے کیوں بنایا میں خود بنا لیتی نا۔"

"کوئی بات نہیں پتر! تو ہی بناتی ہے ہر روز تو ناشتا کر لے۔ مجھے ثریا کی طرف جانا ہے۔" دادی کا انداز بجھا بجھا سا محسوس کر کے وہ زور سے چونکی۔

"کیوں دادی! خیریت؟" وہ جانتی تھی' دادی عام عورتوں کی طرح محلے کے گھروں میں فضول جا کے بیٹھنے کی عادی نہیں تھیں۔

"خاوند فوت ہو گیا ہے اس کا۔" دادی کی اطلاع پہ اسے افسوس ہوا۔

"ساری رات گھر نہیں آیا تھا نمانا۔ بے چاری بڈھی ماں برستی بارش میں چھاتا لیے ڈھونڈتی پھری مگر نہ ملا۔ صبح کوئی نماز پڑھنے کو اٹھے تو گٹر کے گندے نالے کے قریب گرا ہوا ملا۔ اللہ جانے کیسے جان نکلی ہو گی سسک سسک کے بے چارے نے۔" دادی کی آواز بھرا گئی۔

"غلط کاموں کے ہمیشہ غلط نتیجے ہی نکلا کرتے ہیں دادی! وہ غلط راہوں پر چل پڑا تھا تو یہ تو ہونا ہی تھا۔" کسی قدر رعونت سے کہہ کر ناشتے کی سمت متوجہ ہو گئی۔

"وہ ہمیشہ سے ایسا تھوڑا ہی تھا پتر! حالات کی ستم ظریفی کی نذر ہو گیا بے چارہ۔" دادی کے لہجے میں ملال ہی ملال تھا۔

وہ چند نوالوں سے زیادہ نہ لے سکی۔ چائے کا مگ اٹھا کر ناشتا ختم کیا۔

"ایسے مردوں کو راہ راست پہ لایا بھی کیسے جا سکتا ہے دادی! جو سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود راہ سے بھٹک جائیں۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"انسان خطا کا پتلا ہے پتر! غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ پھر حالات ہی انسان کو مایوس یا حوصلہ مند بناتے ہیں۔ مگر اس غلطی کو نہ سدھارنا ہی اصل غلطی ہے۔ مایوسی سے نہ نکلنا ہی تباہی ہے۔ بسا اوقات انسان کو خود اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوتا۔ یا گناہ کی لذت اور کشش اسے اتنا مسحور کر دیتی ہے کہ اندر کا یہ احساس مٹ کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں اس سے وابستہ لوگوں کا فرض ہے کہ اسے بھلائی اور ہدایت کے راستے کی طرف بلائیں اور پھر بیوی کا تو ایسا رشتہ ہے۔ جو بہت مضبوط ہی نہیں بہت قریبی بھی ہوتا ہے۔ عورت اپنے مرد کو پیار محبت اور توجہ دے کر جو چاہے کرا لے۔ مرد کی کمزوری بنایا گیا ہے عورت کو۔ اس کے بغیر مرد کبھی خود کو مکمل اور تسو... محسوس نہیں کرتا اور خاص طور پر وہ عورت جس سے مرد کو محبت ہو' وہ مرد سے کچھ بھی کروا لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

"تو کیا ثریا کے شوہر کو ثریا سے محبت تھی؟ ... ثریا سے محبت کی شادی کی تھی اس نے؟" معاً یہ دم دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ دادی نے گہرا سانس بھرا۔

"پتر! اس رشتے میں تو محبت اللہ کی طرف سے اتاری جاتی ہے۔ دو انجان غیر اور اجنبی افراد ایک رشتے میں بندھتے ہیں تو اللہ ہی ہے جو انہیں ایک دوسرے کو پیار کرنے اور سمجھوتے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں محبت نہ رہی ہو؟ یہ الگ بات ہے کہ بات واقعات کے رخ کے ساتھ اس احساس کی شدت گھٹتی رہتی ہے۔ نیک اور پارسا عورت رشتہ ازدواج کو خوب صورتی سے نبھاتی ہے۔ اس رشتے کو خوب صورت رکھنے میں سب سے اہم کردار بیوی کا ہی ہوتا ہے۔ تحمل مزاج اور خوش اخلاق عورت نہ صرف اپنے شوہر کے دل پہ راج کرتی ہے بلکہ اسے صحیح و غلط راستے پہ بھی چلا سکتی ہے۔ ثریا کے شوہر کی زندگی تو اتنی ہی تھی مگر جس انداز میں اس کی موت ہوئی اس میں یقیناً حالات کے ساتھ ساتھ ثریا کی بھی کوتاہی اور زیادتی شامل رہی ہے۔" دادی نے حسب عادت ایک طویل لیکچر دیا تھا۔

"دروازہ بند کر لو۔ اور میری آواز پہچان کر ہی دروازہ کھولنا۔" دادی تاکید کرتی چلی گئیں۔

وہ دروازہ بند کر کے اندر آ گئی مگر سوچوں کا محور ثریا اس کا شوہر ہی رہے تھے۔ پتا نہیں دادی جو کہہ رہی تھیں وہ کتنے فیصد صحیح تھا۔ عورت سے ہی کیوں ہر کوئی قربانی مانگتا تھا۔ اس کا شوہر اس کے گھر والے اور یہ معاشرہ بھی۔ وہ جتنا سوچتی اسی قدر الجھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کئی دنوں سے چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ آج بھی صبح سے لگاتار بارش برس رہی تھی۔ کبھی تیز بوچھاڑ کبھی ہلکی پھلکی۔ اور ایسی ہی ہلکی پھلکی پھوار میں ذیشان اور لائبہ اچانک بنا کسی اطلاع کے چلے آئے۔

"ہم! پکوڑے اور گلگلے بنائیں۔"

ذیشان کی فرمائش پہ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ بابا حسب عادت آتے ہوئے ڈھیروں سامان لائے تھے۔ جسے امی اس کے ٹھکانوں پہ پہنچا رہی تھیں۔ ساتھ لائبہ لگی تھی۔ ساری سبزیاں دھو کر فریج میں رکھیں۔ جام انڈے اور ڈبل روٹی کے پیکٹ بھی فریج میں رکھے۔ اس کا رزلٹ آ چکا تھا وہ ماسٹرز کرنا چاہتی تھی جبکہ امی اور دادی کا خیال تھا' اب اس کی شادی ہو جانا چاہیے۔ دونوں اپنی بات پہ قائم تھیں۔ پچھلے دنوں امی کی کوششوں کے نتیجے میں ایک دو اچھے رشتے بھی آئے تھے۔ امی آج اسی سلسلے میں دادی کے پاس آئی تھیں۔ یہاں سے ساس بہو کا ارادہ بابا کے ساتھ لڑکے کو دیکھنے جانے کا تھا۔ یہ ساری اطلاعات ابھی کچھ دیر قبل ذیشان نے اسے دی تو اس کے تیزی سے پکوڑوں کے لیے پیاز کاٹتے ہاتھ تھم گئے تھے۔

"کیوں پیچھے پڑ گئی ہیں امی میرے؟ پڑھ تو لینے دیں سکون سے۔" وہ جھنجلا گئی تھی۔

"ہم ہمیشہ کے لیے آپ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں بجو! قسم سے آپ کے بغیر وہاں اتنا مزا آ رہا ہے کہ کیا بتاؤں۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا' مگر دیا کی آنکھیں جانے کس احساس کے تحت لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔

"جان چھڑانا ہے تو مجھے کسی کنویں میں دھکا دے دو نا۔" وہ چھری پھینک کر چیخ پڑی۔ ذیشان بوکھلا گیا۔

"ارے رے! ایک ہینڈسم سے بندے کو ہم بھلا کیوں اتنی پیاری لڑکی سے محروم کریں؟ قسم سے بہت ڈیشنگ ہیں۔ دیکھیں گی تو بس دیکھتی رہ جائیں گی۔"

ذیشان نے اسے چپ کرانے کو کہا تھا وہ ہونٹ بھینچنے لگی اور بھیگی آنکھوں سے اسے گھورا۔

"وہ جتنا بھی ہینڈسم ہو۔ مگر مجھے ماسٹرز کرنا ہے۔ میں بابا سے بات کروں گی۔"

اور اس نے یہ محض دھمکی نہیں دی تھی' رات کے کھانے کے بعد وہ سب کمرے میں دہکتی انگیٹھی سے آگ تاپتے' چائے اور ابلے ہوئے انڈوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے' جب دیا نے یہ بات بابا سے کہی۔

"ہاں تو پڑھ لینا۔ ہم کون سا منگنی کے ساتھ ہی

شادی بھی کردیں گے۔ ابھی تو صرف لڑکا دیکھنے جانا ہے۔" امی کو اس کا یوں منہ پھاڑ کر یہ سب کہہ دینا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا جب ہی بے حد جز بز ہو کر بولی تھیں۔ بابا کے تاثرات نارمل تھے۔ وہ بچوں کو اپنی آزادانہ رائے کا حق دینے کے حامی تھے۔

"آپ فکر نہیں کریں۔ بیٹا! اگر آپ ماسٹرز کرنا چاہتی ہیں تو ماسٹرز کے بعد ہی آپ کی شادی ہوگی۔"

"میں کہے دے رہی ہوں اگر مجھے لڑکا پسند آیا تو میں ہرگز یہ رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دوں گی۔ اچھے رشتے آسانی سے نہیں ملتے۔" امی نے اپنا ارادہ ظاہر کردیا۔

"تو بیگم صاحبہ! آپ اپنا کام کریں۔ اگر لڑکا اچھا ہوا تو ہم بھی پاگل نہیں جو انکار کریں۔" بابا کے کہنے پہ دیا نے احتجاجی نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ آہستگی سے مسکرا دیے۔ وہ بھرپور خفگی کا تاثر دیتی اسی وقت وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

"بیٹا! منگنی ہونے میں تو حرج نہیں ہے نا۔ آئی پرامس کہ شادی ماسٹرز کے بعد ہی ہوگی۔ منگنی ہوگئی تو تمہاری ماں بھی خوش ہوجائے گی۔"

وہ کچن میں کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ بابا نے وہاں آکر اسے مخاطب کیا تو وہ جھینپ کر مسکرا دی تھی۔ بابا مطمئن ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

بابا دیا کا ایڈمیشن یونیورسٹی میں کرانے پہ آمادہ ہوگئے تھے۔ وہ شہر میں اسی کام میں مصروف تھے۔ دیا دادی کو قائل کررہی تھی کہ وہ بھی ان کے ساتھ شہر چلیں۔ دادی کسی طور آمادہ نہ تھیں، اس کا انہیں اکیلے چھوڑنے کا جی نہ تھا۔ وہ انہیں رسانیت اور محبت سے منانا چاہتی تھی اور یہ اس کی منت سماجت ہی تھی کہ دادی کو اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑ گئے تھے۔ وجہ یہی تھی کہ وہ بیٹے کی پہلی اولاد ہونے کے باعث ان کی بے حد لاڈلی تھی۔ جب اس نے ناراضی کی دھمکی دی تو انہیں مانتے ہی بن پڑی تھی۔ دو دن بعد بابا کو انہیں لینے آنا تھا۔ دادی اپنے ہمسایوں سے ملتی پھر رہی تھیں۔

وہ اپنا گھر چھوڑ جانے کے خیال سے اداس بھی تھیں۔

یہ اس گھر میں ان کی آخری رات تھی۔ دادی اپنے بستر پہ سکون کی نیند سو رہی تھیں جبکہ وہ شاید ایک آدھ گھنٹہ نیند لینے کے بعد اٹھ گئی تھی اور اب کروٹیں بدلتے جانے کتنے گھنٹے بیت گئے تھے۔ رات اپنے اندر ہزاروں بھید چھپائے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے چوکیدار کی سیٹی کی گونجنے والی آواز کے علاوہ اندر باہر خاموشی کا راج تھا۔ موسم بدل جانے کے باعث فضا میں غضب کی سردی تھی۔ دادی کے ہلکے خراٹے کمرے کی فضا میں گونج رہے تھے۔ اسے خراٹوں میں کبھی بھی نیند نہیں آتی تھی۔ لائبہ بھی سوتے میں خراٹے لیا کرتی اور اسے اتنی ہی چڑ ہوتی۔ اسے بلا دریغ جھنجوڑ کر جگا دیتی۔ وہ بے چاری پھر جاگے یا سوئے، یہ آرام سے سوجاتی۔

اگلے دن لائبہ ڈھیروں شکایتوں کے ساتھ بابا کے سامنے فریادی بنی کھڑی ہوتی مگر اس کے سامنے کس کی چل سکتی تھی۔

"اللہ کرے۔ آپ کا شوہر اتنی زور سے خراٹے لیا کرے کہ آپ سونے کو ترسیں۔" لائبہ کی ایک نہ چلتی تو وہ بددعاؤں پہ اتر آتی۔ اس وقت اسے لائبہ کی بددعا یاد آئی تو مسکرا دی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے پیاس محسوس ہورہی تھی۔ اس نے سرہانے پڑی میز پہ رکھے جگ کو دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ حالانکہ دادی کی عادت تھی جگ میں رات کو پانی رکھنے کی۔ شاید بھول گئی ہوں۔ وہ دوبارہ لیٹ گئی، باہر جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ مگر پیاس کا احساس شدت اختیار کرنے لگا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ بالآخر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ سوچا اور دل کڑا کرکے باہر کچن تک جانے کا فیصلہ کرلیا۔ دادی کی نیند خراب کرنے کا اس کا جی نہیں چاہا تھا۔ دروازے کی چٹخنی گرائی اور برآمدے میں ڈیوڑھی میں لگے انرجی سیور کی روشنی صحن تک پہنچ رہی تھی۔ چاند غائب تھا۔ ہر شے پہ خاموشی اور پراسراریت کا راج تھا۔ وہ کچن میں آگئی۔ مدھم سی روشنی کچن کی کھڑکی کے ذریعے وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ اس نے لائٹ آن کیے بنا ریک سے گلاس اٹھایا سنک کی ٹونٹی کھول کر گلاس بھرا۔ ابھی منہ کی طرف لے کر گئی بھی نہیں تھی کہ فضا میں گونج اٹھنے والی فائر کی آواز سے اس کا دل کانپ گیا، مگر وہ اس وقت کچھ اور کی جب صحن میں باری باری چند سائے خاموشی سے کودے۔ ایسے لگا اس کا دل حلق میں آگیا ہو۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہوگئی۔ پہلا خیال چوروں کا ہی تھا۔ وہ لمبے تڑنگے آدمی جن کے چہروں پہ سیاہ ڈھاٹے اور ہاتھوں میں چمکتی رائفلیں تھیں دندناتے ہوئے آنگن میں آئے اور پھر کمرے کے کھلے دروازے میں جا گھسے۔ دیا کو ایک پل کو لگا اس کا دل دھڑکنا بھول جائے گا اور وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ خوف سے ساکن آنکھیں لیے وہ اسی حالت میں کھڑی باہر دیکھتی رہی۔ کچن کی لائٹ نہ جلانا، اس کے لیے کتنا مفید ثابت ہوا تھا۔

"او بڑھیا! اٹھ، تیرے باقی گھر والے کدھر ہیں؟"

اس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک کرخت آواز سنی۔ دادی کا خیال آیا تو خوف کے ساتھ تشویش بھی ہوئی۔

"چابیاں نکال بڈھی! سونا، نقدی جو بھی ہے شرافت سے ہمارے حوالے کردے اور کیا تو گھر میں اکیلی ہے؟" وہی سفاک آواز پھر گونجی۔ دیا کا دل دھک دھک کرنے لگا، جانے دادی کیا کہیں؟

"نہیں! بڈھی کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ کھلا ہوا دروازہ اور خالی بستر اس بات کا گواہ ہے۔ کہاں ہے وہ؟ کہیں اسے ہمارا پتا تو نہیں چل گیا اوے۔ یقیناً" مائی کا بابا ہوگا۔ واش روم چیک کرو امانت! اور اسے قابو کرو۔" ایک اور آواز گونجی جس میں یقین تھا۔

دیا کو اپنا وجود سن ہوتا محسوس ہوا۔ برآمدے کے ستون کے پاس کھڑا ہوا آدمی اس آواز پہ چوکنا انداز میں آگے بڑھا تھا۔ اس کا رخ واش روم کی سمت تھا۔ دیا کے دماغ نے لمحے کے ہزارویں حصے میں کام کیا۔ اس نے تیزی سے اپنے دفاع کے لیے کسی چیز کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ چاول پکانے کی بھاری ڈوئی کچن کی سلیب پہ پڑی نظر آئی۔ اس نے وہی اٹھالی اور محتاط سے انداز میں دروازے کی اوٹ میں ہو کر کھڑی ہوگئی۔ واش روم کو خالی پا کر ڈھونڈنے والا اسی سمت آیا تھا۔ دیا نے دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ ڈوئی پہ اپنے کانپتے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کی اور جس پل وہ لمبا آدمی اپنی جھونک میں اندر آیا۔ دیا نے پوری قوت سے ڈوئی گھما کر اس پہ وار کیا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے ہرگز خود کو ان کے ہتھے نہیں چڑھانا چاہتی تھی۔ اس پل اس کے خوف پہ وحشت کا احساس غالب آگیا تھا۔ آنے والے نقاب پوش کو شاید کسی بھی عام فرد سے ایسی چابک دستی اور پلٹ کر حملے کی توقع نہیں تھی کہ جب ہی کچھ پل کو مبہوت رہ گیا۔ نقاب اس کے چہرے سے ہٹ گیا تھا اور اس کی پیشانی سے بھل بھل بہتا ہوا خون اس کے چہرے کے بعد گردن اور دامن کو رنگین کرتا چلا گیا۔ دیا نے دوبارہ اس پہ حملہ کرنا چاہا، مگر تب تک وہ اس سکتے سے باہر نکل کر مغلظات بکتے ہوئے ایک دم اس پہ جھپٹا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی تحویل میں جاتی اور وہ اسے کوئی نقصان پہنچاتا، ایک بھاری بھرکم رعب دار آواز نے فی الفور مداخلت کی تھی۔

"امانت! اسے چھوڑ دو۔"

دیا نے چونک کر سر گھمایا۔ بھاری تن و توش کا وہ طویل القامت نقاب پوش اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ تھیں کہ دیا ایک نگاہ ڈال کر ہی دہل گئی۔

"کیوں چھوڑ دوں؟ تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے میرا حشر۔"

"تم باہر چل کر گاڑی میں بیٹھو! ہم ابھی آرہے ہیں۔" اس لمبے آدمی نے کہا، جبکہ اس کا زخمی ساتھی کچھ خفا خفا سا اسے تکنے لگا تھا۔ دیا کسی کی بھی پروا کیے بغیر بھاگ کر کمرے میں آئی اور ہراساں و وحشت زدہ سی بیٹھی دادی سے لپٹ گئی۔ وہ یوں ساکن تھیں جیسے خوف اور صدمے سے قوت گویائی چھین لی ہو۔

"تم سب واپس چلو۔" اس لمبے سرخ آنکھوں والے نے اندر آکر حکم دیا۔ وہ غالباً "ان کا سرغنہ تھا۔ الماری اور ٹرنکوں وغیرہ میں سونا، نقدی کو تلاشتے"

ہنگامہ مچانے والا اور دادی پہ گن تانے کھڑا نقاب پوش ششدر رہ گئے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہو۔ یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے کہ ہم۔"

"ڈونٹ وری! ہم یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔" اپنی بات کے اختتام پہ اس نے دیا کو سلگتی آنکھوں سے دیکھا۔

دیا کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ اور دادی کچھ سمجھتیں اس لمبے آدمی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر بے دردی سے دیا کو اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ کا گلا بے ہوشی کی دوا میں بھیگے رومال نے اس کے چہرے کے نزدیک آتے ہی گھونٹ دیا تھا۔ اس کے بعد دیا کو لگا تھا' ہر شے پہ اندھیرے مسلط ہو گئے ہوں۔

☼ ☼ ☼

رات بھر گرنے والی اوس میں بھیگی سڑک پہ گاڑی کی لائٹیں پڑیں تو شفاف بوندیں روشنی سے منعکس ہو کر جگمگا اٹھیں۔ سڑک کے دونوں اطراف کھڑے درخت بھی یوں ساکن تھے جیسے پتھرا گئے ہوں۔ جیپ میں بیٹھے چاروں نفوس بے حد خاموش تھے۔ تینوں کے چہروں پر ابھی تک سیاہ نقاب تھے۔ وہ چاروں ہی طویل قامت اور بھاری جسامت کے مالک تھے' مگر جو ان میں سب سے لمبا تھا' وہ اس وقت پچھلی سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا۔ رائفل اس کی گود میں تھی اور داہنے پہلو میں بیٹھی دیا ابھی تک بے سدھ تھی۔ یہ ڈاکوؤں کا ایک گروہ تھا جو پہلی مرتبہ کسی گھر سے مال چوری کرنے کی بجائے اس گھر کی عزت چرا لایا تھا اور ان کے سرغنہ نے ایسا کیوں کیا تھا' یہ نہ تو ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا جیپ ڈرائیو کرتا حسام جانتا تھا' نہ زخمی ہونے والا امانت اور نہ ہی اس کی مرہم پٹی کرتا ہوا راجو۔ تینوں بے حد خاموش اور خفا تھے۔

خاموش تو وہ تھا لمبے قد والا بھی تھا' مگر وہ خفا نہیں مضطرب تھا۔ اس کی بے چین نگاہیں گاہے بگاہے بے ہوش پڑی دیا کی سمت اٹھتیں اور وہ جیسے ہر مرتبہ پہلے سے بڑھ کر مضطرب ہو جاتا۔ وہ خود پہ حیران تھا۔ اپنی بار پہ ششدر تھا۔ وہ لڑکی بے حد پرکشش تھی۔ اس کی بڑی بڑی خواب ناک آنکھیں تھیں اور تراشیدہ لبوں کی رنگت یاقوت کی طرح تھی۔ اس کے کھڑے ہونے' اٹھنے بیٹھنے کے انداز میں ایک انوکھا سا وقار تھا۔ وہ کتنی فرصت سے اسے سوچ رہا تھا۔ محض چند لمحے لگے تھے اور اس کے دل پہ واردات ہو گئی تھی۔ وہ جو ہمیشہ چھینتا آیا تھا' لوٹتا آیا تھا' کیسے لمحوں میں لٹ گیا تھا۔ امانت کو اسی نے کسی دوسرے فرد کی تلاش میں بھیجا تھا۔ اندر بیٹھی عورت کے لیے وہ بندے کافی تھے' جب ہی وہ احتیاطاً" امانت کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی نسبت بے حد محتاط اور چوکنا رہنے کا عادی تھا۔ اس کی اسی سوجھ بوجھ کے باعث وہ کبھی پولیس کے ہتھے نہیں لگے تھے۔ امانت کو واش روم کی سمت جاتے دیکھ کر اس نے کچن کا رخ کیا۔ کچن کے آگے سے گزرتے اسے کھڑکی کی جالی سے اندر جاتی روشنی میں لہراتا آنچل اور لمبی چوٹی نظر آئی تھی۔ وہ وہیں تھم گیا۔ وہ لڑکی ترچھے زاویے سے کھڑی تھی۔ پھر اس کے دیکھتے اس نے ڈوئی اٹھائی تھی۔ وہ لازمی اس کی حکمت عملی پہ غور کرتا اور اس سمت آتے امانت کو خبردار کرتا اگر جو اس کے حواس اس کے ساتھ رہے ہوتے۔ چٹکی ہوئی چاندنی جیسا روپ رکھنے والی اس لڑکی میں ایسا کیا تھا جو پہلی نگاہ میں اس کی سدھ بدھ چھین کے لے گیا تھا۔ یہ وہ نظمی سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی حسین لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں۔ اس کی زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین طرح دار اور فیشن ایبل حسینائیں آئی تھیں۔ مگر وہ ہمیشہ بے نیاز رہا تھا۔ اس کے ساتھی وقت گزاری کو عورتوں کی صحبت اختیار کرتے اور اسے دعوت دیتے' مگر وہ ہر بار ٹال دے جاتا۔

مگر اب اس کے وہی ساتھی جو عورت سے اس کی بے زاری اور گریز سے آگاہ تھے۔ اس فیصلے کے پیچھے محرک سوچ رہے تھے۔

"ہاں تو تم نے اٹھانے نہیں دیا۔ اس لڑکی کو اٹھانے کی کیا تک تھی؟ بتانا پسند کرو گے مستقیم؟" راجو کٹ دار نظروں اور تیز لہجے میں بولا۔

"اگلے ڈاکے میں' میں اپنا حصہ نہیں لوں گا۔ وہ مال سب میں تقسیم ہو گا سوائے میرے۔" مستقیم نے یکدم فیصلہ سنا دیا۔

راجو نے ہونٹ بھینچ کر خود کو بہت کڑی ہوئی سطحی بات کہنے سے روکا۔ وہ اس وقت مستقیم کو طیش دلانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کے غصے کی خوفناکی سے آگاہ تھا' پھر وہ ان کا سرغنہ بھی تھا۔

گاڑی میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ مستقیم نے گن سائیڈ پہ رکھ کر چہرے پہ بندھا رومال اتار دیا۔ اپنے سر کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں سہلایا' پھر بڑھی ہوئی شیو کو کھجاتے ہوئے ایک بار پھر بے ہوش دیا کو دیکھنے لگا۔ اب کی مرتبہ اس کی نگاہ میں پہلے کا سا تفکر نہیں' بلکہ ایک انوکھی چمک تھی۔ جسے اس کے ساتھیوں نے حیرت سے دیکھا تھا۔ آج وہ ہر طرح میں حیران کرنے پہ تلا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

طویل سفر کا اختتام جس جگہ پہ جا کے ہوا وہ ایک بے حد ویران علاقہ تھا' جہاں دور' دور آبادی اور ذی روح کا نام و نشان بھی نہ ملتا تھا۔ ایک عجیب وحشت انگیز سناٹا چہار سو پھیلا ہوا تھا۔ ایک طویل قطعہ زمین جس پہ اگے لاتعداد درختوں اور جھاڑیوں نے اسے جنگل کا روپ دے ڈالا تھا۔ جیپ وہیں آ کے تھم گئی تھی۔ ایک کھٹاک دروازے کھلے اور شفق کی لالی سے طلوع ہوتے سورج کے ساتھ وہ چاروں بھی جیپ سے برآمد ہوئے۔

"اب اس [illegible] کا کیا کرنا ہے؟ کہو تو واپسی پہ ندی میں پھینک دیں؟" راجو کا اشارہ ہنوز بے ہوش دیا کی جانب تھا۔ لہجہ خار کھایا ہوا تھا جو واضح کرتا تھا کہ اس کا موڈ ابھی درست نہیں ہوا۔

مستقیم نے پلٹ کر سرد مگر تندہی نظروں سے راجو کو دیکھا تھا۔ وہ ایک دم ہونٹ بھینچ گیا۔ ایسی تادیبی نظروں کا مطلب تھا اس سے آگے نہیں بڑھنا۔ وہ سب ہی مستقیم کی اس نظر سے خائف رہا کرتے تھے۔ مستقیم نے اس موڈ کے ساتھ آگے بڑھ کر کھلے دروازے سے جھک کر دیا کو احتیاط اور نرمی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ امانت کے ساتھ ساتھ حسام اور راجو کو بھی گویا سانپ نے سونگھ لیا تھا۔ وہ برسوں قبل کا وہ واقعہ ابھی تک بھولے نہیں تھے' جب صائمہ بائی نے جو اس پہ دل و جان سے فدا ہو گئی تھی' اسے اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر ایک رات جب ان کے ہاں عیش و طرب کی محفل عروج پہ تھی۔ صائمہ رقص کرتے ہوئے بڑھ کر مستقیم کے گلے لگ گئی تھی۔ وہاں موجود لوگوں کی سیٹیوں اور قہقہوں کا گلا اس وقت گھٹ گیا تھا' جب مستقیم نے صائمہ کو ایک جھٹکے سے الگ کر کے ایک زنانے دار طمانچے سے اس کے حواس ٹھکانے لگائے تھے۔

"یہ تھپڑ آئندہ بھی تمہیں میرے قریب آنے سے روکتا رہے گا۔ ہر کوئی نفس کا اتنا غلام نہیں ہوتا کہ تم جیسی عورتوں کے ہاتھوں کھلونا بن جائے۔" ایک ایک لفظ پھنکار پھنکار کر کہتا' وہ تن فن کرتا وہاں سے چلا گیا تھا اور اپنے پیچھے سناٹے چھوڑ گیا تھا۔ صائمہ وہاں موجود دیگر لوگوں کی دل جوئی اور ہمدردی کے باوجود بھڑکی رہی تھی اور وہ محفل بدمزگی کے باعث یوں ہی ختم کر دی گئی۔ راجو بعد میں مستقیم پہ بہت خفا بھی ہوا تھا۔

مستقیم نے جھک کر دیا کو احتیاط اور نرمی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔

"کیا کرو گے اس لڑکی کا؟" وہ امانت کے ہمراہ درختوں اور کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتا ہوا جنگل عبور کر رہا تھا۔ جب امانت نے اچانک سوال کیا۔ وہ چونکا' پھر مسکرا دیا۔

"اسے تمہاری بھابھی بنانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ یہ تم سب کے لیے قابل احترام ہے۔ باقیوں کو بھی بتا دینا۔" اس نے اپنی بات مکمل کی اور جنگل کے وسط میں درختوں کو کاٹ کر بنائی گئی اپنی رہائش گاہ کے بند دروازے کو کھول کر اندر چلا گیا۔ لمانت حیرت اور غیر یقینی سے وہیں ساکن کھڑا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ کھلی تو کتنی دیر تک یونہی لیٹے ہوئے غائب دماغی کی کیفیت میں ماحول کی اجنبیت کو تکتی رہی۔ اسے قطعی یاد نہ آسکا وہ کہاں ہے یا اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس نے خفیف سی حرکت دے کر چہرے کو گھمایا۔ وہ سنگل لوہے کا پلنگ تھا جس پہ گلابی پھولوں والی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ اسی بستر پہ وہ چت لیٹی تھی۔ کمرے کی دیواروں حتیٰ کہ چھت پہ بھی سفید رنگ پھیرا گیا تھا جو کہیں کہیں سے اکھڑ چکا تھا اور اس کے پیچھے پلستر کی بجائے لکڑی کے مضبوط تختے کیلوں کی مدد سے جڑے نظر آتے تھے، کمرے کا اکلوتا دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ دروازے کے ساتھ درمیانے سائز کی میز پہ ایک ٹرے رکھی تھی۔ جسے سفید رومال سے ڈھک دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس پہ اس کی نگاہ ٹھہرتی۔

اس کے حواس جاگے تو یادداشت کے پردے پہ وہ دھندلے سے عکس لہرا گئے۔ وہ دھیرے دھیرے سہی، مگر خود پہ بیت جانے والی قیامت سے آگاہ ہوئی تو ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت اور بے بسی کے احساس سمیت نمی بھی تیزی سے پھیلی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب گیا کہ اس کا دوپٹا اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے سراسیمگی کے عالم میں خود کو سمیٹا اور خوف زدہ نگاہوں کو دوپٹے کی تلاش میں دوڑایا جو اسے پلنگ کے سرہانے پڑا نظر آگیا تھا۔ اس نے جھپٹ کر دوپٹا اٹھایا اور خود کو اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ پھر بستر سے اتر کر دروازے کی طرف لپکی۔ دروازہ یقیناً" باہر سے بند تھا۔ جسے کھٹکھٹاتے اور مسلسل پکارتے وہ ہچکیوں سے رونا شروع کر چکی تھی اور جب اس کا گلا مسلسل چیخ اور رونے سے چھل گیا تھا تب اس نے اس روح میں اترتے سناٹوں میں کسی کے قدموں کی آہٹ سی سنی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کے پیچھے ہٹتی، ہلکے سے کھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔

وہی طویل قامت تھا، جس کی آنکھوں میں ایک نگاہ ڈال کر وہ سہم گئی تھی۔ اس پل بھی اسے دیکھ کر خائف ہو گئی۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کک۔ کون ہو تم؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"جو کسی کے گھر میں بنا اجازت گھس جائے لوگ اسے ڈاکو کہتے ہیں۔ ہاں! نام میرا مستقیم ہے۔ "کیوں لایا ہوں" کا جواب ہے "شاید تم اچھی لگیں مجھے۔" وہ اطمینان و سکون سے کہتا مبہم سا مسکرایا اور پلنگ پہ ٹک کر پھر اسے بغور تکنے کا شغل فرمانے لگا، کیا شاہانہ انداز گفتگو تھا۔ دیا کے اندر غیظ و غضب اور اشتعال کی ایک زوردار لہر اٹھی۔

"گھٹیا، خبیث انسان! تم جیسوں کو تو لفظ عزت و حرمت کے لیے بھی معلوم نہیں ہوں گے۔ نفس کے اگر اتنے ہی غلام ہو تو پھر کسی ایسی جگہ کا در کھٹکھٹایا ہوتا، جہاں تم جیسے لوگ اپنی ہوس پوری کرنے جاتے ہیں۔" بے بسی اور لاچاری کی انتہاؤں پہ پہنچ کر وہ چیخ پڑی تھی۔ جبکہ دوسری طرف اسی درجہ اطمینان کی کیفیت تھی۔

"مگر مجھے کوئی ایسی ویسی نہیں، ایک شریف زادی چاہیے تھی۔ اطمینان رکھو میں شادی کروں گا تم سے۔" اپنے تئیں اس نے دیا کو مطمئن کیا مگر اسے تو گویا آگ لگ گئی تھی۔

"میں تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی تم پہ، دو ٹکے کے انسان! اوقات ہے کیا تمہاری؟" اس ڈھٹائی کے مظاہرے نے دیا کا دماغ سلگا دیا تھا۔

مستقیم کو خود پہ ضبط کرنا پڑا۔ احساس توہین نے اس کا چہرہ ایک دم سرخ کر ڈالا۔

"دیکھو لڑکی! کیا نام ہے تمہارا۔۔۔"

"جو بھی ہو، تم سے مطلب؟ بس مجھے واپس چھوڑ کے آؤ۔" وہ جواباً پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

"واپسی کو بھول جاؤ۔ مستقیم ایک مرتبہ جس چیز کو نگاہ بھر کے دیکھ لے، جس چیز کی انجانے میں بھی خواہش کرلے، وہ چیز اس کی ہو جاتی ہے۔" دیا کے اعصاب پہ کوئی بم سا پھٹا تھا۔ مگر وہ خود کو اس لمحے کمزور ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"میں کوئی چیز نہیں ہوں، جیتی جاگتی انسان ہوں، تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ مجھے واپس چھوڑ آؤ، ورنہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔" اس کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ جسے محسوس کرکے مستقیم مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ ایسی ہی تھی جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی بات پہ مسکرا دے، دیا نے اس کی مسکان کو سمجھا اور ہونٹ بھینچ لیے۔

مستقیم اپنی جگہ سے اٹھا اور نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا اس کے نزدیک آگیا۔ دیا اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر اضطراب کی کیفیت میں غیر شعوری طور پہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتی دیوار سے جا لگی تھی۔ اب اس کے اور مستقیم کے بیچ فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سانس روکے آنکھیں پھیلائے ساکن سی بے بسی سے تکنے لگی۔

"تمہاری واپسی کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ ساری کشتیاں جل گئی ہیں۔ واپسی کو بھول جاؤ۔ اب تمہاری زندگی مجھ پہ شروع ہو کر مجھ ہی پہ ختم ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہنسی خوشی اس حقیقت کو تسلیم کرلو، ورنہ مجھے اپنی بات زبردستی منوانا پڑے گی۔ اس لیے کہ پہلی بار تو مجھے دل نے اکسایا ہے کہ کسی سے محبت کروں۔" بات کے اختتام پہ وہ مسکرایا، جبکہ دیا کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ مستقیم نے اسے روتے دیکھا اور ہونٹ بھینچ کر فاصلہ بڑھا دیا۔ وہ پلٹ کر جا رہا تھا، جب دیا بھاگ کر اس کے راستے میں آئی تھی۔

"دیکھو! یہ ظلم مت کرو۔ تمہیں تمہاری سب سے پیاری ہستی کا واسطہ ہے۔ رحم کرو مجھ پہ۔ میں یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتی، مر جاؤں گی میں، مر جاؤں گی۔"

وہ بچوں کی طرح سے ہچکیاں بھر کے روتے ہوئے اب اس کی منت سماجت پہ اتر آئی تھی۔

"مستقیم اتنا بے وقعت تو نہیں ہے کہ اتنی چاہت اور محبت سے کسی کو اپنانے کی خواہش کرے اور وہ یوں بے اعتنائی اور نخوت سے منہ پھیرے۔ تمہیں میری اہمیت کا اندازہ نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں توہین کے احساس نے تپش سی پیدا کردی تھی۔

"میں بھی اتنی ارزاں نہیں ہوں کہ تم مجھے اپنے نفس کی تسکین کی خاطر اٹھا لاؤ اور میں اسے اپنی خوش بختی سمجھ کر قہقہے لگاؤں۔ اور تمہاری اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہے مجھے۔ ایک ڈاکو کی حیثیت کیا ہوتی ہے، جاننا چاہو گے؟ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لوگ تمہیں اور ایسا کرنے میں وہ بالکل حق بجانب ہیں۔ تم اسی قابل ہو۔" وہ کسی آتش فشاں لاوے کی طرح پھٹ پڑی۔

مستقیم نے اس کے لہجے کی تحقیر کو محسوس کیا اور جیسے ایک دم اندر سے ڈھے گیا۔ ہاں! یہی تو تھی اس کی حقیقت، یہی تھا وہ تلخ سچ جسے وہ ایک عرصے تک ہضم نہیں کر پایا تھا اور ان چند سالوں میں جب بھی کسی نے اس کے سامنے آئینہ رکھا تھا، وہ اپنی صورت کی سیاہی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ اس وقت بھی احساس ذلت کے سبب جیسے اس پہ خون سوار ہو گیا۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ دیا کے گال پہ دے مارا تھا۔

"ہنی ڈونٹ کیئر۔ سو بار دیکھیں وہ مجھے نفرت کی نگاہ سے۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں خود انہیں جوتے کی نوک پہ رکھتا ہوں، مگر تم۔۔۔ تم۔۔۔ تم مجھ سے محبت کرو گی۔۔۔ ضرور کرو گی، اس لیے کہ میں ایسا چاہتا ہوں اور جو میں چاہوں، ویسا ہونا ضروری ہے، ورنہ میں آگ لگا دیا کرتا ہوں، ہر اس شے کو جو میری مرضی کے مطابق نہ ہو۔ میں تمہیں بھی جلا ڈالوں گا، سنا تم نے؟" وہ یقیناً حواسوں میں نہیں رہا تھا۔

وہ رونا بھول کر سہمی نظروں سے اسے تکنے لگی۔ پورا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح سے کانپنے لگا تھا۔

"میں کل تک کا وقت دیتا ہوں تمہیں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ پھر فیصلہ کرنا۔ مگر یاد رکھنا! فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہیے اور میں کل ہی تمہارے پاس آؤں گا' کھانا رکھا ہے' کھالینا۔" وہ پلٹ کر باہر نکلا اور دروازہ بند ہو گیا۔

دیا کو لگا اس کے وجود کو آہنی زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہو۔ وہ اپنی مرضی سے جنبش تک نہ کر سکتی ہو۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ وہ بے ساختہ و بے اختیار گھٹ گھٹ کر روتی چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ نیم تاریک کمرا تھا جس کی واحد کھڑکی باہر کی طرف سے بند تھی۔ اسے وہاں محصور ہوئے کتنا وقت بیتا تھا۔ وہ حساب رکھنا بھی چاہتی تو کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس دوران کئی بار اس کے لیے کھانے کی ٹرے لائی گئی۔ لانے والا ہر بار مستقیم ہوتا تھا۔ وہ ہر بار اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیرتی رہی' یہاں تک کہ وہ پلٹ کر چلا نہ جاتا۔

اس وقت بھی وہ اس کے لوٹ جانے کی منتظر تھی کہ وہ قدم بڑھاتا اس کے نزدیک آگیا۔ دیا اپنی جگہ سمٹی اور اپنے دوپٹے کو کچھ اور بھی مضبوطی سے جکڑ لیا' وہ اس کی موجودگی میں لہو کو سوکھتا محسوس کرتی تھی۔ اسے اس وحشی درندے سے بہر حال کوئی اچھی امید نہیں تھی۔

"کیا فیصلہ ہے تمہارا؟" وہ اس پہ نگاہیں ٹکا کر اس کے ستے ہوئے چہرے کو بغور تکتا ہوا بولا۔ جواب میں خاموشی تھی' وہ سلگ اٹھا۔

"چلو! کھانا کھاؤ۔" اس نے اتنی زور سے اس کا دوپٹا کھینچا کہ وہ بھی ساتھ گھسٹتی آئی۔ اس کی آنکھیں خوف کی زیادتی سے پھٹ سی گئیں۔

"نہیں کھاؤں گی۔" اس کے آنسو بہہ نکلے' مستقیم جھنجلا اٹھا۔

"پاگل پن مت کرو۔ کھانا کھالو۔ میں نے کہا ہے نا' تمہاری کشتیاں جل گئی ہیں۔"

"پھر مجھے بھی جلادو۔ مار ڈالو مجھے بھی۔" وہ ضبط گنوا کر زور زور سے رو پڑی۔

"کوئی خود کو بھی نقصان پہنچاتا ہے پگلی! تم تو زندگی کی نوید ہو میرے لیے۔ اتنا بے بس کر دیا مجھے کر تمہارے بغیر جینے کا تصور محال لگا' جب ہی تو ساتھ لے آیا تمہیں۔" وہ بہت توجہ' بہت محبت سے اس کے آنسو پوروں پہ چننے لگا۔ وہ بدک کر فاصلے پہ ہو گئی۔

"مت چھوؤ مجھے اپنے ناپاک ہاتھوں سے۔ مار ڈالا تمہاری اس حرکت نے مجھے۔ ساری زندگی خود سے نگاہ نہیں ملا سکتی۔ جانے دو مجھے۔" وہ اور شدتوں سے رو پڑی۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ٹھیک ہے! اب میں تب ہی تمہیں چھوؤں گا جب تم مجھ پہ حلال ہو جاؤ گی۔ آج شام کو نکاح ہے ہمارا' تیار رہنا۔" وہ بھاری لہجے میں بولا۔

دیا ایک دم سن پڑنے لگی۔ مستقیم نے اس کے خوف زدہ سے تاثرات دیکھے اور ہنس پڑا۔

"کم آن یار! شادی کا مژدہ سنایا ہے۔ تم تو ایسے پیلی پڑ گئی' جیسے خدانخواستہ دار پہ چڑھانے کی بات کہہ دی ہو۔"

"تمہیں کیا پتا' یہ دار پہ چڑھنے کے ہی مترادف ہے' کاش! ان حالات سے دوچار ہونے سے پہلے ہی میں مر ہی جاتی۔" زار و قطار رونے لگی۔

"اب بس بھی کرو یہ رونا دھونا اور اپنی شادی کی تیاری کرو۔ مجھے رات کو فریش دلہن چاہیے۔" اس کی بات پہ وہ ایک دم رونا بھول گئی اور خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔

"کس نے دلائی یہ خوش فہمی تمہیں کہ میں اس سرنڈر کے لیے تیار ہو گئی ہوں؟ میں تمہارے مذموم ارادوں کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی' سنا تم؟"

"کیا کرو گی؟ تم کر بھی کیا سکتی ہو؟ مثلاً۔" اس کے ہسٹریک ہو کر چلانے کی پروا کیے بغیر وہ دلدار مسکان ہونٹوں پہ سجا کر بولا تو دیا بل کھا کر تنتناتے ہوئے

نے پھر بھی اور زور سے اسے دھکا دیا۔ مستقیم اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ذرا سا لڑکھڑایا۔ اس کا دھکا لگنے سے اس کے پیچھے پڑی میز پہ دھرا گل دان زمین بوس ہو کر ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ دیا نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر کسی خیال سے اس کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں اور اگلے لمحے اس میں جیسے پارہ بھر گیا تھا۔ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آئی اور جھک کر ٹوٹے ہوئے گل دان کا ایک نوکیلا ٹکڑا اٹھا لیا۔ اس سے پہلے مستقیم اس کے ارادے کو جانتا' وہ اپنی کلائی نہایت بے دردی سے کاٹ چکی تھی۔

یہ سب کچھ لمحے کے ہزارویں حصے میں ہوا تھا۔ مستقیم تو اس کی کلائی سے فوارے کی طرح ابلتے خون کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتا' دیا نے اپنی دوسری کلائی بھی اسی انداز میں ادھیڑ ڈالی۔ مستقیم کا سکتہ ٹوٹا اور وہ اس پہ جھپٹا اور اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں جکڑنے کے بعد ایک زور کا جھٹکا دیتے ہوئے بھینچے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ کیا کر لیا بے وقوف لڑکی؟"

"ختم کر لوں گی خود کو' مگر تمہارے سامنے شکست تسلیم نہیں کروں گی۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ مستقیم ایک دم ہونٹ بھینچ کر اس کی زخمی کلائیاں بھینچنے لگا۔ پھر اس کے زخموں پہ اپنے ہاتھ جما کر اس نے چیختے ہوئے امانت کو پکارا تھا' پھر اسے دیکھ کر ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے؟"

"اس سے بھی زیادہ۔" وہ پھنکار کر بولی اور مستقیم اس کے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔ جہاں نفرت تھی' بے رنگی تھی۔

"اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دو امانت۔" امانت کے اندر آنے پہ اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا اور خود فاصلے پہ جا بیٹھا۔ امانت کسی معمول کی طرح حکم کی تعمیل کرنے لگا تھا۔ جبکہ دیا نے شاید اس

لیے مزاحمت نہیں کی کہ تسلسل سے بہتے خون نے اس پہ خوف اور نقاہت طاری کر دی تھی۔

"ٹھیک ہے! میں بھی جبر کا قائل نہیں ہوں' مگر کچھ کھیل جبر میں لطف دیتے ہیں۔ مجھے چھیننا' جھپٹ لینا برا نہیں لگتا۔ یہ میرا پیشہ بھی ہے' تم جانتی ہوگی۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔ دیا کو اپنے حلق میں کچھ اٹکتا محسوس ہوا تو وجود پہ برف گرتی ہوئی۔

"کیا مطلب...؟" وہ ایک دم ہراساں ہوئی۔ خلیفہ نے ایک بھرپور اور معنی خیز نگاہ اس کے سراپے پہ دوڑائی۔

"یہاں ہمارے اس ٹھکانے پہ ہر تیسرے دن میرے ساتھی یہ کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ میں بھی آج ہر صورت ان فاصلوں کو مٹانا چاہتا ہوں۔ بہت آزما چکیں تم میرا ضبط۔ میں تو نکاح کرنا چاہتا تھا' مگر شاید تم پابند ہونا پسند نہیں کرتیں۔ اب میں...'' اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی وہ ضبط اور حوصلے گنوا کر بھبھک کے رو پڑی تھی۔

"یا اللہ! اتنا بڑا امتحان... میں مر کیوں نہیں گئی۔ کون سا گناہ کیا تھا جس کی ایسی کڑی سزا۔ اتنی سخت آزمائش۔"

مستقیم نے ہونٹ بھینچ کر اسے روتے دیکھا' پھر رسانیت سے بولا۔

"اس لیے کہتا ہوں نکاح کر لو مجھ سے... کم از کم ضمیر کے بوجھ سے تو آزاد رہو گی۔ ورنہ تم مجھے من مانی سے تو نہیں روک سکتیں۔"

وہ یوں ہی روتی رہی تھی' مگر اب کی مرتبہ آنسوؤں کی روانی میں اس کی شکست کا رنگ تھا۔ جسے مستقیم جیسے زیرک انسان نے محسوس کیا اور چہرے پہ فاتحانہ مسکان بکھر گئی۔

☆ ☆ ☆

کہتے ہیں کسی بھی شریف انسان کے پاس سب سے

قیمتی شے اس کی عزت ہی ہوتی ہے۔ وہ بھی اسی عزت کو بچانے کی خاطر نکاح پہ آمادہ ہوئی تھی۔ وہ کام جس کا عام حالات میں اس کے نزدیک تصور بھی محال تھا مگر اب اسے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے مستقیم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ نکاح کے بعد مستقیم اٹھ کر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو کھانے کی تازہ ٹرے اس کے ساتھ تھی۔

"کیوں ہلکان کر رہی ہو خود کو؟ دیکھو! جب انسان کے پاس اپنی پسند کا اختیار باقی نہ رہے تو اسے خود کو حالات اور تقدیر کے سپرد کر دینا چاہیے۔ مجھے تم اپنے لیے ایک بالکل مختلف انسان پاؤ گی۔" چلو! کھانا کھاؤ وہ اس کے آنسو دیکھ چکا تھا جب ہی بہت پیار اور محبت سے بولا۔

وہ ہرگز کھانا کھانے پہ آمادہ نہیں تھی مگر محض اس سے جان چھڑانے کی خاطر چند نوالے زہر مار کرنے پڑے۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو اس طرح میرے احکامات کی تعمیل کرتی ہوئی۔" اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شوخ ہنسی تھی۔ دیا کا دل بھر آیا۔ اس نے فوری طور پہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"پلیز! مجھے تنہا چھوڑ دو۔" بھرائی ہوئی آواز میں کہتی وہ ملتجی ہوئی تو مستقیم نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

"نہ جی! ابھی تو سنگتوں کے موسم اترے ہیں۔ ابھی سے تنہائی کی باتیں مت کرو۔" اس کی چمکتی نگاہوں کی خیرہ کن چمک میں شوخ تقاضے لہرائے تو دیا کی جان ہوا ہونے لگی۔

"م۔ مجھے ہاتھ لینا ہے۔" جان چھڑانے اور اس کا دھیان ہٹانے کو اسے کچھ تو کہنا تھا۔

"امیزنگ۔ اس کا مطلب، تمہیں مجھ سے بھی زیادہ جلدی ہے۔ گڈ! ابھی سے تو مجھ سے محبت نہیں کرنے لگیں؟" وہ بے حد و بے حساب شوخی سے بولا تو دیا کے رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے مستقیم گہرا ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا۔

اور جب اس نے ہاتھ لے کر سرخ رنگ کا بے حد اسٹائلش لباس پہنا جو اور خیرہ کن چمک دمک لیے اس کے سراپے کی خوب صورتی نزاکت اور دلکشی کو مزید بڑھا گیا تھا۔ مستقیم کو اس پر سے نگاہ ہٹانا دشوار ہو گیا۔

"مائی گاڈ! تم حسین ہو میں جانتا تھا مگر اس قدر حسین ہو یہ تو ہرگز اندازہ نہیں تھا۔" وہ اس پہ جھک کر سرگوشی میں بولا اور اس کی نازک کمر کے گرد بازو حمائل کر کے اپنی پُرحدت پناہوں میں سمیٹ لیا۔ دیا بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک کھلا میدان تھا جس کے درمیان آگ کا بڑا سا الاؤ روشن تھا۔ اونچی چار دیواری کی منڈیروں پہ ٹوٹے کانچ بکھرے تھے۔ ان کے پار دیوہیکل درخت تاریکی میں ڈوبے ساکن کھڑے تھے۔ فضا میں جنگلی حشرات کی آوازوں کی ہیبت تھی۔ الاؤ پہ دو سالم بکرے بھونے جا رہے تھے۔ اور اطراف میں فلاٹنگ چیئرز ڈال کر گویا بیٹھنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مستقیم اسے اپنے ہمراہ لایا اور ایک کرسی پہ نرمی و احتیاط سے بٹھا دیا۔

"آج ہم نے رات کو خوب صورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" امانت نے کہتے ہوئے فل سائز کے ڈیک کا بٹن آن کر دیا۔

"بھابھی! یہ گانا مستقیم کی طرف سے آپ کو ڈیڈی کیٹ کیا جا رہا ہے واضح رہے۔" امانت نے بھنگڑا ڈالتے ہوئے شوخی سے جتایا اور ساتھ ہی مستقیم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ بغیر کسی پس و پیش کے اس کے ساتھ بھنگڑے میں شامل ہو گیا۔

چنگے ہون یار تے ہر کوئی سڑدا اے
کجھ وی ہوئے ساڈا یار تے اے
کیوں ڈھولے دا کیوں ماہیے دا گلہ کراں
میں تاں لکھ واری بسم اللہ بسم اللہ کراں

وہ خالی نظروں سے اسے تکتی رہی جو ایک سرمستی بھرے وجدان کی کیفیت میں بھنگڑا ڈالتے ہوئے گا رہا تھا۔ دیا نے دیکھا وہ اپنے چاروں پانچوں ساتھیوں میں سب سے لمبا تھا۔ یقیناً "شادی کے سلسلے میں یہ اہتمام تھا کہ نہ صرف بالوں کی کٹنگ کرائی گئی تھی بلکہ تازہ شیو بھی تھی اور صحیح معنوں میں اس کی شکل واضح ہوئی تھی۔ دیا نے ذرا بغور دیکھنے پہ جانا وہ اچھا خاصا ہینڈسم تھا۔ دلکش نقوش، صاف ستھری رنگت، گفتگو کے انداز اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی بھی چغلی کھاتے تھے۔ پھر کیا وجہ تھی وہ اس راستے پہ دانستہ آگیا یا کوئی اور محرک۔ وہ جاننا چاہ رہی تھی، نا خواہش اسے سوچ گئی۔

وہ ایک راہداری سے گزر کر اسے جس کمرے میں لایا تھا وہ اس کمرے کی نسبت کشادہ تھا جس میں اب تک دیا کا قیام رہا تھا، مگر نیم تاریک تھا۔ جس کے دروازے سے قدم رکھتے ہی مستقیم نے نائٹ بلب روشن کر دیا تھا۔ جو عام نائٹ بلب کے مقابلے میں بہت کم روشنی دے رہا تھا۔ اتنی کم روشنی کہ کمرے میں دور تک دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ سامنے بستر پہ جانے کس رنگ کی چادر تھی کہ پورا بستر گلاب کی پتیوں سے ڈھکا تھا۔ کمرے میں گلاب اور موتیے کی مسحور کن مہک تھی جو اس کا دل ایک دم گھبرانے لگا۔ وہ اتنی مضبوط اعصاب کی تھی نہ ہی خدا کی خاص ہستی۔ پھر اتنی آزمائش۔ اس کا دل اس ملال سے بھر سا گیا تو دو موتی اس کے رخساروں پہ پھسل آئے جنہیں مستقیم نے دیکھا اور اس کے دونوں شانوں پہ ہاتھ دھر کے اپنے مقابل کر لیا۔

"ایسا مت کرو دیا۔ تم میری اندھیری زندگی میں واقعی روشنی بن کر داخل ہوئی۔ مجھے اس خوشی کو خوشی سے محسوس کرنے دو۔ میرے ساتھ اسی طرح ری ایکٹ کرو۔ جیسے کوئی بھی نئی نویلی دلہن اپنے شوہر سے پہلی بار مل کر کر سکتی ہے۔ میں نے تمہیں جس طرح بھی حاصل کیا ہے مگر اتنا یقین ہے کہ تمہیں اپنی محبت اور اپنی قربتوں سے نہال کر دوں گا۔ ایک بار بس تم میرے نام ہو جاؤ پھر بے فکری ہی بے فکری ہے۔ میں نے اب تک کی زندگی میں ہر طرح کی عورت کو دیکھا ہے۔ پاس سے گزرنے والی عورت کا بھی شجرۂ نسب بتلا سکتا ہوں۔ جانتا ہوں، شریف عورت کچے رنگوں کی طرح نہیں ہوتی کہ ہاتھ دھوئے اور رنگ غائب۔ وہ تو جب رنگتی ہے تو گاڑھے رنگ میں رنگتی ہے۔ کبھی نہ اترنے والے پکے رنگ تمہارے جیسی لڑکی کو اسی لیے تو شریک سفر کیا ہے میں نے کہ اس قسم کی عورت سے بے وفائی کا خطرہ نہیں ہوتا اور تمہیں پتا ہے، جب کوئی عورت کسی مرد سے بے وفائی کرتی ہے تو گویا مرد کی سب سے بڑی توہین کرتی ہے۔ اس کی بے وفائی اس بات کا اعلان ہوتی ہے کہ اس مرد میں کوئی کمی تھی، جو اس نے کسی دوسرے میں ڈھونڈنا چاہی اور کم از کم میں تو یہ توہین افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔"

وہ کہتا رہا وہ صم "بکم" بیٹھی رہی گویا کچھ سنا ہو نہ سمجھا ہو۔ مستقیم نے اسے بغور دیکھا اور پھر مسکرا کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

"ادھر دیا! میری طرف۔ یار! اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں۔ ایک دور تھا جب لڑکیاں مرتی تھیں میری وجاہت پہ۔" وہ کسی قدر شرارت سے کہہ رہا تھا۔ دیا کی آنکھوں کی سطح پہ چمکتی نمی گالوں پہ پھسل آئی جسے مستقیم نے ہونٹوں سے چن لیا تھا۔ پھر درمیانی فاصلے گھٹاتے ہوئے اس کے بے حد نزدیک آگیا اور بوجھل سرگوشی اس کی سماعتوں میں انڈیلی تھی۔

"آج میری قربت میں رونے والی لڑکی آنے والے کل میں میری پناہوں میں آسودہ بھی ضرور ہو گی ان شاء اللہ۔"

اس کی ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ کروٹیں بدلتے بدن ٹوٹنے لگا تھا۔ گریہ وزاری سے آنکھیں جل رہی تھیں۔

یہ تھا اس کا نصیب؟

اس نے بارہا سوچا تھا اور جی چاہا تھا دھاڑیں مار مار کے روئے کہ دل پہ پڑی غم کی سل ہٹ جائے۔ مستقیم کے لیے یہ قربت جتنی بھی سرشاری آسودگی اور تسکین کا باعث ہو۔ اسے تو صرف ایک ہی احساس ملا تھا۔ پامالی کا احساس وہ جیسے خود سے بھی نگاہیں چار کرنے سے قاصر تھی۔

فجر کا وقت اسے جاگتے ہوا مگر اس کے دل میں نماز کی ادائی کا خیال تک نہ آیا۔ یہ اس کا گمراہی کی طرف پہلا قدم تھا۔ حالانکہ شب کے اختتام پہ وہ ہمیشہ رب کی وحدانیت کا اقرار کرنے اٹھا کرتی تھی مگر اس وقت خفگی کے بھرپور احساس سمیت پڑی جوں روتی رہی

قسمت سے شاکی ہوتی رہی اور پھر جانے کب سو گئی یہ سوچے بغیر کہ اس کا رب ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کا منتظر ہے کہ وہ مانگے اور وہ عطا کرتا چلا جائے۔ اسے مانگنے والے ہاتھ بہت محبوب ہیں۔

☼ ☼ ☼

"اس علاقے اور اس گھر کا میں بے تاج بادشاہ ہوں دیا! یہاں مستقیم کا حکم چلتا ہے۔ یہ سب کچھ مجھ سمیت تمہارا ہے یہاں تم جیسے چاہو اپنی مرضی سے رہو۔ کسی کی مجال نہیں کہ مداخلت کر جائے۔" قطار در قطار تن کر کھڑے درختوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے مستقیم نے اسے کہا تھا۔ وہ صبح اٹھ کر باقاعدگی سے جاگنگ کرتا تھا۔ آج زبردستی اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لایا تھا۔

"تمہیں پتا ہے دیا! محبت اپنا آپ ضرور منواتی ہے۔ مجھے یقین ہے میں ایک دن تمہیں اپنی محبت سے جیت لوں گا۔" وہ چلتے چلتے رکا اور اس کے سامنے اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ دیا نے اسے دانستہ نظر انداز کیا اور کترا کر نکلنا چاہا مگر وہ لپک کر پھر اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔

"تم اپنے ہر راستے پہ مجھے اپنا منتظر پاؤ گی دیا!" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر شوخی سے بولا تو دیا نے سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا۔

"زندگی ہر مرتبہ تمہاری من پسند سوغات جھولی میں ڈالے یہ ضروری نہیں۔ خوش فہمیوں کا دائرہ وسیع مت کرو کہ پھر مایوسی کا سامنا کر کے ٹوٹ پھوٹ کے مرحلے سے گزرنا پڑے۔ میں بتا چکی ہوں میرے دل میں تمہارے لیے ہرگز بھی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ایسے شخص کو میں کبھی اپنی ذات سے خوشی لینے کا سوچ بھی نہیں سکتی جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہو' میرے اپنے لوگ' میرے احساسات یہاں تک کہ میری شناخت بھی۔" دیا ایک دم سسک اٹھی اور وہ بے چین ہونے لگا۔

"مر جانے کی حد تک شرمندگی محسوس کرتی ہوں جب یہ خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ میں ایک ڈاکو کی بیوی ہوں۔" وہ سسک سسک کر بے حال ہونے لگی۔ مستقیم کے دل میں عجیب سا درد کروٹیں لینے لگا۔ شاید وہ اس لڑکی کے ساتھ واقعی زیادتی کر گیا تھا۔ کوئی بھی باعزت لڑکی اس کی سنگت میں خوشی محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

"تم حالات سے سمجھوتا بھی تو کر سکتی ہو۔ وہ لڑکیاں بھی تو سمجھوتا کرتی ہیں' جن کے سسرال سخت مزاج ہوتے ہیں۔ ان سے ان کے والدین اور سارے رشتے چھڑا دیتے ہیں۔ مگر وہ اپنے گھر کو بچانے کی خاطر یہ قربانی دیتی ہیں۔"

"مگر میں یہ قربانی کیوں دوں؟ کیوں کروں یہ بیگری فائز؟ مجھے تم نے میرے والدین سے مانگا؟ عزت سے بیاہ کر لائے؟ تم نے اغوا کیا ہے مجھے۔ لوٹا ہے مجھے۔ میرے بابا' امی' دادی' بھائی اور بہن کیسے تڑپتے ہوں گے میرے نام سے انہیں صبر نہیں آتا ہو گا۔ لوگوں کی نظروں میں ان کی باتیں کیسے سہی ہوں گی انہوں نے۔ ان باتوں کا تمہیں کیا اندازہ۔" وہ بھڑک اٹھی۔ وہ ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا' پھر کچھ کہے بغیر واپسی کو پلٹ۔ بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ سردیوں کی مخصوص برفیلی ہوائیں صحن میں لگے درختوں کے پتوں کو بھی ٹھٹھرائے دے رہی تھیں۔ فضا کی نمی اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ رات کو بارش ہو گی۔ پلنگ پر وہ ڈبل پلائی کے کمبل میں دبکی تھی مگر ٹھنڈ سے جسم پھر بھی اکڑا جاتا تھا۔ پہاڑی علاقوں کی سردی بڑی جان لیوا ہوتی ہے۔ مستقیم نے کچھ دیر قبل آتش دان میں لکڑیاں جلائی تھیں' جب ہی کمرے میں میٹھی میٹھی سی پر حرارت فضا کا تاثر قائم ہو گیا تھا۔

اس نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا۔ آتش دان روشن تھا اور ملگجے اندھیرے میں اس کی نارنجی آتشی روشنی بڑی خواب ناک لگ رہی تھی۔ اس نے کمبل ہٹایا اور بستر سے نکل کر ایزی چیئر پہ جا بیٹھی اور آگ تاپنے لگی۔ مستقیم جو جاگ رہا تھا اسے اپنے پہلو سے اٹھتے محسوس کر کے کچھ بے چین سا ہوا۔

"مجھے کچھ دیر یہیں بیٹھنا ہے۔" اس نے جوابا" روٹھے پن سے کہا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"کب تک؟ مجھے سونا بھی ہے۔"

"تو سو جاؤ۔ مجھے لوری سنا کر تو نہیں سلانا تمہیں؟" وہ جھلا اٹھی۔ مستقیم زور سے ہنس دیا۔

"اس سے بھی زیادہ بڑھیا کام کرتی ہو' جو مجھے خمار سے بھر دیتا ہے۔" اس کا گلابی مائل حسین و دلفریب نقوش سے سجا چہرہ اس کھلی بات پہ ایک دم دہک کر سرخ ہوا۔ اس نے بے اختیار چہرے کا رخ پھیر لیا۔ اس کی نظریں ہی ایسی تھیں' جو اسے سراپا رنگ دیتی تھیں۔

"یار! مجھے سلا دو' پھر وہاں بیٹھی رہنا۔" وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پکارا۔ دیا نے اسے گھورا۔

"پلیز! مجھے تنگ مت کرو۔ میں آل ریڈی ڈسٹرب ہوں۔" اس نے ناگواری سے کہا تو مستقیم نے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر اس نے دوبارہ اپنا تقاضا نہیں دہرایا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

وہ اس کے سو جانے کا یقین کر کے ہی بستر پہ آئی تھی' مگر پھر بھی سکون سے نہیں سو سکی۔ وہ سوتے میں خراٹے لینے کا عادی تھا اور دیا بے آرام ہوا کرتی۔ اس وقت بھی اس کے خراٹے اسے کروٹیں بدلنے پہ مجبور کرتے رہے تھے۔ اسے ایک دم سے لائبہ یاد آ گئی۔ اس کی بات کو یاد کرتے اسے پتا بھی نہ چلا وہ کب رو پڑی تھی۔ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی' وہ خراٹے لیتا تھا۔ دیا نے بے اختیار اسے دیکھا۔

"آہ کاش! یہ ٹال اینڈ ہینڈسم نہ ہوتا' مگر ایک مہذب انسان تو ہوتا۔" اس کا دل رو رہا تھا۔ رونے سے دل کا بوجھ تھوڑا اترا۔ اس نے گیلی آنکھیں بے دردی سے رگڑ ڈالیں۔

"میں جتنا بھی رو لوں' تڑپ لوں' اب میری قسمت نہیں بدل سکتی۔" اس نے مایوسی و تنفر سے سوچا اور ایک بار پھر کروٹ بدلی۔ مگر مستقیم کے خراٹے اسے بری طرح زچ کر گئے تو جھنجلا کر اٹھتے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں سے جھنجوڑ ڈالا۔

"ک۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ خیریت؟" سرخ بڑی بڑی خمار آلود آنکھوں میں تشویش کا رنگ تھا' مگر ایک انکشاف بہت شدت سے دیا پہ ہوا کہ اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ گہری اور خوب صورت ہیں۔ وہ بے اختیار نظریں چرا گئی۔

"کچھ نہیں۔"

"پھر جگایا کیوں ہے؟"

"خراٹے مت لو۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

"جو حکم سرکار! نہیں لیتے۔"

وہ مسکرایا اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ ایک دم سٹپٹا گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ چھوڑو مجھے۔"

"سچی بتاؤ! اس وجہ سے نہیں جگایا؟ میں جانتا ہوں تم بہت نرم دل کی مالک ہو۔ مجھے اتنی سختی سے ڈانٹا تھا اب ازالہ کرنا چاہتی ہو نا؟ کہیں مجھ سے محبت سی تو نہیں محسوس کرنے لگیں؟" وہ اس پہ جھک کر بولا۔ دیا نے نگاہ اٹھائی۔ اس کا پرکشش وجیہہ چہرہ بے حد

نزدیک تھا۔ شرارت سے چمکتی شوخ نگاہیں اور دل آویز مسکان سے سجے ہونٹ۔ اس کا لمبا چوڑا مضبوط وجود دیا کے سراپے پہ گویا چھا رہا تھا۔ اپنائیت آمیز محبت بھرا لہجہ، وہ ہمیشہ اسے بہت احتیاط اور نرمی سے چھوتا تھا یوں جیسے وہ نازک آبگینہ ہو۔ اس کے باوجود اس پہ یہ گھڑیاں امتحان بن کر اترتی تھیں۔ اس پل بھی اس کا سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگا۔ چہرے پہ چھپے اس پل اس کی قربت کی آنچ نے آگ دہکا رہی تھی، جبکہ مستقیم پہ اس کے ہوش ربا حسن کی بجلیاں گراتا یہ گھبرایا سٹپٹایا ہوا روپ سحر طاری کر رہا تھا۔

"مجھے معاف کرو، غلطی ہو گئی کہ تمہیں نیند سے جگا دیا۔" وہ بری طرح جھنجلا کر بد مزگی سے بولی تو مستقیم زور سے ہنسنے لگا۔

"ایسی خوب صورت غلطیاں بار بار کرنا۔ میں ہمیشہ خوشی سے ویلکم کہوں گا۔" وہ اس پہ جھک کر گنگنایا اور دیا نے کرب آمیز انداز میں آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ وہ اس کی اذیت کو کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ دکھ صرف اس کا دکھ تھا۔ وہ تو ہر رات اپنی فتح کا جشن مناتا تھا۔ پامال تو وہ ہو رہی تھی لمحہ لمحہ اذیت کی بھٹی میں سلگتی ہوئی وہ ایک عام سی نازک لڑکی جس کے سارے خواب جیسے جھلس گئے تھے۔ وہ اس کے کاندھے پہ سر رکھے، خاموش آنسو بہاتی پل صراط طے کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆
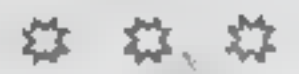
لایعنی سوچیں اس کا دماغ خراب کرنے لگی تھیں، اپنی سوچوں سے پیچھا چھڑانے کو وہ گھبرا کر خود کو مصروف کرنے کی غرض سے کمرے کی صفائی کرنے لگی۔ بستر کی چادر جھاڑ کر بچھائی۔ فرنیچر پہ موجود گرد کو صاف کیا اور جھاڑو اٹھا کر فرش صاف کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو کمرے سے نکل آئی۔ اسے بہرحال مصروفیت چاہیے تھی جو اذیت ناک سوچوں سے چھٹکارا بخش دے۔ ایک طرف آہٹ محسوس کی تو راہداری عبور کر کے اسی سمت آ گئی۔

اندر جھانکا تو اندازہ ہوا کچن ہے۔ کوئی پشت موڑے کھڑا جلتے ہوئے اسٹوو پہ کچھ پکانے میں مصروف تھا۔ وہ متوجہ کرنے کو دانستہ کھنکاری تو وہ بے ساختہ پلٹا۔ اسے دیکھا تو بوکھلا کر سلام کیا۔ وہ اٹھارہ بیس سال کا ایک درمیانے قد کاٹھ کا لڑکا تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟" اس کے لہجے میں غیر محسوس انداز میں مالکانہ استحقاق در آیا، جسے خود اس نے بھی غالباً محسوس نہیں کیا تھا۔

"میں بشیر ہوں جی۔ یہاں کھانا پکانے اور کپڑے وو صفائی وغیرہ کی ڈیوٹی ہے میری۔"

"او کے اب تم کچن سے نکلو۔"

"جی۔؟" بشیر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"میں کھانا بناؤں گی۔ فکر نہ کرو تمہاری نوکری نہیں چھوٹے گی۔ چوروں کے پاس حرام کا پیسہ بہت ہے۔ تمہیں تنخواہ دیتے رہیں گے۔"

طنزیہ کہتی اسے کچن بدر کر کے خود اس کی جگہ کھڑی ہو گئی۔ چولہے پہ موجود کوکر میں جھانکا گوشت کا سالن بھننے کو تیار تھا۔ سالن بھوننے لگی۔ جب وہ کھنکھارتے ہوئے اندر چلا آیا۔ دیا نے کچھ چونک کر اسے دیکھا، مگر اگلے ہی لمحے اسے نظر انداز کرتی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"میں واپس آیا تو تم کمرے میں نہیں تھیں گھبراہٹ میں ہر جگہ دیکھ ڈالی، تب بشیر نے بتایا تم یہاں ہو، اس مشقت میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے میری جان!" وہ لگاوٹ سے بولا۔

"یہ بدلا ہوا انداز، یہ کمبھو مارننگ اسٹائل کہیں مجھ سے محبت تو نہیں ہو رہی؟"

"قیامت تک آس لگائے بیٹھے رہنا، حسرت لیے ہی مرو گے۔" وہ پھنکارنے لگی۔ مستقیم کو یہ لفظی چھیڑ چھاڑ جتنا لطف دیتی تھی، وہ اسی قدر سلگتی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا بشیر نے مداخلت کی تھی۔

"صاحب! آپ کو امانت صاحب بلا رہے ہیں بڑے کمرے میں۔"

"اوہ، ظالم سماج کو کیسے خبر ہو گئی، میں اس وقت یار دیدار کے ساتھ ہوں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا نکلا، تب دیا نے سکون کا گہرا سانس بھرا تھا۔

☆ ☆ ☆
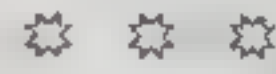
ابر آلود ہوتے موسم نے سردی کی شدت میں ایک اضافہ کر دیا تھا۔ مگر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اس نے گرم سوٹ پہ سویٹر اور گرم شال اوڑھی موزے چڑھائے اور باہر نکل آئی۔ وہ سب صبح دیر تک سونے کے عادی تھے اور کل تو ساری رات ہی مستقیم سمیت سب ویسے بھی غائب رہے تھے اور صبح لوٹے تھے۔ وہ جان سکتی تھی وہ کس مقصد سے گئے۔ دل میں نیا درد ہلکورے لینے لگا تھا۔ ایک اور گھر برباد ہونے والا تھا اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بہت چاہا، بن بٹ جائے، مگر وہ سو ہی نہیں پائی تھی، ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ رات کا آخری پہر بھی اختتام پذیر تھا۔ جب ان کی آہٹیں سنائی دی تھیں۔ مستقیم اپنے کمرے میں آیا تو اسے کھڑکی کی طرف رخ پھیرے دیکھ کر چونکا۔

"آج جلدی اٹھ گئیں تم؟" اس کے قریب آتے ہوئے مستقیم نے اس کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھ دیے تھے۔ دیا نے رخ پھیرے بغیر محض گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"میں رات بھر نہیں سوئی ہوں؟" اس کے لہجے میں طنز نہیں، بے بسی تھی، لاچاری اور کرب تھا، مستقیم زور سے چونکا۔

"کیوں؟ ارے کہیں تم میری کمی تو نہیں محسوس کر رہی تھیں؟ یہ تو بہت اچھی تبدیلی ہے، یعنی تمہیں بھی مجھ سے محبت ہونے لگی ہے۔" رات بھر جاگی ہوئی بادہ کے خمار سے سرخ ہوتی آنکھوں اور چہرہ جوش و مسرت سے تمتمایا، مگر دیا کا موڈ ہنوز آف رہا تھا۔

"کہاں گئے تھے تم؟" وہ اذیت کے پل صراط طے کرنے لگی۔

"یار، روزی روٹی کے وسیلے۔"

"بکواس مت کرو تم، بہت بڑے جھوٹے ہو۔ لوٹتے ہو لوگوں کو اور سمجھتے ہو تم نے یہ کمائی کی ہے۔" وہ پھٹ پڑی، مستقیم نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ بستر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا تھا۔

"تمہیں پتا ہے، آج ہم پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے رہ گئے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آئے ہیں، ورنہ تم بیوہ بھی ہو سکتی تھیں۔" تکیہ سیدھا کر کے لیٹتے ہوئے وہ گویا اسے اپنے تئیں ہولناک خبر سنا رہا تھا۔

"کاش! ایسا ہو جاتا۔ کسی طرح سہی جان تو چھوٹتی تم سے۔" اس کا دماغ غم و غصہ کی زیادتی سے ابل رہا تھا۔ مگر مستقیم ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔

"اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے؟" خاصی دیر بعد جب وہ بولا تو لہجہ عجیب سا تھا۔ دیا نے آگ اگلتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور ہونٹ سکوڑ کر بولی تھی۔

"کیسے یقین کرو گے؟" اس کا لہجہ طنز کی آگ میں جھلسا ہوا تھا۔ مستقیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک نسبتاً چھوٹا مگر جدید ریوالور نکال کر اس کے آگے بستر پہ پھینک دیا۔

"یہ لوڈڈ ہے، شاید اس وقت اس میں چار پانچ گولیاں ہیں۔ تمہیں اجازت ہے، تم مجھے مار کر یہ حسرت پوری کر لو۔" وہ خطرناک حد تک سنجیدگی سے بولا۔ دیا نے نفرت سے سر جھٹکا۔

"مجھے اگر ایسا کرنا ہوتا تو پھر خود کو تمہارے ہاتھوں پامال ہونے دیتی؟" مستقیم کے چہرے کی رنگت متغیر ہونے لگی۔ اس نے بہت بے دردی سے ہونٹ کاٹے تھے۔

"میں نے نکاح کیا ہے تم سے دیا!" اس نے جیسے اپنا دفاع کیا۔

"ہاں! گن پوائنٹ پہ۔" وہ پھنکاری اور مستقیم لاجواب ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ اسی غصیلے موڈ میں کمرے سے نکل گئی۔ کچن میں آکر ناشتا تیار کیا اور دوبارہ کمرے میں آ گئی۔ وہ کروٹ

کے بل لیٹا شاید سو رہا تھا۔
وہ چادر اور جوتے پہن کر باہر آ گئی۔ یہاں فطری حسن جا بجا بکھرا ہوا تھا۔ سرو قامت سرسبز و شاداب درخت، ہری بھری گھاس، ڈھیر سارے جنگلی پھول، تاحد نگاہ پھیلی ہریالی، پرندوں کی سریلی آوازیں، پھولوں کی بھینی بھینی دلفریب خوشبو، سب سے بڑھ کر تنہائی اور خاموشی۔

وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دل بے حد اداس تھا۔ آنکھوں کے گوشے نم ہوتے جا رہے تھے۔ زندگی کا ایسا رخ سامنے تھا جس کا ہر پہلو تکلیف دہ تھا اور وہ خود فراموشی کی چادر اوڑھنے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جاتی، مگر حقیقت کی کرب ناکی ہر طرح سے اپنا احساس بخشتی تھی۔ اس کا جی چاہا کسی مہربان کاندھے پہ سر رکھ کے بہت سارا روئے۔ سکون نیند سب کچھ حرام ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار یہ بے بسی ایسی منتقمانہ احساس میں ڈھلتی کہ اس کا جی چاہتا سچ مچ مستقیم کو قتل کر دے۔ کیسا نفس پرست انسان تھا۔ خود غرضی، سفاکی اور بے حسی کی انتہا تھی اس ظالم و شقی کی کہ محض اپنے غرور کی بلکہ مردانگی کے غرور کی تسکین کی خاطر پسندیدہ ہستی کو جیسے بن سکا حاصل کر لیا۔ ملکیت کا ٹھپہ لگا کر اپنے سنہرے پنجرے میں قید کر لیا۔ فتح کے اظہار کے لیے غرور کی حد برتری کی انتہا کہ ایک جیتے جاگتے وجود کو استحقاق کی بیڑیوں میں جکڑ کر بے بس کر دیا جائے، یہ ملکیت کا ظالمانہ طریق کار ہی اسے وحشت زدہ رکھتا، نفرت پہ اکساتا رہتا۔
"رونے کے لیے یہ جگہ کچھ ایسی محفوظ اور متاثر کن بھی نہیں کہ تم جب جی چاہے منہ اٹھا کر یہاں چلی آؤ۔ بتا چکا ہوں یہ جنگل خطرناک اور خونخوار قسم کے جانوروں سے بھرا پڑا ہے۔" سوکھے پتوں پہ پہلے اس کے قدموں کی آہٹ ابھری تھی، پھر خفا خفا سی آواز۔ دیا جھنجلا کر پلٹی۔
"تم میری جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے ہو؟"
"اللہ سے التجا کرو، وہ سمیع الدعا ہے۔ جی کھول کر بددعائیں دو۔ اس بار بچ گئے ہیں، اگلی بار نہ بچ پائیں، ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے گی۔" اس نے ہتک آمیز انداز پہ جوابا" وہ بھی غصیلے موڈ میں بولا تو دیا نے سلگتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔
"اگر میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو آج یوں قسمت کو نہ رو رہی ہوتی۔" اس کی بات پہ مستقیم نے ہونٹ بھینچ کر خود پہ ضبط کیا۔ پھر توقف سے دھیمے لہجے میں بولا تھا۔
"اندر چلو پلیز! میں بہت تھکا ہوں، اس وقت یہاں تمہارا پہرہ نہیں دے سکتا۔"
"تو مت دو، جاؤ سو جاؤ کیونکہ میں ابھی نہیں جاؤں گی، کر لو جو کر سکتے ہو۔" وہ ہونٹ سکوڑ کر نخوت سے بولی تو مستقیم نے ہارے ہوئے انداز میں ٹھنڈا سانس کھینچا۔
"کر تو بہت کچھ سکتا ہوں، مگر کرنا نہیں چاہتا، ٹھیک ہے ظالم لڑکی! بیٹھو جب تک تمہارا جی چاہے، مجبوری ہے دل کا معاملہ جو ہوا۔"
وہ اس کے عین سامنے سفیدے کے چوڑے تنے سے ٹیک لگا کر ٹانگیں سیدھی کر کے تقریبا" نیم دراز ہو گیا، جبکہ دیا ایک پل کو ششدر رہ گئی تھی۔ وہ گرم کپڑوں پہ سوئٹر اور شال پہنے تھی، پھر بھی سردی اتنی شدید تھی کہ گویا ہڈیوں میں موجود گودے کو بھی جما رہی تھی۔ مگر وہ اس وقت جینز پہ صرف بنیان پہنے ہوئے تھا۔ یعنی جیسے تھا ویسے ہی اس کی تلاش میں اٹھ کر چلا آیا تھا۔ یقینا" سردی تو اسے بھی لگ رہی ہوگی۔ مگر۔۔۔
"کیا یہ مجھ سے واقعی محبت کرتا ہے؟" اس نے پہلی مرتبہ اس نکتے پہ سوچا اور کچھ عجیب سے احساسات کا شکار ہونے لگی اور محض اس سے دھیان ہٹانے کو رخ پھیر لیا۔ جانے کتنی دیر بیت گئی۔ پتا نہیں، وہ اپنا ضبط آزما رہی تھی یا اس کا۔
وہ اب چھینکنے لگا تھا۔ مگر استقامت۔ ہنوز اپنی جگہ تھی۔ آسمان پہ بادل گہرے ہو رہے تھے۔ سورج کی جو جھلک نظر آئی تھی وہ مکمل طور پہ بادلوں کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ ہواؤں کی شوریدہ سری بھی بڑھنے لگی۔

اس نے [illegible] پتوں پہ سرسراہٹ سنی۔ مگر رخ نہیں پھیرا، مگر اس وقت اس کے حلق سے بے ساختہ کرب ناک چیخ نکل گئی تھی۔ جب کسی درخت کی شاخ سے لٹکتے بن مانس نے ایک دم اس پہ چھلانگ لگائی۔ وہ متوحش سی ہو کر پیچھے ہوئی تو توازن کھو کر نیچے سر کے بل گری۔ مستقیم جو اونگھنے لگا تھا چونک کر سیدھا ہوا اور صورت حال سمجھتے ہی بوکھلا کر بن مانس کی جانب بڑھا اور ساتھ ہی جیب سے پسٹل نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، بن مانس قلانچیں بھرتا آن کی آن میں درختوں میں غائب ہو گیا۔
"چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟" مستقیم لپک کر اس کے نزدیک آیا تھا۔ وہ ابھی تک بدحواس تھی۔ مستقیم نے اسے سہارا دے کر اٹھنے میں مدد دی۔
"سوری! پتا نہیں کیسے آنکھ لگ گئی میری۔" وہ معذرت کر رہا تھا۔ دیا نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ اٹھنے کے بعد اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے خوف زدہ سی نگاہوں سے جنگل کی سمت دیکھ رہی تھی۔
"اندر چلو پلیز!" اس پہ ہنوز دہشت سوار تھی۔ مستقیم نے ڈھارس بندھانے کو اپنا ہاتھ اس کے شانے پہ رکھا تو جانے کس جذبے کے تحت وہ اس کے نزدیک ہو گئی۔ مستقیم نے خوش گوار حیرت میں گھر کر اسے دیکھا، مگر وہ متوجہ نہیں تھی اور کچھ سہمی ہوئی تھی۔ مستقیم اسے اپنے بازو کے حلقے میں سمیٹے اندر لایا تھا۔ مگر وہ اپنے کمرے کے دروازے پہ رک گئی۔
"تم اندر جاؤ، مجھے کچن میں کچھ کام ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی۔ ٹرے میں ناشتے کے لوازمات سیٹ کرتے اس نے تازہ چائے بنائی تھی۔ جس وقت وہ ٹرے سمیت اندر آئی تو مستقیم کمبل میں دبکا تقریبا" غنودگی میں جا چکا تھا۔ اس نے ٹرے ٹیبل [illegible] کمبل کھینچا۔ مستقیم نے سرخ دہکتی ہوئی آنکھیں [illegible] کھول کر اسے دیکھا۔
"ناشتا کر لو پہلے، پھر سو جانا۔" وہ اس کی طرف سے نظریں چرا کر بولی۔ مستقیم نے سر کو نفی میں جنبش دی تھی۔
"مجھے سونے دو، بس بہت تھکن ہے۔"
"پہلے ناشتا کر لو۔ تمہیں بخار کب سے ہے؟" اب کی مرتبہ اس نے سارا کمبل گھسیٹ لیا۔ مستقیم کو ناچار اٹھ کر بیٹھنا پڑا تھا۔
"پہلے زخم لگاتی ہو، پھر مرہم رکھتی ہو، بہت انوکھی ہو تم۔" اس کے ہاتھ سے مگ لیتے ہوئے وہ اسے دیکھ کر ہنسا۔ دیا جانے کیوں جزبز سی ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے یہ ہمدردی کس جذبے کے تحت کی ہے۔

"تم نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا؟" وہ اپنا دھیان بٹانے کو بولی، مستقیم سلائس دانتوں سے کاٹتے ہوئے چونکا۔
"کون سی بات؟" اس کی سرخ ڈوروں سے سجی خواب ناک آنکھوں میں استعجاب تھا۔
"طبیعت کب سے خراب ہے؟"
"جب سے تمہیں دیکھا یار! میں سمجھتا تھا، تمہیں حاصل کر لوں گا تو دل قرار پالے گا، مگر یہ بھی عجیب پاگل سا ہے۔ دیکھو! اب تمہاری محبت، تمہاری توجہ اور چاہت کا طلب گار ہے۔ ہے کوئی بات کرنے کی؟ دیوانے کا خواب۔" وہ پھر غیر سنجیدہ ہونے لگا۔ چڑی چھوڑنے لگا۔ دیا نے اسے خفگی سے دیکھا۔
"پھر فضول گوئی۔۔۔؟"
"ہاں! تم تو فضول گوئی ہی سمجھو گی۔ وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے اور خوب کہا کہ۔۔۔
"خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک"
تم سے بات کرنا تو گویا پتھر سے سر پھوڑنا ہے۔" دیا جھنجلا کر اٹھ گئی۔
وہ جھنجلا کر اٹھنے لگی تھی، جب بڑی سرعت سے مستقیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"یہ توجہ، یہ ہمدردی اور یہ احساس مندی۔ یار اگر میں خوش فہم نہیں ہوا تو یہ محبت کی ابتدا تو نہیں۔" وہ سر کھجا رہا تھا، مگر روشن آنکھوں میں آس کے کتنے

دیپ جل رہے تھے۔

دیا نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ کتنی دیر منتظر رہا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولی۔ یہاں تک کہ مستقیم کی آنکھوں میں جلتے آس کے سارے دیپ ایک ایک کر کے بجھ گئے۔

دوپہر کا کھانا بنا کر اس نے بشیر کو بتا دیا تھا۔ بشیر دو کھانا دوسرے کمرے میں دسترخوان پہ لگاتا تھا۔ وہ بہت کم امانت وغیرہ کے سامنے جاتی تھی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی اس حصے کی طرف وہ سب بھی آنے سے احتیاط برتا کرتے۔ بشیر کو بھی وہ ضرورت کے وقت آواز دیتی تو ہی وہ ادھر آتا ورنہ وہ بھی دوسرے حصے میں ہوتا تھا۔

گیلے ہاتھ دوپٹے کے پلو سے خشک کرتی وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو مستقیم کو ہنوز سوتے پا کر اسے عجیب سی وحشت ہونے لگی۔ دن ڈھل رہا تھا۔ وہ صبح کا سویا ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے آواز دی تو مستقیم نے بھاری آواز میں ہنکارا بھرا تھا۔ اسے کسی قدر سکون کا احساس ہوا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" اس نے بے اختیار پوچھ لیا مگر پھر پچھتائی۔

"قربت کی تیری پیاس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں
اک درد دل کے پاس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں

اگر ہو کچھ امید تو ہو جاؤں پرسکون
اک بے وجہ سی آس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں"

اس کے لہجے میں خفیف سی شرارت، خفیف سی شوخی کے ساتھ ایک ان کہا سا درد بھی تھا۔ دیا نے کچھ دھیان سے اسے بغور دیکھا۔ اس کا لہجہ، اس کا انداز گفتگو، اٹھنے بیٹھنے کا انداز بار ہا اسے چونکاتا تھا۔

"پڑھے لکھے لگتے ہو، اپنی کوالیفکیشن بتاؤ گے؟"

"مجھے ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟"

"میں تمہاری نوکرانی نہیں ہوں۔" اپنی بات کو نظر انداز ہوتا دیکھ کر وہ فوراً سیخ پا ہو گئی۔ وہ آہستگی سے مسکرایا۔

"بیوی تو ہو نا؟"

"جس پہ مجھے شرمندگی ہے۔" وہ پھنکار کر بولی تو مستقیم کا چہرہ کچھ پھیکا سا پڑ گیا۔ ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ دیا بعد میں بھی کتنی دیر تک سلگتی رہی۔

سالن بھونتے ہوئے اسے ایک دم زور کی ابکائی آئی تھی۔ ہانڈی کے نیچے آنچ بھی دھیمی کیے بغیر وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر کچن میں ہی سنک کے اوپر جھک گئی۔ صبح کچھ ایسا خاص کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود قے تھی کہ رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ دیا کو لگا اس کی انتڑیاں بھی شاید منہ کے رستے باہر آ جائیں۔ بشیر جو کسی کام کی غرض سے ادھر آیا تھا۔ اسے یوں بے حال دیکھ کر الٹے قدموں بھاگا۔ اگلے چند لمحوں میں ہی مستقیم کسی قدر بدحواسی کے عالم میں دوڑتے قدموں سے اس تک آیا تھا۔ وہ یوں ہی سنک پہ جھکی تھی۔

"دیا! کیا ہوا میری جان؟" اس نے پیچھے سے اس کے وجود کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اپنی طرف رخ پھیرا۔ سرخ چہرہ، آنسوؤں سے جل تھل تھا۔ وہ لمحوں میں جیسے نچڑ کر رہ گئی تھی۔ مستقیم نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اس کی آنکھیں اور گال پونچھے۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو کیا ضرورت تھی یہاں کھڑے ہو کر کام کرنے کی؟ اتنی بار منع کیا ہے تمہیں۔" وہ اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے نرمی سے جھنجلایا۔ دیا کو بے حد نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔

"اندر چلو۔" وہ اسے یوں ہی ساتھ لگائے پلٹا تو دیا نے بے اختیار کمزور سی مزاحمت کی۔

"نہیں! سالن جل جائے گا۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ ایسا تو کچھ دنوں سے ہو رہا ہے، اٹس او کے۔" اس کے بازو ہٹا کر وہ نحیف سی آواز میں بولی تو مستقیم اس دوران پہلی بار زور سے چونکا اور بغور اسے دیکھا۔

"کیا ہو رہا ہے کئی دنوں سے یعنی وومٹنگ؟" وہ کچھ بے چینی، کچھ اشتیاق کی ملی جلی کیفیت کے زیر اثر بولا تو دیا نے اس کی بات پہ دھیان دیے بغیر سر کو اثبات میں جنبش دیا۔ ایک دم جوش مسرت سے مستقیم کے رخسار تمتما اٹھے۔

"اور کیا محسوس کرتی ہو، مثلاً" چکر وغیرہ؟" وہ اسے تھام کر زبردستی اندر لے آیا۔ دیا اس کے سوال پہ چونک گئی۔

"ہاں! مگر تمہیں کیسے پتا؟"

"مجھے ہی تو پتا ہے میری جان! تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔" وہ خوشی و انبساط سے جھوم گیا۔ جبکہ دیا کے اعصاب پہ جیسے کوئی طاقت ور بم پھٹا تھا۔ وہ ایک سکتے کی کیفیت میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تکتی چلی گئی۔ مستقیم اس کے پتھرائے ہوئے انداز پہ دھیان دیے بنا ایک دم اٹھا۔

"میں سب کو بتاتا ہوں۔ آج تو جشن ہو گا۔"

اور دیا کا سکتہ ایک دم چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

"بات سنو! ابھی کیا کہا تم نے؟" اس نے درشتی سے استفسار کیا۔ اسے ابھی بھی گویا اپنی سماعتوں پہ شبہ تھا۔ مستقیم اس سرخوشی کے انداز میں مڑا اور اس پہ دھیان دیے بغیر اسی جوش سے اس کے نزدیک آ گیا۔

"تمہیں بھی اچھا لگا نا؟ ہاں! یہ خبر ہی ایسی ہے کہ بار بار سننے کو جی چاہے۔ تو سنو مائی سویٹ ہارٹ! یو آر پریگننٹ۔" وہ اس کی گھبرائی سٹپٹائی آنکھوں میں جھانک کر ہنستے ہوئے بولا۔ دیا بے جان ہوتی ٹانگوں کے ساتھ ایک دم کھڑے سے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ مستقیم اس کے چہرے کی پیلی پڑتی رنگت کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

"دیا! آر یو او کے؟ تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے؟" وہ اس کے یکلخت سرد پڑ جانے والے [illegible] کو اپنے ہاتھوں میں لیتا ہوا بولا۔ وہ ایک دم دیوانوں کی طرح اسے پکڑ کر جھنجوڑنے لگی۔

"نہیں دیا! یہ بچہ نہیں چاہیے مجھے یہ بچہ۔ میں ایک ڈاکو، ایک لٹیرے کی نسل کو نہیں بڑھا سکتی۔ مجھے ایک سپوت نہیں جننا۔ کیا بنے گا وہ بڑا ہو کر؟ ایک چور۔ کیا پہچان ہو گی اس کی، ایک لٹیرے کی اولاد۔" وہ اتنی وحشت، اتنی بے بسی سے روئی کہ مستقیم کو اسے سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

وہ خود اس پل شدید ذہنی کرب سے دوچار ہو گیا تھا۔ دیا کے الفاظ نوکیلے خنجر کی طرح اس کی رگ جاں میں اترے تھے اور بے دردی سے زخمی کر گئے تھے۔ ہونٹ بھینچے، ضبط کے کڑے مراحل طے کرتے اس نے بپھری ہوئی موج کی طرح تڑپتی مچلتی دیا کو اپنے بازوؤں میں بھینچا اور بستر تک لے آیا۔ وہ رو رو کر بالکل نڈھال ہو گئی تھی۔ جب ہی اس کے بازوؤں میں نیم بے ہوش سی ہو کر جھول گئی۔ مستقیم نے احتیاط سے اسے بستر پہ لٹایا اور کمبل اوڑھا دیا۔ وہ چہرے پہ آنسوؤں کے نشان لیے ہچکیاں بھرتی رہی۔ مستقیم اسے دیکھتے ہوئے اذیت کا شکار ہوتا رہا۔ پھر آہستگی سے پلٹا تو انداز میں تھکن نمایاں تھی۔

☆ ☆ ☆

اونچے اونچے درختوں کے بیچ سرد ہوا کے جھونکوں سے سرسراتے تو رات کے سناٹے میں عجیب سا شور پیدا ہوتا۔ وہ اتنا مضطرب تھا کہ اس غضب کی سردی کا بھی گویا احساس باقی نہیں رہا تھا۔ دیا کے شدید ردعمل نے ایک دم اسے شکستہ کر ڈالا تھا۔ اسے لگا یکایک ہی وہ جیتی ہوئی بازی ہار گیا ہے۔ شاید زبردستی کی جیت کبھی بھی راحت کا سامان میسر نہیں کر سکتی۔ وہ بھی بے حد مضمحل تھا۔ ہونٹوں میں دبا سگریٹ سلگ سلگ کر ختم ہو رہا تھا۔

ساری رات گزر گئی تھی۔ سورج اب دھیرے دھیرے افق سے نمودار ہو رہا تھا۔ یخ بستہ فضا میں کہر بھی تھی۔ وہ وہاں سے نکل کر جھیل کنارے آ گیا اور سطح پہ ہوا کی تندی سے بننے والے بھنور دیکھنے لگا۔ تب ہی اپنے پیچھے آہٹ محسوس کی۔ مگر پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"تم اتنی صبح یہاں کیا کر رہے ہو مستقیم؟" امانت کی آواز میں تحیر تھا۔ مستقیم نے جلتی آنکھیں میچ لیں۔ امانت نے بغور اسے دیکھا۔

"ڈسٹرب لگتے ہو' حالانکہ ہونا نہیں چاہیے۔ آف کورس! ایک خوب صورت اور پارسا بیوی ہے تمہاری۔" امانت نے دانستہ چھیڑا اور اس کے چہرے پہ موجود اذیت گہری ہو گئی۔

"ایسا بہت کچھ جو ہماری زندگی میں نہیں ہونا چاہیے امانت! لیکن وہ ہماری رضا کے بغیر بھی ہو جاتا ہے۔" اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔

"بھابھی کی بات کر رہے ہو؟" امانت نے مسکرا کر اس کی صورت دیکھی' لیکن پھر کسی قدر حیرت سے بولا۔

"مگر یار! اب وہ ایڈجسٹ کر رہی ہیں۔ ڈونٹ وری ٹھیک ہو جائے گا سب۔"

"کچھ ٹھیک نہیں ہو گا۔ میں بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھا مگر رات۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک دم ہونٹ بھینچ لیے۔

"رات کیا ہوا؟ جھگڑا ہوا ہے تمہارا ان سے؟"

"مجھے افسوس ہے۔ مجھے اپنی زیادتی کا احساس اس وقت ہوا' جب ازالے کا وقت گزر چکا۔"

"کیا مطلب؟" امانت کو تحیر نے آن لیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے تکنے لگا۔ یہ وہ مستقیم تو نہیں تھا' جس سے وہ واقف تھا۔ اکھڑ' ضدی' مغرور اور ہٹ دھرم' جو صرف اپنی منوانا جانتا تھا' مگر اس ایک لڑکی کی وجہ سے اس نے اب تک اسے کیسے کیسے نہ بدلتے دیکھا تھا۔

"کیا محبت اتنا ہی باکمال جذبہ ہے؟" اس نے حیرت سے سوچا۔

"وہ پریگننٹ ہے۔ مگر وہ میرے جیسے عادی مجرم اور لٹیرے کے بچے کو جنم دینا نہیں چاہتی۔" مستقیم نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ امانت نے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ اتنی سرخ تھیں' کہ لگتا تھا ابھی ان سے خون ٹپک جائے گا۔ وہ کچھ کہے بغیر چپ سا ہو گیا۔

"آؤ! اندر چلیں۔ جانے نہیں کب سے یہاں بیٹھے ہو۔ اپنی رنگت دیکھو' نیلی ہو رہی ہے سردی سے۔"

"تم چلو! میں آتا ہوں۔" مستقیم نے کہا تو امانت بے بس سا ہو کر اسے تکنے لگا۔ جانتا تھا' وہ اس کی بات نہیں مانے گا' چاہے وہ اپنا سر پیٹ لے۔

☼ ☼ ☼

وہ کروٹ کے بل لیٹی تھی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو تکیہ بھگو رہے تھے۔ جب ہلکی سی آہٹ پہ اس نے بے ساختہ گردن موڑی اور حیرت و غیر یقینی سے ساکن ہو گئی۔ دادی مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ایک ہی جست میں ان کے بازوؤں میں سما گئی۔ دل بھر آیا اور وہ بے ساختہ ہچکیوں سے رو پڑی۔ دادی اس کے سر کو سہلاتی رہیں' آنسو پونچھتی رہیں۔

"آپ کہاں چلی گئیں تھیں دادی؟" اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مسکرا دیں۔

"میں کہاں گئی تھی۔۔۔ تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔۔۔ یاد نہیں؟"

"وہ مجھے لے گیا تھا زبردستی۔ میں کب جانا چاہتی تھی۔" اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔ دادی نے نرمی سے اس کی آنکھیں پونچھ دیں۔

"بس بس! اب رونا نہیں ہے۔"

"میرے آنسو کبھی نہیں خشک ہو سکتے دادی! قسمت نے مجھے ایک مجرم کی ذات کا حصہ بنا دیا ہے۔ مجھے بہت نفرت ہے اس سے۔"

"نہ بیٹا! نفرت مجرم سے نہیں' جرم سے ہونی چاہیے۔" دادی نے ٹوکا اور وہ اس انوکھی منطق پہ حیران ہو گئی۔

"میں تم سے بہت خفا ہوں دیا! تو تو دیا تھی' روشنی کا ذریعہ تو اندھیرے میں کیسے ڈھل گئی۔"

"جی۔" اسے شاک لگا۔ ان کی گود سے اٹھ کر سیدھی بیٹھ گئی اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھا۔

"پتر! جب خدا کسی بندے کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے یا اپنے قریب کرنا چاہتا ہے تو اس سے خاص اور بڑے کام لیا کرتا ہے۔ تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ تمہیں کسی کی ہدایت کے لیے چنا گیا ہے۔ وہ تمہاری محبت میں بے بس ہوا تھا۔ تم اس کی محبت کا فائدہ اٹھا کر کوئی بھی ایسا کام لے سکتی تھیں جو اسے ان اندھیرے اور پر خار راستوں سے واپس لے آتا۔ الٹا تم نے خود بھی ہدایت کی روشنی سے منہ پھیر لیا۔ یہ تھی میری تربیت؟" دادی سوال پہ سوال کر رہی تھیں۔ وہ اس قابل بھی نہیں تھی کہ انہیں کوئی جواب ہی دے دیتی۔

"وقت گزرا نہیں دیا! اپنے حصے کا کام انجام دو پتر اور رب کے حضور آزمائش میں سرخروئی حاصل کرو۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔" دادی نے اس کا سر تھپکا' ہاتھ چوما اور ایک دم جانے کہاں چلی گئیں۔ وہ تڑپ کر اٹھ گئی۔

"دادی۔۔۔ دادی۔" وہ ہڑبڑا کر بستر سے نکلی اور بے قراری و بے تابی سے دروازے کی سمت بھاگی اور اندر داخل ہوتے مستقیم سے ٹکرا کر گرنے کو تھی' جب مستقیم نے بے اختیار اسے سہارا دیا تھا۔ رو رو کر سوجی آنکھیں' متورم چہرہ۔ وہ پسینے میں بھیگی ہوئی تھی اور بری طرح کانپ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ کہاں جا رہی ہو؟" اسے اپنا آپ چھڑا کر دروازے کی جانب لپکتے دیکھ کر مستقیم نے ٹوکا۔

"دادی۔۔۔ ابھی دادی آئی تھیں میرے پاس' پھر پتا نہیں کہاں چلی گئیں۔" اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ مستقیم نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

"تم نے خواب دیکھا ہو گا۔ وہ یہاں کیسے آ سکتی ہیں۔" مستقیم نے نرمی سے سمجھایا' پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"تم آرام کرو' تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اب کی مرتبہ دیا نے جواب نہیں دیا اور منہ پہ ہاتھ رکھ کر سسکیاں دبانے لگی۔ مستقیم ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا۔

"تم یوں خود کو ہلکان مت کرو۔ اگر تم خوش نہیں ہو تو میں اس مصیبت سے تمہاری جان چھڑا دوں گا' ڈونٹ وری۔" وہ تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

بہت دنوں کے بعد اس نے غسل کیا اور نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ دعا کو ہاتھ اٹھائے تو آنکھ کی پوریں ستارے لٹانے لگیں۔ وہ کتنی دیر آنسو بہاتی رہی۔

"دادی کہتی ہیں میں دیا ہوں۔ روشنی دینا میرا کام ہے' بلکہ فرض ہے۔ مگر کیسے؟ میرے اللہ! مجھے راستہ سجھا۔ میں بس تیری مدد کی طلب گار ہوں۔ میری مدد فرما۔" اس نے منہ پہ ہاتھ پھیر کر نظر اٹھائی تو مستقیم کو اپنی طرف کچھ حیرت سے تکتے پا کر پہلی مرتبہ اس کا دل دھڑکا اور پلکیں لرز کر حیا آمیز انداز میں عارضوں پہ سایہ فگن ہو گئیں۔

"یہ لے لو پلیز۔" اس نے ایک چھوٹا لفافہ اس کی سمت بڑھایا۔ جسے تھامتے ہوئے اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

"کیا ہے یہ؟"

"اس کے استعمال سے اس ناسور سے چھٹکارا مل جائے گا۔ جو تمہارے وجود میں پل رہا۔" وہ سنجیدہ تھا۔ لفافہ دیا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ رنگت ہلدی کی طرح سے پیلی پڑ گئی۔ مستقیم زہر خند سا بولا۔

"ڈونٹ وری! اس میں ایسی نقصان والی کوئی چیز نہیں۔ بہت مہنگی دوا ہے۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گی۔" دیا نے دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ رخ موڑ لیا۔

"تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو کل خود ڈاکٹر

کے پاس پہنچ جاتا اور۔"

"مستقیم! پلیز! پلیز لو میں الون۔" وہ بھنچی ہوئی آواز میں چیخی۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر ایک جھٹکے سے پلٹ کر چلا گیا جبکہ وہ کانپتے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے بے آواز رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ خاموش کھڑا برستی بارش کو دیکھ رہا تھا۔ بارش کے قطرے جو کتنے جوش اور جذبے سے زمین کی طرف لپکتے تھے مگر دھرتی کے سینے پہ لگتے ہی اپنا وجود کھو بیٹھتے تھے، اس کی ذات اس کی محبت بھی ایسی ہی مایا بے وقعت تھی۔ اس پہ بارہا ثابت ہوا تھا مگر وہ کتنا احمق تھا کہ پھر بھی اسی جذب، اسی شوق سے اس کٹھن راہ پہ بھاگا جا رہا تھا۔

مگر اب وہ ایک دم سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ایک ایک کرکے اسے وہ ساری اذیتیں پھر سے محسوس ہونے لگیں جو اس نے سہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس نے سگریٹ لبوں سے نکال کر بارش کے پانی میں اچھال دیا۔ وہ گیلا ہوتے ہی بجھ گیا مگر اس کی آنکھوں اور دل میں جلتے بھڑکتے شعلے بجھنے کی بجائے اپنی لو تیز کرنے لگے۔ وہ اسے لیٹرا کہتی تھی، غاصب سمجھتی تھی۔ کیا وہ ہمیشہ سے لٹیرا تھا۔ کیا وہ ہمیشہ سے غاصب تھا؟

نہیں یقیناً "نہیں۔ ہمیشہ حالات کی سنگینی واقعات کی سفاکی ہی انسان کو کچھ سے کچھ بنایا کرتی ہے وہ بھی کچھ سے کچھ ہوتا چلا گیا تھا تو اس کی وجہ یہی واقعات و حالات تھے۔

☼ ☼ ☼

تپتے ہوئے جون کی ایک سخت ترین دوپہر تھی۔ سورج کا دہکتا گولہ عین سروں کے اوپر چمک رہا تھا۔ تیز دھوپ درختوں کی جڑوں تک کو گرمائے دے رہی تھی۔ اس پل گاؤں کی گلیاں اکثر سونی ہوتی ہیں۔ کہیں اکا دکا کوئی بڈھا کسی پیڑ کی چھایا میں چارپائی بچھائے اونگھتا نظر آجائے تو آجائے، ورنہ مائیں اپنے بچوں کو گھروں میں گھسائے نہ صرف خود سوتیں بلکہ بچوں کو بھی زبردستی سلا لیتیں۔ مگر وہ تو موجود تھا نا جو اپنی نانی کے بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ اسے کھیلنے سے شغف تھا نہ لڑنے بھڑنے سے۔ وہ تو بس پڑھائی کا شوقین تھا۔ اس پل بھی وہ نیم کی گہری چھاؤں میں بیٹھا اسکول کا کام نبٹا رہا تھا چھٹیوں کے کام کا رجسٹر اس کی موتیوں جیسی لکھائی سے بھرتا جا رہا تھا فضا میں اچانک ڈھول تاشوں کی بے ہنگم آواز نے جگہ بنائی اور پھر ہر آواز پہ غالب آتی چلی گئی۔ دو گلیاں پار کر موچی کی بیٹی کی بارات آرہی تھی۔ ابھی صبح ہی تو ناصر نے اسے بتایا تھا، اس کے واحد دوست نے۔

"اماں کی آنکھ بچا کر نکل لینا۔ پیسے لوٹیں گے۔" موجو اور ناصر کو پیسے لوٹنے کا بہت شوق رہتا تھا۔ ان لوٹے ہوئے پیسوں سے وہ سیخچے اور کھٹی گولیاں لے کر کھایا کرتا، ورنہ اماں تو چونی مانگنے پر بھی بے دریغ دھنک کے رکھ دیا کرتی تھیں۔ ناصر اس سے وعدہ لے کر ہی ٹلا تھا مگر پڑھائی لکھائی میں مگن ہو کر وہ یکسر بھول بیٹھا تھا۔ اب ڈھول کی آواز سن کر یاد آیا تو کنکھیوں سے نانی کو دیکھا۔ وہ نیند کے جھونکوں کی زد میں کبھی ادھر جھولتیں، کبھی ادھر۔ وہ قلم دوات رکھ کے ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے اٹھنے سے بان کی چارپائی چرچرائی تو اس نے سانس بھی روک لیا۔ اگر نانی کی آنکھ کھل گئی تو۔ وہ وہاں پہنچا تو بارات بھی قریب پہنچ چکی تھی۔ پیسے چھن چھن برسے۔ گندے مندے بچے چیل کووں کی طرح جھپٹے اور دھول مٹی میں اٹ گئے ان میں موجو اور ناصر بھی تھے۔

موجو کے اندر بڑی ترنگ تھی۔ زندگی میں پہلی بار آج وہ پیسے لوٹنے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ کسی ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا وہ آلو چھولوں کی ریڑھی کی طرف ابھی بڑھا ہی تھا جب اس کی تلاش میں اس سمت آتے ابو نے اسے دیکھا تھا۔ ننگے پاؤں، دھول اڑاتا چیختا ہوا، بے حد گندے کپڑے، مٹی سے اٹے پاؤں، بدرنگ بال ان

یک دم بجھ گیا۔

"مستقیم! مستقیم!" انہوں نے چیخ کر پکارا۔ وہ پہلے ٹھٹک کر ٹھٹھک گیا۔ اپنا ہی نام اسے اجنبی لگا تھا۔ بچپن کا پھر نانی کی وجہ سے "موجو" ہی مشہور ہو گیا تھا۔ مستقیم تو بس اسکول میں حاضری کے وقت آواز پڑتی اور وہ "حاضر جناب" کہہ کر پھر سے یہ نام بھول جاتا۔ اس کے ہم جماعت بھی اسے "موجو" ہی کہتے تھے۔

"شرم نہیں آتی، یہاں یہ سب کرتے ہو تم؟" ابو نے اس کی کلائی بہت سختی سے پکڑ کر زور کا جھٹکا دیا۔ وہ ہم گیا۔ پینٹ کوٹ میں ملبوس بابو ٹائپ آدمی اس کا باپ تھا، اس نے ہمیشہ انہیں غصے میں ہی دیکھا تھا۔ وہ بہت کم گھر آتے، جب بھی آتے، کسی نہ کسی بات پہ چنگھاڑنے لگتے۔ اس کی ماں بھی دہل جاتی! اس کی آنکھوں سے خوف چھلکتا اور موجو تو سانس لینا بھی بھول جاتا۔

"گھر چلو! پوچھتا ہوں میں تمہاری ماں اور اس کی ماں سے۔ یہ تربیت ہو رہی ہے میرے بیٹے کی؟"

اسے یونہی سختی سے دبوچے وہ گھر تک آئے۔ لکڑی کا سال خوردہ دروازہ ایک ٹھوکر سے کھولا۔ چولہے کے آگے پھونکنی سے آگ دہکاتی اس کی ماں دہل کر مڑی۔ پھر ابو بہت دیر تک چنگھاڑتے رہے، چیختے رہے اور غصہ میں فی الفور انہیں ساتھ لے جانے کا فیصلہ سنایا۔ وہ جتنا ہراساں ہو رہا تھا، اس کی ماں اور نانی اتنی ہی خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ نانی نے لپک جھپک پکڑ کر اسے نہلایا اور اچھے کپڑے پہنانے سے پہلے بالوں کو خوشبودار تیل لگایا پھر پاؤڈر لگا کر اس کا نکھار مکمل کیا، مگر اسے دیکھتے ہی ابو کا مزاج بگڑ گیا۔ کچھ باتیں سنانے کے بعد انہوں نے اسے پھر سے نہلانے کا آرڈر جاری کیا۔

"احمق جاہل عورتیں۔ پتا نہیں کہاں پھنس گیا ہوں۔ اتنا بھی نہیں پتا، تیل نہانے کے بعد نہیں پہلے لگایا جاتا ہے۔" وہ کتنی دیر تک کلستے رہے اور موجو ان کے سامنے جنگ ہوتا رہا۔

☼ ☼ ☼

پھر سب کچھ بدل گیا۔ اس کا ماحول، اس کا گھر، اس کا اسکول بھی۔ پہلے وہ شلوار قمیص پہن کر کپڑے کا تھیلا گلے میں لٹکا کر، ہاتھ میں تختی گھماتا اسکول جاتا تھا، پھر وہ نیکر، شرٹ میں رنگین بیگ لے کر ایک انگلش میڈیم اسکول میں جانے لگا۔ ہر طرح کے مزے تھے۔ بس ابو سے اس کی جان جاتی تھی۔ اس کی ماں اس کے جتنے لاڈ اٹھاتی، ابو اتنا ہی کھینچ کر رکھتے۔ سب کچھ بدل گیا تھا، مگر اس کا مزاج اب بھی سادہ ہی تھا۔ وہ اپنے کلاس فیلوز سے بہت آرام سے دھوکا کھا جاتا۔ شرارت کسی اور کی ہوتی، پکڑوا اسے دیا جاتا۔ اس کی سادگی اور بھولپن کی وجہ سے وہ بدھو کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ دور بھی گزر گیا۔

☼ ☼ ☼

اسکول کے بعد کالج میں آیا تو اس کا قد چھ فٹ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی گندمی رنگت اور بڑی بڑی سحر انگیز آنکھوں میں کچھ تو ایسا تھا کہ لڑکیاں دیوانہ وار اس کی طرف لپکتی تھیں مگر اس پہ ہر وقت ابو کا ہوا سوار رہتا۔ جب ہی کسی لڑکی کے نزدیک بھی نہ پھٹکتا۔ بلکہ اس نے تو دبے لفظوں میں امی سے کہا تھا۔

"مجھے کو ایجوکیشن میں نہیں پڑھنا آپ ابو سے کہیں، مجھے بوائز کالج میں بھیج دیں۔" اس کی ماں نے سنا اور افسردگی سے مسکرا دی۔

"بیٹا! کیا حرج ہے؟ مقصد تو تعلیم حاصل کرنا ہے نا؟ تمہارا باپ میری کہاں سنے گا۔"

اور وہ خاموش ہو گیا تھا۔ وہ جان گیا تھا اس کی ماں سالہا سال گزر جانے کے باوجود اس کے باپ کے دل میں ذرا سی بھی جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ اس کے باپ کی خالہ زاد کزن تھی اور اس کے باپ کی نہیں، دادی کی پسند تھی۔ اس کا باپ عبدالماجد شاید کسی اپنے جیسی حسین، طرح دار عورت کو پسند کرتا تھا، جب ہی اس کی ماں کو اس نے نہ کبھی عزت دی، نہ

تب — جب خاطب کیا طرزِ حقارت اور نحوت سے۔ ایک جھگڑا ہوتا اور اس کی ماں کئی کئی مہینوں تک نانی کے گھر بھیج دی جاتی۔

اس ادھر ادھر کے چکر میں اس کی تعلیم کا اتنا حرج ہو رہا تھا' چنانچہ نانی نے اس کا مستقل داخلہ گاؤں ہی کے اسکول میں کرا دیا تھا۔ ابو نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ شاید انہیں بیوی کے ساتھ بیٹے سے بھی کسی محبت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ مگر ان کے طرزِ زندگی کو دیکھتے ہوئے ایک مرتبہ ان کی بہن نے ان کو سمجھایا۔ وہ نہ صرف پڑھی لکھی تھیں' بلکہ عمر میں بھائی سے بڑی بھی تھیں۔

"تم نے اپنی زندگی کا کیا فیصلہ کیا ہے عبدالماجد؟" ان کے سوال پہ وہ سخت مایوسی کے عالم میں بولے۔

"مجھے کیا فیصلہ کرنا ہے؟ فیصلہ تو اماں کر چکی ہیں برسوں قبل۔ وہ تو اب مر چکی ہیں۔"

"زبردستی سہی' تم نے ان کا فیصلہ مانا بھی۔ لیکن اس کی سزا بیوی بچے کو کیوں دے رہے ہو؟"

"سزا تو میں خود کاٹ رہا ہوں۔ ایسی جاہل عورت گلے باندھی ہے میرے۔" وہ حسبِ عادت پھنکارنے لگے۔

"سعیدہ ان پڑھ ضرور ہے ماجد! مگر سمجھ دار عورت ہے' پھر سب سے بڑھ کر تمہارے بیٹے کی ماں ہے۔ کس ماحول میں لاوارثوں کی طرح چھوڑ ہوا ہے تم نے اپنے بیٹے کو؟ جانا ہوا تھا میرا۔ یقین کرو' مجھے بہت دکھ ہوا۔ وہ تمہارا بیٹا تو لگتا ہی نہیں ہے۔ پوری طرح اس ماحول میں رچ بس گیا ہے۔ وہ بہرحال تمہاری اولاد ہے ماجد! تمہیں اس کا خیال کرنا چاہیے۔ تمہیں پڑھے لکھے ہو کر بھی اس بات کی سمجھ نہیں کہ ماں باپ کی لڑائی سے بچوں پہ کتنا برا اثر پڑتا ہے۔ ان کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسے بچے جن کو والدین کی طرف سے سپورٹ حاصل نہیں ہوتی' وہ اپنی بقا کی جنگ کے لیے ہر صحیح اور غلط کو اپنی زندگی میں اپلائی کرتے ہیں۔ وہ ڈبو بھی ہو سکتے ہیں اور معاشرے کے کرپٹ انسان بھی۔ تمہارا بچہ ابھی چھوٹا ہے' مگر اتنا بھی چھوٹا نہیں کہ رویے اس پر اثر انداز نہ ہوتے ہوں۔ وہ پیار اور نفرت کو بہت جلدی مارک کرتا ہو گا۔ اگر ایسا ہی رہا تو وہ اپنی عمر سے پہلے کم سنی کو پھلانگ جائے گا۔ اور ایسے بچے جو کم سنی سے یکدم بڑی رسیدگی میں چلے جائیں' ان کی زندگی میں اگر سب کچھ ہو' پھر بھی زندگی کی بے رنگی اور تلخی ختم نہیں ہوتی۔ اکیلا پن' غیر محفوظ ہونے کا احساس انہیں دل سے ہنسنے نہیں دیتا۔ اور آئی تھنک! تم اپنے بیٹے کے لیے ہرگز یہ نہیں چاہو گے؟" ان کی بہن ان کی سوچ کا در وا کر گئی تھیں اور وہ واقعی لرز گئے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ جا کر بیوی اور بچے کو گاؤں سے لے آئے' مگر ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول گئے تھے کہ بیٹے کی شخصیت کو مضبوط بنانے کے لیے انہیں اپنی روش' اپنا انداز بھی بدلنا چاہیے۔ اور انہیں پتا بھی نہ چلا' ان کا بیٹا اگر کرپٹ انسان نہیں بھی بنا تھا تو ڈبو ضرور رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ تھرڈ ایئر میں تھا' جب اس کی ایک کلاس فیلو ثمرینہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ثمرینہ نے اس میں ایسا کیا دیکھا تھا۔ جو اس کی سمت لپکتی تھی۔ وہ جتنا بدکتا' ثمرینہ اسی قدر اس میں کشش محسوس کرتی۔

"مجھ سے دوستی کر لو شائی ڈارلنگ!"

وہ کلاس لے کر نکلا تھا اور کینٹین میں آ کر بیٹھا ہی تھا' جب اس کے راستے پہ آنکھیں بچھائے بیٹھی ثمرینہ اس کے پیچھے چلی آئی اور بنا اجازت اس کی ٹیبل پہ براجمان ہو گئی اور اس پہ جھک کر بے باکی سے آنکھ ماری۔ تنگ جینز پہ سفید چکن کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ جس کے گریبان کے اتنے بٹن کھلے تھے کہ مستقیم کے اوسان خطا ہونے لگے۔ ثمرینہ کا باپ مل اونر تھا' وہ اکلوتی تھی۔ لاڈلی اور بگڑی ہوئی اور جو کپڑوں کی طرح

گاڑیاں بدلتی تھی۔ کالج کے سارے لڑکے اس کے دیوانے تھے اور وہ مستقیم پہ مرتی تھی۔

"کچھ بولو نا' تمہاری آواز بھی تمہاری طرح کیوٹ ہے۔" وہ بے باکی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ مستقیم کرنٹ کھا کر یوں اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مار رہا ہو۔

"پلیز! مجھے کسی بھی لڑکی سے دوستی نہیں کرنی۔"

"تب مجھتیں کیوں نہیں؟" وہ کسی قدر زچ ہوا' مگر ثمرینہ کے بلند قہقہے نے اسے نروس بھی کر ڈالا۔

"کم آن یار! کیسی دقیانوسی باتیں کرتے ہو۔ کو ایجوکیشن میں پڑھ رہے ہو تم۔"

"میری کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے۔ چلتا ہوں۔" وہ جان چھڑا کر بھاگا' مگر کب تک۔ ثمرینہ جان چھوڑنے والی کہاں تھی۔

ابو نے ایگزام پاس کرنے پہ اسے بائیک لے کر دی تھی۔ جو آج کل پتا نہیں کیوں مسئلہ کرنے لگی تھی۔ چھٹی کے بعد وہ اپنی بائیک اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا' جب اس کی ہنسی کی جھنکار پہ پہلے چونکا' پھر خفیف ہو گیا۔

"یہ اسٹارٹ نہیں ہو گی۔ آجاؤ میرے ساتھ۔ ڈراپ کر دوں گی۔" پیش کش بہت پرکشش تھی' مگر وہ اسے نظر انداز کر کے بائیک اسٹارٹ کرنے میں لگا رہا۔ وہ منتظر نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے دوبارہ پیش کش کرتی' اسی وقت وہ بائیک اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ زن سے اس کے قریب سے بائیک لے اڑا۔ وہ کینہ توز نظروں سے اڑتی دھول کو تکتی رہ گئی۔

"کب تک بچو گے آخر؟" اپنی توہین نے اسے تلملا کر رکھ دیا تھا۔

اور یہ اس سے ٹھیک ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ بے تحاشا سرد ٹھٹھرتے موسم میں ثمرینہ کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوا تھا اور وہ کافی پریشان تھی۔ اس کی گاڑی وہیں خراب ہوئی تھی' جہاں مستقیم کی بائیک کھڑی تھی۔ وہ کالج کی لائبریری میں ایک گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا۔ لائبریرین کے ٹوکنے پہ وہ اپنا جرنل اور کتابیں اٹھاتا جب عجلت میں اپنی بائیک تک پہنچا تو ثمرینہ اسی کی منتظر تھی۔

"مستقیم! میری گاڑی خراب ہو گئی ہے' پلیز ہیلپ می۔"

"سوری! میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔" اس نے رکھائی سے کہا۔ اور بائیک اسٹارٹ کر دی۔

"تم صرف مجھے مال تک چھوڑ دینا' میں وہاں سے رکشہ یا ٹیکسی کر لوں گی' پلیز مستقیم!" اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ثمرینہ نے اچک کر اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھنا چاہا' مگر مستقیم نے فوراً" بائیک بھگا دی۔ ثمرینہ گرتے گرتے بچی۔ وہ پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہیں کھڑی اس کی پشت کو گھورتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

یہ اس سے محض چند دن بعد کی بات تھی۔ اسے اس روز لائبریری سے کچھ کتابیں ایشو کروانا تھیں۔ اس سلسلے میں کچھ لیٹ ہو گیا' جبکہ امی کو کسی شادی میں شریک ہونا تھا۔ اسے خصوصی تاکید کی تھی جلدی آنے کی' مگر وہ بھول بیٹھا تھا۔ وقت مقررہ سے جب دو گھنٹے لیٹ وہ گھر پہنچا تو امی بے تابی سے اسی کی منتظر تھیں۔

"تم فریش ہو کر کھانا کھا لو بیٹا! پھر جیولر سے میری چوڑیاں لا دینا۔ اسی انتظار میں بیٹھی ہوں' صبح سے آپا کے دو فون آ چکے ہیں' ابھی تک پہنچے کیوں نہیں۔"

"آپ رسید لائیں! میں پہلے ادھر جاتا ہوں۔ کھانا آ کر کھاؤں گا۔"

اور جب وہ رسید ہاتھ میں لیے شہر کے مشہور جیولرز کی روشنیوں سے جگمگاتی دکان میں داخل ہو رہا تھا' اس کے بالکل سامنے موجود ڈپارٹمنٹل اسٹور سے نکلتی ثمرینہ کی نظر اس پہ پڑی تھی اور محض ایک لمحہ لگا تھا اس کے شیطانی دماغ کو منصوبہ گھڑنے میں۔ اگلے ہی

لمحے وہ اس پہ عمل پیرا ہو گئی تھی۔ مستقیم نے دکان دار کو رسید دکھا کر چوڑیوں کا تقاضا کیا تو دکان دار نے اسے نشست پہ بیٹھ کر انتظار کرنے کا کہا۔ مستقیم بیٹھنے کی بجائے گھوم پھر کے شوکیس میں لگے خوب صورت اور چمکتے دمکتے زیورات کو سرسری نظر سے دیکھنے لگا۔ ثمرینہ وہیں کھڑی بریسلٹ نکال نکال کر دیکھ رہی تھی مستقیم بے دھیانی میں چلتا ہوا جیسے ہی اس کے قریب پہنچا اس نے ایک بریسلٹ اتنی صفائی سے سب کی نگاہ بچا کر سرعت سے مستقیم کی جیکٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ وہ صورت حال کی سنگینی سے بے خبر اپنے آپ میں مگن اب جھک کر سرخ یاقوت سے مزین جڑاؤ کنگن مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔

"سوری! مجھے کوئی ڈیزائن پسند نہیں آسکا۔ اوکے فائن پھر کبھی سہی۔" وہ کاندھے جھٹک کر سیلز مین سے مخاطب ہوئی۔ اس نے کاندھے اچکائے تھے اور کیس بند کرنے لگا مگر اگلے لمحے وہ ایک دم چوکنا ہوا تھا۔

"ون اے منٹ میم! اف یو ڈونٹ مائنڈ پلیز! یہاں آئیں۔"

"جی!" ثمرینہ جو اسی صورت حال کی منتظر تھی کسی قدر تحیر سے پلٹی۔

"اس کیس میں ایک بریسلٹ کم ہے۔ حالانکہ ابھی جب میں نے آپ کو دکھائے تھے تو۔۔۔"

"کیا مطلب؟ کہنا کیا چاہتے ہیں آپ کہ۔۔۔ میں چور ہوں؟" وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ مستقیم بھی متوجہ ہو چکا تھا مگر ثمرینہ کے لیے اس کے تاثرات سرد ہی تھے۔

"سوری! میں آپ کو بلیم نہیں کر رہا مگر ہمیں آپ کی تلاشی تو لینا ہوگی۔" سیلز مین بے حد سبھاؤ سے اور محتاط ہو کر بات کر رہا تھا۔ نقصان اس کی موجودگی میں ہوا تھا۔ بریسلٹ لڑکی سے نہ ملنے کی صورت میں خمیازہ اسے بھگتنا پڑتا۔

"دیکھیے آپ میری توہین کر رہے ہیں مسٹر! میں ایک مہذب اور شریف شہری ہوں۔۔۔ ایک مل اونر کی بیٹی۔ مجھے کیا ضرورت ہے ایسی گھٹیا حرکت کرنے کی؟ اور ویسے بھی آپ شک صرف مجھ پہ کیوں کر رہے ہیں جبکہ آپ جانتے ہیں جب میں بریسلٹ دیکھ رہی تھی تو یہ لڑکا بھی بالکل میرے برابر کھڑا تھا۔ چور یہ بھی تو ہو سکتا ہے' آپ اس کی تلاشی بھی لیں۔"

اس نے اتنی خوب صورتی اور چالاکی سے صورت حال پلٹی تھی کہ مینیجر اور سیلز مین تذبذب کا شکار ہو گئے۔ مستقیم تو ایک دم چکرا گیا تھا۔ اسے اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ مینیجر کے اشارے پہ سیلز مین نے تلاشی کے پہلے مرحلے پہ بریسلٹ اس کی جیکٹ کی جیب سے برآمد کر لیا۔ وہ اس حد تک سراسیمہ ہوا کہ اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔ اس کی پھٹی پھٹی نگاہ ثمرینہ کی طرف اٹھی۔ وہ مسکراتی اٹھلاتی اِتراتی دکان سے باہر نکل گئی۔ مینیجر نے فون کیا اور اگلے چند لمحوں میں پولیس پہنچ گئی۔

"دیکھیے سر! پلیز یہ جھوٹ ہے۔ میرے خلاف سازش۔ م۔۔۔ میں۔"

"اوئے چپ کر! ثبوت جیب سے برآمد ہوا اور تو اسے سازش قرار دیتا ہے؟" حوالدار کے ہاتھ کا زناٹے دار تھپڑ اس کا گال سرخ کر گیا۔ اس کی ایک نہیں سنی گئی اور بھرے بازار میں پولیس والے جب اسے ڈنڈے مارتے ہوئے لے جا کر گاڑی میں بیٹھے اس روز احساس ذلت کے سبب وہ خود سے بھی نظریں نہیں ملا سکا تھا۔

وہیں جیل میں پہلی بار اس کی ملاقات ماکھے سے ہوئی تھی۔ ماکھے نے اس کی چپ کو توڑنے کی بہتیری کوشش کی۔ یہاں تک کہ اس کی ہمدردی میں پولیس والوں کو گالیاں بھی دیں اور اپنے لیے آئے کھانے' چائے وغیرہ کی بھی پیش کش کی مگر وہ تو کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کا خودکشی کرنے کا جی چاہا مگر وہ خود پہ جبر کرتا رہا۔ ابو کو یقیناً اس کی گرفتاری کا علم ہو چکا تھا۔ مگر ابو اس کی ضمانت کو نہیں آئے۔

وہ جانتا تھا ابو کا پارہ آسمان کو چھو رہا ہو گا۔ مگر غصہ اپنی جگہ مگر بات تھی! انہیں اس کی ضمانت تو کرانا چاہیے تھی۔ اس نے ماکھے سے موبائل لے کر اسی کے تھوڑے پیسوں پہ گھر فون کیا تھا اس کی بات امی سے ہو گئی تھی جو اس کی آواز سنتے ہی رونا شروع ہو گئیں۔

"آپ ابو سے کہیں نا! وہ میری ضمانت تو کرائیں۔ یہ قید بہت جان لیوا ہے میرے لیے۔" وہ اتنا بڑا ہو کر خود پہ ضبط کھو کر بچوں کی طرح رو پڑا تھا۔

"منتیں کرتی ہوں دن رات۔۔۔ میرے لال! تمہارا کیا خیال ہے میں سکون سے بیٹھی ہوں' مگر نہیں مانتے۔ وہ تو تمہاری شکل بھی دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔ خاندان میں' محلے میں ہر جگہ تمہاری گرفتاری کی خبر پھیل گئی ہے۔ لوگ افسوس کے بہانے آ کر ان کو اور بھی اشتعال دلا جاتے ہیں' تمہارے خلاف باتیں کر کے۔"

وہ اتنا دل برداشتہ ہوا تھا کہ مزید کچھ بھی نہیں کہہ سکا اور فون بند کر دیا۔ صورت حال اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر سنگین ہو چکی تھی۔ ابو اس سے بے حد نالاں تھے۔ انہوں نے کبھی اسے سمجھا نہیں تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یوں قطع تعلق ہو جاتے۔ ماکھا اس سے پوچھتا رہا کہ کیا کہا گھر والوں نے مگر اسے تو ایسی چپ لگی تھی جو ٹوٹتی نہ تھی۔ وہ مزید ایک ہفتہ حوالات میں بند رہا۔

ماکھے کی ضمانت ہوئی تو اس نے اپنی وفاداری اور دوستی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور اس کو بھی رہا کرا لیا۔ وہ اس کا ممنون ہوا تھا مگر شکریہ ادا نہیں کیا کہ ایسی صورت میں ماکھا پھر اس سے راہ و رسم بڑھائے گا' جو وہ نہیں چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے محلے میں داخل ہوا تو محلے کے کئی لوگوں سے اس کا سامنا ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر پہلے چونکتے پھر کترا کے گزر جاتے یا پھر اس سے ان قصوں کی تفصیل جاننے کی کوشش کرتے جو قصے اس کی غیر موجودگی میں اس کے حوالے سے مشہور ہو چکے تھے۔ اس کا جی چاہا' ایسے سوالات کرنے والوں کا منہ نوچ لے' مگر خود پہ ضبط کرتا ہوا اپنے گھر کی جانب بڑھتا رہا۔ بند دروازے پہ دستک کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کہ دروازہ یوں ہی بھڑا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔

اتنے بڑے گھر پہ ایک عجیب سی ویرانی کا پہرا تھا۔ یوں جیسے کوئی صدیوں سے یہاں بستا ہی نہ ہو۔ اس نے اپنے ہی گھر میں خود کو اجنبی محسوس کیا تھا قدرے جھجکتے ہوئے انداز میں وہ امی کے کمرے کی طرف بڑھا۔

"امی۔۔۔ امی!" اس نے آہستہ سے پکارا۔

جائے نماز پہ بیٹھی امی اس کی آواز پہ چونکیں اور اگلے ہی لمحے وہ جھٹکے سے مڑی تھیں۔ بیٹے کو روبرو پا کے ان کی آنکھیں حیرت' خوشی اور غیر یقینی سے ساکن رہ گئیں۔ وہ آہستگی سے مسکرا دیا اور بڑھ کر خود ان سے کسی ننھے بچے کی طرح لپٹ گیا۔

"یا اللہ! تیرا شکر۔ اب تو مجھے لگنے لگا تھا تیری راہ تکتے میری آنکھیں پتھر ہو جائیں گی۔" امی زار و قطار آنسو بہاتے ہوئے اس کے چہرے کے نقوش والہانہ انداز میں چوم رہی تھیں۔ مستقیم کو لگا جیسے اس کے اندر جنموں کی پیاس بجھنے لگی ہو۔ وہ ایک دم آسودہ ہونے لگا۔

"کیا حشر کر دیا ظالموں نے میرے چاند کا۔ چل اٹھ! نہا دھو لے۔ میں تازہ کھانا بناتی ہوں' پھر آرام کر لینا۔" امی نے نرمی سے سر تھپک کر اسے اٹھایا تو وہ مسکراتے ہوئے اٹھا تھا۔ پھر انہیں دیکھ کر شوخی سے بولا۔

"مٹر پلاؤ بنایئے گا امی! وہاں آپ کے ہاتھ کے ذائقے کو بہت مس کیا ہے۔ پھر میں آپ کو بتاؤں گا' یہ سب میرے ساتھ کس نے کروایا۔ آپ کو یقین ہے نا امی! کہ آپ کا بیٹا مجرم نہیں ہے؟" اس کی آنکھیں

اپنی صفائی دیتے ایک دم ابو کے سامنے سے جھنگ گئیں۔

"ارے! چور کو تو گرم توے پہ بھی بٹھا کر پوچھا جائے کہ وہ چور ہے تو وہ تب بھی نہ مانے۔ ساری دنیا میں بدنامی کے اشتہار لگا کر یہاں آنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ میرے گھر میں کسی مجرم کی کوئی جگہ نہیں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" ابو جانے کب وہاں آگئے تھے۔ وہ ایک دم دھاڑے۔ امی خائف ہو کر تھر تھر کانپنے لگیں جبکہ مستقیم نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ ان کے غصے کو بجا سمجھتا تھا، مگر یہ محض الزامات تھے۔ وہ انہیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

"ابو! آپ تک جو اطلاعات پہنچی ہیں، وہ غلط ہیں میں..." اس کی بات ابو کا تھپڑ پڑنے کی وجہ سے ادھوری رہ گئی۔ انہوں نے ایک تھپڑ پہ اکتفا نہیں کیا۔ یکے بعد دیگرے اس کے چہرے پہ طمانچے برساتے چلے گئے۔ وہ چکرا گیا جبکہ امی کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔

"اتنے فالتو ہیں لوگ جو بیٹھے تمہارے خلاف سازشیں کرتے ہیں؟ ہاں! احمق سمجھ رکھا ہے ہمیں؟ میں تمہیں شوٹ کرنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

ابو اسے باہر کی طرف دھکا دینے لگے تو امی اس کے اور ابو کے بیچ میں آگئیں۔

"نہیں، نہیں... خدا کا واسطہ ہے آپ کو... اسے یوں گھر سے مت نکالیں۔ کہاں جائے گا۔ اسے معاف کر دیں۔ سن تو لیں، کیا کہنا چاہتا ہے۔" وہ دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے ابو کے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجائیں کرنے لگیں، مگر وہ تو اس پل غیظ و غضب کی انتہاؤں پہ پہنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک الٹے ہاتھ کا تھپڑ امی کو بھی دے مارا۔ ان کی ناک سے خون بہنے لگا۔

"خبردار! جو تم نے کوئی مداخلت کی۔ اس بڑھاپے میں چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دوں گا اس کے ساتھ ہی۔"

ان کی دھمکی نے امی کو ساکن کر دیا، جبکہ مستقیم تڑپ اٹھا تھا۔ ابو سے اتنے شدید ردعمل کی اسے توقع نہیں تھی۔ امی تو اس قدر سہمی ہوئی تھیں گویا سانس لینا بھول گئی ہوں۔

"امی! آپ چلیں میرے ساتھ۔ میں ہرگز آپ کو یہاں نہیں رہنے دوں گا۔" وہ غم و غصے کی شدتوں سے کانپتا ہوا بولا۔ کچھ فیصلے ایکا ایکی ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایسا ہی فیصلہ تھا۔ ابو نے خاصی تمسخر اڑاتی نظروں سے اسے دیکھا اور امی کو دیکھ کر پھنکار کر بولے۔

"ہاں، ہاں! لے جاؤ اپنی ماں کو بھی ساتھ... میں اپنے نام کی بیڑی سے اسے آزاد کرتا ہوں، پھر لے جانا۔ چور اچکوں کے رشتہ داروں سے میں خود بھی کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ابو کو تکتی امی کے پاس آکر انہیں اپنے بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے ابو کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے! دیں میری ماں کو طلاق۔ ہم خود بھی اب آپ سے کوئی رشتہ، کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔ آپ جیسے خود پسند لوگ ساری زندگی اپنی ذات میں تنہا ہی گزارتے ہیں۔" وہ ایک بدلے ہوئے مستقیم کی شکل میں سامنے تھا۔ ابو کو اس کی ڈھٹائی اور بے غیرتی پہ غش آنے لگے، جبکہ اس کے الفاظ پہ امی جیسے ہڑبڑا کر حواسوں میں لوٹ آئیں۔

"مستقیم!" وہ چیخیں۔ "شرم سے ڈوب مرو۔ ماں کو اس بڑھاپے میں طلاق دلوا رہے ہو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں۔ بے بسی، بے کسی، ذلت اور شرم کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے وہ سخت مضطرب ہو گیا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"جاؤ! چلے جاؤ یہاں سے... مستقیم! چلے جاؤ۔ میں سمجھ لوں گی تم پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔"

مستقیم صدمے اور غیر یقینی سے گنگ ہو گیا۔ جبکہ ابو کے چہرے پہ طنز اور تمسخر کے ساتھ اس مقابلے میں ملنے والی فتح کا احساس بھی اترا تھا۔

"بس! سن لیا... ہو گئی تسلی؟ اب اپنے کالے کرتوتوں کے ساتھ شکل گم کرو۔" انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر حقارت سے کہا۔

اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے پہلے ابو کو دیکھا۔ ان کے چہرے پہ تلخی و درشتی تھی۔ پھر اس کی نظریں امی پہ جا ٹھہریں۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپے رو رہی تھیں۔ شاید اس نے انہیں دکھ دیا تھا اور اب وہ بھی اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے بھی اسے جانے کا کہہ دیا تھا۔ یعنی اب اس گھر میں کہیں بھی اس کے لیے جگہ نہیں تھی اور یہ احساس بہت جان لیوا تھا۔ وہ واپسی کو مڑا۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

☼ ☼ ☼

دکھ کی شدید لہر اس کے اندر اتر آئی تھی۔ ابو کے ساتھ جب امی نے بھی ٹھکرایا تو وہ جیسے خود سے بچھڑ گیا۔ وہ گھر سے نکلا تو شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ وہ محلے کے جانے پہچانے منظر کسی اجنبی کی نظر سے دیکھتا آگے بڑھتا رہا۔

وہ ساری رات چلتا رہا اور تھکا نہیں کہ روح کی تھکن وجود کی تھکن پہ غالب تھی۔

صبح ہوئی تو وہ ایک پارک کی بینچ پر گر کر بے سدھ ہو گیا۔

آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی تیز شعاعوں نے اس کے چہرے کو جھلسایا، ایک ہی زاویے پہ پڑے رہنے سے اس کے اعصاب مفلوج ہو رہے تھے۔ مگر اس سے بھی شدید احساس پیٹ میں دہکتے الاؤ کا تھا۔ اس نے جانے کتنے دنوں سے ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا تھا۔

پارک سے نکل کر وہ ایک چھپر ہوٹل تک آگیا۔ اس کی جیب میں بیس روپے تھے، یہ پیسے ماکھے نے زبردستی اس کی جیب میں ٹھونس دیے تھے کہ گھر جانے کا کرایہ رکھ لو۔ وہ دال روٹی کا آرڈر کر کے بان کی چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ تب ہی جانے کس طرف سے نکل کر ماکھا بہت ہی پرجوش انداز میں آکر اس سے بغلگیر ہو گیا۔

"وے شہزادے! تو کدھر شیر جوانا؟ یہاں لوگ غالباً کھانا کھانے آتے ہیں۔" ماکھے کے برعکس اس کا انداز سرد مہر تھا، مگر ماکھا پھر بھی خفت کا شکار نہیں ہوا۔ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

"تجھے پتا ہے شہزادے! نخرہ بھی بجتا ہے تجھ پہ۔" وہ منہ میں موجود پان چباتے ہوئے بولا۔

اس وقت ہوٹل کے ملازم نے اس کے آگے کھانا لا کر رکھا۔ پلاسٹک کی چنگیر میں دو تندوری روٹیاں، تام چینی کی پلیٹ میں ماش کی بھنی ہوئی دال، جس پہ باریک کٹی پیاز ڈالی گئی تھی، ساتھ دہی کی چٹنی۔

"اوئے ککڑ کی ٹانگیں لا، ہمارے ببر شیر کے لیے۔ تجھے نہیں پتا یہ ہمارا مہمان ہے؟" ماکھے نے ملازم کو جھاڑ ڈالا۔

ملازم نے سہم کر "جی اچھا جناب!" کہا اور سرعت سے پلٹ گیا۔ اس سے مستقیم نے اندازہ لگایا، اس علاقے میں ماکھے کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ مگر اسے کیا، وہ تو ماکھے سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس نے ٹرے اپنی جانب گھسیٹی اور کھانے لگا۔ ماکھا گہری نظروں سے اسے کھاتے دیکھنے لگا۔

"گھر والوں نے نکال دیا تجھے؟" نسوار کی پڑیا نکال کر چٹکی منہ میں رکھتے ہوئے اس کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ مستقیم کا نوالہ منہ کی طرف لے جاتا ہاتھ اسی زاویے پہ ساکن ہو گیا۔ ماکھے کی زیرک نگاہ نے اس کے چہرے پہ اترتے اذیت کے رنگوں کو دیکھا اور گہرا سانس بھر کے بولا۔

"میں نے کہا تھا نا! یہ دنیا بہت ظالم ہے۔"

مستقیم نے اس کی طرف نگاہ بھر کے دیکھا نہیں گیا۔ اسے لگا تھا اسے ایک بار پھر کسی نے سربازار عریاں کر دیا ہو۔ وہ ایک دم اٹھا اور ماکھے کو نظر انداز کرتا آگے بڑھتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

سارا دن گھٹا چھائی رہی۔ آسمان پہ گہرے بادل ہونے کی وجہ سے زمین کے مکین سورج کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔ تیز برفیلی ہوائیں نیزوں کی مانند جسم

میں پیوست ہوئی تھیں۔ اس کا وجود تھکن اور بخار سے جلتا تھا۔ پچھلے چھ گھنٹے اس نے لگاتار کام کیا تھا۔ اس کے سامنے پھیلا تین کینال کے گھر کی دوسری منزل ابھی زیر تعمیر تھی اور اسی میں اس نے آج مزدوری کی تھی۔ پیٹ کا دوزخ ایندھن مانگتا تھا اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ ہاتھ پھیلانا اور چھیننا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یہ دونوں کام نہیں کرسکا۔ حالانکہ ماکھے نے سمجھانے کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ شامل ہونے کا مشورہ بھی دیا تھا مگر وہ اس راہ کا مسافر نہیں تھا۔ ابھی اس نے اپنے مستقبل کے حوالے سے کچھ نہیں سوچا تھا۔

فی الحال وہ تین وقت کی روٹی کی فکر میں تھا اور اس سلسلے میں آج ایک مزدور کی حیثیت سے جان توڑ رہا تھا۔

اس چند گھنٹے کی مزدوری میں اس نے واضح طور پر یہ محسوس کیا تھا کہ اس کے ساتھی مزدور اس سے اضافی مشقت لے رہے ہیں۔ اینٹوں سے بھری ریڑھی وہ اوپر لے کر جاتا تو واپسی پہ اس کی ریڑھی میں ماربل بھر دیا جاتا۔ اسے غصہ تو آیا مگر وہ ضبط کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جب ہی حوصلے اور برداشت کو آزماتا رہا۔

مگر یہ برداشت ' یہ حوصلہ اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا ' جب دن بھر کی جان کنی کے بعد اُجرت ملنے کا وقت آیا۔ ہتھیلی پہ رکھے جانے والے دس ' دس کے دس نوٹوں کو اس نے تحیر سے دیکھا۔ وہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھا ' مزدور کی ایک دن کی دیہاڑی ڈیڑھ سو روپے تھی۔

"یہ کم ہیں۔ مجھے میری پوری اُجرت چاہیے۔" نوٹ واپس کرتے ہوئے اس نے تحمل سے ٹھیکیدار کو مخاطب کیا۔ اس کے چہرے کے زاویے اس فرمائش کو سن کر بگڑ گئے۔

"اتنے مل گئے ہیں نا غنیمت سمجھو۔ کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ ہمارے مخصوص مزدور ہیں اور ہم کمیشن۔۔۔"

"مگر میں اس کمیپ میں شامل نہیں ہوں تو میں کمیشن بھی نہیں دوں گا۔ جب کام میں کمی نہیں تو مجھے اجرت بھی پوری چاہیے۔" اس کا مطالبہ ناجائز نہیں تھا۔ مگر ٹھیکیدار کو جانے کیوں اس کی اپنے حق میں اٹھاتی آواز مشتعل کر گئی۔

"اوئے تمیز سے بات کر لونڈے! ورنہ زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔"

"کیوں کھینچ لوگے زبان تم؟ زر خرید غلام ہوں تمہارا؟ سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔" اسے بھی غصہ آگیا۔ کھری کھری سنائیں۔ ٹھیکیدار نے تلملا کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور آس پاس کھڑے مزدور اس کے ایک اشارے پہ حرکت میں آگئے تھے۔ پھر ہر طرف سے اس پہ لاتوں کی گھونسوں اور تھپڑوں کی گویا بارش برسا دی گئی۔ اس طرح شاید وہ ٹھیکیدار کو اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔

"اوئے! تجھے جرأت کیسے ہوئی۔ ٹھیکیدار صاحب سے بدکلامی کرنے کی۔" مستقیم جتنا بھی شہزور اور بہادر ہوتا ' اتنے آدمیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں اس کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔

اس واقعے کے بعد وہ ایک بار پھر بہت بددل ہوگیا اور یہ اس کی ذہنی ابتری ہی تھی کہ ایسے لمحوں میں جب ایک بار پھر ماکھے نے اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی تو وہ ہمیشہ کی طرح انکار نہیں کرسکا۔ یہ نہیں تھا کہ دنیا سے اچھے لوگوں کا خاتمہ ہوگیا تھا یا اچھائی رخصت ہوگئی تھی۔ مگر شاید قسمت اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی تھی۔ ماکھے نے اسے سمجھایا تھا۔

"دیکھ! دنیا بہت خراب ہے۔ بنا جرم کے تجھے مجرم بنا دیا۔ تجھے لوٹا۔ اب تو وہی انداز اپنا لے۔ اگر جینا چاہتا ہے تو۔۔۔"

اور اس نے مایوسی کی انتہائی کیفیت میں اس راستے کو اپنا لیا ' جس پہ نہ چلنے کے اس نے خود سے عہد باندھے تھے۔ اب اگر اسے اپنایا تھا تو اسے لمحہ بھر کا بھی ملال نہیں تھا۔ وہ دنیا کو وہی لوٹانے جا رہا تھا جو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی دیا گیا تھا۔ اسے اب اس بات پہ دکھ اور افسوس بھی نہیں تھا کہ معاشرے کی ناانصافیوں اور انسانی رویے کی بدصورتی نے اس سے اس کی سادگی معصومیت چھین لی تھی۔ اس کی شرافت کو اس کی کمزوری اور بزدلی سے تعبیر کیا گیا تو اسے شرافت اور نرمی سے نفرت ہوگئی۔ اس معاشرے کو شرافت کی زبان سمجھ میں نہیں آئی تو اس نے ہاتھ میں ڈنڈا پکڑ لیا۔

☼ ☼ ☼

ماکھا اپنے علاقے کا بدمعاش تھا ' جگا ٹیکس وصول کرتا اور چھوٹی موٹی چوریاں کیا کرتا۔ کبھی کسی سے موبائل چھین لیا ' کبھی کسی راہ گیر کو کسی سنسان جگہ پہ گھیر کر ریوالور دکھا کر پیسے نکلوا لیے۔

مستقیم بھی اس کے نقش قدم پہ چلنے لگا۔ کیا ٹھاٹھ کی زندگی تھی ' وہی لوگ جو کبھی اسے آنکھیں دکھاتے تھے اب اس سے دہشت کھانے لگے ' بدکنے لگے۔ وہ جہاں سے گزرتا لوگ راہ بدل لیتے۔ کس میں جرأت تھی کہ اس کے سامنے آنکھ اٹھاتا۔ ماکھے کے اور بھی ساتھی تھے جو اس کے انڈر تھے۔ راجو ' حسام ' سالار ' امانت ' یہ بھی کم و بیش مستقیم جیسے حالات کا ہی شکار نوجوان تھے۔ مگر ماکھا اسے بے حد خاص سمجھتا تھا۔ سب جانتے تھے وہ اس کا چہیتا ہے۔ ماکھے کے تعلقات بہت بڑے بڑے لوگوں سے تھے۔ ہر تیسرے دن ان کی بیٹھک میں محفلیں جمتیں۔ پھر وحشیانہ کھیل رچایا جاتا ' جس میں مستقیم نے ماکھے اور امانت کے اصرار کے باوجود کبھی شامل ہونے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ماکھے کے بعد امانت تھا ' جس سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ پڑھا لکھا بھی تھا۔

وقت کچھ اور آگے سرکا۔ مستقیم نے ماکھے سے اسلحے کے استعمال اور کراٹے وغیرہ کی تربیت حاصل کی۔ وہ چیتے کی طرح پھرتیلا اور لومڑی کی طرح عیار تھا۔ ماکھے نے اپنا سارا ہنر مستقیم میں منتقل کر دیا۔ شیر جیسی طاقت تو اس میں موجود تھی۔ ماکھے نے اسے اپنا بھی دامان لیا۔

اور جب ایک پولیس مقابلے میں ماکھا جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو اس کے تمام ساتھیوں کی متفقہ رائے سے مستقیم کو ماکھے کی جگہ سردار کی حیثیت دے دی گئی۔

☼ ☼ ☼

مستقیم نے ماکھے کے اسٹائل کو چھوڑ کر اپنے اسٹائل میں ڈکیتی شروع کی۔ اس نے دو بار بینک لوٹے۔ اس کا شکار ہمیشہ بڑے بڑے جاگیردار اور سیٹھ ہوتے تھے۔ اس نے محدود سے عرصے میں اپنے ساتھ اپنے ساتھیوں کو بھی مالا مال کر دیا تھا۔ پچھلے دنوں پولیس بہت الرٹ تھی۔ ایک ' دو بار تو وہ بال بال بچے تھے۔ مستقیم نے دانستہ ان دنوں کوئی واردات نہیں کی۔ مگر پھر ساتھیوں کے اصرار پہ مستقیم نے ایک نسبتاً" چھوٹے درجے کی واردات کی تھی ' وہ بھی شہر سے یکسر الگ تھلگ ایک قصبے میں ' مگر وہیں سے اس کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا تھا۔

وہ جو عورت کے وجود سے بھی الرجک تھا۔ جانے کیا تھا اس نازک بدن ' بے انتہا خوب صورت اور باوقار سی لڑکی میں کہ وہ اپنی زندگی کا دوسرا بڑا فیصلہ اتنا اچانک کر گیا ' جس نے اس کی زندگی بدل کے رکھ دی تھی۔ دیبا کی محبت اسے اپنے روم روم میں بسی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایسی مقناطیسی کشش کہ وہ بے اختیار ہوجاتا۔ اس کے باوجود کہ وہ اس سے نفرت کرتی تھی ' اسے دیبا کا تنفر برا نہیں لگتا تھا۔ وہ اسے اس کے ہر رویے میں برحق سمجھتا تھا ' مگر ابھی جو کچھ ہوا تھا اس کے اندر ایک ساتھ بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے پھر اسی مقام پہ کھڑا تھا ' جب ابو نے اسے ایک چور لٹیرا سمجھتے ہوئے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس دکھ سے تو وہ نکل آیا تھا ' مگر اس کرب کے سمندر سے شاید کبھی نہ نکل پاتا۔ حقیقت کی کرختگی اور سفاکی اسے کند چھری سے ذبح کر رہی تھی۔

اس کا جی چاہا ' زندگی کی اتنی اہم بازی ہار جانے پہ وہ بچوں کی طرح سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روئے۔ اس نے تو ایک بچے کی طرح سے دیبا کے آنچل میں پناہ ڈھونڈی

تھی۔ سکھوں، خوشیوں، سکون کی چاہ لے کر، لیکن اس نے اپنا آنچل ہی سمیٹ لیا تھا۔ اسے ایک بار پھر اپنا وجود حالات کی کڑی دھوپ سے جھلستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کتنی چاہ سے اس نے دیا کے ہمراہ ایک نئی زندگی، نئے آشیانے کی بنیاد رکھی تھی، مگر اسے لگا تھا، زندگی کی بساط پہ ایک بار پھر اس کے مہرے پٹ گئے ہوں۔

☼ ☼ ☼

دیا نے کروٹ بدل کر دروازے سے باہر نگاہ کی۔ وہ ابھی تک اسی کیفیت میں ساکن کھڑا تھا جیسے پچھلے چھ، سات گھنٹوں سے۔ پتا نہیں، وہ تھکتا نہیں تھا یا خود اذیتی کا شکار ہو تا تھا۔ وہ مضطرب ہو گئی۔ موسم بہت سرد تھا۔ اسے ٹھنڈ لگ سکتی تھی۔ اسے حیرت نہیں ہوئی کہ اسے اس کی فکر ہو رہی ہے۔

"مستقیم! کیوں کھڑے ہیں یہاں؟ اندر چلیں، لیٹ جائیں ذرا۔" وہ اٹھ کر اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ اپنا نازک ہاتھ اس کے بازو پہ رکھا۔

سگریٹ کے کش لیتے مستقیم نے اپنی دہکتی لو رنگ آنکھوں سے ایک نگاہ غلط انداز اس پہ ڈالی اور پھر سے تاریکیوں میں کچھ گھورنے لگا۔ انداز تخاطب تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ تم سے آپ کے درجے پہ فائز ہوا تھا۔ یہ معمولی انقلاب نہیں تھا۔ مگر وہ غور کرتا تو سمجھتا۔ وہ تو اس پل خود سے بھی روٹھا ہوا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہوں میں؟ سن کیوں نہیں رہے؟" اب کی مرتبہ دیا اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"تم سو جاؤ۔ جا کے میری فکر چھوڑ دو۔" اس کی آواز بے حد بھاری تھی۔

"نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ باہر ہیں تو مجھے نیند نہیں آ رہی۔" وہ کچھ لاچاری سے بولی۔ یہ بھی عام بات نہیں تھی، مگر وہ پھر بھی نہیں چونکا۔

"تمہیں میری موجودگی میں بھی نیند نہیں آتی، میرے خراٹوں کی وجہ سے۔"

"اب آجاتی ہے۔ میں عادی ہو گئی ہوں۔"

مستقیم نے کش لیتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ پہلی بار اس نے نگاہ نہیں چرائی۔ بلکہ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچ کر نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔

"تم نے میڈیسن یوز کی؟"

"نہیں۔۔۔ اور کروں گی بھی نہیں۔"

"کیوں؟" وہ اسے گھورنے لگا۔ وہ بدستور مسکراتی رہی۔

"اس کا جواب میرے پاس ہے تو، مگر میں دوں گی نہیں۔ آپ خود سوچیں۔" وہ کہہ کر اندر جانے کو مڑی تھی، جب مستقیم نے ایک دم سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم اس گناہ سے بچنا چاہتی ہو گی، مگر واضح رہے اس گناہ کو کیے بغیر تم اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتیں۔" وہ تنک کر بولا۔ دیا نے گہرا سانس بھرا۔

"یہ وجہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا وجہ ہے بتاؤ مجھے؟" وہ ضبط کھو کر چیخ پڑا۔

"شاید مجھے اس دنیا میں آنے والے بچے کے باپ سے محبت ہو گئی ہے۔" اس نے شرما کر کہا اور ہاتھ چھڑا کر اندر دوڑ گئی۔

مستقیم ایک پل کو ہونق ہوا، پھر اگلے لمحے اس کے حلق میں کڑواہٹ بھر گئی تھی۔ وہ تنتناتا ہوا اندر آیا تو دیا بستر پہ بیٹھی تھی۔ ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھیں۔

"جھوٹ بولتی ہو تم۔ بکواس کرتی ہو۔ مگر سنو! مجھے اس دھوکے میں پڑنے کی ضرورت نہیں سمجھیں۔" اس کا چہرہ اپنے فولادی ہاتھ میں بھینچ کر وہ ایک دم ہذیانی انداز میں چلانے لگا۔

دیا نے مزاحمت نہیں کی۔ بہت سکون سے اسے دیکھتی رہی تو مستقیم نے جھنجلا کر اسے جھٹک دیا تھا اور خود زور زور سے پیر مارتا پھر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

دیا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، وہ ایسا کیا کرے کہ مستقیم اس کٹھن راہ سے پلٹ آئے۔ کرسٹل جیسی

فطرت تہہ در تہہ گناہ کے احساس سے ۔۔۔ تھی اور برسوں کی تربیت کے سارے ۔۔۔ قہر اور طیش کی زد میں ڈوب گئے۔ ۔۔۔ اس کے بارے میں کچھ بھی نہ جان پاتی، اگر کل ۔۔۔ کی صفائی کے دوران مستقیم کی ذاتی ڈائری اسے ۔۔۔ ہوتی، جس میں اس کے وہ سارے دکھ رقم ۔۔۔ اصل اور صحیح راستے سے ہٹانے کا محرک ۔۔۔ چند لمحوں کو تو وہ خود بھی گم صم ہو گئی تھی۔ ۔۔۔ معنوں میں اسے مستقیم سے ہمدردی محسوس ہوئی ۔۔۔ کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے کچھ دیر انتظار ۔۔۔ پھر اس کی تلاش میں باہر آ گئی۔ وہ ساتھ والے ۔۔۔ میں موجود تھا۔ فرشی بستر پہ چت لیٹا دونوں بازو ۔۔۔ دھرے۔ دیا کو اس کا انداز کچھ اور بھی ۔۔۔ کر گیا۔

"مستقیم! آپ کمرے میں کیوں نہیں آئے؟" وہ ۔۔۔ کے نزدیک بیٹھ گئی۔ مستقیم چونکا، پھر سپاٹ سے ۔۔۔ انداز میں بولا۔

"میری مرضی۔"

"کیا بات ہوئی؟ پلیز! اٹھیں یہاں سے۔" اس ۔۔۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو مستقیم کو ایک دم غصہ ۔۔۔

"مجھے تنگ مت کرو دیا! جاؤ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"تو آپ نہیں آئیں گے؟"

"کہا نا نہیں آؤں گا۔" وہ نروٹھے پن سے بولا تو دیا ۔۔۔ اس کے برابر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہے! پھر میں بھی یہیں رہتی ہوں۔" اس ۔۔۔ میں اطمینان تھا جس سے وہ جھنجلانے لگا۔

"۔۔۔ پھر میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔" وہ غصے ۔۔۔ دیا نے ایک دم اس کی کلائی دونوں ہاتھوں ۔۔۔

"۔۔۔ رہے ہیں مجھ سے؟" اس کی آنکھوں میں ۔۔۔ تھی۔

"۔۔۔ نہیں۔۔۔ تمہارے جھوٹ سے۔" وہ ۔۔۔ دیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخیاں تھیں۔

"کون سا جھوٹ بولا ہے آپ سے؟" وہ بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی۔

"تم جانتی ہو۔" وہ نروٹھے پن سے کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ یہ جھوٹ ہے؟" وہ ایک دم روہانسی ہو گئی۔

"جواب میں" وہ خاموشی سے اسے گھورنے لگا۔

"آپ خائف کیوں ہیں محبت سے؟ میں نے آپ کی ڈائری پڑھ لی ہے۔ سارے حالات جانتی ہوں تو آپ بے قصور لگے مجھے۔" اس نے وضاحت کی تو وہ زہر خند سے مسکرایا۔

"پھر تم اسے ہمدردی کا نام دے سکتی ہو، محبت کا نہیں۔" دیا ایک دم لاجواب ہو گئی۔ مستقیم کی آنکھوں میں طنز ابھر آیا۔ گویا کہہ رہا ہو میں غلط تو نہیں سمجھ رہا تھا۔

جبکہ وہ سوچ رہی تھی۔ اس کی احساس محرومی سے شکستہ شخصیت کو دوبارہ سے نکھارنا اور ان پیچیدہ راستوں سے ہٹا کر پھر سے حق اور سچ کے راستوں پہ لانا اتنا آسان تو نہیں تھا۔ وہ جس بھنور میں پھنسا ہوا تھا، اس سے نکلنا اگر ناممکن نہ بھی ہو تو بھی مشکل ضرور تھا۔

"آپ نے اپنی امی کو بھی ابھی تک معاف نہیں کیا؟" مستقیم نے ایک سرد آہ بھری۔ سر کو نفی میں جنبش دینے لگا۔

"نہیں! وہ ایک وقتی احساس تھا۔ میں سمجھتا ہوں اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو شاید دنیا کی ہر عورت سے میرا ہمیشہ کے لیے اعتبار اٹھ گیا ہوتا۔ آج تم بھی میری زندگی میں شامل نہ ہوتیں۔ میرے لیے ہر عورت بے وفا ہوتی۔"

"شکر ہے، آپ کی سوچیں تو ابھی تک مثبت ہیں۔" وہ ہلکی پھلکی ہو کر مسکرائی۔ پھر اپنی دونوں کہنیاں اس کے سینے سے ٹکا کر اس پہ جھکتی ہوئی کس قدر شرارت سے بولی۔

"اگر کسی روٹھے ہوئے کو منانا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟" مستقیم نے نظریں اٹھا کر اس کی ستاروں کی مانند چمکتی دمکتی آنکھوں کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر اپنے جسم کو ایک دم جھٹکا دیا۔ وہ بے توازن ہوئی اور پوری کی پوری اس کے اوپر آگری۔ ایسے بے حد نزدیک آکر۔

وہ اس کی بوکھلاہٹ کو محسوس کر کے زور سے ہنسا اور پھر دیا کی جھینپی ہوئی ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔ اس نے جان لیا تھا کہ دل کی زمین ایک بار بنجر ہو جائے تو پھر کوئی موسم پھول کھلانے نہیں آتا۔ چاہے آنے والا وقت کتنی ہی مہربانیاں کرے، کوئی کتنی ہی دلداریاں کرے، دل میں جو جذبے مرجائیں، وہ پھر زندہ نہیں ہوتے اور اسے اس کے دل کو مرنے سے بچانا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ اس کی آخری آس تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچ رہی ہو؟" بستر کی چادر کے ڈیزائن پہ بے خیالی میں انگلی پھیرتے ہوئے وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھی۔ جب مستقیم نے اسے چونکایا۔ وہ پلکیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر ایک گہرا سانس کھینچا۔

"مستقیم! آپ کو نہیں لگتا، ہم ایک نارمل زندگی نہیں گزار رہے؟ مجھے بہت گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔

آپ کو زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی؟" اس نے بات کرتے کرتے ایک سوال داغ دیا۔ مستقیم کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔

"پہلے ہوتی تھی، جب تک تم نہیں تھیں۔ اب میں مکمل طور پہ آسودہ ہوں۔ کچھ ٹائم ہے بیچ میں، پھر ہمارا بچہ بھی ہو گا۔" دیا جھینپ سی گئی۔ اس کی لانبی پلکیں حیا سے لرزنے لگیں۔

"میرا مقصد آپ کے دیگر رشتوں سے تھا۔ آپ کی امی اور... اور... ابو... ہم ان سے مل تو سکتے ہیں نا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ مستقیم کے چہرے پہ پتھریلی سنجیدگی چھا گئی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ دیا گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

شام کے وقت وہ سو گئی تھی۔ جب ہی رات کا کھانا بناتے دیر ہو گئی۔ ہربائی دم پہ لگا کر وہ کس قدر تھکان محسوس کرنے لگی۔ آج کل وہ بہت تھوڑا سا کام کر کے بھی ہانپ جاتی تھی۔ اس وقت بھی ذرا کمر سیدھی کرنے کے خیال سے کمرے میں آئی تھی۔ جب مستقیم کی تیاری دیکھ کر آرام کو سرے سے بھول گئی۔

"کہیں جا رہے ہیں آپ؟" بلیک جینز شرٹ میں اس کا لمبا قد بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی، جب وہ لوگ ڈاکے کی نیت سے نکلتے، تب ہی سیاہ لباس استعمال کرتے تھے۔ اس کا دل سینے میں اودھم مچانے لگا۔ آج وہ امتحان کی گھڑی آگئی تھی، جب اسے خود کو استعمال کرنا تھا۔ جس کے لیے وہ کئی دن سے نہ صرف خود کو تیار کر رہی تھی، بلکہ خائف ہونے کے ساتھ منتظر بھی تھی۔

"تمہیں پتا تو ہے یار! پھر فائدہ ایسے سوالات کا؟" مستقیم نے ریوالور کے چیمبر میں گولیاں چیک کیں اور اسے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھنے لگا۔

"ایک بات مانیں گے؟" وہ ایک دم اس کے سامنے آگئی۔

"بولو!" مستقیم نے مسکرا کر گویا اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"آج کہیں مت جائیں، میرے پاس رہیں پلیز!"

"کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟" مستقیم ایک دم متفکر ہونے لگا۔

"ہاں! ٹھیک ہوں، بس رات کو تنہائی کے خیال سے وحشت ہوتی ہے۔"

"تم دوا لے کر سو جانا۔ میں اتنے ... تمہارے ساتھ ہی تو تھا۔" وہ نرمی و محبت سے اس کے گال کو سہلا کر بولا۔ دیا نے بے چین نظروں سے دیکھا۔

"میں ہمیشہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، مستقیم!" وہ اس کے بازو سے لگ کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ مستقیم اندر تک نہال ہو گیا۔

"میں تم سے دور ہو کر بھی تمہارے پاس ہوتا ہوں ڈونٹ وری۔ مگر جانو! کام کو بھی تو وقت دینا ہوتا ہے نا۔"

"آپ... آپ یہ کام چھوڑ دیں مستقیم! میرا دل کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

"یہ چھوڑ دوں تو پھر اور کیا کروں۔" وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔

"کچھ بھی... کچھ بھی... لیکن یہ نہیں... پلیز... پلیز مستقیم!" وہ باقاعدہ رونے لگی۔ مستقیم کے اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔

"میں ایک ان دیکھے جال میں پھنس چکا ہوں دیا! جس سے چاہوں بھی تو رہائی ممکن نہیں۔"

"کچھ بھی ناممکن نہیں ہے مستقیم! آپ عہد تو کریں۔" اس کے انداز میں بے قراری تھی۔ مستقیم کے چہرے کے عضلات ایک دم تن گئے۔

"تم بے وقوف ہو۔ کچھ نہیں جانتیں۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"آپ میری بات نہیں مانیں گے؟" دیا نے کچھ مایوسی، کچھ خفگی سے اسے دیکھا۔

"مجبوری ہے... نہیں مان سکتا۔"

"ٹھیک ہے! پھر میں بھی آپ کی بات نہیں مانوں گی۔" وہ ایک دم بچوں کی طرح سے روٹھ گئی۔ مستقیم کو ہنسی آگئی۔

"نہ مانتا... میں زبردستی کر لیا کرتا ہوں، تم جانتی ہو۔" وہ شریر قسم کی مسکان سے بولا تو دیا کا چہرہ حجاب سے سرخ پڑ گیا۔ مستقیم نے بہت دلچسپی سے اس کے چہرے کے رنگوں کو دیکھا۔ پھر گہرا سانس بھر کے اسے ... تھام کر ... اچھا ... گیا۔ اپنی اس ناکامی پہ دیا کا دل بری طرح بھر آیا۔ وہ بے آواز رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

ایک بار پھر وہ کامیاب اور شاداں و فرحاں ہونے تھے۔ مگر دیا کا موڈ بے حد خراب تھا۔ اس کے خیال میں غلطی کرنا غلطی نہیں تھا، غلطی کو دہرانا غلطی تھا۔ مستقیم نے جتنی بار بھی اسے مخاطب کیا، وہ منہ پھلائے اس کی بات کو نظر انداز کر گئی۔ اب اس نے اپنی بات منوانے کا ایک دوسرا طریقہ سوچا تھا۔

وہ سب کمرے میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے، جب ہی وہ وہیں چلی آئی اور اپنی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتار کر امانت کے آگے رکھ دی۔

"امانت بھائی! اسے بیچ کر مجھے ایک کلہاڑی لا دیں۔" اس کے مطالبے پہ وہاں موجود سب ہی نفوس کے چہروں پہ تحیر و استعجاب اتر آیا۔ راجو کو تو باقاعدہ اچھو لگا تھا۔

"کلہاڑی؟" امانت نے اسی تحیر کے زیر اثر سوال کیا۔ جبکہ مستقیم کچھ خفا خفا سا ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا۔

"کیا کریں گی اس کا آپ؟" اس کے سر کو اثبات میں جنبش دینے پہ امانت نے جز بز ہو کر سوال کیا۔

"آج رات کا جب کھانا پکے تو اسے پہلے کسی کتے کو کھلا کر چیک کر لینا۔ ایسا نہ ہو یہ محترمہ ہمیں نیند کی دوا ملا کر سلائیں اور سوتے میں ہم ہی سے منگوائی کلہاڑی سے ہماری گردنیں اتار ڈالیں۔" راجو نے حسب عادت کلس کر کہا۔ امانت بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ جبکہ باقی سب ابھی بھی ہونق تھے۔

"بے فکر رہیں مجھے اگر ایسا کرنا ہوتا تو آلۂ قتل آپ سے منگوا کر آپ کو شک میں مبتلا نہ کرتی اور اطلاعاً عرض ہے میں اس طرح کے متعدد مواقع پا کر بھی اگر ایسا نہیں کر پائی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے بہر حال مجرموں کے بیچ رہ کر بھی گناہ اور ثواب کے فرق اچھی طرح ازبر ہیں الحمد للہ!" اس کا لہجہ آپ ہی آپ طنزیہ ہو گیا تھا۔ انہیں ان کے احساسات میں گھیر کر وہ جیسے آئی تھی، ویسے ہی پلٹ گئی۔

"کیا کرو گی تم اس کلہاڑی کا؟" مستقیم بیڈ روم میں آیا تو موڈ ہنوز آف تھا۔ دیا نے پروا نہیں کی۔ وہ خود بھی اس سے ناراض تھی۔

"جب کروں گی تو دیکھ لیجیے گا۔" اس نے رکھائی کا

مظاہرہ کیا۔

"تم مجھ سے بھی کہہ سکتی تھیں۔" مستقیم نے ناگواری سے کہا۔

"میں آپ سے خفا ہوں۔ میں آپ سے اب کچھ مطالبہ نہیں کروں گی۔" وہ درشتی سے بولی تو مستقیم اسے گھورنے لگا مگر وہ خائف نہیں ہوئی۔

"مقابلہ کرو گی میرا؟"

دیا نے کاندھے اچکا دیے۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ دیا گہرے گہرے سانس بھر کے خود کو نارمل کرنے کی سعی کرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کھانا نہیں کھایا نا؟" وہ کلہاڑی لیے بیٹھی تھی۔ جب مستقیم اس کے پاس آیا تھا۔

"کچھ پوچھ رہا ہوں؟" وہ زچ ہوا۔

"یہ ذریعہ معاش جائز ہے نہ حلال۔۔۔ اور میں حرام کا نوالہ منہ میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ یہ کلہاڑی اس لیے منگوائی ہے کہ اب میں جنگل میں لکڑیاں کاٹوں گی انہیں بیچوں گی۔ پھر ان سے حاصل شدہ رقم سے اپنے لیے کھانے کا انتظام کروں گی، کیونکہ میں۔۔۔" اس کی بات پوری نہیں ہو سکی۔ مستقیم جو اس کی بات کو حیرت سے سن رہا تھا، وہ حلق سے اُمڈنے والے قہقہے پہ قابو نہ رکھ سکا۔

"تم۔۔۔ یعنی تم لکڑیاں کاٹ کر بیچ کر پھر کچھ کھاؤ گی؟ یعنی اپنے زورِ بازو پہ؟" ہنسی بمشکل روک کر وہ سرخ پڑتا ہوا بولا۔ دیا کا چہرہ سبکی کے احساس سے دہکنے لگا۔ اس نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ سلگتی نظروں سے اسے گھورا تھا، پھر پھنکار کر بولی۔

"آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟" اس کا لہجہ بے حد تیکھا تھا۔ مستقیم بے اختیار گڑبڑایا، مگر مصنوعی انداز میں۔

"تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔ اتنی دھان پان سی ہو اور عزائم۔۔۔" وہ اس کی قہر بھری نگاہوں کو خود پہ جمے پا کر بھی دوبارہ ہنسنے لگا۔

"میرا وجود جتنا بھی کمزور اور نازک ہو، مگر میرے ارادے بہت مضبوط ہیں۔ میں آپ کو ایسا کر کے دکھاؤں گی۔" اس نے دوٹوک اور قطعی انداز میں کہا۔ مستقیم بھی کس قدر سنجیدہ ہوا تھا اور ہاتھ اٹھا کر درشتی سے بولا۔

"بس! بہت ہو گیا مذاق۔ یہ کچھ دوائیں اور پھل وغیرہ ہیں۔ تمہیں ضرورت ہے اچھی خوراک کی اور۔۔۔"

"مگر میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ سنا نہیں آپ نے میں اپنے بچے کو حرام کی کمائی کا ایک نوالہ بھی کھا کر جنم نہیں دوں گی۔ تاکہ اس کی بنیاد حرام سے نہ ہو سمجھے؟" وہ اس کی بات کاٹ کر چیخ پڑی۔ مستقیم کے فراخ ماتھے پہ ایک شکن نمودار ہوئی۔

"اس سے پہلے بھی تم یہ سب کھاتی رہی ہو۔" اس نے جیسے جتلایا اور دیا کے چہرے پہ اضطراب چھا گیا۔

"ہاں! میں نے خود تو کھا لیا، مگر کہا ناں کہ اپنے بچے کی بنیاد حرام پر نہیں رکھوں گی۔" اس نے ہٹ دھرمی اور ضدی پن سے کہا تو مستقیم نے ہونٹ بھینچ کے اسے سرخ ہوتی آنکھوں سے دیکھا۔

"اب تم جھگڑا کرو گی مجھ سے؟"

"میں نہیں۔۔۔ آپ کریں گے۔ میں نے آپ کو فورس تو نہیں کیا نا؟ آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں اور میں اپنی۔"

"یہ مشقت طلب کام میرے بچے کو نقصان پہنچا دے، پھر؟" وہ بری طرح زچ ہوا تھا۔ دیا نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ مستقیم نے جھنجلا کر اسے شانوں سے جکڑ لیا۔

"کھانا کھاؤ دیا!" وہ ہونٹ بھینچے دوسری جانب دیکھتی رہی۔ وہ جھلانے لگا۔

"نہیں مانو گی؟" اس نے خاصی تاخیر سے سوال کیا تو دیا نے فی الفور سر کو نفی میں ہلا دیا۔

"جہاں تک میری بات تھی، میں نے خود کو ... کر لیا۔ اولاد کے بارے میں تو کمپرومائز میں ...

فیصلے سے یوں ہی ٹکرا جاؤں گی۔ پہلے مجھے اپنی ... کا خوف تھا۔ اب کیا کرو گے تم۔ مار دو گے ..." اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ... میں کوئی ردعمل ظاہر کرتا، امانت بدحواسی میں ... اندر آیا تھا۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے جو اطلاع دی تھی اسے سن کر مستقیم بھی ایک دم بوکھلا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ سجدے میں سر جھکائے سسک سسک کر بے حال تھیں۔

"برس ہا برس گزرے ایک ہی دعا، ایک ہی التجا ... سات سالوں میں تو کوڑے کے ڈھیر کا نصیب بھی بدل جاتا ہے۔ میرے اللہ! میرے مولا! میں کوڑے کی ڈھیری سے بھی حقیر ہوں تیری نگاہ میں جو معافی کا اشارہ نہیں ملتا۔ دعا کی مقبولیت کی نوید نہیں ملتی۔" ان کی ہچکیاں بندھ رہی تھیں۔ جب ان کے ... عبدالماجد کے مہربان ہاتھ کا لمس پڑا تھا۔

"بس کرو بیگم! حوصلہ کرو، خدا سے شکوہ نہیں کرتے۔ اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں۔" یہ ... شوہر تھے جنہوں نے ہمیشہ طنز کے تیر برسائے تھے۔ جب بھی بات کی تھی، لہجے میں بےزاری یا سرد مہری ہوا کرتی۔ ایک طرح سے بہت کڑی زندگی گزاری تھی انہوں نے شوہر کی ہمراہی میں۔ ہر لمحہ ... ہر گھڑی ہراس کے ساتھ۔ کب کہاں کون سی ... ناگوار گزر جائے۔ مگر اب وہ بھی بدل گئے تھے۔ ... بھر کی کمائی تھا وہ۔ ہمیشہ اسے غیر کی نگاہ سے ہی ... کبھی بیٹے کی طرح چاہا ہی نہ تھا۔ پتا نہیں کیسا ... تھا ان کا کہ ہر وقت چڑتے رہتے۔ وہ ذرا سہما سا ... کبھی خاص اور اہم لگا ہی نہ تھا مگر جب اسے ... تب ایک دم جیسے خالی ہو گئے۔ خالی دامن، خالی ... اور خالی گھر۔ کیسے کیسے ارمان جاگ اٹھے تھے ... بسانے، اس کی اولاد کو کھلانے کے۔ ایک ہی ... مگر ملال تھے کہ ختم ہی نہ ہوتے۔

یہ کیا کر بیٹھے وہ۔۔۔ کیسے اپنے پیروں پہ خود کلہاڑی مار بیٹھے، عمر بھر کی کمائی اپنی نادانی سے گنوا دی اب اس کی بےگناہی تو ثابت ہو ہی چکی تھی۔ مگر وہ تو مجرم تھے اس کے۔ باپ، جو اولاد کی زندگی میں اہم اور خاص مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے کیا کردار ادا کیا، پڑھے لکھے ہو کر بھی۔

وہ سوچتے اور اپنی گردن پہ آہنی حلقہ محسوس کرتے۔ کیا کوئی ایسا ذریعہ تھا کہ وہ ازالہ کر سکتے؟ وہ خود کو بےبس پاتے تھے کہ چڑیاں کھیت چگ کر اڑ چکی تھیں۔ اب صرف ملال تھے۔ وہ ایسے دل برداشتہ تھے کہ کہیں سکون نہ پا کر خدا سے لو لگا لی۔ دن رات ایک ہی التجا، ایک ہی گزارش آنسوؤں کے نذرانے کے ساتھ اس مالکِ حقیقی کے حضور پہنچاتے اور ندامت سے آنسو بہاتے رہتے۔

"میں مجرم ہوں اس کا۔ خدا بھی مجھے نہیں بخشے گا۔ اگر میں نے اس سے معافی نہ مانگی اور۔۔۔ کہاں ڈھونڈوں اسے۔"

"نہیں! آپ نہیں، مجرم تو میں ہوں اس کی۔ آپ کا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ سے ایسا تھا۔ ہرٹ تو میری وجہ سے ہوا وہ۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے؟ کیوں اسے وہ سب کہہ ڈالا۔" ان کے رکے ہوئے آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے۔

"اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ لگتا ہے خدا بھی ہم سے خفا ہو گیا ہے۔ کوئی دعا اثر نہیں کرتی۔" وہ خود بھی بکھرنے لگے اور پھر وہ دونوں دیر تک اس کی باتیں اور یادیں دہراتے رہے۔

☼ ☼ ☼

سلائی مشین کی گھرر گھرر کی آواز ایک تسلسل سے اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی اور وہ مضطرب ہو کر کروٹوں پہ کروٹیں بدلنے لگتی۔ حالانکہ ڈاکٹر نے سختی سے اسے زیادہ حرکت کرنے سے منع کیا تھا۔ اس روز پولیس نے ان کے ٹھکانے پہ ریڈ کیا تھا اور جب پولیس ان کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی اس کے

ساتھی بھرپور مزاحمت کر رہے تھے۔ فائرنگ کی آواز سے پورا جنگل گونج رہا تھا اور امانت کی ایک ہی رٹ تھی۔

"تم بھابھی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

اور مستقیم کو ہرگز بھی یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ اس مشکل گھڑی میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ جائے۔ جب ہی صاف انکار کر دیا مگر امانت مستقل مصر تھا۔

"بھابھی کی پوزیشن ایسی ہرگز نہیں ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو مستقیم! ہم گرفتار ہوئے تو ان کا کیا ہوگا؟ ہماری پولیس کی کمینگی سے آگاہ ہو تم۔ ہماری فکر مت کرو۔ ہم جیتے جی گرفتاری نہیں دیں گے۔ پچھلا راستہ ابھی تک محفوظ ہے تم وہاں سے نکل جاؤ بھابھی کو لے کر۔"

اور مستقیم کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کڑے وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑنا پڑا تھا۔ جس پل اس نے ہراساں و متوحش دیا کو دیکھا تھا اس کی نگاہوں کی التجا کو رد نہیں کر سکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی سطح پہ بے بسی نمی کی صورت پھیل رہی تھی اور پھر وہ دیا کے ساتھ وہاں سے نکل آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مستقیم نے اپنا حلیہ یکسر تبدیل کر لیا تھا۔ شلوار قمیص کی جگہ جینز شرٹ اور داڑھی مونچھ صاف کرا کے وہ کلین شیو اور آرمی کٹ میں ایک بالکل بدلے ہوئے روپ میں تھا۔ اس کے باوجود اسے پہچان لیے جانے کا دھڑکا ہر پل ستایا کرتا۔

یہ ایک غیر معروف سا قصبہ تھا۔ جس مکان کو اس نے کرائے پہ حاصل کیا تھا' وہ بستی سے الگ تھلگ تھا۔ اطراف میں وسیع کھیتوں کے سلسلے تھے اور سامنے درختوں کے درمیان گھری نہر۔ مستقیم کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس کڑے وقت میں بھی مستقیم نے وہاں سے آتے ہوئے افراتفری میں سی نوٹوں کی گڈیاں اٹھا کر اپنے لباس میں چھپالی تھیں۔ اب بھی اس کا ارادہ اسی پیسے پہ عیش کرنے کا تھا مگر دیا کی ضد کے آگے ہار کر وہ اس روز کسی کام کے ارادے سے نکلا تھا کہ روڈ کراس کرتے ہوئے اس کا بہت شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس کا بازو اور دائیں ٹانگ بری طرح متاثر ہوئی تھی۔

چار دن اسپتال میں گزار کر وہ گھر آیا تو دیا کو اس نے ایک بدلے ہوئے روپ میں پایا۔

"تم تو سخت مایوس ہوئی ہو گی۔۔۔ ہے نا؟ میں مرتے مرتے پھر زندہ بچ گیا۔ جان ہی نہیں چھوٹ رہی تمہاری۔۔۔ اوپر سے یہ رہی سہی کسر میری معذوری نے پوری کر دی۔" وہ اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلا رہی تھی جب مستقیم نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا۔ دیا کے دل پہ جیسے گھونسا لگا۔ اس نے خفا خفا سی نظر اس پہ ڈالی اور سوپ کا پیالا واپس رکھ دیا۔

"آپ ابھی تک مجھے سمجھے نہیں؟"

"میں کسی کو بھی کچھ نہیں سمجھ سکا۔ ساری زندگی میں نے بس جھک ماری۔ تمہیں پتا ہے امانت پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ راجو پولیس کی حراست میں ہے اور حسام فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتی پھرتی ہے۔ تمہاری ضد کہ میں محنت کی روزی کما کر تمہیں کھلاؤں۔ سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔" وہ جھلا کر بولتا چلا گیا۔ دیا نے گہرا سانس کھینچا۔

"فی الحال آپ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ میں نے یہاں کی خواتین سے سلائی کی بات کی ہے۔ دادی غلط نہیں کہتی تھیں۔ ان کی دور اندیشی آج میرے کام آ رہی ہے۔ ہاتھ میں ہنر ہے۔ میں اسی ہنر کو روزی کا وسیلہ بناؤں گی۔ میں تھکنے والوں میں سے نہیں ہوں مستقیم! مجھے ہمت نہیں ہارنی۔ بس مجھے آپ کا ساتھ چاہیے۔ میرا ساتھ دیں گے؟" اس نے اپنی بات کے اختتام پہ آس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر یونہی بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ چہرے کا رخ پھیر لیا۔ دیا کے چہرے پہ ایک رنگ سا گزر گیا مگر وہ ہار تسلیم نہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

مستقیم کی زندگی میں آنا ازل سے طے شدہ امر تھا۔ وہ تو ایک بھٹکے ہوئے راہی کو راہ پہ لانے کا وسیلہ بنی تھی۔ وہ بڑی استقامت سے حالات کے سامنے ڈٹ گئی تھی۔ وہ نازک سی لڑکی جو پہلی مرتبہ زندگی کا مرحلہ طے کر رہی تھی۔ جسے خدا نے مشکل راستے کا راہی بنانے سے قبل مضبوط حوصلے پہلے عطا کیے تھے۔ مگر وہ تو ان باتوں سے دور تھا جب ہی اس کے حوصلوں پہ حیران ہوا کرتا۔ اس روز بھی وہ سلائی کا کام نمٹا کر اس کے پاس ہی سبزی کی ٹوکری لے کر چلی آئی تھی تو وہ اسے دیکھ کر دکھ سے بولا۔

"مجھے اکثر اپنی خود غرضانہ سوچ پہ ندامت ہوتی ہے۔ کن دکھوں میں ڈال دیا تمہیں۔ ملال تو تمہیں بھی ہو گا؟" وہ جواباً مسکرا دی۔

"میں تقدیر سے شاکی نہیں ہوں۔ تقدیر اٹل ہوتی ہے اور آزمائش میں مبتلا کیے جانے والا تو اللہ کا مقرب اور پسندیدہ ہوتا ہے۔ میں نے اس بات کو ذرا دیر سے جانا مگر جب جانا تو پھر صبر بھی آ گیا۔ میں جان گئی میرے رونے پیٹنے سے یا غمزدہ رہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہو گا تو وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہے۔ دادی کہا کرتی تھیں جو آزمایا گیا' وہ خاص ہوا۔ میں بھی آزمائی گئی۔ یہ میرا امتحان ہے اور میں اس امتحان میں کامیابی کی خواہش مند ہوں لیکن مستقیم! مجھے آپ کا ساتھ اور آپ کا تعاون درکار ہے۔ ہم اپنے بچوں کو رزق حلال سے پروان چڑھائیں گے۔" اس کی خوش نما آنکھوں میں کتنے ہی جھلمل کرتے خواب تھے۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"سادہ سی آنکھوں کو خوابوں سے خالی کرنے کا حوصلہ کہاں تھا۔ یقیناً "نہیں"

"ضروری تو نہیں مستقیم! اگر دنیا ہمارے ساتھ برائی کرے تو ہم بھی برائی پہ اتر آئیں۔ اس طرح تو ہر طرف برائی کا راج ہو جائے گا۔ جبکہ رب کا حکم اچھائی کو پھیلانے اور برائی کو روکنے کا ہے۔" اس نے پھر آس بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ مستقیم اسے تکتا رہا پھر گہرا تھکن زدہ سانس بھر کے گویا ہوا۔

"میری خواہش زندگی کے ہر راستے پہ تمہارے ہم قدم چلنے کی ہے۔ میں تمہیں خفا نہیں کرنا چاہتا دیا! مگر لوگ یہ معاشرہ نہ تو کبھی میرے عیب ڈھکے گا نہ مجھے زندگی کو نئے سرے سے شروع کرتے دیکھ سکے گا۔ تم نہیں جانتیں یہ۔"

"آپ ایک بار عہد تو کریں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم واپس چلیں گے۔ آپ کے ابو امی کے پاس۔ میرے بابا اور امی سے بھی ملیں گے۔ آپ کو پتا ہے' اللہ جب مشکل راستے کسی کے نصیب میں لکھتا ہے تو اسے مضبوط حوصلے بھی بخشتا ہے۔" مستقیم نے سرد آہ بھری تھی۔

"واپسی کا یہ سفر بہت تکلیف دہ ہو گا۔ بہت پُرپیچ اور کٹھن مگر میں اسے اختیار کرنے کی کوشش اس لیے بھی کروں گا کہ اس کی منزل بہت پُرکشش ہے۔ میں گناہ کے راستوں پہ چلتے بہت تھک گیا ہوں دیا۔ اب اندھیروں سے روشنی میں آنے کی خواہش ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ گمراہی کے اس دورانیے میں میرا ضمیر کبھی بھی مطمئن نہیں ہو سکا اور یہ بھی کہ مجھے ان آنکھوں کی روشنی سے محبت ہے اور میں انہیں ہمیشہ روشن دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے ایک محبت بھری نگاہ اس کی آنکھوں پہ ڈالی اور مسکرا دیا تھا۔

دیا کے اندر ڈھیروں آسودگی اتر آئی۔ وہ اپنی کامیابی پہ سجدۂ شکر بجا لانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کامیابی جو اس کے رب کی ہی بخشی ہوئی تھی پھر شکرانہ تو اس پہ واجب تھا ناں۔

سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں۔ حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکا گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کا یک برس کی عمر میں سبین پھپھو کے بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ سبین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تایا فرقان کے بیٹے داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے' وہاں میجر احمد اس کی شکایت پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔ داور کی شادی میں سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کی غرض سے تعارف کرواتے ہیں۔ وہ ولیمہ والے دن حیا سے بیہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی' حیا کی عزت بچاتا ہے۔ ڈولی اور اس کا دوست پنکی حیا کو اکثر ہم مواقع پر ملتے رہتے ہیں۔ حیا یورپی یونین کی طرف سے ملنے والے اسکالرشپ پر اپنی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے کے ساتھ ترکی جاتی ہے۔ اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں اور ابو ظہبی ایئرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ ترک لڑکی ہالے ان کو ہر جگہ گائیڈ کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق مسز عبداللہ حیا اور ڈی جے کی

مکمل ناول

عوت کرتی ہیں۔ وہاں حیا کو پاشا کے متعلق پتا چلتا ہے۔ حیا جہان کے گھر جاتی ہے۔ جہان سرد مزاجی سے ملتا ہے 'تاہم سبین پھپھو بہت محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو سفید پھول ملتے ہیں۔ جہان خفا ہوتا ہے۔ جہان کو حیا کے ساتھ اپنے نکاح کا علم ہے۔ اپنے باپ کے غدار ہونے پر اسے شرمندگی ہے۔ ویلنٹائن کی رات حسب معمول حیا کو ملنے والے سفید پھولوں کے ساتھ کاغذ پر حیا کے دوست معتصم کو لیموں کا رس لگا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ کو تپش پہنچاتا ہے تو وہاں "اے آر پی" لکھا ہوتا ہے۔ حیا 'جہان اور ڈی جے جزیرہ بیوک ادا کی سیر پر جاتے ہیں۔ وہاں ایک بنگلے میں داخل ہو جاتی ہے 'جہاں اس کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک چیریٹی شو میں پاشا نے پہلی بار حیا کو دیکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ سفید پھول بھیجے تھے اور میجر احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو ہٹائی تھی۔ میجر احمد کرنل گیلانی کا بیٹا ہے 'جسے جہان کے ابا پھنسا کر ترکی چلے گئے تھے۔ پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب کبھی حیا کے راستے میں نہیں آئے گا اور اسے اس کا چیچ دے کر جانے دیتی ہے۔ حیا 'پاشا سے جہان کے ریسٹورنٹ کے لیے مدد مانگتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے جہان کے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت پچھتاتی ہے۔ ترکی میں ڈی جے مر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ حیا اور جہان بھی پاکستان آجاتے ہیں۔ جہان سے حیا کی والدہ کے علاوہ تمام لوگ سرد مہری سے ملتے ہیں 'تاہم آخر میں سلیمان صاحب کے دل میں بھی جہان کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مہوش کی شادی والے دن پنکی 'حیا کو ڈولی کی طرف سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا دیتا ہے 'جو ایک پہیلی سے کھلے گا اور جب تک وہ کھولے گی 'ڈولی اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ وہ چھ حرفی کوڈ کھولنے کی حیا بہت کوشش کرتی ہے 'جہان سے بھی کہتی ہے 'پھر ترکی لے جاتی ہے۔ ڈبا کھلوانے کے لیے حیا 'معتصم کی مدد لیتی ہے۔ ڈبے کا کوڈ یونانی مفکر ہر اقلیطس کے کسی فلسفے میں پوشیدہ ہے۔ مسز عبداللہ کے گھر سے نکلتے ہوئے کوئی اسے اغوا کر لیتا ہے۔ وہاں ایک روسی حیا کے سر پر گرم گرم ویکس ڈالتا ہے اور گرم سلاخوں سے اس کے بازو پر Who لکھ دیتا ہے۔ حیا 'عثمان شبیر کے بیٹے سفیر کو فون کرتی ہے۔ وہ پاشا کو اطلاع دیتا ہے اور حیا وہاں سے پاشا کے بنگلے پر پہنچ جاتی ہے جہاں عائشے اور بہارے اس کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مختلف پہیلیوں پہ رکھے گئے کوڈ والے وہ ڈبے عائشے اور بہارے بناتی ہیں۔ حیا کے اغوا سے سب بے خبر ہیں سوائے میجر احمد کے۔ میجر احمد حیا کو بتا دیتا ہے کہ وہی پنکی ہے اور ڈبے پر پہیلیاں بھی وہی لکھتا ہے۔ جہان حیا سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور روحیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ روحیل سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور روحیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ روحیل سے تصدیق کرتی ہے۔ وہ اقرار کر لیتا ہے کہ جہان کو گولی لگی تھی اور اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ ارم کی منگنی ہو جاتی ہے۔ عائشے اور بہارے کی غیر موجودگی میں حیا 'پاشا کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے۔ اسی وقت پاشا کا فون آتا ہے اور اس کے کمرے میں جانے پر حیا کو ڈانٹتا ہے۔

بہارے کا پزل باکس کھل گیا۔ اس میں سے نیکلس نکلتا ہے مگر وہ سمندر کی لہروں میں بہہ جاتا ہے۔ حیا کو پتا چلتا ہے کہ پاشا کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے 'جو بظاہر یونان میں ہے۔

پاشا اپنی سیکریٹری دیمت سے اپنے مسئلے پر مشورہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی اسے زبان بند رکھنے کے لیے اس سے ایک راز سے اپنی واقفیت بھی ظاہر کر دیتا ہے۔

جہان بیوک ادا آتا ہے۔ حیا اس کا پیچھا کرتی ہے مگر کچھ جان نہیں پاتی۔ اخبار میں چھاپنے کے لیے ایک کہانی وہ جہان اور پاشا کو سناتی ہے۔ جہان اسے شائع کروانے سے منع کرتا ہے جبکہ پاشا بھڑک اٹھتا ہے۔ پاشا بیوک ادا آتا ہے تو اسے حیا کا پزل باکس ملتا ہے۔ وہ اسے چھپا لیتا ہے۔ بہارے کو علم ہوتا ہے پھر جب عائشے گل اور حیا اسے ڈھونڈتی ہیں تو بہارے چپکے سے اسے لا کر دے دیتی ہے۔ اس پر پاشا بہارے سے ناراض ہوتا ہے۔

سلیمان صاحب ترکی آتے ہیں۔ حیا ہوٹل مرمرا میں ملنے جاتی ہے تو ان کے ساتھ ولید لغاری اور اس کا اپنے باپ ۔۔۔ حیا جہان کو فون کر کے بلا لیتی ہے۔ وہاں جہان اپنا تعارف حیا کے شوہر کی حیثیت سے کرواتا ہے۔ حیا اپنا

موبائل مرمت کرانے جاتی ہے تو دکان والا بتاتا ہے کہ اس کے فون میں ٹریسر لگا ہے۔ حیا اسے لگا رہنے دیتی ہے۔ سلیمان صاحب اپنی بہن کے ساتھ مل کر حیا اور جہان کی باقاعدہ منگنی کرتے ہیں۔

عائشے گل کے کہنے پر حیا اسکارف پہننا شروع کر دیتی ہے۔ ایک کافی شاپ میں پاشا سے سامنا ہوتا ہے۔ تو حیا اس کے کافی پھینک کر بھاگ جاتی ہے۔

ایک سیمینار میں شرکت کرنے کے بعد حیا باقاعدہ نقاب لینا شروع کر دیتی ہے۔ حیا کا پزل باکس کھل جاتا ہے مگر اندر ایک اور پہیلی نکلتی ہے۔ جس کے سلسلے میں وہ سسلی امانت نا کر جاتی ہے۔ وہاں اسے پاشا کا میسج ملتا ہے کہ پرکر گنگ میں ایک سرپرائز ہے۔ وہ سب چھوڑ کر وہ جہان کے ریسٹورنٹ پہنچتی ہے۔ وہاں پاشا اور جہان ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ حیا جہان کا پاشا سے تعلق نکلنے پر بے حد خفا ہوتی ہے اور ترکی چھوڑ کر فوراً "پاکستان آجاتی ہے۔

امامت لا کر سے حیا کو فلیش ڈرائیو ملتی ہے جو کسی پاس ورڈ سے کھلے گی۔ حیا کی سہیلی زارا اس کے حجاب لینے پر تنقید کرتی ہے۔ جہان کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ سبین پھپھو ان کی میت لے کر بائیس سال بعد پاکستان آئی ہیں۔ جہان دوسرے دن پاکستان پہنچا ہے۔ سبین پھپھو پاکستان میں مستقل رہنے کا فیصلہ کر لیتی ہیں۔ ارم کی منگنی کے فنکشن میں حیا حجاب لے کر شرکت کرتی ہے۔ اسے سب کی سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ فنکشن سے واپسی پر حیا 'جہان کو شروع سے لے کر اب تک اپنے ساتھ ہونے والے تمام واقعات سناتی ہے۔ جواباً "جہان بتاتا ہے کہ اس نے ہوٹل گرینڈ میں کچھ عرصہ کام کیا ہے اور وہ پاشا اور اس کے بھائی کو جانتا ہے۔ وہ دونوں سگے بھائی نہیں ہیں اور یہ بات آنے اور جہان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ فیملی کے جعلی پاسپورٹ بنانے میں تاخیر پر جہان سے پاشا کی تلخ کلامی ہوئی تھی جس پر حیا پاکستان آجاتی ہے۔ پاشا 'عائشے اور بہارے کو جعلی ناموں سے دوسرے ملک بھجوا رہا ہے۔

امریکا میں روحیل نے بدھسٹ عورت سے شادی کر لی۔ جہان اس بات سے واقف ہوتا ہے تاہم ایک احسان کے بدلے وہ اس کا پردہ رکھتا ہے۔ سلیمان صاحب کو اس بات پر ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ حیا ان کے آفس جانا شروع کر دیتی ہے۔ تایا فرقان اور زاہد چچا کو بہت برا لگتا ہے۔ ولید لغاری ان کے بزنس کا دس فیصد کا پارٹنر ہے۔ وہ ہیڈ آرکیٹیکٹ کے ساتھ مل کر ٹریڈ سینٹر کے نقشے میں جان بوجھ کر غلطی کرتا ہے۔ جس سے ٹریڈ سینٹر کے پروجیکٹ میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کا الزام سب حیا کے سر تھوپ دیتے ہیں تاہم وہ وینڈر سے مل کر سپلائی جاری کروا دیتی ہے۔ جس سے ان کا حالیہ پروجیکٹ متاثر ہو رہا تھا۔ فرخ کے ولیمہ والے روز حیا جب اپنے تایا زاد سے پردہ کرتی ہے تو تایا فرقان اس کے نقاب پر سخت تنقید کرتے ہوئے اسے خوب بے عزت کرتے ہیں۔ زاہد چچا بھی اس کی حمایت نہیں کرتے حتیٰ کہ فاطمہ بھی حیا کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔

جہان حیا سے دبے لفظوں میں گھر والوں کی حمایت کرتا ہے تو حیا سختی سے حجاب نہ اتارنے کا فیصلہ سناتی ہے۔ جہان بغیر کچھ کہے چلا جاتا ہے۔

جہان کے چلے جانے پر سب حیا کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ حیا کی دوستیں اس کے نقاب کی وجہ سے اس سے دور ہو گئی ہیں۔ ارم دوبارہ حیا سے اس کا موبائل مانگتی ہے۔ حیا اپنے ڈرائیور کا فون اسے دے دیتی ہے۔ بعد ازاں ڈرائیور کے موبائل سے وہ نمبر اپنے پاس بھی محفوظ کر لیتی ہے۔ ارم کی زبانی حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان کے حیا سے ناراض ہو کر چلے جانے پر عابدہ چچی اپنی بیٹی سحرش کی جہان سے بات چلانے کے چکر میں ہیں۔

حیا فلیش ڈرائیو کا پاس ورڈ بوجھ کر فائل کھول لیتی ہے۔ اس ویڈیو فائل میں جہان کو دیکھ کر حیا چونک جاتی ہے۔ ویڈیو میں جہان حیا کو مخاطب کر کے بتاتا ہے کہ جہان 'ڈولی 'میجر احمد اور عبدالرحمن پاشا ایک ہی شخص کے چار حوالے ہیں۔ اس بات سے عائشے گل اور بہارے بھی واقف ہیں۔

جہان نے حیا کو چیریٹی شو میں دیکھا تھا۔ وہاں وہ اپنے دوست حماد کی بیوی ثانیہ سے ملنے گیا تھا۔ ثانیہ نے جہان کا کوئی خفیہ کام کیا تھا۔ ان کی ملاقات اسی سلسلے میں تھی۔ جہان 'ثانیہ کو حیا کے بارے میں مختصراً "بتاتا ہے۔ جہان کے والد ترکی میں تھے۔ انہوں نے غداری کی جس کی وجہ سے ترکی میں جہان کے دادا اور ممی کو کافی مشکلات برداشت کرنا پڑیں۔ جہان اپنے دادا کے بہت قریب تھا۔ جہان کے ابا اور دادا میں ایک روز شدید جھگڑا ہوتا ہے۔ دادا دل برداشتہ ہو کر مر جاتے ہیں۔

انطاکیہ میں جہان کے ابا ایک پاکستانی جاسوس کو قتل کردیتے ہیں پھر جہان کی مدد سے فارم ہاؤس کے دالان میں فوارے کے پاس دفنا دیتے ہیں۔ اس جاسوس سے جہان کو بہت انسیت محسوس ہوتی ہے۔ جہان یہ بات کسی کو نہیں بتاتا مگر وہ اکثر خواب میں یہ واقعہ دیکھتا ہے۔ سبین پھپھو جہان کو بتادیتی ہیں کہ اس کے ابا نے کچھ فوجی راز بیچے ہیں جس کی سزا کے طور پر وہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ سکندر شاہ اب بیمار رہنے لگے ہیں۔ سبین پھپھو کو دگنی مشقت کرنی پڑ رہی ہے۔

جد سکی میں جہان ایک ورکشاپ میں کام کرنے لگتا ہے۔ اس کے مالک کرامت بے کی بھاوج فریحہ اکثر جہان کو بناہ گزین کی اولاد کا طعنہ دیتی تھی۔ جہان کو فریحہ اور کرامت بے کے ناجائز تعلقات کے علم ہوجاتا ہے۔ ممی کے کہنے پر جہان سلیمان ماموں کے گھر جاتا ہے اور کوریر شاپ پر چند لفافوں پر پرانی تاریخوں کی مہر لگواتا ہے۔ راستے میں وہ سرخ کلیوں کا بوکے لینے کے لیے رکتا ہے مگر پھول والے کے پاس صرف سفید گلاب ہوتے ہیں۔ وہ ان پر سرخ رنگ کا اسپرے کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

سرخ اسپرے نہیں ملتا تو جہان سفید پھول ہی لے لیتا ہے۔ سلیمان ماموں کی طرف جانے کا اس کا موڈ نہیں ہے۔ وہ صرف اپنی ماں کی وجہ سے جارہا ہے۔ گیٹ کے قریب پہنچتا ہے تو فرقان ماموں چند دوستوں کے ساتھ باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ وہیں رک جاتا ہے۔ اسے فرقان ماموں کچھ مشکوک محسوس ہوتے ہیں۔ وہ فرقان ماموں کے گھر میں داخل ہوکر درمیانی دروازے سے حیا کے گھر میں جاتا ہے۔ حیا کے کمرے کی پچھلی طرف کی کھڑکی سے اندر جھانکتا ہے۔ حیا اپنی سہیلی زارا کو سبانجی یونیورسٹی کے اسکالر شپ کے بارے میں بتارہی ہوتی ہے۔ جہان ان سفید پھولوں کے ساتھ ایک پرچہ لکھ کر کچن کی کھڑکی سے اندر رکھ کر واپس آجاتا ہے اور اس کی گاڑی پر جی پی ایس ٹریسر بھی لگادیتا ہے۔

جہان فریحہ کو تنبیہہ کرکے کرامت بے کی دکان چھوڑ دیتا ہے اور چابی ساز کے پاس کام کرنے لگتا ہے جہاں سے وہ ہر قسم کے تالے کھولنے میں مہارت حاصل کرلیتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات کرنل رؤف گیلانی سے ہوتی ہے جنہیں جہان کے ابا نے اپنے جرم میں پھنسایا ہوتا ہے۔ وہ سزا کاٹ چکے ہیں۔ حماد ان ہی کا بیٹا ہے۔ ان کے کہنے پر جہان آرمی کمیشن میں داخلہ لیتا ہے اور ٹریننگ کے بعد پاکستانی جاسوس بن جاتا ہے۔

اس بات سے جہان کے دونوں ماموں بے خبر ہوتے ہیں۔ انہوں نے سبین پھپھو سے کہا تھا کہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر پاکستان آجاؤ تو ہم سپورٹ کریں گے ورنہ ہمیشہ کے لیے تعلق ختم۔ سبین پھپھو ان کے ساتھ جانے پر ترکی میں رہ کر محنت کرنے کو فوقیت دیتی ہیں۔

ایک دوست نما دشمن کی مخبری پر جہان بھارت کی ڈی ایم آئی تنظیم کے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے۔ ایک، دو دس دن بعد اسے آزادی ملتی ہے۔ ہنگی اور ڈولی کے روپ میں حیا کو جہان اور حماد ملتے ہیں۔ داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا کے برابر والے خالی پلاٹ سے جہان تقریب پر نظر رکھتا ہے۔ داور کی بارات والے دن حیا کا ولید کے ساتھ بیٹھنا جہان کو از حد ناگوار گزرتا ہے۔ وہ اس وقت ڈولی کے روپ میں حیا کو بچاتا ہے۔ جہان نے حیا کی آئی ڈی پر کلون لگا دیا۔ جس کی وجہ سے حیا کو آنے والا ہر میسج اور ہر ای میل جہان کو بھی ملے گی۔ حیا کے ڈانس کی ویڈیو دیکھ کر جہان کو بہت غصہ آتا ہے۔ جہان نے سیف ہاؤس میں ملاقات کے وقت حیا کے موبائل میں بھی وسیع رینج کا جی پی ایس ٹریسر لگادیا۔

ولید اور تمام بورڈ آف ڈائریکٹرز حیا کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ولید یہ حیا کو بتاتا ہے تو حیا ٹریڈ سینٹر کے پروجیکٹ میں ولید کی سازش کا انکشاف کرتی ہے اور سب کچھ اپنے ابا کو بتادینے کی دھمکی دیتی ہے۔ ولید طیش میں آجاتا ہے اور آفس سے واپسی حیا پر گاڑی چڑھا دیتا ہے۔

۱۲
بارہویں قسط

ہوٹل گرینڈ کی سب سے اوپری منزل کے اس چیئر پاور آفس میں پرفیوم کی خوشبو کے ساتھ سگریٹ کی مہک بھی پھیلی تھی۔ وہ ریوالونگ چیئر پہ بیٹھا لیپ ٹاپ پہ ہوٹل کے ریکارڈز چیک کررہا تھا۔ قریب رکھا ایش ٹرے سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑوں اور راکھ سے بھر چکا تھا۔ یہ اس کی واحد بری عادت تھی جسے وہ بہت چاہ کر بھی نہیں چھوڑ سکا تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں ہوٹل عثمان شبیر دیکھتے تھے۔ وہ ایک اچھے اور ایمان دار آدمی تھے۔ ان کا بیٹا سفیر بھی ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ لیکن جہان کی کوشش ہوتی تھی وہ اس لڑکے کو ایڈمنسٹریشن کے معاملات سے دور ہی رکھے۔ وہ قدرے غیر ذمے دار اور فطرتاً "لالچی سا لڑکا تھا اور ایسے لوگوں پہ وہ کبھی بھی اعتبار نہیں کیا کرتا تھا۔ عثمان شبیر اگر چھٹی پہ ہوتے تب بھی وہ سفیر کو ان کے کام میں دخل نہیں دینے دیتا تھا۔ اب بھی اس کا یہی کرنے کا ارادہ تھا۔ عثمان شبیر کل پاکستان جارہے تھے۔ سو ان کی غیر موجودگی میں اسے سفیر کو ذرا کھینچ کر رکھنا تھا۔

ڈاکومنٹس دیکھتے ہوئے وہ ایک دم چونکا۔ عثمان شبیر کل پاکستان جارہے تھے۔ ان کی واپسی بھی جلد ہی متوقع تھی۔ کیا وہ ان ہی تاریخوں میں واپس آئیں گے جب پاکستان سے دو ایکسچینج اسٹوڈنٹس حیا سلیمان اور خدیجہ رانا استنبول آئیں گی؟

اس نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ حیا کی ای میلز اسے ملتی رہتی تھیں۔ تازہ ترین میں اس کے ٹکٹ کی کاپی اور الیکٹرونک فارم تھا جو ڈورم الاٹمنٹ کے لیے حیا نے پُر کرکے بھیجا تھا۔ اسے یہ میل صبح ملی تھی۔ وہ مصروفیت کے باعث پڑھ نہیں سکا تھا۔ اب پڑھی تو بے اختیار چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔

پاگل لڑکی۔ کیا کیا لکھ کر سبانجی والوں کو بھیج رہی تھی۔ انہیں واقعتاً "اب اسے خونخوار قسم کی لڑکیوں کے ساتھ ڈورم دینا تھا۔ اس نے ٹکٹ والی میل چیک کی۔ پانچ فروری کو ان دونوں لڑکیوں کی فلائٹ تھی۔ ابھی اس میں پورے دو ہفتے تھے۔ [illegible] فون اٹھایا

اور عثمان کا ایکسٹینشن ملایا۔

"عثمان بے! آپ کو واپس کب آنا ہے؟" بنا تمہید کے اس نے کام کی بات پوچھی۔

"پندرہ بیس دن تک۔"

"پندرہ یا بیس؟"

"آٹھ فروری کی فلائٹ ہے' آپ حساب لگالیں' تقریباً"۔" وہ جیسے خود بھی گننے لگ گئے۔

"آپ اتحاد ایر لائنز کی پانچ فروری کی فلائٹ لے سکتے ہیں؟ اصل میں میرے دوست کی بہن اپنی فرینڈ کے ساتھ استنبول آرہی ہے۔" پھر اس نے مختصر الفاظ میں ان کو سمجھایا کہ ان کے درمیان کچھ فیملی کلیش ہے۔ وہ ان کے بارے میں فکرمند ہے کہ پہلی دفعہ استنبول آنے کے پیش نظر ان کو یہاں کوئی مسئلہ نہ ہو' سو وہ چاہتا ہے کہ عثمان شبیر ان سے اپنا تعارف کروادیں' تاکہ اگر وہ کبھی مشکل میں ان سے رابطہ کرے' تو وہ فوراً "عبدالرحمن کو بتائیں۔ لیکن ظاہر ہے اس کا نام درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔ عثمان شبیر نے ہامی بھرلی۔

وہ اب پہلے سے زیادہ مطمئن تھا۔ پتا نہیں وہ کب اس سے اور ممی سے رابطہ کرتی ہے۔ اس دوران کہیں اس کو کوئی مسئلہ نہ ہو' وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کی ذمہ داری اور اگر وہ جان بھی لے کہ عثمان شبیر' عبدالرحمن پاشا کے کہنے پہ یہ سب کررہے تھے' تب بھی وہ نہیں جان سکتی تھی کہ عبدالرحمن پاشا کون تھا۔

عبدالرحمن پاشا اور عبدالرحیم پاشا' یہ دونوں حبیب پاشا کی پہلی بیوی کی اولاد تھے۔ حبیب پاشا کچھ وجوہات کی بنا پہ پہلی بیوی اور دو بیٹوں کو چھوڑ کر کئی برس قبل استنبول آگئے تھے۔ وہ ایک درمیانے درجے کے بھارتی بزنس مین تھے۔ ترکی میں انہوں نے امت اللہ نامی ترک خاتون سے شادی کی اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ان دونوں کا ایک ہی بیٹا تھا۔ طیب حبیب پاشا المعروف پاشا بے۔

بیوک ادا میں امت اللہ کا خاندانی گھر' وہ عثمانی طرز کا سفید محل تھا۔ طیب حبیب ابھی چھوٹا تھا۔ جب

حبیب پاشا کا انتقال ہو گیا۔ تب امت اللہ اپنے بیٹے کو لے کر اناطولیہ کے ایک گاؤں چلی گئیں۔ جہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ یوں وہ گھر بند ہو گیا۔ کئی برس وہ بند رہا۔ پھر طیب حبیب نوجوانی کی دہلیز عبور کرتے ہی فکر معاش کی خاطر ادالار (شہزادوں کے جزیروں) پہ آگیا۔ اس نے وہ گھر کھولا اور پھر ایک شہزادے کی طرح جینے کی خواہش کے ساتھ بیوک ادا میں رہنے لگا۔

دور اناطولیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھی اس کی سادہ سی ماں نہیں جانتی تھی کہ وہ ادالار میں کیسے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ امت اللہ نے بہت دفعہ چاہا کہ وہ بیٹے کے پاس بیوک ادا چلی آئیں، مگر طیب حبیب نے ایسا کبھی نہ ہونے دیا۔ اس کی کمزوری اس کی ماں تھی۔ جو اسے بہت عزیز تھی اور وہ جانتا تھا کہ جس دن اس کی ماں کو علم ہوا کہ وہ مافیا کا حصہ بن چکا ہے، اس دن اس کی ماں مر جائے گی۔

ترک ڈرگ اور اسلحہ اسمگلنگ مافیا اپنی مثال آپ تھا۔ برطانیہ میں پہنچائی جانے والی اسی فیصد ڈرگز ترکی کے راستے ہی آتی تھیں۔ البتہ ادالار کا مافیا اطالوی یا سسلین طرز کا مافیا نہ تھا۔ اطالوی مافیا فیملیز مضبوط اور منظم طریقے سے ایک علاقے میں کام کرتی ہیں۔ لوگ کسی منظم فوج کی طرح درجہ بدرجہ اس میں عہدے پاتے ہیں۔ اس طرح کی مافیا فیملیز کو ٹریک کرنا اور پکڑنا پولیس کے لیے آسان ہوتا ہے۔ اگر اطالوی یا سسلین فیملی کے کسی ممبر کو کچھ بھی ہو جائے، فیملی وہیں رہتی ہے اور اپنا کام جاری رکھتی ہے۔

ترک مافیا ایسا نہ تھا۔ وہ روس کے قریب ہونے کے باعث روسی مافیا کی طرح کام کرتے تھے۔ روسی فیملیز ایک علاقے میں اکٹھی ہوتیں۔ کچھ عرصہ وہاں وارداتیں کرتی تھیں اور پھر غائب ہو جاتیں۔ کچھ عرصے بعد چہروں کے نقاب بدل کر وہ کسی دوسرے علاقے میں اٹھتیں اور یوں ان کا کام جاری رہتا۔ ان پہ ہاتھ ڈالنا پولیس کے لیے بہت مشکل ہوتا تھا۔ اطالوی مافیا کی طرح وہ قدیم طرز کے جرائم میں نہیں، بلکہ جدید جرائم جیسے سائبر کرائم، جعلی کمپنیاں، کریڈٹ کارڈ فراڈز، اسمگلنگ وغیرہ میں ملوث ہوتی تھیں۔

یونان سے ترکی اور ایران کے راستے ایشیائی ملکوں بالخصوص پاکستان میں بڑے پیمانے پہ اسلحہ اسمگل کیا جاتا تھا اور بعد میں یہی اسلحہ دہشت گردی کی وارداتوں میں استعمال ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے متاثرہ ممالک کی ایجنسیوں کے قابل ایجنٹس ان فیملیز میں گھل مل کے، ان کا اعتماد جیت کر، ان شپ منٹس کی مخبری کیا کرتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کون سا آدمی اصل مافیا ممبر ہے یا کسی دوسرے ملک کا جاسوس۔

طیب حبیب نے اپنی مافیا فیملی میں جگہ بنا لینے کے بعد دولت تو بہت کمائی، ساحل کنارے ایک اونچا سا ہوٹل بھی کھڑا کر لیا۔ مگر وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بہت زبوں حالی کے بعد لکشمی کو اپنے قریب پاتے ہیں تو اپنا ماضی اور احساس کمتری چھپانے کے لیے خود پہ کسی جدی پشتی رئیس کا خول چڑھا لیتے ہیں، بلکہ خول چڑھانے کی کوشش ہی کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ فیشن خریدا جا سکتا ہے، مگر اسٹائل نہیں۔ طیب حبیب بھی کوے اور ہنس کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔ زندگی کا ایک لمبا عرصہ چھوٹے لوگوں کے ساتھ گزارنے کے باعث وہ ذہنی طور پہ آج بھی اسی کلاس میں تھا۔ بھاؤ تاؤ کر کے خریداری کرنے والا، کسی ڈھابے نما ہوٹل کے شیف کے ساتھ بیٹھ کر ملکی حالات پہ تبصرہ کرنے والا۔ خود بھی وہ ہوٹل میں اپنے پاور آفس کے بجائے نیچے کچن میں پایا جاتا تھا۔ ہوٹل کو اس نے کبھی اپنی مافیا سرگرمیوں کا مرکز نہیں بنایا تھا اور وہاں ایک شریف آدمی کے طور پہ جانا جاتا تھا۔ اس کی اسی فطرت کے باعث اس کے ورکرز اس سے خاصے بے تکلف تھے۔ یہاں پہ آکر اس کے مصنوعی خول میں دراڑیں پڑنے لگتیں۔ تب ہی اس نے خود کو پاشا بے کہلوانا شروع کر دیا۔

ترکی میں عموماً پہلے نام کے ساتھ ہی پکارا جاتا ہے، جبکہ ادالار میں آخری نام (سرنیم) کے ساتھ "مسٹر" کہلوانا، خود پسندی اور تکبر کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ مگر طیب حبیب کبھی نہیں جان سکا کہ انسان کا قد اپنے نام ولقب کی وجہ سے نہیں، اس کے اخلاق اور کردار کی وجہ سے بڑا ہوتا ہے۔

طیب حبیب نے اپنی مافیا فیملی میں ایک عرصہ بطور فیملی ممبر کام کیا، مگر پھر زیادہ پیسے کے لیے اس نے جہان کی ایجنسی سے ڈیلنگ شروع کر دی۔ بہت جلد وہ ان کے مہرے کے طور پہ کام کرنے لگا اور پھر اس نے اپنے تمام اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی ایجنٹ کو اپنے سوتیلے بھائی کی حیثیت سے اپنی فیملی میں متعارف کروایا۔ عبدالرحمٰن پاشا، جو واقعی اس کے سوتیلے بھائی کا نام تھا۔ جہان سکندر نے یہ نام استعمال کر کے بہت جلد طیب حبیب کی مافیا میں اپنا مقام بنا لیا۔ چونکہ یہ اطالوی مافیا نہ تھا، روسی مافیا میں اپنی جگہ بنانا بہت مشکل ثابت نہیں ہوا۔ پیسہ اس دنیا کے اکثر مسائل کا ریڈی میڈ حل ہوتا ہے۔

طیب حبیب اور عبدالرحمٰن ایک ڈیل کے تحت ساتھیوں کی طرح کام کرنے لگے تھے۔ طیب اسے اپنی ماں سے ملوانے بھی لے گیا تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک سادہ لوح عورت کو اپنے نرم رویے اور محبت بھرے انداز سے کیسے اپنے لیے موم کرنا ہے۔ امت اللہ اس کے بارے میں بس اتنا جانتی تھیں کہ وہ ان کے بیٹے کا دوست ہے اور اس نے ان کے بیٹے کی جان بچائی ہے جس کے باعث وہ اس کی احسان مند تھیں۔ چونکہ وہ بیوک ادا میں نہیں رہتی تھیں، اس لیے طیب کو یہ سب ان کو بتانے میں عار محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ سب سے جھوٹ بول سکتا تھا۔ مگر آنے سے یہ بات نہیں چھپا سکتا تھا۔

حبیب پاشا کے انتقال پہ ان کے دونوں بیٹے انڈیا سے یہاں آئے تھے اور بچھڑے درمیان میں کتنے برس [illegible] ان کی شکلیں اور رنگ اچھی طرح یاد تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ عبدالرحمٰن ان کے شوہر کا بیٹا نہیں ہے، مگر جب ان کا اپنا بیٹا بضد تھا کہ [illegible] دوست کو اپنے بھائی کے طور پہ متعارف کروانے میں اس کا فائدہ ہے۔ تو وہ بھی اس بات کو نبھانے کے لیے راضی ہو گئیں۔ ویسے بھی عبدالرحمٰن ایسا بیٹا تھا جیسا وہ طیب حبیب کو بنانا چاہتی تھیں۔ اس کی اقدار، تہذیب، اخلاق، غرض ہر شے آنے کے لیے فخر کا باعث تھی۔

کافی عرصہ ان دونوں نے بیوک ادا میں ایک ساتھ کام کیا۔ البتہ طیب حبیب یہ نہیں جانتا تھا کہ عبدالرحمٰن ڈبل ایجنٹ کے طور پہ کام کر رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ ادالار میں اپنا نام بنانا چاہتا ہے تو اسے ترک خفیہ ایجنسی کی مدد چاہیے تھی۔ تاکہ گرفتاری کی تلوار سر پہ لٹکنا بند ہو جائے۔ بدلے میں وہ مافیا کی معلومات ترکوں کو دیتا تھا اور اگر اسے ترکوں کی کوئی خبر ملتی تو اسے مافیا تک پہنچا دیتا تھا۔ یوں وہ ایک خالص ڈبل ایجنٹ تھا۔ جو صرف اپنی ایجنسی کے ساتھ وفادار تھا۔ تاش کے پتوں کا گھر اس نے بہت محنت سے کھڑا کیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ جس دن یہ پتے ذرا سی پھونک سے الٹے، اس روز وہ اپنی جان بچانے کے لیے ترکوں اور مافیا، دونوں سے بھاگ رہا ہوگا۔ مگر...

خطرات کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے؟

اس نے نامحسوس انداز میں طیب حبیب کے ہوٹل گرینڈ میں بھی اپنا عمل دخل شروع کر دیا تھا۔ وہ طیب حبیب کے برعکس شخصیت کا مالک، ورکرز سے خاص فاصلہ رکھنے والا باس تھا۔ اس کے بیش قیمت سوٹ، دو قیمتی پتھروں والی انگوٹھیاں جو بظاہر سونے کی لگتیں اور گلاسز، ہر شے طیب سے بہت مختلف اور پرفیکٹ ہوا کرتی تھی۔

پاکستان سے اسے اجازت تھی کہ وہ چاہے تو یہاں شادی کر سکتا ہے، وطن واپسی پہ اس کی بیوی کو پاکستانی شہریت بھی دے دی جائے گی، مگر وہ اس نہج پر نہیں سوچا کرتا تھا۔

پھر ایک روز طیب حبیب بہت اچانک یونان میں گرفتار ہو گیا۔ اس میں جہان کا تصور نہیں تھا۔ ہاں وہ طیب کو چھڑانے کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے باس نے کہہ دیا کہ وہ خاموشی سے اپنا کام کرے اور طیب کو اس کے حال پہ چھوڑ دے۔ اپنی

مرضی وہ اس کام میں نہیں چلا سکتا تھا۔ طیب نے کئی دفعہ اسے پیغام پہنچایا کہ وہ اس کے لیے کچھ کرے۔ مگر اس نے سنی ان سنی کردی۔

البتہ ایک بات جہان نے اس کی مانی اور وہ یہ تھی کہ اس کی ماں کو کچھ علم نہ ہو کہ وہ جیل میں ہے۔ اس نے سب کو کہہ دیا کہ وہ خود بھی لاعلم ہے کہ پاشا بے کہاں ہے۔ اس کام میں اس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ آنے کبھی ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ گواہ تھیں کہ عبدالرحمٰن' پاشا بے سے بہت محبت کرتا ہے اور اس پہ پانی کی طرح پیسہ بہاتا ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ ان کے بیٹے کے ہوٹل کو ترقی صرف اور صرف عبدالرحمٰن کے تجربے و سرمائے کی وجہ سے ملی ہے۔ وہ بھلا کیسے اس پہ شک کر سکتی تھیں؟ بس وہ بہت اداس' بہت پریشان رہنے لگی تھیں۔ وہ ان کے لیے دکھی تھا' مگر اسے حکم نہیں تھا کہ وہ سب چھوڑ چھاڑ کر پاشا بے کے لیے یونان چلا جائے۔

پھر گردونواح میں ہر جگہ اس نے کہنا شروع کردیا کہ پاشا بے کام کے باعث یونان منتقل ہو گیا ہے۔ یہ گرفتاری صیغہ راز میں تھی۔ سو اس کی اس بات سے سب مطمئن تھے اور سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔

طیب حبیب پاشا کے جانے کے بعد اس نے ہوٹل گرینڈ کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ پہلے اس نے ملازمین کو قابو کیا۔ لوگ لالچ یا خوف سے ہی قابو ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان سے کام نکلوایا جاتا ہے۔ جس کو وہ لالچ دے کر وفادار بنا سکتا تھا۔ اس کو ویسے بنایا اور پھر ہر ایک ورکر کی زندگی کے سیاہ اوراق چھانے' تاکہ جب بھی کوئی ٹیڑھ پن کرے' تو وہ اس کی رسی کھینچ سکے۔ اب وہ ہوٹل گرینڈ کا بلاشرکت غیرے مالک تھا اور اس نے ادالار میں اپنی ایک شہرت بنالی تھی۔

اور پھر تب آنے کے ساتھ وہ دو لڑکیاں آگئیں۔

وہ امت اللہ حبیب کی رشتے کی پوتیاں تھیں۔ ان کے ماں' باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تو امت اللہ ان کو ساتھ لے آئیں۔ جہان کو آج بھی وہ دن یاد تھا جب وہ پہلی مرتبہ ان دو لڑکیوں سے ملا تھا۔ آنے نے اس کو فون پہ بتایا تھا کہ وہ ان بچیوں کو ساتھ لا رہی ہیں۔ وہ اس وقت ہوٹل میں تھا۔ جب گھر پہنچا تو دبے چاپ اندر داخل ہوتے ہوئے وہ لاؤنج میں بیٹھی دو لڑکیوں کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔ ایک اسکارف لپیٹے بڑی لڑکی تھی اور دوسری گھنگھریالی پونی والی چھوٹی بچی۔ وہ بچی پانی پی کر گلاس رکھ رہی تھی۔ جب اس نے بڑی لڑکی کو تاسف سے نفی میں سر ہلا کر کہتے سنا۔

"بہارے گل! پانی پی کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یاد ہے ہمارا وہ چوزہ جو اپنی کٹوری سے پانی چونچ میں لینے کے بعد گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھ کر پہلے شکر ادا کرتا تھا اور پھر گردن جھکا کر دوسرا گھونٹ پیتا تھا؟"

چھوٹی بچی نے اس سے بھی زیادہ تاسف سے پیشانی پہ ہاتھ مارا۔

"عائشے گل! وہ تو اس لیے گردن اونچی کرتا تھا تاکہ پانی حلق سے نیچے اتر جائے' مجھے بابا نے خود بتایا تھا۔" اسے جیسے اپنی بڑی بہن کی کم علمی پہ بہت افسوس ہو رہا تھا۔

"تم نہیں سدھرو گی۔" بڑی لڑکی گلاس اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ جو لابی کے دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا' باہر نکل کر سامنے آیا۔ کسی مقیم ایجنٹ کے لیے کور فیملی میں کسی نئے فرد کا اضافہ خوش آئند بات نہیں ہوتی۔ وہ بھی ان کے آنے سے خوش نہیں تھا۔

چھوٹی بچی نے آہٹ پہ چونک کر اس جانب دیکھا۔ پھر بے اختیار اس کے جوتوں کو۔ اس کی بھوری سبز آنکھوں میں حیرت ابھر آئی۔ وہ واقعی گاؤں کی لڑکیاں تھیں۔ جن کو نہیں معلوم تھا کہ استنبول کی ہائی ایلیٹ گھر میں جوتے پہن کر داخل ہوتی ہے۔

"مرحبا۔ کیا تم آنے کے بیٹے ہو؟" اگلے ہی لمحے وہ حیرت بھلائے' دلچسپی سے اسے دیکھتی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"ہوں۔ اور تم؟" وہ گردن ذرا جھکا کر اس ننھی سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

"میں بہارے گل ہوں۔ اناطولیہ کی بہارے گل!"

"تمہارا مطلب ہے گل بہار؟" اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔ ترکی میں گل اور بہار کو کبھی بہارے گل کہہ کر نہیں ملاتے تھے۔ بلکہ "گل بہار" کا مرکب بنایا جاتا تھا۔

"نہیں! میں بہارے گل ہوں۔ یہ ایرانی نام ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے گلاب کے پھول پہ آئی بہار۔ پتا ہے' میرا نام یہ کیوں ہے؟"

"کیوں؟"

"کیونکہ میری آنَم (ماں) کا نام آئے گل تھا۔ یعنی چاند کا پھول' میری نانی کا نام غنچے گل تھا اور میری بہن کا نام ہے عائشے گل۔ یعنی وہ گلاب جو ہمیشہ زندہ رہے۔" اس نے بہت سمجھ داری سے کسی رٹے رٹائے سبق کی طرح اپنے نام کی وجہ تسمیہ بیان کی جو شاید محض ہم آواز کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔

"بہت دلچسپ۔ ترکی کے سارے پھول تو تمہارے خاندان میں ہیں۔ تمہارے بابا کا نام کیا ہوگا پھر' شاید گوبھی کا پھول؟" وہ ذرا مسکراہٹ دبا کر بولا تو بہارے کی آنکھیں حیرت سے وا ہو گئیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان میں شرارت کی چمک ابھری اور وہ مسکرائی۔

"نہیں' ان کا نام غفران تھا۔"

"بہارے گل!" اسی پل اس کی بہن کچن سے باہر نکلی۔ "جلدی سے ناخن کاٹ لو۔ لمبے ناخن بلیوں کے اچھے لگتے ہیں' لڑکیوں کے نہیں۔" پھر اس پہ نگاہ پڑی تو سنجیدگی سے مرحبا کہہ کر آگے نکل گئی۔

بہارے گل نے افسوس سے اپنی بہن کو جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس کی طرف چہرہ کر کے بہت رازداری سے بتایا۔

"برا مت ماننا' میری بہن آدھی پاگل ہے۔"

اور شاید بہت عرصے بعد وہ بہت زور سے ہنسا تھا۔

اس دن اس کی اس چھوٹی سی شرارتی اور ذہین لڑکی سے ایک وابستگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس کی ہر بات پہ نہیں ہنستا تھا۔ نہ ہی بہت زیادہ بے تکلف ہوتا تھا۔ مگر اس بچی کو تو جیسے وہ پسند آگیا تھا۔ وہ اسٹڈی میں بیٹھا کام کر رہا ہے تو وہ دبے پاؤں آکر اس کے قریب بیٹھ جائے گی۔ صبح وہ ہوٹل جانے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ تو وہ کبھی اس کے جوتے پالش کر کے لا دے گی' تو کبھی گلاس صاف کر کے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ کام عائشے کرتی تھی یا ملازمہ۔ مگر مجال ہے جو بہارے گل نے کبھی کسی اور کو کریڈٹ لینے دیا ہو۔ وہ اپنی بہن سے بہت مختلف' ذرا باغی طبیعت کی مالک تھی۔

عائشے ایسی نہیں تھی۔ وہ کم بولنے والی' دھیمے اور سنجیدہ مزاج کی' ایک فاصلے پہ رہنے والی لڑکی تھی۔ ان دونوں کی بات چیت ڈائننگ ٹیبل پہ ہی ہو پاتی' یا یوں ہی گزرتے ہوئے۔

مگر وہ شروع سے ہی اس کی طرف سے لاشعوری طور پہ فکرمند رہنے لگا تھا۔ وہ اسے واقعی طیب حبیب کا سوتیلا بھائی سمجھتی تھی۔ لیکن جو بھی تھا وہ اس گھر کی مالکن بن گئی تھی۔ (یہ سفید محل آنے نے عائشے کے نام کردیا تھا اور اس نے اعتراض نہیں کیا تھا) وہ قانونی طور پہ آنے اور طیب حبیب کی اصل وارث تھی۔ اگر کبھی وہ ہوٹل کے معاملات میں دخل دینے لگے تو وہ کیا کرے گا؟ بیس سال کی لڑکی سے اسے یہ امید نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر اس کا ماننا تھا کہ انسان کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور لوگوں پہ اعتبار تو وہ ویسے ہی نہیں کرتا تھا۔

پھر کچھ عرصہ گزرا اور عائشے کے کانوں میں بھی لوگوں کی باتیں پڑنے لگیں۔ آنے تو عبادت میں مشغول رہنے والی' ایک بہت ہی غیر سوشل خاتون تھیں۔ ان کی طرف سے اس کو فکر نہیں تھی۔ مگر جب عائشے الجھی الجھی رہنے لگی اور ایک دن صبح اس نے اسے کہا کہ شام میں وہ اس سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے تو وہ اچھا کہہ کر باہر نکل گیا۔ مگر اندر سے وہ ذرا پریشان ہو گیا تھا۔

تاش کے پتوں کا گھر بکھیرنے کے لیے آنے والا جھونکا عموماً" وہاں سے آتا ہے جہاں سے کبھی امید بھی نہیں کی جا سکتی۔ اب اسے اس لڑکی کو طریقے سے سنبھالنا تھا' تاکہ وہ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ پیدا کرے۔

انسانوں کو قابو ان کی کمزوریوں سے کیا جاتا ہے اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی آپ کے معاملے میں دخل نہ دے تو آپ کو نامحسوس طریقے سے اس شخص کو اس کے اپنے معاملات میں الجھانا و مصروف کرنا پڑتا ہے۔ عائشے کی کمزوری اس کا دین تھا۔ وہ بہت مذہبی اور عملی قسم کی مسلمان تھی۔ اسے یاد تھا ایک روز وہ سوتی رہ گئی اور اس کی فجر چھوٹ گئی۔ تو وہ پچھلے باغیچے میں بیٹھ کر کتنا روئی تھی۔ سو اس شام جب وہ اس سے بات کرنے آئی تو وہ اسٹڈی میں قرآن کھولے بیٹھا تھا۔

قرآن پڑھنے کا جو وقت اسے جیل میں ملا تھا' پھر دوبارہ کبھی نہیں مل سکا تھا۔ اب بس کبھی کبھی وہ قرآن پڑھ پاتا تھا۔ اب بھی عائشے آئی تو جہان نے اس کی بات سننے سے قبل اپنی کہنی شروع کردی۔ وہ جانتا تھا کہ عائشے کے نزدیک اسکارف لینا زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور بہارے گل اس چیز سے سخت بے زار تھی۔ اس نے سورۂ احزاب کھولی اور اس سے پوچھنے لگا کہ کیا وہ جانتی ہے سورۃ الاحزاب میں آیت حجاب کیوں اتری ہے؟ کیا وہ یہ پہیلی حل کرسکتی ہے؟ یہ بات بہت پہلے اس نے کسی اسکالر سے سنی تھی۔ اس کے بعد جہان نے اسے اپنے متعلق پھیلی خبروں کو دشمنوں کی پھیلائی ہوئی افواہیں سمجھ کر نظرانداز کرنے پر بہت اچھی طرح قائل کرلیا۔ عائشے جب اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تو اس کا ذہن شکوک و شبہات سے خالی تھا اور وہ صرف سورۂ احزاب کی پہیلی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پھر وہ روز صبح پچھلے باغیچے میں قرآن اور ایک کاپی لے کر بیٹھ جاتی اور خدا جانے کیا کیا لکھتی رہتی۔

ایک دن اس نے آخر جہان کو وہ پہیلی بھی اپنے طور پہ حل کرکے بتادی۔ اب وہ اسے دوبارہ کیسے مصروف کرے؟ خیر' اس نے حل نکال لیا۔ عثمان شبیر کی بیگم حلیمہ جدیسی کے بچوں کو قرآن پڑھایا کرتی تھیں' اس نے عائشے کو وہاں بھیج دیا اور وہ تو جیسے اپنے جیسے لوگ ڈھونڈ رہی تھی' وہ روز صبح ادھر جانے لگی۔ (بہارے نے البتہ جانے سے صاف انکار کردیا تھا۔)

عائشے کو مصروف کرنے کے لیے اس نے یہ بھی چاہا کہ وہ کالج میں داخلہ لے لے۔ مگر ان دونوں کا تعلیمی سال اپنا گاؤں چھوڑنے کے باعث ضائع ہوگیا تھا۔ سو وہ دونوں مصر تھیں کہ وہ اگلے سال داخلہ لیں گی۔

پھر ایک روز اس نے بہارے کے پاس ایک چائنیز پزل باکس دیکھا تو بہارے نے بتایا کہ ایک چینی بوڑھے نے عائشے کو یہ فن سکھایا تھا۔ یہ بات بہت خوش آئند تھی۔ اس نے عائشے کو سمجھایا کہ اسے وہ باکسز دوبارہ سے بناکر بیچنے چاہئیں۔ اس مقصد کے لیے کافی دقتوں سے اس نے عائشے کے لیے بالخصوص بیوک ادا کے جنگل میں لکڑی کاٹنے کا پرمٹ بنوا دیا تھا۔ بالآخر وہ دونوں لڑکیاں اپنے اپنے کاموں میں اتنی مصروف ہوگئی تھیں کہ ان کے پاس عبدالرحمن پاشا کے معاملات میں مداخلت کا وقت نہیں رہا تھا۔ عائشے تو جیسے اب اس پہ شک کرہی نہیں سکتی تھی۔ جو شخص قرآن کو اتنی گہرائی سے پڑھتا ہو' وہ بھلا برا آدمی کیسے ہوسکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

چند روز مزید آگے سرکے۔ ہر کام نپٹاتے ہوئے اس کے لاشعور میں دنوں کی گنتی جاری رہتی تھی۔ پانچ فروری یعنی اس کی بیوی کے استنبول آنے میں کتنے دن رہ گئے ہیں؟ دس' نو' آٹھ۔

پھر اسے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اس کے بارے میں فکرمند بھی رہنے لگا ہے۔ لیکن اتنا خیال تو اسے استنبول میں مقیم اپنی سگی ماں کا بھی تھا کہ وہ ان کے متعلق باخبر رہا کرتا اور بار بار ان کے بارے میں پتا کرتا رہتا تھا۔ اب اس کی بیوی کا بھی حق تھا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ پاکستان میں وہ ایک طرح سے فارغ تھا۔ وہاں ہر وقت گرفتاری کا خدشہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر استنبول میں وہ اپنی بیوی کی ہر نقل و حرکت پہ نظر نہیں رکھ سکتا تھا۔ مگر رکھنا ضرور چاہتا تھا۔ کوئی ایسا آدمی جو قابل اعتبار ہو؟ جو اس کی نگرانی کرسکے۔

ہاشم الحسان کا نام اس کے ذہن میں سب سے پہلے آیا تھا۔ اس نے فوراً" اس سے رابطہ کرنا چاہا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ دبئی گیا ہوا ہے۔ ہاشم چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث رہنے اور استنبول میں جیل ریکارڈ رکھنے کے باعث یہاں کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا بچہ بیمار تھا اور اس کو کافی رقم کی ضرورت تھی۔ جہان نے اسے بلوالیا۔ مگر اس نے ہاشم کو ابوظہبی سے اسی فلائٹ پہ استنبول آنے کا کہا جو حیا اور اس کی دوست کو ملی تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ ہاشم ائیرپورٹ پہ اسے سفید پھولوں کا گلدستہ پہنچا سکے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حیا ان سفید پھولوں کے بھیجنے والے کو بھولے۔ مگر یہ نہیں ہوسکا۔ ہاشم نے واپس آکر اسے بتایا کہ جب وہ فون پہ بات کررہا تھا تو وہی لڑکی اس کے پاس کارڈ ڈالنے کا طریقہ پوچھنے آئی تھی۔ ایسے میں وہی اس کو چند منٹ بعد پھول لاکردے' یہ ٹھیک نہیں تھا۔ ہاشم کی بات پہ وہ گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

پانچ فروری کی صبح ایک سرپرائز اس کے آفس میں اس کا منتظر تھا۔ طیب حبیب پاشا واپس آگیا تھا۔ جانے وہ کیسے فرار ہوکر واپس پہنچا تھا۔ مگر وہ بہت برے حال میں تھا۔ استنبول میں اس کے دشمن بڑھ گئے تھے اور وہ ان سے بچنے کے چکر میں مفرور مجرم کی طرح گویا خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ جہان سے سخت بدگمان بھی تھا کہ اس نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ پاشا بے بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جہان نے اس کو دھوکا دیا ہے۔ (وہ اس کی دوسری شناخت سے واقف تھا۔ کیونکہ برگر کنگ اس کا ریسٹورنٹ تھا۔ جہاں حالات خراب ہونے کی صورت میں جہان چلا جایا کرتا تھا۔) اب اس کا اصرار تھا کہ وہ اور اس کی ایجنسی اپنا وعدہ پورا کرے اور اس کو اپنے خاندان سمیت کسی دوسرے ملک میں سیٹل کرادے۔ جہان جانتا تھا کہ ایجنسی یہ کرادے گی۔ مگر پھر بھی وہ چاہتے تھے کہ وہ ذرا صبر کرے۔ مگر پاشا بے کو بہت سا پیسہ اور نئی زندگی بہت جلدی چاہیے تھی۔

وہ بہت لڑ جھگڑ کر وہاں سے گیا اور اس کے جانے کے بعد جہان فیری لے کر استنبول آگیا۔ برگر کنگ اور ہوٹل گرینڈ یہ دو واحد جگہیں تھیں جہاں پاشا بے اس سے ملنے آسکتا تھا اور ایسے جھگڑے کو برگر کنگ پہ کرنے کا تو متحمل تھا مگر ہوٹل گرینڈ پہ نہیں۔

ممی سے وہ اب ملا تھا۔ وہ اس کے آتے ہی حسب توقع بہت خوش تھیں۔ مگر زیادہ خوشی اپنی بھتیجی کے آنے کی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ کل یا پرسوں وہ ہاسٹل جاکر حیا سے مل آئیں۔ پتا نہیں وہ خود ادھر آئے یا نہیں۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ نہیں جائے گا۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ سلیمان ماموں کی بیٹی اتنی جلدی تو خود ان سے ملنے نہیں آئے گی۔ مگر اگلے دن جب وہ کچن میں کھڑا ممی کا کیبنٹ جوڑ رہا تھا تو اس کا فون بجا۔

جہان نے فون نکال کر دیکھا۔ یہ اس کا جی پی ایس ٹریسر الرٹ تھا جو اگر اس کی حدود میں آتا تو بجنے لگتا۔ یعنی اگر اس سے ایک فاصلے تک وہ آئے گی تو ٹریسر جہان کو اطلاع دے دے گا۔ یہ اس نے اس لیے کر رکھا تھا کہ کبھی اگر وہ اپنے کسی خاص مہمان کے ساتھ موجود ہے اور اسی جگہ پہ اتفاقیہ یا غیر اتفاقیہ طور پہ حیا آجائے' تو وہ بروقت اطلاع پالے۔ ابھی وہ اس کے قریب ہی تھی اور جس سڑک پہ تھی' وہ جہانگیر کو ہی آتی تھی۔

وہ دوسرے ہی دن اس کے گھر آرہی تھی؟ ویری اسٹرینج۔

اس نے ممی کو کچھ نہیں بتایا۔ مگر اپنے گھر سفید پھول ضرور منگوالیے۔ وہ اسے ذرا ستانا چاہتا تھا۔ جس لڑکی کے لیے وہ اتنا عرصہ خوار ہوا تھا۔ اسے تھوڑا سا خوار کرنے میں کیا حرج تھا؟

جب وہ دروازے پہ آئی تو بھی وہ اس سے اسی خشک طریقے سے ملا جیسے اپنے ماموں کی بیٹی سے ملا کرتا تھا۔ پھر بھی اسے امید تھی کہ اس کے "کون حیا سلیمان؟" کہنے کے جواب میں وہ شاید کہہ دے "تمہاری بیوی اور کون؟" مگر وہ بہت نروس اور ابھی ابھی لگ رہی تھی۔ وہ اس سے اتنی مختلف تھی کہ وہ پھر سے بددل ہونے لگا۔

ممی اس سے مل کر خوش ہوئیں۔ مگر ماحول تب بدلا جب وہ وہی اپنے باپ اور تایا والی طنزیہ ٹون میں ان کو احساس دلانے لگی کہ وہ رشتے داروں کے ساتھ بنا کر نہیں رکھتے' پھر اس نے ابا کے آرمی سے تعلق کا پوچھا۔ یا تو وہ نہیں جانتی تھی' یا پھر طنز کرنے کا کوئی اور بہانہ؟! اس کے اندر مزید تلخی بھرتی گئی۔ وہ شاید واقعی یہ رشتہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ پہلے اس کا ارادہ محض سفید پھول بھیجنے کا تھا' مگر اس ساری تلخ گفتگو کے بعد جب وہ پھول لینے گیا تو ویلنٹائن کا کارڈ جان بوجھ کر اندر ڈالا۔ جس کی وجہ سے وہ فوراً "اٹھ کر چلی گئی۔

بعد میں ممی بہت خفا ہوئیں۔ وہ اپنے بیٹے اور اس کے انداز کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھیں۔ مگر وہ ان کی سرزنش سنی ان سنی کر گیا۔

پھر اسے پتا نہیں کیوں افسوس ہونے لگا۔

ممی نے فاطمہ مامی سے فون پہ بات کی تو انہوں نے بتایا کہ حیا کو اس کی دوست اچانک ہی وہاں لے گئی تھی۔ وہ اس وقت جلدی میں تھی۔ بعد میں تسلی سے اس ہفتے کسی دن آئے گی۔

وہ آج کل استقلال اسٹریٹ میں ہی ہوتا تھا۔ یہ گلی مافیا راج کے لیے خاصی مشہور تھی۔ برگر کنگ طیب حبیب کا تھا۔ مگر اس کا انتظام بھی وہی سنبھالتا تھا۔ جب اسے deactivate (غیر فعال) ہونا پڑتا تو وہ یہیں آکر چھپ جاتا۔ کچن میں کھڑے ہو کر عام سے حلیے میں سارا دن چند ورکرز کے ساتھ کام کرتے ہوئے یہ اندیشہ بھی نہ تھا کہ کوئی ادالار کا بندہ وہاں آکر اسے پہچان لے گا۔ اس کا ارادہ اس دفعہ حیا کے اپنے گھر آنے پہ اس سے ملنے کا تھا۔ تاکہ وہ ذرا تمیز سے بات کر کے اپنے پچھلے رویے کی معذرت کر لے۔ مگر اس سے پہلے پاکستان سے کال آگئی۔ اسے دو دن کے لیے وہاں جانا تھا۔ ویک اینڈ تک وہ واپس آجائے گا۔ کوئی اہم بریفنگ تھی۔

اس سہ پہر اس نے اپنا ٹریسر چیک کیا تو وہ تاقسم سے قریب ہی تھی۔ گورسل بس اس کو تاقسم پہ اتارتی تھی۔ وہ گورسل کا سارا شیڈول نیٹ پہ دیکھ کر حفظ کر چکا تھا۔ یعنی ابھی وہ تاقسم پہ اترے گی۔ اگر وہ وہیں اس سے مل لے اور اسے ویک اینڈ پہ گھر آنے کا کہہ دے تو وہ اس کی موجودگی میں ہی آئے گی۔ اگر غیر موجودگی میں آئی تو ابا کا بھروسا نہ تھا۔ وہ جانتے تھے' وہ پاکستان جاتا ہے اور وہ ادالار بھی جاتا تو ان کی زبان پہ اس کے لیے محض گالیاں اور لعنتیں ہوتیں کہ وہ پاکستان کیوں جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حیا ایسی کوئی بات سنے۔ اس لیے اس برستی بارش میں وہ اس کے لیے تاقسم آیا تھا۔ اس سے مل کر وہ فیری لے کر ادالار چلا جائے گا۔ تب ہی اس نے اپنا بریف کیس بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔

وہ جب میٹرو کی سیڑھیوں پہ تھی تو جہان نے اسے لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا۔ تب اس نے اس کی ایک تصویر کھینچی تھی۔ کبھی بعد میں وہ اسے وہ تصویر دکھائے گا۔

پھر جب وہ اتفاقیہ طور پہ اس سے ملا تو پہلی بات اس نے حیا کو ویک اینڈ پہ گھر آنے کی کہی۔ اس سارے میں صرف ایک بات اسے مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھی کہ میٹرو میں کچھ لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ بات سرخ کوٹ کی نہیں تھی۔ بات سرخ کوٹ کے ساتھ گہری سرخ لپ اسٹک کی تھی۔ مگر شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ اکیلی لڑکی' سرخ کوٹ اور گہرے میک اپ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ ریسٹورنٹ میں اس نے یوں ہی مذاقاً "اس کے کوٹ کا حوالہ دیا۔ تاکہ وہ واپس جا کر کسی سے اس بات کا مطلب پوچھے اور آئندہ اس طرح کا لباس پہن کر نہ نکلے۔

مگر ساری گڑبڑ تب ہوئی جب کافی کا کپ لبوں تک لے کر جاتے ہوئے اس نے حیا کو عبدالرحمٰن پاشا کے بارے میں استفسار کرتے سنا۔ کافی کی بھاپ نے لمحے بھر کو اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا اور گو کہ وہ ایک سیکنڈ میں ہی سنبھل چکا تھا۔ مگر وہ سیکنڈ بہت بھاری تھا۔

وہ کیسے جانتی تھی؟

اس نے بالخصوص اس سے ہی عبدالرحمٰن پاشا کا کیوں پوچھا؟

وہ اندر تک گڑبڑا گیا اور بات کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے شاید لمحے بھر کو وہ ذہنی طور پہ اتنا الجھ گیا تھا کہ بل کی فائل میں اپنا کریڈٹ کارڈ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ کر سکا کہ اس پہ عبدالرحمٰن پاشا لکھا ہے۔

یہ خیال اسے تب آیا جب اس نے حیا کو غصے سے اپنے ملک کی حمایت کرتے ہوئے فائل کی طرف بڑھتے دیکھا۔

اسی وقت قریب سے دو ویٹرز ایک ساتھ گزر رہے تھے۔ میزوں کے میز پوش زمین تک گرتے تھے۔ ایسے میں جب اس نے تہہ شدہ چھتری کو ذرا سا آگے سرکایا تو نہ حیا نے وہ دیکھا' نہ ہی پلیٹ اٹھائے ویٹر نے اور نتیجتاً "سب کچھ الٹ گیا۔ اس سارے معاملے میں حیا کو بل والی بات بھول چکی تھی۔ اس نے بہت آرام سے فائل سے کریڈٹ کارڈ نکال کر کرنسی نوٹ رکھ دیے۔

پتا نہیں وہ اس کے بارے میں کتنا جانتی تھی۔ یہی جاننے کے لیے اس نے واپسی پہ اسے کہا کہ وہ کیچڑ ٹھیک سے گھٹنے پہ لگائے' کیونکہ اس کی کور اسٹوری میں جھول تھا۔ اس نے "کور اسٹوری" کہتے ہوئے بغور حیا کا چہرہ دیکھا۔ کیونکہ کور اسٹوریز جاسوس ہی بنایا کرتے ہیں' مگر وہ نہیں چونکی۔

اسے ذرا اطمینان ہوا۔ وہ اتنا مشہور نہیں تھا کہ باہر سے آنے والا کوئی سیاح پہلے ہی روز اسے جان لے' شاید اس نے کسی ایسے شخص سے عبدالرحمٰن پاشا کے بارے میں سنا ہو جو اس کو ذاتی طور پہ جانتا ہو۔ بہر حال پہلے اس نے سوچا تھا کہ اس سے کہے گا کہ وہ ادالار میں کام کرتا ہے۔ مگر اب یہ خطرے والی بات تھی' سو اس نے دوسرا کور ڈھونڈا۔ وہ ایک معمولی سا ریسٹورنٹ منیجر تھا۔

پاکستان جانے سے قبل وہ ممی کو تاکید کر کے گیا تھا کہ اگر وہ اس کی غیر موجودگی میں آجاتی ہے تو وہ ابا کو اس سے ملنے مت دیں۔ پھر پاکستان جا کر وہ مصروف ہو گیا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ارم کے پاس جا سکے۔ اس لیے اس نے ایک پروفیشنل کو اس کام کے لیے بھیجا تھا۔ اسے معلوم تھا ارم' ضرور حیا کو فون کر کے بتائے گی۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ حیا اسے نہ بھولے۔ کہیں دور اندر اس کو یہ بے اعتباری تھی کہ وہ اسے بھول جائے گی اور اس خیال کے بعد دل جیسے خالی ہو جاتا تھا۔

جب وہ واپس آیا تو ابھی ایئر پورٹ کے راستے میں تھا۔ (قدیم شہر میں) جب حیا کا اس کو فون آیا۔ وہ آ رہی تھی۔ وہ پتا نہیں کیوں بہت مسرور تھا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا کہ وہ ان کے گھر آ رہی تھی۔ مگر جب تک وہ پہنچا' وہاں ایک ناگوار واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ اسے سخت غصہ اور افسوس تھا۔ پتا نہیں ابا نے کیا کیا کہہ دیا ہو گا۔ وہ اکثر اس پاکستانی جاسوس کا ذکر کرتے جس کو انہوں نے مارا تھا۔ ممی تو ان باتوں کو پاگل پن پہ محمول کرتیں۔ مگر وہ ان کا پس منظر جانتا تھا۔ سو اس کو تکلیف ہوتی۔ البتہ کوئی دوسرا ان باتوں سے کھٹک بھی سکتا تھا۔

حیا شاید ابا کے بارے میں نہیں جانتی تھی ہاں' ماموؤں نے اس بات کو ہر ممکن طور پہ دبانے کی کوشش کی ہو گی تب اس نے گھر کی بیرونی سیڑھیوں پہ بیٹھے ہوئے اس کو ابا کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ "ہم پاکستان نہیں جا سکتے۔" بات ٹھیک بھی تھی' وہ' ممی اور ابا اکٹھے پاکستان کبھی نہیں جا سکتے تھے۔ اس کا سارا موڈ برباد ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ جاتے ہوئے اس کو کہہ کر گیا تھا کہ وہ کھانا ضرور کھا کر جائے۔ پچھلی دفعہ بھی وہ نہیں کھا کر گئی تھی' وہ اس کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔

حیا کو وہیں چھوڑ کر وہ ادالار چلا آیا۔ ہوٹل جانے کے بجائے وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا تاکہ ذرا حلیہ ٹھیک کر کے باہر نکلے۔ تب ہی عائشے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اس سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔

جب وہ بولنا شروع ہوئی تو اس کی وہ خوش گمانی کہ اس نے عائشے کو اپنے کاموں میں مصروف کر دیا ہے ہوا میں اڑ گئی۔ یہ لڑکی واقعتاً "اس کے لیے مصیبت کھڑی کرنا چاہتی تھی۔

"کیا پاشا بے کا تم سے کوئی رابطہ ہے؟"

"میں نے تو پچھلے برس سے اسے نہیں دیکھا۔"
اس نے شانے اچکا کر لاپروائی سے کہا۔

وہ چند لمحے لب بھینچے اسے دیکھتی رہی، پھر ایک دم زور سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اسے عائشے سے کبھی یہ امید نہیں تھی۔ لمحے بھر کو وہ خود بھی سناٹے میں رہ گیا۔

"تم دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے ہو۔ تم نے خود اس کو نکالا ہے۔ مجھے کبریٰ کے بیٹے نے بتایا ہے کہ کچھ دن پہلے وہ تمہارے آفس میں آیا تھا اور تم دونوں جھگڑ رہے تھے۔ تم جانتے ہو اس کی وجہ سے آنے کتنی تکلیف میں ہیں اور تم پھر بھی ان سے چھپا رہے ہو؟ ان کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ پاشا بے زندہ ہے، وہ ٹھیک ہے۔ تم سچ کیوں نہیں بولتے؟" وہ بھیگی آنکھوں سے کہتی، اپنا سرخ پڑتا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دبا بھی رہی تھی۔ اس کا اپنا ہاتھ بھی بہت دکھ گیا تھا۔

"مجھے تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں رہا اب۔ تم ہماری زندگیوں سے دور کیوں نہیں چلے جاتے؟ اور تم کسی دن سارا مال سمیٹ کر دور چلے جاؤ گے، میں جانتی ہوں۔ اور پھر کیا ہوگا؟ آنے، وہ کتنا ہرٹ ہوں گی۔ اور میری بہن!" اس کی آواز میں دکھ کی جگہ غصے نے لے لی۔

"میری بہن سے بے تکلف مت ہوا کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ تمہاری وجہ سے ہرٹ ہو۔ سنا تم نے!" وہ سرخ ہاتھ کی انگشت شہادت اٹھا کر تنبیہہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

جہان نے اسی کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"نکل جاؤ اس کمرے سے۔ ابھی اسی وقت نکل جاؤ۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔"

وہ مزید کوئی لفظ کہے بنا گیلے چہرے کے ساتھ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد جہان نے ہاتھ سے اپنے رخسار کو چھوا۔

"کیا یہ صلہ ہوتا ہے قربانیوں کا؟ مگر نہیں، انسان تو کبھی کسی چیز کا صلہ نہیں دیا کرتے، پھر ان کے رویے کا افسوس کیا کرتا؟"

رات کھانے کے بعد وہ بہت سوچ کر عائشے کے پاس پچھلے باغیچے میں آیا۔ وہ اپنی ورک ٹیبل پہ کام کر رہی تھی۔ اسے بس نظر اٹھا کر دیکھا اور خاموشی سے کام کرنے لگی۔

وہ اسے مزید جھوٹ بول کر رام نہیں کر سکتا تھا۔ سو اس نے سچ کی ذرا سی ملاوٹ کر کے اسے بتایا کہ وہ دراصل ترک انٹیلی جنس کے لیے کام کرتا ہے۔ اس کی اور پاشا بے کی یہی ڈیل تھی، اسی لیے وہ ساتھ کام کرتے ہیں، مگر پاشا بے گرفتار ہو گیا تھا اور اگر آنے کو یہ بتایا جاتا تو وہ زیادہ ہرٹ ہوتیں۔ ہاں وہ پاشا بے سے اس دن جھگڑا ضرور تھا مگر صرف اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ طیب حبیب پاشا، آنے سے آکر مل لے، مگر وہ اپنی مجبوریوں کا رونا روئے جا رہا تھا۔

"کون سی مجبوریاں؟ اگر وہ جیل سے رہا ہو گیا ہے تو وہ یہاں کیوں نہیں آتا؟" وہ متذبذب سی پوچھ رہی تھی۔

"دیکھو! وہ رہا نہیں ہوا، وہ مفرور ہے، اب وہ انڈر گراؤنڈ ہے، اس طرح آزادی سے نہیں گھوم پھر سکتا۔ مگر بہت جلد وہ واپس آجائے گا، لیکن یہ جیل والی بات تم وعدہ کرو، کسی کو نہیں بتاؤ گی۔" اس کے سنجیدگی سے کہنے پہ عائشے نے وعدہ کر لیا اور معذرت بھی کر لی۔ مگر اس نے عائشے کی معذرت قبول نہیں کی۔

اس نے بہت سختی سے کہا کہ "مجھے تمہارے رویے سے دکھ پہنچا ہے۔ میں اپنا کام ختم کر کے تمہارے خاندان کا سارا پیسہ تمہیں لوٹا کر یہاں سے چلا جاؤں گا اور تم یا تمہاری بہن سے بے تکلف نہیں ہوں گا، لیکن تمہاری اس بدتمیزی کو بھلانے کے لیے مجھے کچھ وقت لگے گا۔"

"سوری!" اس نے سر جھکا دیا۔ وہ بنا کچھ کہے اٹھ آیا۔ ایک دفعہ پھر وہ عائشے کو مصروف کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ویلنٹائن کی رات اس نے ہاشم کے ذریعے حیا کے کمرے کے باہر پھول رکھوائے تھے، البتہ آج اس نے کاغذ پہ اپنے پیغام کے ساتھ نیچے لائم انک سے اے آر پی بھی لکھ دیا تھا۔ ساتھ میں اس نے کاغذ کو ذرا لائم کی خوشبو کا اسپرے کر کے بند کیا تھا، تاکہ کھولنے پہ وہ گیلا ہی محسوس ہو، اور وہ اسے آنچ ضرور دکھائے۔ پتا نہیں وہ "اے آر پی" سے کیا اخذ کرتی ہے۔ اس نے اے آر پی کے نام کی تختی ادالار میں اپنے آفس کے باہر بھی لگا رکھی تھی۔ لوگ اس کو عبدالرحمن پاشا کا مخفف ہی اخذ کرتے تھے جبکہ وہ اس سے اپنے کوڈ نیم مراد لیا کرتا تھا، شاید اس لیے کہ عبدالرحمن پاشا کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے بھی وہ کبھی نہ بھول سکے کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔

مگر اسے کسی نے بتایا کہ عبدالرحمن پاشا کون ہے؟ وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہ یہ جانتی ہے کہ جہان ہی عبدالرحمن ہے؟ وہ ایک دن اسے ضرور بتادے گا، مگر تب تک اسے اس چیز کو راز رکھنا ہوگا جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ وہ دونوں زندگی کے سفر میں ایک ساتھ چل سکتے ہیں یا نہیں۔

بہارے سے اس نے بے تکلف ہونا واقعی چھوڑ دیا تھا۔ عائشے سے وہ خود سے مخاطب بھی نہیں ہوتا تھا۔ آج کل ویسے بھی ادالار میں حالات اتنے اچھے نہیں جا رہے تھے کہ وہ زیادہ وقت ادھر گزارتا۔ اسے معلوم تھا طیب حبیب پاشا پھر کسی دن جھگڑا کرنے پہنچ جائے گا۔ لالچی انسان صبر نہیں کر رہا تھا۔ اور پھر ایک دن، وہ خود تو نہیں آیا، مگر اپنی ایک ساتھی عورت کو برگر کنگ اس سے بات کرنے بھیج دیا۔ پاشا بے فوری طور پہ کسی دوسرے ملک میں سیٹل ہونا چاہ رہا تھا، مگر اسے اس کی فیملی سمیت یہاں سے ابھی بھیجنا جہان کے لیے مشکل ہو سکتا تھا۔ وہ کافی دیر اس کی ساتھی خاتون سے بحث کرتا رہا کہ وہ انتظار اور اعتبار کرنا سیکھ جائے، مگر گفتگو تلخ سے تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی بار بار اس کا موبائل الرٹ دے رہا تھا۔ بالآخر اس نے گفتگو درمیان میں روک کر موبائل دیکھا۔ اس کا ٹریسر الرٹ ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی قریب میں ہی تھی۔ استقلال اسٹریٹ کے دہانے پہ۔

"شٹ!" وہ جی بھر کے بے زار ہوا تھا۔ یہی ڈر تھا اسے۔ اپنی ذاتی اور کاروباری زندگی کو الگ الگ رکھنے کی کوشش میں کچھ غلط نہ ہو جائے۔ اس کے کاروباری لوگ اس کی ذاتی زندگی سے وابستہ کسی لڑکی کو دیکھیں، دوسرے معنوں میں اس کی کوئی کمزوری پکڑنے کی کوشش کریں، وہ فوراً "نیاہت" سے کھلی فضا میں بات کرنے کا کہہ کر باہر نکلا تھا، مگر پھر بھی اس کا سامنا حیا سے ہو گیا۔

وہ اکیلی تھی، اور اس کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ چمک سی آگئی تھی۔ وہ جیسے اس کو اپنے سامنے پا کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ یقیناً "اسی سے ملنے آئی تھی، مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ نیاہت اس کے بارے میں کچھ جانے، اسی لیے اسے سختی سے حیا سے بات کر کے اسے خود سے دور کرنا پڑا۔ مگر اس کا اپنا دل بہت دکھ گیا تھا۔ اس نے آخری پل اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ وہ بری طرح ہرٹ ہوئی تھی اور یہ بات اب جہان کو بہت ہرٹ کر رہی تھی۔

کچھ دن اس نے صبر کیا، پھر سوچا جا کر اس سے معذرت کر لے۔ پتا نہیں کیوں، مگر وہ اس لڑکی کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ بھلے ان دونوں کا رشتہ قائم ہو یا نہ ہو، وہ اس کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ڈورم کا نمبر وغیرہ سب جانتا تھا، مگر پھر بھی اس نے ممی سے پاکستان فون کروا کر فاطمہ مامی سے ڈورم بلاک اور کمرے کا نمبر معلوم کروایا تھا، تاکہ وہ بعد میں وضاحت کر سکے کہ اسے ڈورم نمبر کس طرح پتا چلا۔

اس کے ڈورم بلاک کی بیرونی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ایک لڑکی کو کتابیں تھامے، فون کان سے لگائے زینے اترتے دیکھا۔ اسکارف میں لپٹا دودھیا چہرہ اور سرمئی آنکھیں۔ وہ تیزی سے اوپر چڑھتا گیا، مگر اس کی بہت اچھی یادداشت اسے بتا رہی تھی کہ اس لڑکی کو اس نے پہلے بھی دیکھ رکھا ہے۔ مگر کہاں، کب اور کیسے؟ وہ یہی سوچتا ہوا اوپر آیا اور ان

ہی سوچوں میں غلطاں اس نے اپنے ازلی بنا چاپ پیدا کیے انداز میں چلتے ہوئے کامن روم کا دروازہ ذرا زور سے دھکیلا۔

اور پھر جو ہوا' وہ بہت برا تھا۔

حیا ہاتھ میں جنجربریڈ ہاؤس کی ٹرے پکڑے دروازہ بند کر رہی تھی' اسے غیر متوقع سی ٹکر لگی اور ٹرے زمین بوس ہو گئی۔ وہ سخت متاسف و ششدر رہ گیا۔ بہت محنت سے بنائی گئی چیز کو صرف اس کی لمحے بھر کی غفلت نے تباہ کر دیا گیا تھا وہ معذرت کرنا چاہ رہا تھا' اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا' مگر وہی حیا کی ایک دم سے ری ایکٹ کر دینے کی عادت پہلے سلش' پھر حلوکی انگلیاں اور اب جنجربریڈ کا ٹکڑا اٹھا کر اس نے جہان کے منہ پہ دے مارا مگر اسے زیادہ تکلیف اس کے الفاظ نے پہنچائی۔ وہ اس کی زندگی سے نکل جائے کیونکہ وہ اس کے لیے دکھ اور عذاب کے سوا کچھ نہیں لاتا۔

وہ واقعی چاہتی تھی کہ وہ اس کی زندگی سے نکل جائے؟

وہ جھیل تک اس کے پیچھے گیا' اس نے اسے بتانے کی کوشش کی کہ اپنی تیز زندگی میں بہت تیز چلتے ہوئے وہ اس کا بہت سا نقصان کر بیٹھا ہے' مگر وہ اس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی تھی۔

اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک وہ جھیل کے کنارے بیٹھا رہا۔ آج وہ بہت غصے میں تھی اور یہ غصہ صرف جنجربریڈ ہاؤس کے ٹوٹنے کا نہیں تھا۔ کیا ان دونوں کے درمیان کچھ باقی تھا؟ اس نے کہا' اس کی زندگی میں جنجربریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل ہیں' کیا وہ اس سفید پھولوں کے بھیجنے والے سے بھی پریشان تھی؟ وہ خوامخواہ اس کو اذیت دے رہا تھا وہ کیا کرے کم از کم وہ اس پہ اتنا بھروسا تو کرے کہ اپنے مسائل شیئر کرے پھر اس نے سوچا اگر وہ اپنی موجودگی میں عبدالرحمن پاشا کی طرف سے اسے کال کرے' تو شاید وہ اس کو بتا دے کہ یہ آدمی اسے ستا رہا ہے؟

اس رات جب وہ دونوں کچن میں تھے' اس نے Timed کال کی مدد سے حیا کو کال کی۔ اس نے سوچا تھا کہ دس سیکنڈ کی ریکارڈنگ کے بعد لے فون حیا کے ہاتھ سے لے لیتا ہے' مگر حیا نے اس کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ یا تو اس پہ بھروسا نہیں کرتی تھی یا پھر اپنے مسائل خود حل کرنا چاہتی تھی۔

وہ اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ایک اور کوشش کی اس نے ہفتے کی رات کا ڈنر پلان کیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس پہ کتنا اعتبار کرتی ہے؟ وہ اس کو پھول بھیجے گا' وہ پھول لے کر جہان کے سامنے کیا ردعمل دے گی؟ اگر وہ اسے سچ سچ سب کچھ اول تا آخر بتا دیتی ہے تو وہ اسے سچ بتا دے گا۔ اس کا ارادہ ڈنر پہ وہ سارا میس کری ایٹ کرنے کا ہرگز نہیں تھا' مگر جس چیز نے اسے غصہ چڑھایا وہ یہ تھی کہ وہ عبدالرحمن کی بھیجی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی بھیجتے ہوئے اس نے ہاشم کو تاکید کی تھی کہ وہ عبدالرحمن کا نام صرف اس کے پوچھنے پہ لے گا اور وہ جانتا تھا کہ وہ گاڑی میں کبھی نہیں بیٹھے گی' مگر جب وہ اسی گاڑی میں آئی تو اسے بے اختیار دھکا سا لگا۔

کیا وہ واقعی ہر ایک کی گاڑی میں بیٹھنے والی لڑکی تھی؟

بے اختیار اسے وہ رات یاد آئی جب اس نے حیا کو اس لڑکے کی گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔ جو نرم گوشہ پھر سے اس کے دل میں بننے لگا تھا' وہ پل بھر میں دب گیا۔ گو کہ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ اسے جہان کی گاڑی ہی سمجھی تھی' مگر اتنی بھی کیا لاپروائی کہ آپ یونہی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ جاؤ؟ اسے سخت غصہ چڑھا تھا' مگر پھر وہی حیا کی عادت۔ وہ غصے میں ہاتھ مار کر گلدان توڑ کر چلی گئی۔

اسے ذرا سا افسوس ہوا' مگر یہ کوئی چھوٹی غلطی تو نہ تھی۔ اگر اس کی جگہ وہ گاڑی کسی اور نے بھیجی ہوتی تو؟

وہ اپنا موبائل بھول گئی تھی' اس نے موبائل اٹھایا اور بر گر کنگ آ گیا۔ یہ اس کا ترک سم والا موبائل تھا جس کو وہ "عموماً" اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اب کل وہ ادالار جائے گا' تو وہاں رکھے سرویلنس آلات میں سے ایک اچھا ٹریسر اس میں بھی لگا دے گا۔ یہی سوچ کر وہ اس کا موبائل لیے بیوک ادا آ گیا۔

ہوٹل میں کچھ مسئلے بڑھ گئے تھے۔ اس طرح کا موقع چھ سات ماہ قبل آیا تھا اور ایسے وقت میں پیچھے سے آپ کا باس آپ کو deactivate (غیر فعال) ہو جانے کی ہدایت کر دیا کرتا ہے' اس کو بھی یہی ہدایت مل گئی تھی۔ وہ آفیشلی کچھ ہفتوں کے لیے انڈیا جانے کا کہہ کر ادالار سے پیک اپ کرنے لگا تھا۔ وہ اس نے بس استقلال اسٹریٹ تک بتایا تھا' مگر آنے کو بھی بتایا تھا کہ وہ انڈیا جا رہا ہے' شاید اس دفعہ واپس نہ آئے۔ وہ ہر دفعہ جانے سے قبل یہی کہا کرتا تھا' وہ نہیں چاہتا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو جائے یا واپسی کا حکم نہ ملے تو کوئی ایک عمر اس کی راہ دیکھتا رہے۔

پھر اچانک ہی حیا کی دوست ڈی جے کا فون آ گیا۔ وہ دونوں لڑکیاں بیوک ادا جانا چاہتی تھیں اور ان کو کمپنی چاہیے تھی۔

اب وہ کیا کرے؟

"جہان سکندر" تو پچھلے تین برس سے ادالار نہیں گیا تھا۔ وہاں تو ہمیشہ عبدالرحمن پاشا جاتا اور رہتا تھا مگر حیا ناراض تھی' اسی لیے اس نے اس دن کا انتخاب کیا' بس کی صبح اسے ادالار چھوڑنا تھا۔

درمیان کے دو دن اپنے سارے کام پیک اپ کرتے ہوئے بھی وہ اپنے اور حیا کے رشتے کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ (غیر محسوس طریقے سے وہ پھر سے "اس لڑکی" سے حیا پہ آ گیا تھا۔) تب کچھ سوچ کر اس نے حیا کو فون کیا۔ عبدالرحمن پاشا اس سے ملنا چاہتا ہے' یہ بات سن کر وہ کیا کہے گی؟ اب بالآخر اس ناٹک کو ختم ہونا چاہیے۔ میجر احمد کو جب اس نے انکار کیا تو تب وہ جہان جیسے بے مروت اور اکھڑ آدمی کو نہیں جانتی تھی' مگر اب وہ جانتی تھی۔ کیا اب وہ کسی امیر آدمی کا سارا جاہ و حشمت دیکھ کر بھی اسی معمولی سے ریسٹورنٹ اونر کی وجہ سے اس کو انکار کرے گی؟ اور ہر دفعہ یہ "وجہ" جہان کیوں ہو؟ وہ لڑکا جس کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھی تھی' اس کا ذکر کیوں نہیں کرتی وہ؟ وہ دونوں سے اتنا بے اعتبار اور مشکوک ہو چکا تھا کہ اتنا سب کچھ دیکھنے کے باوجود اس کا دماغ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ لڑکی اس جیسے آدمی کے ساتھ رشتہ رکھنا چاہتی ہو گی۔

آنے ان لوگوں میں سے تھیں جو اس کی مٹھی میں تھے۔ اس نے آنے کو ایک اسکرپٹ یاد کروایا تھا' اگر وہ ہاں کہے تب یہ کہنا ہے' اگر ہاں کہے تب یہ۔ آنے کو اس نے یہ جتایا تھا کہ وہ اس لڑکی کو پسند کرتا ہے' مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔

آنے مان گئیں۔ ویسے بھی جو باتیں انہوں نے اس سے کہنی تھیں' ان میں کچھ بھی جھوٹ نہیں تھا۔ عبدالرحمن نے واقعی اسے اس چیری بلنچ والے دن دیکھا تھا' ڈولی اس کے آبائی گھر کا پرانا خادم تھا۔ خادم یعنی سرونٹ۔ سول سرونٹ' گورنمنٹ سرونٹ۔ وہ بے چارہ میجر جسے اس نے بے عزت کیا تھا وہ کرنل گیلانی کا بیٹا تھا اور حیا کی ویڈیو ہٹوانے کے لیے اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ بس یہ سچ نہیں تھا کہ وہ اس کے کرنل گیلانی کا بیٹا ہونے سے لاعلم تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حیا سمجھے' عبدالرحمن کوئی برا آدمی ہے اور اس کے شوہر کے "دشمنوں" کے ساتھ ہے۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ انکار کرتی ہے یا سوچنے کے لیے وقت مانگتی ہے؟

اس نے سوچا تھا کہ بیوک ادا کی گلیوں میں اپنے رف سے جینز' سوئیٹر اور بکھرے بالوں والے حلیے میں پھرتے ہوئے اسے اپنا کوئی شناسا نہیں ملے گا' آخر بیوک ادا کے سات ہزار رہائشی افراد میں سے ہر شخص تو اس کا جاننے والا نہیں تھا' مگر وہ غلط تھا۔

جب وہ تینوں ٹہلتے ہوئے مین بازار میں پہنچے تو سڑک کے عین وسط میں مجمع سا لگا تھا۔ بہارے گل کا ریڈ کارپٹ شو۔ حیا اور ڈی جے بے اختیار اس کی تصاویر بنانے لگیں اور وہ ذرا سا رخ موڑے' ناگواری سے سارا تماشا دیکھنے لگا۔ وہ اس طرح کھڑا تھا کہ بہارے کی اس کی جانب پشت تھی۔ اب وہ ڈی جے اور حیا کو فوراً "چلنے" کا کہہ کر خود کو مشکوک نہیں کر سکتا تھا۔ سو ان کو مصروف پا کر اس نے موبائل پہ عائشے کو

میسج لکھا۔

"تمہاری سات دن کی تربیت کا یہ اثر ہوا ہے کہ تمہاری بہن پورے ادالار کے سیاحوں سے تصاویر بنوا رہی ہے۔"

اسے معلوم تھا کہ عائشے سامنے دکان میں ہی ہوگی جہاں وہ اپنے پزل باکسز بیچا کرتی تھی۔ پچھلے سات دنوں سے وہ بہارے کو زبردستی اپنے ہمراہ حلیمہ عثمان کے گھر قرآن پڑھنے لے جاتی تھی۔

"میں کچھ دوستوں کے ساتھ ہوں' مجھے پہچاننا نہیں۔" ایک دوسرا پیغام احتیاطاً" بھیج کر اس نے موبائل بند کر دیا۔ مگر وہ نہ بھی کہتا' تب بھی عائشے ایسی لڑکی نہیں تھی کہ بھرے مجمع میں اسے پکار لے۔ اس کی پہلی بات پہ وہ ہرٹ ہوئی تھی تب ہی فوراً" اپنی بہن کو لینے پہنچی اور اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجمع چھٹنے لگا اور اس سے پہلے کہ بہارے گل اسے دیکھتی' وہ دونوں لڑکیوں کو لیے پلٹ گیا۔

بھی پہ حیا کے ہمراہ' بیوک ادا کی گلیوں سے گزرتے ہوئے' عائشے مسلسل اسے پیغامات بھیج رہی تھی۔

"آنے نے کہا تھا تم نے صبح کی فلائٹ سے انڈیا جانا ہے' مگر تم تو یہیں ہو کیا خیریت ہے؟ اور کیا یہ وہی لڑکی ہے' جس کا ذکر آنے کر رہی تھیں؟"

وہی عائشے کی تفتیش کرنے کی عادت اس کو یقیناً" آنے نے بتایا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرنے لگا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ وہ حیا کے ساتھ بات کرتے ہوئے اسے جواباً" یہی بتا رہا تھا کہ وہ بعد میں وضاحت کر دے گا اور ابھی وہ نماز پڑھنے ان کی مسجد میں ہی آئے گا اور اگر حسب معمول دونوں بہنیں مسجد میں ہوں تو اسے مت پہچانے اور وہ بہارے کو اس معاملے سے دور رکھے۔

"ہم مسجد میں ہیں مگر اندر والے کمرے میں' تم آجاؤ۔ ہم تمہیں ویسے ہی نہیں پہچانتے تو اب کیا کہیں گے۔"

اپنے سفید محل کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے برائے بات سرسری سا اشارہ ان گھروں کی جانب کیا تھا وہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ وہ ان جیسا کوئی گھر اپنی تنخواہ سے نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ فلموں میں ہوتا ہے کہ اسائنمنٹ ختم ہونے کے بعد ایجنٹ کو نوٹوں سے بھرا بریف کیس ملا کرتا ہے' اصل میں صرف پیٹ پہ تھپکی ملتی تھی اور کچھ نہیں۔ پاکستان میں جاسوس سے زیادہ انڈر پیڈ شاید ہی کوئی ہو۔ معمولی تنخواہ اور آپ کے گرفتار ہونے یا مرنے کی صورت میں فیملی کو مالی امداد (ایک بہت قلیل مالی امداد) دینے کا وعدہ' بس یہی ملا کرتا تھا۔ بعد میں جب ایجنسی سے تبادلہ ہو کر واپس فوج میں چلا جائے گا اور اگر اس مستقل درد سر نے کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہ کیا تو ترقی ملنے کے بعد شاید وہ "غریب آدمی" نہ رہے' لیکن ابھی وہ غریب آدمی ہی تھا۔

مسجد سے نکلتے ہوئے حیا نے جب پوچھا کہ اس نے دعا میں کیا مانگا تو اس نے کہا' اس نے زندگی مانگی اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ زندگی وہ ہمیشہ مانگا کرتا تھا' مگر ابھی اس نے یہی مانگا تھا کہ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی ایک امیر آدمی کا عالیشان محل دیکھنے کے بعد اپنے غریب شوہر کو چھوڑنے کا نہ سوچے۔ اپنوں کا کوئی ایسے امتحان لیتا ہے بھلا؟ اسے خود پہ افسوس ہوا۔ مگر یہی تو وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ [illegible] اس کے اپنوں میں سے ہے یا نہیں' البتہ وہ اس کی "زندگی" والی بات نہیں سمجھ سکی۔ وہ اس کی پہیلیوں کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔

"حیا" عبرانی زبان کے لفظ "حوا" سے نکلا ہے جو کہ اماں حوا علیہ السلام کا نام تھا۔ حوا کے معنی ہے "زندگی"۔ سو حیا کے بھی یہی معنی ہیں۔ اسی لیے عربی میں حیا کا لفظی معنی ترو تازگی و شادابی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں زندگی کی علامت ہوتی ہیں اسی سے لفظ "حیات" (زندگی) اور اللہ تعالیٰ کی صفت "الحی" (ہمیشہ زندہ رہنے والا) ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی شرم اور modesty اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ شرم انسان کی اخلاقی زندگی وہ کردار کو ترو تازہ اور زندہ رکھتی ہے' مگر وہ نہیں سمجھ سکی۔

لیری پہ جب وہ بچہ اس کا پرس چھیننے آیا تو وہ اس کی

[illegible]ٹ کے مطابق بالوں میں لگانے والی موتیوں کی [illegible] لے کر ہی آیا تھا' جس واحد چیز کے لیے وہ رکے وہ اس کے بالوں کی خوب صورتی میں اضافہ کرنے والی چیز ہی ہونی چاہیے تھی اور جتنی جلدی رد عمل [illegible] کرنے والی وہ لڑکی تھی' وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے [illegible]ٹ اور آئی ڈی کارڈ کے لیے ضرور بھاگے گی۔

جب وہ دونوں دوبارہ تھانے میں ملے تو وہ رو رہی [illegible] نہیں وہ کس بات پہ رو رہی تھی' آنے سے [illegible] اس کی بات نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس روز پہلی دفعہ [illegible] پورے استحقاق سے اسے جھڑکا تھا۔ اسے لگا [illegible] حیا اپنے غریب شوہر کو نہیں چھوڑا۔ اس کا کار [illegible] اس لڑکے سے کوئی تعلق نہیں ہو گا' وہ واقعی [illegible] کے ساتھ رہنا چاہتی تھی' سو بس' یہ ڈراما ختم۔

رات آنے سے بات کر کے اس کی تصدیق کرنے کے بعد اس نے ہاشم کو کہا کہ وہ مزید اس لڑکی کا پیچھا نہیں کرے گا۔ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔

ہاشم اپنے بیٹے کی بیماری کا ذکر کر رہا تھا' مگر اس نے دلچسپی نہیں لی۔ ہوٹل گرینڈ کا پیسہ اس کا ذاتی پیسہ تھا' ذاتی تو اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور ہاشم سدا کا جواری' اپنی ساری جمع پونجی تو وہ جوئے میں لٹا آتا تھا پھر وہ کیوں اس کی مدد کرے؟ اپنے تئیں اس نے بات ختم کر دی۔ تب ہی عائشے کا میسج آیا۔

"میں نے آنے سے پوچھا تھا' وہ کہہ رہی ہیں کہ تم صبح کی فلائٹ سے انڈیا چلے گئے تھے۔ ویسے اتنے سارے لوگوں سے ایک وقت میں اتنے سارے جھوٹ بولتے ہوئے تمہیں کبھی افسوس نہیں ہوتا؟"

"نہیں۔" اس نے یک لفظی جواب بھیج کر ادالار والی سم بند کر دی۔ یہ عائشے کبھی نا' کسی دن اسے مروائے گی۔

☆ ☆ ☆
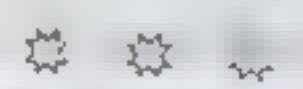
اگلے ہی روز اس نے ہاشم کو ادالار بھیجا اور وہ اس وقت تک اس دکان پہ کھڑا رہا جب تک کہ عائشے نہیں آگئی۔ تب اس نے عائشے کو چھ چوکھٹوں والے

پزل باکس کا آرڈر لکھوا دیا اور چوکھٹے بھی وہ جن پہ ترکی کے بجائے انگریزی حروف تہجی ہوں۔ ساتھ میں اس نے عبدالرحمن کو بتانے سے سختی سے منع بھی کیا۔ وجہ صاف تھی۔ اسے وہ پزل باکس حیا کو دینا تھا۔ جیسے وہ اپنی معلومات اور کلاسیفائڈ ڈاکومنٹس ایک ایجنٹ سے دوسرے کو منتقل کرتے تھے کہ کہیں کسی لاکر میں کچھ چھوڑ دیا' یا ٹریش کین میں' اور بعد میں کسی دوسرے ایجنٹ نے آکر اسے اٹھا لیا' تاکہ ایجنٹ کو معلوم نہ ہو سکے کہ اس کا دوسرا ساتھی کون ہے اور پکڑے جانے کی صورت میں وہ اپنے ساتھی کے لیے کوئی خطرہ نہ بنے۔ اس نے بھی اپنی اصلیت بتانے کے لیے کسی ایسے ہی ٹریژر ہنٹ کا سوچا تھا خود آمنے سامنے وہ کبھی نہیں بتائے گا۔ اس کی بیوی کو اس کو سمجھ کر' اسے خود ڈھونڈنا چاہیے۔ مگر جب وہ پزل باکس اس تک پہنچے گا اور بالفرض کسی طرح اس نے ادالار تک اس باکس کے بنانے والوں کو ٹریس کر لیا' تو وہاں سے وہ محض اتنا جان پائے گی کہ یہ کام عبدالرحمن کے علاوہ کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ حیا اس کو تلاش کرے' یہ وہ چاہتا تھا' مگر وہ اس کی جاسوسی کرے' یہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

اگلے چند روز خیریت سے گزر گئے۔ وہ غیر فعال ہو کر بس اپنے ریسٹورنٹ اور گھر تک محدود ہو گیا تھا۔ ان ہی دنوں اسے اس لڑکی کا خیال بار بار آتا رہا جو اس نے سبانجی میں دیکھی تھی' وہ اس کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اسے یاد تھا کہ پچھلے سال سبانجی کے کچھ اسٹوڈنٹس انٹرن شپ پروگرام کے تحت ہوٹل گرینڈ آئے تھے اور چند ہفتے انہوں نے وہاں کام کیا تھا۔ اس نے کمپیوٹر میں سارا ڈیٹا کھولا اور ایک ایک انٹری کو چیک کرتے ہوئے بالآخر وہ اسے مل ہی گئی۔

ہالے نور جونگ لو۔ رومی فورم کی ایک کارکن۔ اس کا فیلڈ ریکارڈ بھی کافی اچھا تھا۔ وہ اس کی ایمپلائی تھی' اور اپنے ہر ایمپلائی کا سارا بائیو ڈیٹا وہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ مگر اس کے ہر ملازم نے اسے نہیں دیکھ رکھا تھا۔ وہ ہوٹل مالکان کی طرح پرائیویٹ لفٹ استعمال

کرتا تھا اور نچلے درجے کے عہدوں پہ کام کرنے والے ملازموں کی اس سے کوئی ملاقات نہ تھی اور انٹرنیز سے کہاں اس کا رابطہ ہو پاتا تھا۔ پھر بھی شاید یونہی آتے جاتے اس لڑکی نے اسے دیکھ رکھا ہو۔ وہ اسی ڈورم بلاک سے نکل رہی تھی جو حیا کا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں کسی کام سے آئی ہو اور اس کا اپنا بلاک کوئی دوسرا ہو اور اس کا حیا سے کوئی رابطہ نہ ہو اور اس نے کبھی گرینڈ ہوٹل اونر کو نہ دیکھ رکھا ہو۔ آئندہ وہ سبانجی جاتے ہوئے احتیاط کرے گا ورنہ دنیا واقعی بہت چھوٹی تھی۔

چند دن بعد ایک صبح کام کرتے ہوئے اس کے سر میں بہت درد اٹھنے لگا تھا۔ یہ درد اسے بہت چڑچڑا بھی بنا دیتا تھا۔ وہ زور سے کھٹ کھٹ کرتا گوشت کاٹ رہا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے قبضہ مافیا کے کچھ لوگ اس کو تنگ کر رہے تھے۔ ریسٹورنٹ کی لیز کا معاملہ تھا اور پاشا بے کے ساتھ ان کی کوئی تلخی ہو چکی تھی۔ ایسے میں اسے اپنے ریسٹورنٹ کی سیکورٹی کے لیے اپلائی کرنا تھا، مگر اس سے قبل وہ کوئی ٹھوس واقعہ ایسا چاہتا تھا کہ جس سے اس کا کیس آسان ہو جائے۔ ارادہ تھا کہ آج سہ پہر میں کچھ اپنے آدمیوں سے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کروا کر سیکورٹی کلیم اور انشورنس کلیم دونوں حاصل کرلے گا۔ ایسے وقت میں اسے موقع سے ہٹ جانا چاہیے۔ اسی وقت حیا اور ڈی جے آگئیں۔

تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ ان کے ساتھ چل پڑا۔ سر کا درد بخار میں تبدیل ہو گیا، مگر وہ ان کا ساتھ دیتا رہا۔ پھر ڈی جے کو سر درد کی شکایت ہونے لگی، وہ واپس جانا چاہتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ دونوں توپ قپی کے عقبی برآمدے میں آبیٹھے۔ حیا نے کہا بھی کہ وہ واپس چلا جائے، مگر ابھی ریسٹورنٹ پہ وہ ڈراما ہو رہا تھا، ابھی وہ کیسے واپس جا سکتا تھا۔ البتہ سر درد کے باعث وہ شال تان کر لیٹ گیا۔ اس کو نیند ویسے بھی مشکل سے آتی تھی، پھر ابھی ایک پبلک پلیس پہ کیسے سو سکتا تھا؟ بس یونہی لیٹا رہا۔

تب ہی اس نے محسوس کیا کہ اس سے ایک زینہ نیچے بیٹھی حیا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا ہے شاید یہ جاننے کے لیے وہ سو رہا ہے یا نہیں۔

وہ ذرا سا کھٹک گیا۔ اس نے آنکھوں سے بازو ذرا ترچھا کر دیکھا، وہ موبائل پہ کسی کو میسج کر رہی تھی۔ جہان نے ذرا سی گردن اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پہ اوپر انڈیا کا نمبر نظر آرہا تھا۔

اسی کا نمبر۔ وہ پیغام تو نہیں دیکھ سکا، مگر یہ وہی نمبر تھا جس سے چند روز قبل اس نے حیا کو میسج کیا تھا۔ اے آر پی تو اس کا پیچھا چھوڑ چکا تھا، پھر وہ اس سے کیوں رابطہ کر رہی تھی؟ چند منٹ ٹھہر کر اس نے بائیں ہاتھ سے جینز کی جیب سے موبائل نکالا۔ (وہ اس کے دائیں جانب ایک زینہ نیچے بیٹھی تھی، سو دیکھ نہیں سکتی تھی۔) اس نے اسی طرح لیٹے لیٹے انڈین سم آن کی، پھر ذرا سا چہرہ موڑ کر "ایکسچینج اسٹوڈنٹ" کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے سامنے بات نہیں کرے گی اور واقعی وہ اٹھ کر منڈیر تک چلی گئی۔ وہیں شال گردن سے اوپر تک لیے، آنکھوں پہ بازو رکھے وہ بیند زفری سے اس سے کچھ دیر بات کرتا رہا۔ وہ چاہتی تھی کہ عبدالرحمٰن اس کے کزن کی مدد کرے۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ مدد کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کر دیا۔

مگر جب وہ واپس ریسٹورنٹ پہنچے تو توڑ پھوڑ دیکھ کر اسے احساس ہوا، حیا اسے عبدالرحمٰن پاشا کی حرکت سمجھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے۔

چلو، یہ بھی ٹھیک تھا۔ اسے سبق مل گیا ہو گا کہ اپنے مسائل حل کروانے کے لیے دوسروں کا رخ کبھی نہیں کرتے۔

وہ دوبارہ سبانجی نہیں گیا، مگر اس روز جب وہ گھر پہنچا تو اپنے لاؤنج میں حیا کے ہمراہ ان تین لڑکیوں میں ہالے نور کو دیکھ کر اس کا لمحے بھر کو سانس ہی رک گیا۔ ہالے نے اس کے سلام کا جواب دے کر بغور اسے دیکھا تھا۔ وہ بنا مزید کچھ کہے کچن میں چلا آیا۔

یہ لڑکی جس کا تعلق ہوٹل گرینڈ سے رہ چکا تھا اس کو اس گھر میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے تھا۔

تب اس نے ترکی میں وہ تکلیف دہ الفاظ کہے تو ممی تو ششدر رہ ہی گئیں، مگر وہ لڑکی بھی چونک گئی۔ پانچ منٹ بھی نہیں لگے اور وہ چاروں وہاں سے چلی گئیں۔

"یہ کیا بدتمیزی تھی جہان؟" ممی ابھی تک ششدر تھیں۔

"وہ اسکارف والی لڑکی مجھے کسی اور حوالے سے جانتی تھی، میری بیوی کی وجہ سے میرے کور کو نقصان پہنچ جاتا تو میرا کورٹ مارشل ہو جائے گا ممی۔"

"اوہ!" وہ خاموش ہو گئیں۔

اس نے سوچا تھا، وہ پھر حیا سے معذرت کرلے گا، جیسا کہ ہمیشہ ہوتا تھا۔ مگر موقع ملنے سے قبل ہی وہ انقرہ چلا گیا۔ وہاں کچھ کام تھا اور جس دن وہ واپس آرہا تھا، تب حیا کا میسج ملا۔ ڈی جے تاقسم فرسٹ ایڈ میں ایڈمٹ تھی۔ اسے برین ہیمبرج ہوا تھا۔

وہیں ایئرپورٹ سے اس نے تاقسم فرسٹ ایڈ میں ایک جاننے والے کو فون کیا۔ ڈی جے کا برین انیورزم پھٹ گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس کے پاس چند گھنٹے تھے۔ اسے یاد آیا، وہ توپ قپی میں سر درد کی شکایت کر رہی تھی۔

استنبول پہنچتے ہی وہ سیدھا حیا کے پاس پہنچا۔ اس کے حساب کردہ گھنٹے ختم ہونے کو تھے۔ کسی بھی وقت وہ ڈی جے کی موت کی خبر دے دیں گے، پھر باڈی کلیئرنس کروانے میں وقت لگے گا، باڈی پاکستان جائے گی، ظاہر ہے حیا بھی ساتھ ہی جائے گی۔ یعنی دو تین دن وہ نہیں سو سکیں گے اور موت کی خبر ملنے کے بعد وہ کچھ نہیں کھائے گی، حقیقت پسندی سے تجزیہ کرتے ہوئے اس کو صرف حیا کی فکر تھی۔ ڈاکٹر کے خبر دے دینے کے باوجود اس نے یہ خبر اسے تب دی جب وہ ... پہنچ چکی تھی۔

... وہ تین دن بہت تکلیف دہ تھے۔ اسے ڈی جے کی موت کا بہت افسوس تھا، لیکن اپنی جاب کے دوران اتنے لوگوں کو اپنے سامنے مرتے دیکھ چکا تھا کہ ... کی طرح وہ بھی ذرا immune ہو چکا تھا۔

مگر حیا کو روتے دیکھ کر اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ سو وہ جو سمجھتا تھا کہ جیل کے ان تاریک دنوں نے اس کے اندر سے ساری حساسیت کو نگل لیا ہے، تو شاید وہ غلط تھا۔

باڈی کلیئرنس ملنے سے قبل وہ حیا کے ہمراہ سبانجی گیا تھا (ہالے نور سمیت اسٹوڈنٹس کی اکثریت اسپرنگ بریک پہ جا چکی تھی۔) ڈی جے کی چیزیں اس نے ساتھ ہی پیک کروائی تھیں۔ اس کے رجسٹرز اکٹھے کرتے ہوئے وہ بھیگی آواز میں کہہ رہی تھی کہ ڈی جے اپنے نوٹس یا رجسٹرز فوٹو کاپی شاپ پہ بھول جاتی تھی، اس لیے وہ فوٹو کاپی شاپ تک گیا، مگر جب وہاں رکھے ڈی جے کے رجسٹر کا پہلا صفحہ اس نے پلٹا تو اس پہ بڑا بڑا کر کے یونانی فلسفی ہراقلیطس کا ایک قول لکھا تھا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر رجسٹر وہیں چھوڑ کر واپس آگیا۔ حیا اس وقت ذہنی طور پہ اتنی ڈسٹرب تھی کہ اس کو کچھ پوچھنے کا ہوش نہیں تھا۔ بعد میں وہ واپس آکر یہ رجسٹر لے گی تو اس قول کو ضرور پڑھے گی، وہ اسے اپنے پزل باکس کے اوپر لکھ سکتا تھا۔ ڈی جے فلسفے کی طالبہ تھی تو شاید حیا بھی اس فلاسفی کے پس منظر سے واقف ہو۔

ممی کے مجبور کرنے پہ وہ اپنے کنٹرولر سے اجازت لے کر حیا کے ہمراہ پاکستان آیا۔ وہی موقع جس سے وہ بھاگتا تھا، سامنے آگیا تھا۔ اپنے ماموؤں کے سامنے آج بھی وہ خود کو کمزور محسوس کرتا تھا۔ چونکہ وہ ترک شہری کے طور پہ آیا تھا، اس لیے اس کی حرکات و سکنات اپنے کور کے مطابق تھیں۔ بھلے وہ انگریزی میں بات کرنا ہو، گھاس پہ جوتوں سمیت نہ چلنا ہو یا بنا جوتوں کے گھر میں داخل ہونا، وہ وہی بنا رہا جو وہ لوگ اس کو سمجھتے تھے۔

اس کی توقع کے مطابق فرقان ماموں کی باتیں اور طنزیہ انداز ویسا ہی تھا، البتہ سلیمان ماموں یوں طنز نہیں کرتے تھے، مگر اکھڑے اکھڑے سے رہتے تھے۔ وجہ ان کا گزشتہ استنبول کا دورہ تھا، جب وہ اوالار میں ہونے

کے باعث ان کے لیے جہانگیر نہیں آسکا تھا۔ اور جب آیا تو تھوڑی دیر ہی بیٹھ سکا۔ اس کے دل کی بے گانگی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور اس کے اکھڑ رویے کے باعث سلیمان ماموں بھی بدظن ہو چکے تھے۔
مگر پاکستان آکر اس پہ ایک انکشاف بہت شدت سے ہوا کہ وہ جو ہمیشہ "میرے دونوں ماموں" اور "میرے ماموؤں سے" جیسے صیغوں میں سوچتا تھا تو وہ غلط تھا۔

وہ زمانے گئے جب دونوں ماموں ایک فریق تھے۔ اب وہ دو فریق تھے۔ سلیمان ماموں تو بڑے بھائی کی بہت عزت کرتے تھے، مگر فرقان ماموں اور صائمہ ممانی کی گفتگو سے ہی یہ بات واضح تھی کہ اگر وہ حیا سے رشتہ توڑے گا تو وہ ہرگز ناخوش نہیں ہوں گے۔ اگر وہ فرقان ماموں کے رویے کی وجہ سے سلیمان ماموں سے تعلق خراب کرتا ہے، تو یہ ناانصافی تھی۔ اب جب کہ یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ وہ یہ شادی قائم رکھنا چاہتا تھا تو پھر اسے اپنا رویہ بھی ٹھیک کرنا ہوگا۔
مہوش کی بدتمیزی کے بعد جب سب ہی کھانا کھائے وہاں سے اٹھ آئے تو اس نے صرف سلیمان ماموں کے لیے پاستا بنایا تھا۔ اور دونوں کے درمیان سرد مہری کی دیوار تبھی اس سے پگھل گئی تھی۔ پاکستان آکر اس نے اپنے "پرائیوٹ نمبر" سے حیا کو کال بھی کی تھی تاکہ اسے اس پزل باکس کا بتائے جو وہ اسے دینا چاہتا تھا، مگر وہ دوسرے کی پوری بات کب سنتی تھی؟
سو جب اس نے نہ سنا تو اگلے روز حملو کی بہت منت کر کے اس نے وہ باکس حیا تک پہنچا ہی دیا۔ اس کے اندر جواہر کے ایک لاکر کی بار کوڈ سلپ اور اندرونی تجوری کی چابی تھی۔ لاکر ابھی خالی تھا، مگر وہ واپس جاتے ہی کچھ ریکارڈ کر کے اس میں رکھ دے گا۔

باقی رشتہ داروں سے بھی تعلقات بہتر ہوتے گئے۔ مہوش کی چھوٹی بہن جس کو اس نے صرف اس لیے ڈانٹا تھا کہ وہ اس کی تصویر نہ کھینچے کیونکہ وہ فوراً "فیس بک" پہ تصویریں لگا دیا کرتی تھی اور وہ اس معاملے میں احتیاط کرتا تھا، اس سے لے کر سلیمان ماموں تک، اب کوئی اس سے ناراض نہ تھا۔ جب وہ بعد میں اپنی جاب کے متعلق بتائے گا، تو ان کا کیا ردعمل ہوگا، وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔
حیا نے پزل باکس رات میں اسے ہی لا کر تھما دیا۔ پہلے تو وہ واقعی گڑبڑا گیا کہ وہ جان چکی ہے، مگر وہ صرف کھولنے میں مدد چاہ رہی تھی۔ پاگل لڑکی، یہ رازداری سے رکھنے والی چیز تھی، وہ کیا اب ہر کسی سے یوں ہی مدد مانگتی پھرے گی؟ اس کے علاج کے طور پہ اس نے چھرا اور ہتھوڑا مانگا تو حیا نے فوراً "گھبرا کر باکس واپس لے لیا۔ چلو اس کو اس کی توڑ کر نہ کھولنے والی خواہش کا اتنا احترام تو تھا ہی۔ اب اس کے لاکر سے ویڈیو نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ واپس استنبول جائے۔ ایک وقت تھا جب وہ اسے روکنا چاہتا تھا، مگر آج وہ خود سلیمان ماموں کے پاس گیا اور جب اس نے ان کو یہ کہا کہ اگر وہ واپس نہیں جائے گی تو کبھی ڈی جے کے دکھ سے نہیں سنبھل پائے گی، وغیرہ وغیرہ، تو سلیمان ماموں نے بس اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اجازت دے دی۔ انہیں اس کا حیا کے لیے فکر مند ہونا اچھا لگا تھا۔
سب ٹھیک جا رہا تھا۔ وہ دونوں واپس آئے تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ دن اسے اپنے گھر رکنے کا کہے گا۔ آہستہ آہستہ وہ اس کال کو ڈھونڈ لے گی اور اس سے پہلے کہ کسی دوسرے کے منہ سے وہ کچھ سنے، وہ ویڈیو اسے مل جائے گی۔ پھر وہ مل کر کچھ فیصلہ کریں گے کہ آگے زندگی انہیں کیسے گزارنی ہے۔
لیکن پاکستان سے واپسی پہ اس کے سر کا درد بڑھ ہی گیا تھا، اور اس کے باعث اسے بخار ہو گیا تھا۔ جس رات حیا نے آنے کا کہا تھا، اس شام سے ہی وہ درد ناقابل برداشت صورت اختیار کر گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا، ابھی سر پھٹ جائے گا۔ وہ اپنا کام خود کر لیتا تھا، مگر؟
اس نے ممی سے کہا کہ وہ اسے دودھ گرم کر کے لا دیں اور ساتھ میں نیند کی گولی بھی۔ دونوں چیزیں لے کر پھر وہ لیٹ گیا۔ حیا آئے گی تو وہ اٹھ جائے گا۔ ابھی تھوڑا

سو لے۔ نیند میں جاتے ہوئے بھی اس کے اندر ایک ذہنی جنگ چھڑی ہوئی تھی کہ وہ اپنا ایم آر آئی پھر کروائے یا اس درد کو نظر انداز کرتا رہے، وہ کسی نئی خبر سے ڈرتا تھا۔
اس کا کیریئر۔ اس کی منزل۔ ناکارہ فوجی قرار دے [illegible]منٹ۔
رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ موبائل بجتی گھنٹی سے کھلی۔ اس نے اٹھنا چاہا تو سر بے حد وزنی ہو رہا تھا۔ بمشکل وہ کہنی کا سہارا لے کر اٹھا ہوا اور فون دیکھا۔ سفیر عثمان۔ جب اس نے فون کان سے لگایا تھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا اور جب اس نے سفیر کی بات سنی، تو اسے جیسے زور کا چکر آیا تھا۔
وہ رات شاید اس کی زندگی کی خوف ناک ترین رات تھی۔ انڈیا میں ڈی ایم آئی کی تحویل میں گزری راتوں سے بھی زیادہ تلخ، زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ بھیانک۔
اسے لگا تھا، وہ حیا کو کھو چکا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ اس کی نگرانی نہیں کر سکا۔ وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکا، وہ لوگ اسے اغوا کر چکے تھے۔ صرف اس لیے کہ اس رات عبدالرحمن پاشا سو گیا تھا۔
سفیر نے باسفورس برج کا نام لیا تھا، مگر باسفورس پہ بھی تو دو تھے۔ ایک فرسٹ باسفورس برج جس کو عرف عام میں "باسفورس برج" کہا جاتا تھا اور دوسرا سیکنڈ باسفورس برج جس کا عام نام سلطان احمد برج تھا۔ پل سلطان احمد مسجد (نیلی مسجد) کی پشت پہ تھا۔
چونکہ حیا نے سفیر کو پاکستانی موبائل سے کال کی تھی، اس لیے اس نے سب سے پہلے اپنے ٹریسر کا سسٹم چیک کیا۔ وہ واقعی سلطان احمد برج کے قریب وہیں تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ حیا نے اسے کال نہیں کی۔ اس نے عثمان شبیر سے مدد مانگی، مگر اس سے کیوں نہیں؟ نہ جہان سے، نہ عبدالرحمن سے؟ لیکن یہ ثانوی باتیں تھیں۔
وہ آرگنائزڈ کرمنلز تھے جو لڑکیوں کو اغوا کرتے تھے۔ ترکی اس شے کے لیے خاصا بدنام تھا۔ روس، یوکرائن اور مالدووا کی لڑکیاں نوکری کے لالچ میں ادھر لائی جاتیں اور بیچ دی جاتی تھیں۔ وہ اکیلا آدمی ان کے کسی شب پہ حملہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ اسے پولیس کی مدد چاہیے تھی۔
اس نے اپنے تمام کانٹیکٹس استعمال کیے۔ بے حد شدید سر درد اور بار بار دھندلی پڑتی بصارت کے ساتھ وہ جیکٹ اٹھا کر گھر سے باہر بھاگا تھا۔ اس کے ٹریسر نے اس جگہ کی لوکیشن ڈھونڈنے میں مدد دی تھی، پھر بھی اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ دیر نہ کر دیں۔ کہیں کچھ برا نہ ہو جائے۔ بہت عرصے بعد اس نے خود کو بہت بے بس اور مضطرب محسوس کیا تھا۔

اور جب اس نے ایک کمرے کے پیچھے سے حیا کی چیخیں سنیں، تو اسے لگا وہ اس کو کھو چکا ہے۔ آفیسرز کمرے کے دروازے کی درز سے اندر دھواں پیدا کرنے والے بم چھوڑ رہے تھے اور جب تک وہ داخل ہو پائے، وہ حیا کو اس کی بیوی کو آتش دان پہ پھینک چکا تھا۔

وہ اس کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ منظر تھا۔ کمرے میں بہت سا دھواں پھیلا تھا۔ اور وہ کرسی پہ بندھی، زخمی بازو کے ساتھ آگ کے قریب تھی۔ اس کے لباس کا دامن جل رہا تھا۔ ایک آفیسر تیزی سے اس کے لباس کو بجھانے لگا، مگر وہ صرف اس پست قد روسی کی جانب بڑھا تھا جس نے اس کی بیوی کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ سر درد، بخار، فرسٹریشن اور غصہ، وہ اس روسی کو گردن سے پکڑے دیوانہ وار اس کا سر دیوار سے مار رہا تھا۔ روسی کی مزاحمت سے اس کا اپنا سر بھی کئی ایک بار دیوار سے جا لگا تھا، مگر وہ نہیں رکا۔ اگر اس کا دوست آفیسر اس کو نہ پکڑتا تو شاید وہ اس آدمی کی جان لے لیتا۔
تب تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ شاید اس نے دھوئیں سے بھرے کمرے میں بھی اسے دیکھ کر پہچان

کیا ہو گا کہ یہ مشکل تھا مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ ابھی صرف اور صرف اس کی خیریت چاہتا تھا۔ اگر وہ عبدالرحمن پاشا نہ ہوتا تو وہ سیکورٹی آفیسر کبھی بھی بازیاب ہونے والی لڑکیوں کی تعداد چونتیس سے پینتیس لکھنے پہ اور اسے خاموشی سے اپنی دوست کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دیتا' اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ اس نے ہاشم کو گرفتار شدگان میں دیکھا تھا' اور جیسے کسی نے اس کے اوپر دہکتے کوئلے انڈیل دیے تھے۔ یہ سب اس کا اپنا قصور تھا۔ اس نے غلط آدمی پہ بھروسا کیا' اس نے اپنی وجہ سے حیا کو اتنا نقصان اٹھانے پہ مجبور کر دیا۔ وہی ذمے دار تھا اس سب کا۔ اپنے آپ کو ملامت کرتا جب وہ اسے بیوک ادا لایا تو اس کا سر تب بھی درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

وہ اسے اسپتال نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ اسے خود اسپتال لے جائے گا تو صبح تک پورے ادا کو خبر مل جائے گی۔ اپنے کسی آدمی پہ اسے بھروسا نہ تھا کہ وہ حیا کو کہیں لے جائے۔ وہ اتنا ہرٹ اور پریشان تھا کہ جو آخری جگہ جہاں سے بات باہر نہیں نکلے گی' اسے ادا میں اپنا وہ گھر ہی لگی تھی۔ جہاں عائشے گل بہارے گل اور آنے بھی تھیں۔

حیا کے زخم ایسے نہ تھے کہ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت پڑتی۔ وہ خود بھی اس کی پٹی کر سکتا تھا' مگر سارا مسئلہ اس کے بالوں کا تھا' اگر وہ خراب ہوئے تو وہ ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر سکے گا۔ ابھی جلد از جلد اسے اس کے بالوں پر سے وہ ویکس اتارنا تھا۔

عائشے اور بہارے اس روز اکیلی تھیں۔ آنے کچھ رشتے داروں سے ملنے شہر سے باہر گئی تھیں۔ جب پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہو کر اس نے پہلی منزل کے اس پرتعیش سے گیسٹ روم بیڈ پہ اسے لٹایا تو تب بھی وہ بے ہوش تھی۔ وہ تیزی سے زینے پھلانگتا نیچے آیا اور عائشے کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

عائشے سر پہ اسکارف لپیٹتی' نیند سے گھبرا کر اٹھی اور باہر نکلی تو اسے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تم؟ تم انڈیا سے کب آئے؟"

اور تب اسے یاد آیا کہ ادالار والوں کے لیے وہ انڈیا میں تھا۔

"آج ہی آیا تھا۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔ اوپر آؤ۔" جینز اور سویٹر' بکھرے بال' رف حلیہ' عینک غائب' یہ وہ عبدالرحمن تو نہیں تھا جسے وہ دونوں جانتی تھیں۔ وہ دونوں بہنیں اٹھ کر اوپر اس کے ساتھ آئیں۔ سارا معاملہ ان کو سمجھا کر جہان نے جب مدد کے لیے کہا تو عائشے تذبذب سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم اسے اسپتال لے جاؤ۔ یہی ٹھیک رہے گا۔"

"نہیں! کل صبح ہم ڈاکٹر گھر پہ بلا لیں گے' ابھی مجھے صرف اس کے بال بچانے ہیں۔ تم کسی طرح یہ ویکس اتار دو۔"

"تمہیں کیوں لگتا ہے' میں یہ کر سکوں گی؟ تم خود ہی تو کہتے ہو عائشے گل کبھی کچھ نہیں کر سکتی۔" اس نے ملال سے کہتے ہوئے بے ہوش پڑی لڑکی کے چہرے کو دیکھا۔ وہ اکثر یہ بات کہہ دیا کرتا تھا کہ عائشے سب کچھ کرنا سیکھ جائے۔

"پلیز عائشے! کچھ کرو۔ مجھے کسی پہ اعتبار نہیں ہے اور اگر تم کچھ نہ کر سکتی ہوتیں تو میں فیور لینے تمہارے پاس کیوں آتا؟" وہ اس کے سامنے کھڑا' بہت ٹوٹے ہوئے لہجے اور ستے چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"او کے! ہم کوشش کرتے ہیں۔" اس کے انداز میں کچھ تھا کہ عائشے سویٹر کی آستین اوپر چڑھاتی اٹھی اور غنودہ لڑکی کے سرہانے آ بیٹھی۔ بہارے البتہ صوفے پہ بیٹھی' ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے گہری سوچ میں گم تھی۔

"کچھ بھی کرو' مگر مجھے اس کے بال واپس چاہئیں۔" وہ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے پھر سے جیسے منت کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ زمانوں کا کرب و تکلیف رقم تھی۔ "اس کے بال بہت خوب صورت ہیں اور مجھے یہ واپس چاہئیں۔"

"کیا یہ تمہیں اچھی لگتی ہے؟" بہارے نے بہت سوچ کر سوال کیا' عائشے نے ملامتی نظروں سے اسے گھورا' مگر وہ جہان کی طرف متوجہ تھی۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا۔ "بہت زیادہ۔"

"اور اگر اس کے بال خراب ہو گئے تو یہ تمہیں اب نہیں لگے گی؟"

"بہت ہو گیا' بہارے گل!" عائشے نے سختی سے ٹوکا تو بہارے نے منہ بسور کر سر جھٹکا۔

"وہ مجھے تب بھی اچھی لگے گی۔" کچھ دیر بعد وہ مضبوط لہجے میں بولا تو بہارے نے ناک سکیڑ کر چہرہ پھیر لیا۔

"ویکس ہے' ویکس کھینچ کر اتاری جائے تو بالوں کو نقصان دے گی' لیکن اگر اس کو ہم پگھلا کر اتاریں تو یہ اتر جائے گی' مگر Scalp (کھوپڑی) کو جو نقصان پہنچا ہو گا' وہ۔"

"تم Scalp (کھوپڑی) کے زخموں کی فکر مت کرو' صرف یہ ویکس اتار دو۔"

"ہاں! بعض دفعہ ہاتھ پہ بھی گرم گرم ویکس گر جاتی ہے' اتنا نقصان نہیں ہوتا۔ مگر اس کو کیسے پگھلائیں؟ ایسی کون سی چیز ہے جو ویکس پگھلا سکتی ہے؟" عائشے جمے ہوئے ویکس کو ہاتھ سے چھو کر دیکھتی سوچ میں پڑ گئی۔

"گرم پانی؟"

"ہم اس کا چہرہ بچائے بنا بال گرم پانی میں نہیں ڈال سکتے۔ ویکس اس کی مانگ پہ گری ہے۔" پھر وہ ایک دم چونکی۔ "شیمپو۔ ہاں شیمپو ویکس کو پگھلا سکتا ہے۔ شیمپو بالوں پہ لگی چیزوں کو پگھلا سکتا ہے۔ مگر۔" وہ جوش سے کہتے کہتے رکی۔ جہان اور بہارے منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ "عموماً تمام شیمپوز میں ویکس پہلے سے موجود ہوتی ہے' ہمیں کوئی ایسا شیمپو استعمال کرنا ہو گا۔ جس کے اجزا میں ویکس نہ شامل ہو۔"

"سن سلک!" وہ ایک دم سر اٹھا کر بولا۔ "سن سلک میں ویکس نہیں ہوتی۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" بہارے نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"جب میں جیل میں تھا تو وہاں ایک دفعہ باتھ روم میں سن سلک کی بوتل قسمت سے مجھے دکھ گئی تھی' میں نے اس کے سارے اجزائے ترکیبی حفظ کر لیے تھے' مجھے یاد ہے ان میں ویکس نہیں تھی۔"

"تم جیل میں بھی رہ چکے ہو؟" عائشے کو جہاں شاک لگا' وہیں بہارے مارے ایکسائٹمنٹ کے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"واقعی! تم جیل میں بھی رہ چکے ہو؟ واؤ!" وہ بے حد متاثر ہو چکی تھی۔

"ہاں! بس ایک دفعہ غلطی سے۔ بس ایک رات کے لیے۔ جاؤ تم سن سلک لے کر آؤ' میں اسٹڈی میں ہوں' مجھ سے یہ سب نہیں دیکھا جائے گا۔"

دکھتے سر کے ساتھ وہ بات نہیں بنا پا رہا تھا۔ سو اٹھ کر اسٹڈی میں جا بیٹھا اور سگریٹ پہ سگریٹ پینے لگا۔ اس کا دل بہت بری طرح سے دکھا تھا۔

عائشے نے پہلے ٹشو رول لیا' اور اسے اچھی طرح حیا کے سر پہ لپیٹا' اس جگہ جہاں ویکس گری تھی' اور پھر اوپر سے ہیئر ڈرائیر چلا دیا۔ تیز گرم ہوا سے ٹشو تلے جمی ویکس پگھل پگھل کر ٹشو میں جذب ہونے لگی۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ٹشو بدل دیتی۔ یوں بہت سارا ویکس یوں ہی اتر گیا۔ باقی کے لیے اس نے شیمپو استعمال کیا۔ درمیان میں ایک دفعہ اس کی آنکھ بھی کھل گئی' مگر پھر

جلد ہی وہ دوبارہ غنودگی میں چلی گئی۔

صبح فجر سے قبل اس کے بال' تھوڑے سے ضیاع کے بعد واپس اپنی حالت پہ آ چکے تھے۔

"صبح تم ڈاکٹر کو لے آنا' باقی سارے کام وہ کر دے گا' مگر ایک بات۔" واپس جانے سے قبل اس نے دونوں بہنوں کو سختی سے تاکید کی تھی۔ "تم اس کو نہیں بتاؤ گی کہ میں یہاں آیا تھا۔ بہارے! اگر تم نے منہ سے ایک لفظ بھی نکالا تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گا۔"

"او کے! میں کیا کہہ رہی ہوں۔" وہ نروٹھے پن سے شانے اچکا کر بولی۔

جب بہارے منظر سے ہٹ گئی' تو اس نے عائشے کو مخاطب کیا۔

"تم نے مجھے بہت بڑا فیور دیا ہے۔ تم اس کے بدلے مجھ سے کچھ بھی مانگ سکتی ہو۔" عائشے کھلے دل سے مسکرا دی۔

"میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ زندگی میں دوبارہ کبھی اگر تمہیں کسی بڑے فیور کی ضرورت پڑے تو تم مجھ سے ضرور مانگو۔"

"بالکل۔ میں دوبارہ بھی مانگوں گا۔ کیا' میں نہیں جانتا' مگر ضرورت پڑنے پہ میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔ ایک اور بات۔" قدرے رک کر اس نے بتانا شروع کیا جس کو سن کر عائشے کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"وہ تمہاری بیوی ہے؟ اور وہ تمہیں دوسرے نام سے جانتی ہے؟ پھر تم نے آنے سے کیوں کہا کہ تم اس سے شادی۔"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کسی امیر آدمی کے لیے اپنے شوہر کو چھوڑ سکتی ہے یا نہیں؟"

"اپنوں کو اس طرح آزماتے نہیں ہیں عبدالرحمن!"

"جو بھی ہے' تم بہارے کو یہ سب مت بتانا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی اور کے منہ سے میرے بارے میں سنے۔ ایسی صورت میں وہ کبھی میرا اعتبار نہیں کرے گی۔ میں اسے خود سب بتا دوں گا' مگر کچھ وقت بعد۔"

"تم بہت جھوٹ بولتے ہو۔" عائشے نے دکھ سے اسے دیکھا۔ اور جواباً اس کے تاثرات پھر سے سپاٹ ہو گئے۔

پوری رات جس شخص کو عائشے نے دیکھا تھا' وہ چلا گیا تھا' اور پرانا عبدالرحمن واپس آ گیا تھا' جو اس تھپڑ کے باعث ابھی تک اس سے خفا تھا۔

"کوشش کرنا وہ کچھ دن تمہارے پاس ٹھہر جائے۔ میں جا رہا ہوں' فون کرتا رہوں گا۔" سنجیدگی سے کہہ کر وہ پلٹ گیا تھا۔

چونکہ اسے واپس انڈر گراؤنڈ ہو جانا تھا' اس لیے اگلے ہی روز اس نے عائشے کو کال کر کے بتایا کہ وہ واپس جا رہا ہے۔ حسب معمول وہ مان گئی۔ اب وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ جتنے دن حیا اس گھر میں رہے' امت اللہ حبیب واپس آئیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جائے گی کہ وہ عبدالرحمن کی اصلیت جان جائے گی۔ وہ اچھی خاصی ذہین لڑکی تھی۔ وہ اس کو انڈر اسٹیمیٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر کسی دوسرے کے منہ سے وہ سنے گی تو وہ اس کا اعتبار کھو دے گا۔ اس لیے بہتر تھا کہ جب تک وہ اپنا پزل باکس نہ کھولے' تب تک وہ عبدالرحمن کی حقیقت سے بے خبر رہے۔ اس لیے اس نے آنے کے ذمہ کچھ کام ایسے لگا دیے جو ان کو چند دن مزید مصروف رکھیں گے۔ تیسرے روز اس نے عائشے کو انڈین نمبر سے کال کی۔ وہ حیا سے بات کرنا چاہتا تھا' وہ اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اس کے دل کو اس دن سے اب تک قرار نصیب نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ اس کی بات سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ نتیجتاً اس نے کہلوا دیا کہ وہ اوالار نہیں آئے گا' وہ آرام سے ادھر رہے۔

بار بار اس رات کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آتے اور اس کو تکلیف دیتے تھے۔ حیا کے بازو پہ داغا WHO' اور ساتھ میں آخری سلاخ کے دو حروف RE جو جلد ہی سلاخ ہٹا لینے کے باعث ٹھیک سے داغے نہ جا سکے تھے' اور آبلے سے بن گئے تھے' وہ منظر بہت اذیت رساں تھا۔

جانے سے قبل اس نے ایک اور کام یہ کیا تھا کہ جتنی تصاویر اس کے پاس حیا کی تھیں' وہ اس نے اسٹڈی کے کمپیوٹر سے پرنٹ آؤٹ کر کے اسٹڈی کی دیواروں پہ آویزاں پینٹنگز کے فریم میں اصل پینٹنگ اور شیشے کے درمیان لگا دی تھیں' تاکہ یوں لگے کہ وہ تصاویر ہی فریم کی گئی ہیں۔ جب وہ یہ دیکھے گی تو جان لے گی کہ وہ برا آدمی نہیں تھا۔ وہ اس کے بہت سے دن میں اس کے ساتھ تھا' اور اس کا خیال رکھا کرتا تھا۔

ممی البتہ ذرا پریشان تھیں کہ حیا کہنے کے باوجود نہیں آئی۔ اس صبح جب وہ گھر پہنچا تو ممی نہیں تھیں' انہوں نے رات کو اسے جاتے نہیں دیکھا تھا سو ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ رات کہاں رہا تھا۔ دوپہر میں ان کی ملاقات ہوئی تو ممی نے بتایا کہ وہ حیا کے ہاسٹل گئی تھیں' اور ایک اسٹوڈنٹ نے بتایا کہ شاید اسے میزبان فیملی کی طرف رکنا تھا۔ اس کے دونوں نمبرز بند جا رہے تھے' یہی بات ممی کو پریشان کر رہی تھی۔ اس نے ممی کو کچھ نہیں بتایا' اس کو راز رکھتے آتے تھے' بس اس نے تسلی دی کہ فون خراب ہو گا۔ وہ فکر نہ کریں۔ البتہ عائشے کو اس نے فون پہ تاکید کی کہ وہ حیا سے کہے' وہ اپنے گھر فون کر لے۔ اگلے روز اس نے واقعی فون کر لیا' اب سرکاری طور پر جہان سکندر کے ہاں اس کا نمبر آ گیا تھا' مگر وہ اس کو وہاں فون کرے' یہ مناسب نہیں تھا۔ اس نے ہوٹل گرینڈ میں ایک بندے سے کہلوا کر حیا کے لیے نیا موبائل اور سم بھی دلوا دی تھی' اور ظاہر ہے' یہ نمبر بھی اس کے پاس تھا' لیکن اگر جہان اسے فون کرے تو اس کو نمبر کہاں سے ملا جیسے سوال کی کوئی منطقی وضاحت نہ بنتی تھی۔ عبدالرحمن سے بات وہ کرنا نہیں چاہتی تھی' جہان اسے کال کر نہیں سکتا تھا' پھر؟ وہ کیسے اس کی آواز سنے؟ کیسے اس سے بات کرے؟

میجر احمد۔ ہاں' میجر احمد بھی تو ہے' وہ اسے کال کر سکتا تھا کیونکہ میجر احمد عموماً "ہر بات جانتا ہوتا تھا۔ شاید تب وہ اس کی آواز سن سکے۔

اور یہ کوشش کامیاب رہی۔ کتنے دنوں بعد اس نے اس کی آواز سنی تھی۔ وہ حسب معمول میجر احمد سے بے زار تھی' مگر یہ طے تھا کہ وہ اس پہ اعتبار کرتی تھی' تب ہی وہ اس سے پوچھ رہی تھی بلیک میلرز کو کیسے قابو کرے' اس کو کون بلیک میل کر رہا تھا؟ اس کا دھیان اس کی طرف گیا۔ خیر اگر وہ عبدالرحمن پاشا تھا تو وہ ہاشم کو کئی سال تک جیل سے باہر آنے نہیں دے گا' پھر اس نے اندھیرے میں تیر چلا کر اسے بتایا کہ وہ پزل باکس کھول چکی ہے۔ تب وہ ہنس دیا۔ اس کا لاکر ابھی تک خالی تھا' جب اس نے ویڈیو رکھی ہی نہیں تو کیسا انکشاف؟ وہ تلملا کر فون رکھنا چاہتی تھی' مگر وہ اس کو مزید سننا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سو گئی' مگر وہ اس کی خاموشی سنتا رہا۔ اس وقت وہ اپنے ریسٹورنٹ کے کاؤنٹر پر بیٹھا استقبالیہ کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ وہ اپنے کام نپٹاتا رہا' اور دوسری جانب اسے حیا کے سانس لینے کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ابھی آدھا گھنٹہ گزرا تھا کہ اسے لگا اس کے تھنے گیلے ہو رہے ہیں۔ تکلیف کی ہلکی سی لہر اٹھی' اور سر کا وہی درد ہر چیز پہ چھانے لگا۔

اس نے ہاتھ سے ناک کو چھو کر دیکھا۔ خون۔ پہلی دفعہ سر درد سے اس کی نکسیر پھوٹی تھی' باتھ روم میں جا کر بیسن کے سامنے ناک اور سر کو دھوتے ہوئے بھی اس نے فون کا اسپیکر آن رکھا۔ وہ سو رہی تھی' اور وہ بیسن پہ نڈھال سا جھکا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ تین گھنٹے اور بیس منٹ کے بعد کال خود بخود کٹ گئی۔ چونکہ وہ انٹرنیٹ سے کنیکٹ کر کے کال کر رہا تھا' اس لیے وہ گھنٹے بعد کٹنے کے بجائے کافی دیر سے کٹی۔ موبائل بند کرتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنا چیک اپ کروا لینا چاہیے۔ کہیں نہ کہیں کچھ غلط تھا۔

اگلی صبح حیا نے اسے نمبر بھیج دیا۔ اس نے نمبر ملتے ہی اسے فون کیا۔ کرنے کی بات کوئی نہیں تھی' بس وہ اس سے بات کرتے رہنا چاہتا تھا۔ اگلے روز وہ صرف اس سے ملنے اوالار آیا۔ اس نے عائشے سے کہہ دیا تھا کہ وہ جب پورٹ پہ آئے تو بہارے کو ساتھ نہ لائے۔ عائشے ظاہر نہیں کرے گی' مگر بہارے چھوٹی بچی ہی تو تھی۔ سو عائشے نے ایسا ہی کیا۔

کھلی فضا میں کرسیوں پہ بیٹھے ناشتہ کرتے اس نے چند ایک بار کریدنے کی کوشش کی' مگر حیا نے نہیں بتایا کہ عائشے اور بہارے سے اس کی دوستی کیسے ہوئی' اور نہ ہی یہ کہ اس کے زخم کیسے ہوئے۔ وہ ابھی اس پہ

اعتبار نہیں کرتی تھی۔ البتہ وہ دوبارہ اس کے فون کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔ گو کہ اس نے اسے دو ایک بار ہنٹ دیا تھا کہ وہ اسپیشل گفٹ تھا' اور اسپیشل سے مراد "اسپیشل سروسز" ہی تھیں 'مگر وہ ابھی تک بوجھ نہیں پائی تھی۔ خود سے یونہی وہ نہیں بتائے گا۔ وہ پہلے خود بوجھے گی 'تب ہی وہ اسے ڈھونڈ پائے گی۔ البتہ تب وہ ذرا سا سنبھلا جب حیا نے کہا کہ اس کا چہرہ اپنے پاس کے ذکر پہ چمکنے لگتا ہے۔ یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اپنا ملک' اپنی جاب' سب بہت یاد آتا تھا۔ مگر کیا اس کی صحت اسے مزید نوکری کرنے کی اجازت دے گی؟ یہیں وہ الجھ جاتا تھا۔

وہیں اس کے ساتھ بیٹھے' اس کو ممی اور عائشے دونوں کے ٹیکسٹ موصول ہوئے تھے۔ صرف ممی کے مسیج کا اس نے حیا کو بتایا' اور عائشے کے پیغام پڑھ کر وہ صرف مسکرا دیا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا۔ اتنے سارے لوگوں سے ایک وقت میں اتنے سارے جھوٹ بولتے تمہیں بالکل افسوس نہیں ہوتا۔ اب تو مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تم کبھی انڈیا گئے ہی نہیں تھے۔ تم استنبول میں ہی تھے۔"

"یہ لڑکی بھی نا۔" اس نے مسکرا کر سر جھٹکے۔ "شکریہ" لکھ کر جوابی پیغام بھیج دیا۔

اس روز ساحل سمندر پہ چلتے ہوئے غیر ارادی طور پر روحیل کا ذکر نکل آیا تھا۔ وہ روحیل سے تین' ساڑھے تین برس قبل اس وقت ملا تھا جب وہ ایک چھوٹے سے کام کے سلسلے میں وہاں ایک تعلیمی ادارے میں گیا تھا۔ تب ایک طالب علم نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی تھی' اور ایک گولی اس کو بھی لگ گئی تھی۔ چونکہ وہ غیر قانونی کام کے سلسلے میں وہاں تھا' سو وہ جلد از جلد موقع سے فرار ہو گیا۔ خراب ہوتے زخم کے باعث اس کو کسی قابل اعتماد شخص کے پاس پناہ لینی تھی' اور چونکہ امریکہ آنے سے قبل وہ وہاں موجود ہر رشتے دار کا پتا کھوج کر لیا تھا' اس لیے وہ روحیل کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ بات اس نے روحیل کو صیغہ راز میں رکھنے کو کہی تھی' اور جواب میں وہ یہ بات راز رکھے گا کہ وہ لڑکی روحیل کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس ڈیل کے بارے میں وہ حیا کو تو نہیں بتا سکتا تھا' سو بات ٹال گیا۔ اب وہ پوچھتی رہے اپنے بھائی سے اسے کیا۔

ساحل پہ جب حیا نے سیپ چننے کی بات کی تو اسے اطمینان ہوا کہ اب وہ' وہ کام کر سکتا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ عائشے بہارے کے ساتھ سیپ چننے کی عادی ہو گئی تھی۔ عائشے کے اکثر سیپ موتی سے بھرے نکلے تھے جبکہ بہارے کے خالی۔ جب جہان نے عائشے کی سالگرہ پہ پچھلے برس اسے ایک قیمتی انگوٹھی بطور تحفہ دی تو دو ماہ بعد جب "عبدالرحمن پاشا" کے پاسپورٹ کے مطابق اس کی سالگرہ آئی تو عائشے نے اسے اپنے ایک سیپ سے اکٹھے نکلے تین موتی دیے تھے۔ وہ موتی ایک ایک ننھی سی قدرتی خراش لیے ہوئے تھے۔ یعنی ان کو پہچاننا آسان تھا۔ اس نے عائشے کو گو کہ اس لڑائی کے بعد بتا دیا تھا کہ وہ جلد یا بدیر ان کو چھوڑ دے گا' مگر اب بھی جب تک وہ یہاں ہے' اس کو خود کو ان دو معصوم لڑکیوں سے دور رکھنا چاہیے۔ اس طرح کی جذباتی وابستگیاں مستقبل میں ان دونوں کا دل بہت بری طرح سے توڑ سکتی تھیں۔ چھوٹا زخم' بڑے زخم سے بہرحال بہتر ہوتا ہے۔ اس نے سوچا وہ عائشے کو چھوٹا زخم دے دے' تاکہ وہ مستقبل میں بھی اس سے کوئی امید نہ رکھے۔

وہ تین موتی اس نے کسی اور طرح سے حیا کو دینے کا سوچا تھا' مگر جب وہ سیپ کھولنے کے لیے چھری لینے دور بیٹھے ان ٹورسٹس کے پاس گئی تو جہان نے رخ موڑ کر اپنی جراب کے ساتھ بندھا چاقو نکالا' سیپ کو آدھا کاٹا' اور تینوں موتی اندر کچھ اس طرح سے ڈالے کہ جب وہ حیا کے سامنے سیپ کاٹے گا تو وہ یہی سمجھے کہ موتی اندر قدرتی طور پر موجود تھے۔ اگر وہ یہ کام عائشے کے ساتھ کرتا تو وہ بھانپ لیتی' اس کو سیپوں کا تجربہ تھا' مگر حیا نہیں جان سکتی تھی۔ اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ موقع کا انتظار کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ موقع خود پیدا کرنے پہ یقین رکھتا تھا۔

☆ ☆ ☆
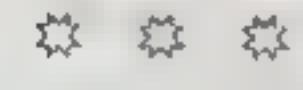
اس روز اسے کچھ بہت اہم پیپرز چاہیے تھے جو وارڈ روب میں اس کے کمرے میں رکھے تھے۔ اس نے عائشے کو صبح میں فون کر کے پوچھا' مگر وہ مدد کرنے سے قاصر تھی۔

"تمہارا بریف کیس تمہاری الماری میں ہو گا' اور وہ لاک ہوتی ہے۔ چابی بھجوا دو تو میں نکال سکتی ہوں۔"

"تم رہنے دو' میں خود کچھ کر لوں گا۔" عائشے کے لہجے کی خفگی وہ سمجھتا تھا۔ وہ یقیناً حیا کے پاس ان تین موتیوں کو دیکھ کر بہت ہرٹ ہوئی ہو گی۔ مگر ان دونوں کے لیے یہی بہتر تھا۔ جو بھی تھا' وہ سمجھ دار لڑکی تھی' اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

اسی شام عائشے اور بہارے کو ایک جاننے والوں کے گھر فوتگی میں جانا پڑ گیا۔ سو شام میں وہ ادالار آیا' گور اپنے گھر کے عقبی دروازے کو کھول کر ایک الگ تھلگ سے زینے سے اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے کی ایک چابی عائشے کے پاس اور دوسری اس کے پاس تھی۔ اوپر آ کر اس نے کمرا لاک کر دیا' الماری سے اپنا بریف کیس نکال کر بیڈ پہ رکھا اور اسے کھول کر مطلوبہ فائلز دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا' حیا نیچے ہی تھی' مگر وہ بھلا اوپر کیوں آئے گی؟ یہی سوچ کر اس نے نوٹ پیڈ تھاما' اور فائل میں سے کچھ نام دیکھ کر اس پہ لکھنے لگا۔ پہلے ہی لفظ پہ پین کی روشنائی ختم ہو گئی۔

کیا مصیبت ہے؟! اس نے پین کو ذرا زور سے جھٹکا تو بریف کیس اور فائلز پہ سیاہی کے موٹے موٹے قطرے گر گئے۔ اس نے تاسف سے سر جھٹکتے ہوئے [illegible] وہ ان لوگوں میں سے تھا جو قسم سے [illegible] عمل ترتیب دینے پہ یقین رکھتے تھے۔ ابھی فہرست درمیان میں تھی کہ سیاہی پھر سے [illegible] لگی۔ اس نے دوبارہ قلم جھٹکا' موٹی موٹی بوندیں [illegible] سے بریف کیس پہ گریں۔ اس سے قبل کہ وہ عبدالرحمن پاشا کی نفاست پسندی پہ افسوس کرتا' کمرے کے دروازے کے لاک میں چابی گھمائے جانے کی آواز آئی۔

لمحے بھر کو تو وہ واقعی سکتے میں رہ گیا۔ عائشے بہارے واپس آ گئیں یا وہ حیا تھی؟

وہ جو بھی تھی' ایک ایک کر کے چابیاں لگا رہی تھی۔ وہ عائشے نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسری چابی تک اس نے آناً "فاناً" بریف کیس بند کیا' اور الماری میں ڈالا۔ تیسری چابی تک وہ باتھ روم میں جا کر دروازے کے پیچھے کھڑا ہو چکا تھا۔ چوتھی چابی پہ دروازہ کھل گیا۔

وہ حیا ہی تھی' اور وہ اندر کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے باتھ روم کے دروازے کی درز سے دیکھا' وہ اب الماریاں کھول رہی تھی۔ جلدی میں وہ نہ بریف کیس بند کر سکا تھا نہ ہی آخری الماری' سو وہ اس کا بریف کیس نکال کر بیڈ پہ لے آئی جہاں چند لمحے قبل وہ بیٹھا تھا۔ اصولاً "اس جگہ کو گرم ہونا چاہیے تھا' بلکہ چادر پہ شکنیں بھی پڑی تھیں' مگر وہ بریف کیس کی جانب متوجہ تھی سو محسوس نہ کر سکی۔

خدایا' اندر تو اس کے ڈاکومنٹس تھے' برگر کنگ کی فائلز بھی تھیں۔ وہ ایسے پکڑے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ ایسے پکڑا گیا تو وہ کبھی اس کا یقین نہیں کرے گی۔ اوہ' اوہ نہیں۔ اس کا پیجر بھی اندر تھا۔ وہ اس کا پیجر ہی نہ کھول لے۔ اسے شدید غصہ آیا۔ خود پر بھی اور حیا پہ بھی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اسے کیسے وہاں سے نکالنا ہے۔ اس نے اپنے موبائل سے پیجر کو بیپ دی۔ نتیجتاً" پیجر بجنے لگا۔ حسب توقع حیا نے گھبرا کر بریف کیس بند کیا اور چند لمحوں بعد وہ جا چکی تھی۔

دروازہ دوبارہ اندر سے لاک کرتے ہوئے اس نے دوسرے نمبر سے اسے فون کیا۔ بہت غصے سے اس کو کھری کھری سناتے ہوئے وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اب اس لڑکی کو اس کے گھر سے چلے جانا چاہیے۔ حیا وہاں رہ کر صحت یاب ہو' وہ یہ چاہتا تھا' مگر وہ اس کی جاسوسی کرے' یہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

یہی بات اس نے عائشے سے کہی کہ اب حیا کو وہاں

سے چلے جانا چاہیے۔
"وہ جو بھی اس کی اسپرنگ بریک بھی ختم نہیں ہوئی، وہ چار دن تو وہ اور بھی ٹھہر سکتی ہے، اس سے زیادہ وہ نہیں رکے گی، اور میں اپنی مہمان کو خود سے جانے کے لیے نہیں کہوں گی۔"

مگر یہ دو چار دن بھی جہان کے لیے کسی سزا سے کم نہیں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ حیا صرف لوالار میں دو وجوہات کی بنا پہ رکی ہوئی ہے۔ ایک یہ کہ استنبول میں وہ زخموں والا چہرہ لے کر نہیں جانا چاہتی، اور دوسرا تجسس۔ وہ اس شخص کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی جو کافی عرصہ اسے ڈسٹرب کرتا رہا تھا۔ مگر اب تو وہ بے چارہ باز آچکا تھا۔ مگر وہ باز نہیں آئی تھی۔

دو روز قبل کی ڈانٹ بھلا کر اس دن حیا نے خود اس سے بات کی تھی۔ اسے بہارے کے لیے اس جیولری شاپ کا پتا چاہیے تھا۔ جواباً اس نے پتا دینے کے بجائے واؤچرز بھجوا دیے۔ کون سا اس کا اپنا پیسہ تھا۔ سب انہی لڑکیوں، آنے اور پاشا بے کا ہی تو تھا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا جب ایک روز بیوک ادا فون کرنے پہ اسے حیا کا "ہیلو" سنائی دیا۔ اس نے جلدی سے بنا کچھ بولے پہلے وائس کنورٹر آن کیا، اور پھر بات کرنے لگا۔ مگر جو بات اس نے آگے سے کہی، وہ اسے غصہ دلانے کے لیے کافی تھی۔ وہ جان ہی گئی تھی کہ عبدالرحمن پاشا کا ایک دوسرا بھائی بھی تھا۔ وہ پاشا بے کا نام نہیں لے رہی تھی، مگر نام بھی وہ جانتی ہی ہوگی یقیناً۔ ساتھ ہی وہ اخبار میں اس کے متعلق آرٹیکل لکھنے کی بات بھی کر رہی تھی۔ اس سے آگے جہان کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ یہی ڈر تھا اسے، وہ دو زندگیاں سنبھال نہیں پائے گا۔ اور اب وہی ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ حیا بیوک ادا میں رہے، اسے گوارا نہیں تھا۔ دو روز بعد یوں بھی اسے اپنے عبدالرحمن پاشا کے کور کو فعال کرنا یعنی بیوک ادا واپس جا کر وہاں کچھ دن رہنا تھا، سو اب ان دونوں کو وہاں نہیں اکٹھے ہونا چاہیے۔ حیا کو اس نے پرسوں کا کہا، مگر خود

اگلی ہی صبح وہ بیوک ادا آگیا۔ آتے وقت اس نے حیا کو میسج کر دیا تھا۔ اس کا ارادہ آج ایک مقامی "دوست" سے ملنے کا تھا۔ آروی (وہ مقام جہاں دو جاسوس ملتے ہیں) اس کی اپنی طے کردہ تھی، اور وہ عیسیٰ کی پہاڑی تھی۔ وہاں اسے اپنے ساتھی کو چند چیزیں پہنچانی تھیں۔ اس کے بعد وہ دوپہر میں حیا سے ملے گا، اور اسے واپس چلنے پہ راضی کرے گا۔ ویسے بھی سلیمان ماموں نے دو دن بعد استنبول آنا تھا۔ اچھا بہانا تھا۔ اب وہ واپس آجائے گی، اور وہ آرام سے بیوک ادا میں کام کر سکے گا۔ ویسے بھی حالات جیسے جا رہے تھے، یوں لگتا تھا ترکی میں اس کا قیام جلد ختم ہونے والا ہے۔ ایسے میں اسے اپنی فکر نہیں تھی۔ ممی، ابا اور حیا کی فکر تھی۔ وہ تینوں اس کی فیملی تھے۔ ممی کو ان تین برسوں میں وہ استنبول چھوڑنے پر راضی نہیں کر سکا تھا۔

پاکستان وہ جا نہیں سکتے تھے، اس نے بہت کوشش کی کہ وہ ابا کو لے کر جرمنی چلی جائیں، مگر پہلے وہ نہیں مانتی تھیں۔ البتہ اب اس کے یہاں کام کرنے کے بعد ——— ہر طرح سے یہ خطرے والی بات تھی کہ اس کے ماں باپ یہاں ہیں۔ ممی راضی ہو گئی تھیں کہ وہ ابا کے ساتھ جرمنی چلی جائیں گی، مگر جب تک جہان ادھر ہے، وہ یہیں رہیں گی۔

وہ پندرہ جون تک ادھر ہی تھا۔ پندرہ جون کو ایک اہم کنسائنمنٹ کے لیے اسے انقرہ جانا تھا، اور کام کچھ اس قسم کا leakout تھا کہ اس کے بعد یقیناً شک اسی پہ جائے گا، اس لیے اسے کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو جانا تھا۔ اس نے یہاں اتنے دشمن بنا لیے تھے کہ اس کے روپوش ہو جانے کے بعد کہیں کوئی اس کے قریبی عزیزوں کو نقصان نہ پہنچائے، اس لیے بہتر تھا کہ جانے سے قبل وہ اپنے گھر والوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر دے۔ ممی، ابا اور حیا اس کی پہلی ترجیح تھے۔ بے کی فیملی دوسرے نمبر پہ تھی۔ سب کو وہ یہاں سے بھیج دے گا، مگر حیا کا سمسٹر پانچ جولائی کو ختم ہوتا تھا۔ اسے وہ پندرہ جون سے پہلے پہلے کیسے بھیجے گا؟
اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے، کام شروع کرنے سے

قبل وہ اس الجھن میں گرفتار تھا۔ مسائل کا حل وہ عموماً نکال ہی لیا کرتا تھا، مگر یہاں وہ قدرے مخمصے میں تھا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے ساتھ میں کافی بھی منگوائی تھی، اور جب تک دیمت کافی لے کر نہیں آئی، وہ یہی سوچتا رہا کہ حیا کو یہاں سے کیسے بھیجے؟ ایک حل تھا بالواسطہ۔ یعنی جہان اسے کہے کہ وہ واپس چلی جائے، اور دوسرا تھا بلاواسطہ، یعنی میجر احمد یا عبدالرحمن پاشا میں سے کوئی کہے۔ مگر وہ کسی کی کیوں مانے گی؟

جب اس کی سیکریٹری دیمت فردوس کافی لے کر آئی تو کچھ سوچ کر اس نے یہ بات دیمت سے پوچھ لی۔
"کسی غیر ملکی کو ترکی سے واپس بھیجنا ہو تو کیا کیا جائے؟"

دیمت ایک ایمان دار اور مستعد ورکر تھی۔ وہ اس کو اپنے باس کی حیثیت سے پسند کرتی تھی مگر کبھی کبھی باتوں کے دوران وہ پاشا بے کا ذکر کر دیا کرتی۔ "آپ کے چھوٹے بھائی بھی بہت اچھے تھے۔" یہ فقرہ وہ اکثر دیمت سے سنا کرتا تھا۔ طیب حبیب شناختی کارڈ کے اعتبار سے اس سے دو سال چھوٹا دکھنے میں کئی سال بڑا، اور درحقیقت ہم عمر ہی تھا۔ دیمت کو پاشا بے کی طبیعت کی بے تکلفی پسند تھی، کیونکہ وہ خود چاہے عبدالرحمن ہو یا جہان ہو، اس کی طبیعت اور مزاج ایک سے ہی رہتے تھے۔ وہ عبدالرحمن پاشا کے روپ میں بھی اتنا ہی سنجیدہ مزاج، خاموش طبع اور قدرے تلخ تھا جتنا وہ فطری طور پہ تھا۔ دیمت اس کو پسند کرتی تھی، مگر چونکہ پاشا بے کے برعکس جہان نے ہوٹل گرینڈ کو غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، اس لیے دیمت اس قسم کے لوگوں کی ہوٹل آمد پہ الجھی رہتی تھی۔ خیر، اس کی ساری دھمکی ریس وہ جانتا تھا، اسے معلوم تھا کب کس کو کہاں سے دبانا ہے۔

دیمت کے پاس اس مسئلے کا سادہ سا حل تھا جو معلوم نہیں اس کے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس لڑکی، جسے ترکی سے بھیجنا ہے، کی واحد

کشش اگر یہاں اس کا شوہر ہے تو اسے شوہر سے بدگمان کر دیا جائے، اس کا شوہر کسی سے بھی اپنے کسی مشتبہ عمل کا ذکر کر سکتا تھا، اور اس لڑکی کو سیٹ اپ کر کے وہ گفتگو بظاہر اتفاقیہ طور پہ سنوائی جائے تو وہ فوراً اپنے شوہر سے دور جانے کی کوشش کرے گی۔

دیمت شاید ساری بات کسی اور نقطہ نظر سے کہہ رہی تھی۔ مگر اس کا ذہن ایک ہی بات پہ اٹک کر رہ گیا تھا۔ معصوم سا اتفاق۔ درست ٹائمنگ، ہاں، وہ حیا کو جانتا تھا۔ وہ ایک دم سے ردعمل دینے والی، ایک دم سے بڑے فیصلے لے لینے والی لڑکی تھی۔ جس چیز سے وہ بچتا رہا تھا کہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے، اگر وہ چیز ہو بھی جائے، اور وہ ازخود جان جائے کہ جہان ہی عبدالرحمن ہے، تو وہ وقتی طور پر بے شک اس کا اعتبار کھو دے گا، لیکن بعد میں جب وہ ساری حقیقت جان لے گی تو وہ بدگمانی دور ہو جائے گی۔ پندرہ جون سے چند دن قبل ہی اس کے امتحان ختم ہونے تھے، اگر وہ یہ سب اس کے امتحان ختم ہونے کے فوراً بعد پلان کرے تو وہ اپنا آخری مہینہ کسی دوسرے ملک میں گزارنا پسند کرے گی، نہ کہ ترکی میں ایک دو چہروں والے انسان کے ساتھ۔ وہ فوراً اس سے دور جانے کا سوچے گی۔ وہ ہمیشہ یہی کرتی تھی۔ جب وہ ایک دفعہ استقلال اسٹریٹ میں ریسٹورنٹ میں ڈنر کے لیے گئے تھے، وہ ڈنر جو جنجر بریڈ ہاؤس توڑنے کی معذرت کے طور پہ تھا، تب بھی غصے میں وہ فوراً اس کے پاس سے چلی گئی تھی۔ وہ غصے میں ہمیشہ یہی کرتی تھی۔ وہ اب بھی یہی کرے گی۔ بھلے وہ برا بن جائے، مگر اسے اپنی بیوی کا تحفظ اپنی ذات سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ ترکی میں اسے اکیلے چھوڑ کر کبھی نہیں جا سکتا تھا۔ جانے سے قبل اس کو یہ مسئلہ حل کرنا تھا۔

دیمت کو اپنے انداز میں متنبہ کر دینے کے بعد وہ کچھ دیر سوچتا رہا کہ سیٹ اپ کس کے ساتھ ترتیب دیا جانا چاہیے؟ وہ کون ہوگا جس کو اس کے ساتھ دیکھ کر وہ اس سے دور جانے کا سوچے گی؟ طیب حبیب پاشا، وہ بہت متجسس تھی نا عبدالرحمن کے گمشدہ بھائی کے

بارے میں تو چلو اس طرح وہ اس کا تجسس دور کر دے گا۔ پاشا بے سے اسے ملنا ہی تھا' باقیوں کی طرح اس کے لیے بھی وہ انڈیا میں تھا۔

طیب حبیب پاشا کے لیے استنبول میں دو ہی جگہیں محفوظ تھیں جہاں وہ عبدالرحمن سے مل سکتا تھا۔ ایک برگر کنگ' اور دوسرا ہوٹل گرینڈ' وہ جانتا تھا کہ طیب حبیب استنبول میں ہی ہے' اور چونکہ وہ خود بیوک ادا آچکا تھا' اس لیے اس نے اسی مناسبت سے اسے پیغام لکھا۔ آیا کہ طیب ہوٹل گرینڈ آئے گا' یا وہ برگر کنگ آجائے؟

اسے معلوم تھا کہ طیب حبیب انکار نہیں کرے گا' اور اس نے انکار نہیں کیا۔ اسے عبدالرحمن کی ضرورت تھی۔ اس نے برگر کنگ پہ چند روز بعد ملنے کی ہامی بھرلی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ابھی استنبول سے باہر ہے' واپس آتے ہی اس سے ملے گا۔ اب پتا نہیں یہ سچ تھا یا نہیں' بہرحال اسے اب طیب حبیب کا انتظار کرنا تھا۔

کافی پی کر اس نے ایک میٹنگ بلالی تھی۔ ابھی اس سے فارغ ہوا ہی تھا کہ حیا کا فون آنے لگا۔ میٹنگ اس وقت برخاست ہو رہی تھی' سب اٹھ رہے تھے' کانفرنس روم میں شور سا مچا تھا جب اس نے حیا کی کال وصول کی۔ حیا کو اس نے سچ ہی بتایا کہ وہ دوست سے ملنے آیا تھا۔ عجلت میں بات ختم کرتے ہوئے اس نے فون کان سے ہٹایا اور بورڈ ممبران سے اختتامی الفاظ باآواز بلند کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اپنی چیزیں اٹھاتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ فون ابھی تک آن تھا۔ اس نے جلدی سے کال کاٹی' وہ ترکی میں بات کر رہا تھا' حیا نے کچھ بھی نہیں سنا ہو گا یقیناً' سو اسے پریشانی نہیں ہوئی۔

واپس اپنے آفس میں آکر بیٹھے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی جب اس کے موبائل پہ ٹریسر الرٹ بجنے لگا۔ وہ چونک سا گیا۔ اس کا ٹریسر اسی علاقے کے قریب تھا۔ کیا حیا آس پاس تھی؟ وہ کیوں ادھر آ رہی تھی؟

ابھی دوست سے ملاقات میں کافی وقت تھا' اور ہوٹل کا کام وہ بعد میں دیکھ لے گا' پہلے اسے اپنی بیوی کو ہینڈل کرنا تھا۔

لباس تبدیل کر کے جینز والا رف حلیہ بنا کر' سر پہ کیپ لیے' وہ اپنے آفس کی پرائیویٹ لفٹ سے نیچے آیا' اور آخری فلور پہ پیچھے کی طرف سے باہر نکل آیا۔ قریب سے اس نے بگھی لی' اور اسے پھولوں کی مارکیٹ کا چکر لگانے کو کہا۔ جب اسے وہ پھولوں کے اسٹال پہ نظر آگئی' تو وہ بگھی سے اترا' اور واپس ہوٹل کے عقبی پارکنگ ایریا تک آیا۔ ایک کام کرنا وہ بھول گیا تھا' اور بھلے وہ دیکھتی رہے' یہ کام اسے کرنا تھا۔ اس نے اپنے گارڈ کو اپنے والٹ میں لگی حیا کی ایک تصویر دکھائی۔

"یہ لڑکی کبھی تمہیں اپنے آس پاس نظر آئی ہے؟"

"نہیں سر!" گارڈ نے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے' اگر یہ کبھی ہوٹل میں داخل ہونے کے لیے اس طرف آئے تو اس کو اندر مت جانے دینا' اور فوراً" مجھے اطلاع کرنا۔"

"تمام تمام! (او کے' او کے)" گارڈ نے فوراً" تابعداری سے سر ہلایا۔ جہان نے والٹ جیب میں واپس ڈالا' اور پلٹ آیا۔ ابھی اسے اپنی بیوی کو رنگے ہاتھوں پکڑنا تھا جو اس کی جاسوسی کر رہی تھی۔ پھر اسے اچھا خاصا شرمندہ کر کے' تاکہ وہ دوبارہ اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہ کرے' وہ عیسیٰ کی پہاڑی کی طرف جانے والے راستے پہ چل دیا۔ مگر چونکہ وہ پہلے اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ دو تین سال بعد ادھر آیا ہے' اس لیے اس بات کو نبھانے کے لیے وہ کبھی کبھی ظاہر کرتا تھا کہ اسے راستہ یاد نہیں۔ توقع کے عین مطابق وہ اس کی طرف سے مطمئن تھی۔

وہاں عیسیٰ کی پہاڑی کے سبزہ زار پہ بیٹھے' اس نے نوٹ کیا تھا کہ حیا نے ان تینوں موتیوں کو پہن رکھا تھا' اور یہ گردن والی چین تو بہارے کی تھی' وہ اسے پہچانتا تھا۔ البتہ ایک فرق اس نے محسوس کیا تھا۔ وہ عموماً گردن کے گرد دوپٹہ لیا کرتی تھی' البتہ آج اس نے اپنی شال شانوں کے گرد اچھی طرح لپیٹ رکھی تھی۔ یا تو عائشے کی کمپنی کا اثر تھا' یا پھر وہ اسے حلیمہ عثمان کے پاس لے گئی ہو گی۔ جو بھی تھا' اسے یہ نامحسوس سی تبدیلی اچھی لگی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی' تب بھی وہ اسے اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کر چکا تھا۔

جب ادھر بیٹھے حیا نے اس سے کبھی جلنے کا زخم محسوس کرنے کا پوچھا تو لمحے بھر میں جیل میں بیتے وہ تاریک دن اور اندھیری راتیں اس کے ذہن میں اٹھ آئیں' مگر وہ بات ٹال گیا۔ اسے اپنے زخم دکھا کر ہمدردی حاصل کرنے کا شوق ہرگز نہیں تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے' دور الاؤ کے پاس بیٹھے لڑکوں کے گروپ کو دیکھ رہا تھا۔ اسی میں ایک لڑکا اس کا "دوست" تھا۔ ابھی ملاقات میں وقت تھا' مگر وہ وہیں سے اسے پہچان گیا تھا۔ اس لڑکے کی عمر کم تھی' شاید پچیس برس' اس کے لیے تو وہ ایک جونیئر ایجنٹ ہی تھا۔ جونیئر مگر بہادر اور ذہین۔ اس کو پاکستان جانا تھا اور جہان سے کچھ چیزیں لے کر جانا تھا۔ دو ایک کام وہ پہلے بھی ساتھ کر چکے تھے' اور اپنے سینئر ایجنٹ کی وہ لڑکا "عمر" بہت عزت کرتا تھا۔ اس کو عمر کا اصل نام معلوم نہ تھا' نہ وہ کبھی اپنے ملک کی باتیں کرتے تھے' اجازت ہی نہیں تھی' مگر وہاں بیٹھے' حیا سے اس کی رپورٹ کا پوچھتے ہوئے بھی وہ عمر کی موجودگی سے ہی بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ملک کی تو ہوا بھی اپنی لگتی ہے' یہ تو پھر ہم پیشہ' ہم وطن تھا۔

"میں عبدالرحمن پاشا کے گمشدہ بھائی پر رپورٹ لکھ رہی ہوں۔" کسی اور دھیان میں اس نے حیا کی بات سنی اور اگلے ہی لمحے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی؟ جب فون پہ حیا نے کہا تھا کہ وہ کچھ لکھ رہی ہے تو وہ اسے یونہی خالی خولی سی دھونس سمجھا تھا' مگر یہ تو کچھ وہ بتا رہی تھی' اس نے لمحے بھر کو تو جہان کا سانس ہی روک دیا۔

بات رپورٹ کی نہیں تھی' اس کی رپورٹ نہ کبھی کہیں جانی تھی نہ کسی نے شائع کرنی تھی۔ بات یہ تھی کہ اس کو یہ ساری باتیں کون بتا رہا تھا؟ اگر عائشے نے بتایا ہے تو پھر یہ بات خطرے کی علامت تھی کہ عبدالرحمن کے گھر سے باتیں باہر نکل رہی تھیں۔ پاشا بے نئی زندگی شروع کرنے جا رہا تھا۔ ذاتی اختلاف ایک طرف' وہ ان کا ایجنٹ تھا اور اس کی حفاظت کو یقینی بنانا ان کا فرض۔ اب اس کے گھر سے' اس کی بیوی کی طرف سے کوئی ایسی بات باہر نکلے جو پاشا بے کو نقصان پہنچائے' یہ اس کو مضطرب کر دینے کے لیے کافی تھا۔ حیا اور عائشے پھر یہ باتیں اور لوگوں سے بھی کہتی ہوں گی' ایک صرف جہان سے تو ذکر نہیں کیا ہو گا نا۔ یہ باتیں ادالار میں نہیں پھیلنی چاہئیں۔ دنیا ویسے تو چھوٹی تھی ہی' مگر بیوک ادا تو بہت چھوٹا تھا۔

بہت مشکل سے اس نے بات کا رخ پھیرا۔ چونکہ وہ حیا سے ایسی بات کی توقع نہیں کر رہا تھا' اس لیے وہ خود بھی ذرا سا پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پہاڑی کے نیچے تک آیا تھا' پھر وہ سامان لینے چلی گئی تو وہ واپس اوپر آیا' عمر سے ملا' امانت پہنچائی اور واپس بندرگاہ پہ آگیا۔

کل وہ دوبارہ بیوک ادا آئے گا' پھر عائشے سے نبٹے گا' مگر آج کل میں اسے وہ ویڈیو لاکر میں رکھ دینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ پزل باکس کھول چکی ہو' اور اب جب کہ وہ استنبول جا ہی رہی تھی تو وہ جلد یا بدیر لاکر ڈھونڈ ہی لے گی۔

اگلے روز وہ بیوک ادا آگیا۔ وہ ہوٹل میں تھا جب عائشے نے اسے میسج کیا کہ حیا کل چلی گئی تھی سو وہ گھر آسکتا ہے۔ عائشے جانتی تھی کہ وہ اسی کے ساتھ گئی ہے مگر اسے اطلاع دینے کا مقصد اسے گھر بلانا تھا۔ آنے بھی گزشتہ رات آگئی تھیں۔ وہ مزید ان کو ادالار سے دور نہیں رکھ سکتا تھا' سو اچھا ہوا کہ حیا ان کے آنے سے قبل جا چکی تھی۔

عائشے کو اس نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے سلام بھی نہیں کیا' نہ ہی اس کے مخاطب کرنے پہ ٹھیک سے بات کی۔ عائشے کو موتیوں والی بات معلوم ہو چکی تھی' اور اس نے یہی قیاس کیا کہ عبدالرحمن اس سے اسی تھپڑ پہ ابھی تک خفا تھا' تب ہی سوائے اس رات کے'

اس نے عائشے سے ٹھیک سے بات نہیں کی تھی۔ وہ پھر سے معذرت کرنے آئی تھی مگر جہان کے حیا کو پاشا بے کے متعلق بتانے پہ جھڑکنے پہ وہ خفا ہو کر واپس چلی گئی۔ وہ اسٹڈی سے مطلوبہ اشیا لے کر پلٹنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر میز پہ رکھے پزل باکس پہ پڑی۔ وہ ایک دم ٹھہر گیا، پھر باکس اٹھا کر دیکھا۔ جلی ہوئی اطراف ابھری ہوئی سطور، چھ چوکھٹے الٹ پلٹ کر دیکھنے سے ہی وہ جان گیا تھا کہ یہ وہی پزل باکس ہے۔

جب اس نے عائشے سے باکس منگوایا تھا تو اس کی شکل یہ نہ تھی اور اس کا کوڈ (Ayeshe) عائشے پہ سیٹ تھا۔ چونکہ وہ انگریزی حروف تہجی پہ بنایا گیا تھا' اس لیے عائشے کے نام کے ہجے انگریزی کے حساب سے تھے' ورنہ ترکی میں اس کا نام Aysegul لکھا جاتا تھا۔ (اس میں انگریزی حرف "s" کے نیچے ننھی سی لکیر ہوتی تھی۔ ترک اگر عام "s" لکھتے تو اسے سین کی آواز سے پڑھتے' لیکن اگر ایس تلے لکیر ہوتی تو اسے شین کی طرح پڑھا جاتا۔)

بعد میں جہان نے اس کو کھول لینے کے بعد اس کا کوڈ تاقسم سیٹ کر دیا تھا۔ وہیں اسٹڈی میں کھڑے کھڑے اس نے کوڈ بار کو اوپر نیچے کیا' تاقسم پہ باکس کھل گیا۔ اندر اس کے لاکر کی سلپ' چابی اور کاغذ ویسے ہی پڑے تھے' اس نے پھر سے باکس بند کیا' سلائیڈز آگے پیچھے کیں اور وہیں کھڑے کھڑے سوچنا چاہا کہ اس لاپروائی کی وہ اپنی بیوی کو کیا سزا دے؟ حد ہو گئی' جو چیز اس نے بہت احتیاط سے اس تک پہنچائی تھی' اس کو یوں ادھر بھول کر چلی گئی تھی۔ غصہ اسے آیا مگر وہ دبا گیا۔

اب وہ کیا کرے؟ یہ باکس یہیں پڑا رہنے دے؟ مگر ایسی صورت میں ملازمہ یا عائشے کے ہاتھ لگ سکتا تھا' اور عائشے سے وہ ویسے ہی ذرا محتاط رہتا تھا۔ پھر کیا کرے؟ عائشے کو باکس دے دے کہ اسے بحفاظت حیا تک پہنچا دے۔ جو بھی تھا' عائشے امانت دار لڑکی تھی' امانت کو کھول کر نہیں دیکھے گی۔

مگر نہیں۔ ہاشم نے باکس بنواتے وقت عائشے سے یہی کہا تھا کہ عبدالرحمن کو اس بات کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔

پھر عبدالرحمن' جو کہ اس چیز میں ملوث ہی نہیں تھا' وہ باکس واپس حیا تک کیوں پہنچائے گا؟ اس کی کور اسٹوری میں جھول آ رہا تھا۔

کچھ دیر وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا' پھر ایک دم سے اسے خیال آیا۔

بہارے گل۔ وہ ہر کسی سے راز رکھ سکتی تھی سوائے اپنی بہن کے۔ وہ اپنا سارا کھایا پیا اپنی بڑی بہن کو ضرور بتاتی تھی۔ اس نے ذہن میں ایک لائحہ عمل ترتیب دیا اور باکس پکڑے باہر آیا۔

"یہ تو حیا کا ہے۔" اس کے استفسار پہ بہارے نے حیرت سے باکس کو دیکھتے ہوئے بتایا۔ "وہ یہیں بھول گئی؟ کل اس کا کزن آیا تو اسے جلدی میں جانا پڑا' تمہیں پتا ہے اس کا کزن بہت ہینڈسم ہے۔"

"بہارے نے حیا کے کزن کو کہاں دیکھ؟" اسے اچنبھا ہوا مگر جان بوجھ کر اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے اس نے بہارے سے سوالات پوچھنے شروع کیے۔ باکس کس نے حیا کو دیا' کس نے بنایا وغیرہ۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہ پکڑا جا سکتا تھا یا نہیں۔ مگر لگتا تھا حیا کو صرف باکس کھولنے میں دلچسپی تھی' اس نے بھیجنے والے کی زیادہ تحقیق نہیں کی تھی۔

اس نے بہارے سے کہہ دیا کہ وہ باکس اب اس کے پاس رہے گا' اور وہ جانتا تھا' بہارے بہت دیر تک یہ راز نہیں رکھ سکے گی۔ وہ عائشے کو ضرور بتائے گی۔ آنے کہتی تھیں' یہ دونوں آنے گل کی بیٹیاں ہیں' ان کی ماں نے ان کو کچھ کھلایا نہیں جب تک کہ اس پہ اللہ کا نام نہ پڑھ لیا ہو' اس لیے یہ نہ کبھی خیانت کر سکتی ہیں' نہ کسی کو دھوکا دے سکتی ہیں۔ بہارے کو لاکھ اپنی بہن کے درس سے چڑ ہو' وہ آخر تھی عائشے کی بہن۔

وہ حیا کی امانت مسلمان کی امانت اس تک ضرور واپس پہنچائے گی۔ ساتھ میں یہ بھی بتائے گی کہ عبدالرحمن اس باکس کو اس سے دور کرنا چاہتا تھا' شاید یہی سن کر حیا اگلی دفعہ اس کو کہیں رکھ کر بھولے گی نہیں۔

جب وہ واپس پلٹتا تو اس کو معلوم تھا' بہارے اس کے پیچھے دبے قدموں ضرور آئے گی۔ اس کو میز تلے' دروازوں کے چابی کے سوراخ اور دیواروں کے پیچھے سے باتیں سننے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے جب وہ اپنے کمرے میں گیا تو اس نے دروازہ ذرا سا کھلا رہنے دیا' اور بہارے کے سامنے الماری لاک کر کے چابی دراز میں ڈال دی۔

اب وہ پہلی فرصت میں جا کر اپنی بہن کو یہ بات بتائے گی اور عائشے "فوراً" سے پیشتر حیا تک اس کا باکس واپس پہنچا دے گی۔ اور کم از کم اس سے وہ اتنا تو جان لے گا کہ بہارے گل راز رکھ سکتی ہے یا نہیں؟ اپنی بہن سے تو شاید بالکل نہیں۔

اسی رات اپنے کمرے میں اس نے وہ ویڈیو ریکارڈ کی' اور اس میں وہ سب کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ اگر کچھ نہیں بتایا تو ابا کے ہاتھوں مارے جانے والے جاسوس کا قصہ کہ وہ ابا کا راز تھا' اور فریحہ کی جاسوسی کا قصہ کہ وہ فریحہ کا راز تھا' اور اپنے سر درد کا قصہ کہ وہ اس کا اپنا راز تھا اور راز نبھانے اسے بہت اچھی طرح آتے تھے۔

اس رات وہ سو نہیں سکا۔ صبح جب وہ واپس استنبول آیا تو سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ جواہر جا کر اس نے اپنے لاکر میں یو ایس بی فلیش رکھی' اور پھر واپس ریسٹورنٹ آ گیا۔ پوری رات کی بیداری کے بعد اب وہ پچھلے کمرے میں ایک صوفے پہ بیٹھا اور سر صوفے کی پشت سے لگایا ہی تھا کہ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ابھی اسے نیند میں گئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ موبائل بجنے لگا۔ بدقت اس نے آنکھیں کھولیں' سیدھا ہوا اور جیب سے فون نکال کر دیکھا۔ ایکسچینج اسٹوڈنٹ کال کر رہی تھی۔ ایک تو یہ ایکسچینج اسٹوڈنٹ ٹھیک سے چین بھی نہیں لینے دیتی۔ ایک لمحے کے لیے جہان نے سوچا کہ نظرانداز کر دے' مگر پتا نہیں کیوں وہ نہیں کر سکا اور کال ریسیو کی۔

"آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت سو رہا ہے' براہ مہربانی تھوڑی دیر بعد رابطہ کریں۔ شکریہ۔" وہ بولا تو اس کی آواز خمار آلود تھی۔

"جہان! اٹھو اور میری بات سنو۔" وہ بہت جھلا کر کہہ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی جہان ابھی اسی وقت تاقسم میں مرمرا ہوٹل پہنچے' سلیمان ماموں کے کوئی دوست آئے ہوئے تھے۔ وہ سخت کبیدہ خاطر ہوا۔

"میں نہیں آ رہا' مجھے آرام کرنے دو۔" جواب میں وہ بے حد خفا ہوئی اور اپنا پسندیدہ "جہنم میں جاؤ" بول کر فون رکھ دیا۔

جہان نے پھر سے سر صوفے کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں' مگر اب نیند کا آنا ناممکن تھا۔ کچھ دیر بعد حیا کا پھر میسج آیا۔ وہ اسے بلیو موسک بلا رہی تھی۔ یوں ہی اس کو جوابی ٹیکسٹ کر کے چھیڑتے ہوئے وہ اٹھا' شرٹ بدلی' چہرے پہ چھینٹے مارے' اور چابی اٹھا کر ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔

حیا نے میسج پہ بلیو موسک کا کہا تھا' اور نیلی مسجد کے باہر کے سبزہ زار پہ نصب بنچ پہ وہ اسے دور سے نظر آ گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ اسے واقعی پہچان نہیں پایا تھا۔

حیا نے سر پہ دوپٹا لے رکھا تھا۔ گہرے سبز رنگ کا دوپٹا جس کو وہ مستقل چہرے کے گرد ٹھیک کر رہی تھی۔ چونکہ اسے دوپٹا لینے کی عادت نہیں تھی' اس لیے وہ بار بار سر سے پھسل جاتا تھا۔

نیلی مسجد کے باہر کبوتر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ کتنی ہی دیر تو وہ اس منظر کو ٹھہر کر دیکھے گیا۔ ایک دم سے اسے کچھ یاد آیا تھا' جب وہ انڈیا میں تھا' اور اس بک اسٹال کے ساتھ وہ لڑکی ملی تھی' جسے ظاہر ہے کہ اس کے اپنوں نے ہی بھیجا تھا' اور وہ اسے اس آفیسر کا نام بتا گئی تھی۔ جو اس کی مدد کرے گا' اور بعد میں اسی کی مدد سے وہ جیل سے فرار ہوا تھا' اس لڑکی کے سر پہ بھی ایسے ہی سفید دوپٹہ تھا۔ خوب صورت' بہت خوب صورت جیسی علی کرامت کی ممی تھیں' جیسی آنے گل کی بیٹیاں تھیں' اور اب جیسی اس کی بیوی تھی۔

یہی تو چاہا تھا اس نے کہ اس کی بیوی ایسی ہو۔ جیسے وہ چہرہ نہ ڈھکنے' مگر باقی ہر طرح سے خود کو چھپائے اور

آج اس کی ساری خواہشیں پوری ہو گئی تھیں۔ اس کو بھی ایک مرہ جیلہ مل گئی تھی۔

اور تب ہی اس کی نگاہ حیا کے مقابل بیٹھے نوجوان پہ پڑی۔ اوہ۔ وہ ریسٹورنٹ سے فرائنگ پان کیوں نہیں لایا؟ آخر یہ شخص یہاں کیا کر رہا تھا؟ ایک لمحے کو اسے شدید غصہ چڑھا مگر جب اس نے دوبارہ حیا کو دیکھا تو جیسے بہت سے مناظر اس ایک منظر کی روشنی میں غائب ہو گئے۔

داور کی مہندی کی ویڈیو، حیا کا اس آدمی کی گاڑی میں بیٹھنا، بارش میں سرخ کوٹ میں ملبوس چلتی لڑکی۔

سارے منظر غائب ہوتے گئے، ایسے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ پیچھے صرف ایک منظر بچا۔ بار بار چہرے کے گرد دوپٹا ٹھیک کرتی، خفا اور اداس سی بیٹھی لڑکی جو ذرا غصے سے سامنے بیٹھے شخص کو کچھ کہہ رہی تھی۔

جب وہ ان کے قریب آیا تو وہ چونکی اور ایک دم اس کا چہرہ جیسے کھل اٹھا۔ وہ حیران تھی اور خوش بھی۔ وہ اتنی بے اختیار ہو کر اٹھی کہ موبائل جو شاید اس کی گود میں تھا، زور سے نیچے جا گرا۔

"جہان! یہ ابا کے دوست کے بیٹے۔" وہ تعارف کرانے لگی۔ اب وہ کیا بتاتا کہ وہ اس آدمی کو پہلے سے جانتا ہے، مگر ولید کو وہ ضرور کچھ بتانا چاہتا تھا۔ سلیمان ماموں اور حیا سے بہت ہی اپنائیت سے بات کرنے کے بعد اس نے لغاری صاحب کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں مسکراتے ہوئے اسی اپنائیت سے سارے رشتوں کی وضاحت ایک فقرے میں کر دی۔

"میں جہان سکندر ہوں، سلیمان ماموں کا بھانجا اور داماد، حیا کا ہزبینڈ۔"

اور اس ایک فقرے نے اس کے اپنوں کو جو حیرت بھری خوشی عطا کی، اس سے سلیمان ماموں کا داماد اور بھانجا اور حیا کا ہزبینڈ بالآخر یہ بات جان گیا کہ وہ سب یہ رشتہ چاہتے تھے۔ ساری ناراضیاں دور ہو گئیں، سارے گلے ختم ہوئے۔ اس نے اپنی بیوی کو اس شخص کے سامنے مان دیا جس کے اور اس کی بیوی کے درمیان کبھی کچھ نہیں رہا تھا، ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

شام کو جب ماموں اور ممی لاؤنج میں تھے، وہ کچن میں حیا کی مدد کروا رہا تھا۔ تب اس نے حیا کا پلان جاننے کی کوشش کی۔ وہ اسے ترکی سے بھیجنا چاہتا تھا مگر حیا نے ابھی کچھ طے نہیں کیا تھا کہ اسے ترکی میں رہنا ہے یا کسی دوسرے ملک۔ جہان نے لندن جانے کی بابت پوچھا۔ نیلی مسجد میں اس کے اعتراف کے بعد وہ ابھی تک ذرا ششدر تھی، سو فوری فیصلہ نہیں کر سکی۔ ممی اور ابا کو وہ لندن میں سیٹل کر رہا تھا۔ اگر حیا لندن جانے پہ راضی ہو گئی تو وہ اسے ان کے ساتھ لندن بھیج دے گا، لیکن اگر وہ نہیں راضی ہوتی، تو وہ دوسرا طریقہ استعمال کرے گا۔

شام میں ان کی منگنی ہوئی۔ ممی کو جیسے ہی پتا چلا کہ اس نے سب کے سامنے یہ اعتراف کیا ہے، وہ بہت خوشی سے وہ دو انگوٹھیاں نکال لائیں جو انہوں نے اس موقع کے لیے عرصے سے سنبھال کر رکھی تھیں۔

وہ واقعی اس روز بہت مطمئن تھا۔ جب رات میں وہ ماموں کو چھوڑ کر گھر واپس آیا تو اس کا ارادہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھی سی کافی پینے اور کوئی اچھی سی مووی دیکھنے کا تھا۔ فیملی والا احساس بہت عرصے بعد دل میں جاگا تھا، وہ اس احساس کو جینا چاہتا تھا۔

مگر اس سے قبل حیا نے اسے بری خبر سنا دی۔

"تمہارے لیے فون آیا تھا۔ کوئی لڑکی تھی، نام تو نہیں بتایا مگر کہہ رہی تھی کہ تمہارا پارسل اسے نہیں ملا، کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے۔"

اور کسی نے واقعتاً اس کا سانس روک دیا۔ اس کا گھر ایک سیف ہاؤس کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہاں شام سے ایک "کانٹیکٹ" کی کال ہی آ سکتی تھی، اور اس کو پارسل نہ ملنے کا مطلب بہت بھیانک تھا۔ پارسل جو اس نے یہاں سے بھیجا تھا، واپس نہیں پہنچا تھا، بلکہ کسی غلط ایڈریس پہ جا چکا تھا۔ اس نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پیغام کو ڈی کوڈ کیا۔

اس کا بھیجا ہوا لڑکا، عمر واپس نہیں پہنچا تھا۔ بلکہ گرفتار ہو گیا تو یقیناً "بہت ایمرجنسی سچویشن" تھی۔ اس

لیے پیغام اس کے گھر چھوڑ دیا گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ پیغام جس نے بھیجا ہو، وہ بھی جلدی جلدی اپنی جگہ سے پیک اپ کر کے نکل رہی ہو۔ خدایا یہ کیا ہو گیا تھا؟

اس کا ڈر کا پکڑ آ گیا تھا۔ جیل تشدد، اذیت اس کے ہر طرف وہی تنگ و تاریک سیل چھانے لگا۔ ایسے میں کافی، مووی، سب فضول تھا۔

پوری رات وہ اسی صوفے پہ بیٹھ ہینڈلر کی کال کا انتظار کرتا رہا، مگر کال نہیں آئی۔ دو راتوں کی بے خوابی کے باعث صبح تک اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ ہر کوئی جیل سے فرار نہیں ہو پاتا۔ لوگ برسوں جیل میں سزا اور تشدد کاٹ کر وہیں خاموشی سے جان دے دیتے ہیں۔ ایک اور اسپائی ضائع ہو گیا۔ ایک اثاثہ ضائع ہو گیا۔ اس کی اذیت کی کوئی حد نہیں تھی۔

اس سارے میں حیا کا خیال اس کے ذہن سے بالکل نکل گیا۔ صبح ہوتے ہی وہ واپس چلی گئی۔ جہان نے روکا بھی نہیں۔ اس کے پاس کرنے کو بہت سے دوسرے کام تھے۔

اگلے روز وہ بیوک ادا چلا گیا۔ حیا، پزل باکس، جواہر کالا کر اس نے سب کچھ ذہن سے جھٹک کر خود کو ہوٹل گرینڈ میں مصروف کر لیا۔ ریسٹورنٹ میں اس نے بتا دیا تھا کہ اگر اس کی دوست (حیا) شام میں آئے تو کہنا جہان جلدی اٹھ کر چلا گیا ہے، اگر صبح میں آئے تو کہنا وہ آیا ہی نہیں۔ چند روز وہ واقعی نہیں آئی۔ عمر کی گرفتاری کی بھی تصدیق ہو گئی۔ پھر ان ہی دنوں وہ بالآخر خود کو راضی کر کے انقرہ لے آیا۔ یہاں اسے اپنا چیک اپ کرانا تھا، سر کا بدترین درد جو سر سے ہوتا ہوا گردن تک جاتا، اسے اب اس کا علاج چاہیے تھا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد اس نے گردن اور سر کے ایک طرف کا ایم آر آئی کروایا تھا، مگر برین ایم آر آئی اس نے نہیں کروایا تھا۔ اپنا درد اس نے ہر جگہ چھپایا تھا۔ تب اتنی تکلیف ہوتی بھی نہیں تھی۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھی تھی۔ پچھلے سال جہان ... اذیت

کے ساتھ گزارے تھے، اب بالآخر وہ اس کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔

ایم آر آئی سے قبل، سادہ ایکسرے سے ہی سارا معاملہ صاف ہو گیا۔ اس کو ایکسرے دکھانے سے قبل ڈاکٹر نے پوچھا تھا۔

"کیا کبھی تمہیں سر پہ کوئی چوٹ آئی تھی؟ کوئی ایکسیڈنٹ جس میں سر کسی چیز سے ٹکرایا ہو؟"

"ہاں! میری لڑائی ہو گئی تھی کچھ لوگوں سے، انہوں نے مجھے سر پہ ایک تلے کی طرح کی چیز سے مارا تھا جس سے سر سے خون بھی نکلا تھا۔ مگر خون اتنا زیادہ نہیں تھا۔ آنکھ کے قریب زخم سا ہوا تھا جس سے تھوڑا سا خون نکل کر کنپٹی تک ہی گرا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے، لیکن۔۔۔" ساتھ ہی ڈاکٹر نے اس کا ایکسرے اس کے سامنے رکھا۔ "شاید جس چیز سے انہوں نے تمہیں مارا تھا، اس پہ چھوٹی سی کیل لگی ہوئی تھی۔ ایک اعشاریہ ایک انچ کی کیل جو تمہاری آنکھ کے قریب گھس گئی تھی۔"

اس نے بے اختیار آنکھ کے قریب چہرے پہ ہاتھ رکھا۔ وہ ایک Foriegn object کے ساتھ پچھلے پانچ برس سے رہ رہا تھا اور اسے کبھی پتا نہیں چل سکا؟

"اب کیا ہو گا؟" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ماضی کا افسوس کرے یا مستقبل کے لیے پریشان ہو۔ اسے واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"ہمیں سرجری کے ذریعے یہ فارن آبجیکٹ ریموو کرنا پڑے گا، مگر۔" ڈاکٹر متذبذب سا رک گیا۔

"آپ بتا دیں جو بھی بتانا چاہتے ہیں۔ میں تیار ہوں۔" بمشکل اس نے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔

"دیکھو! میڈیکل ہسٹری میں بہت سے ایسے کیسز آئے ہیں جس میں لوگ برسوں فارن آبجیکٹ کے ساتھ رہتے ہیں اور انہیں علم بھی نہیں ہوتا۔ وہ آدمی جس کے گلے کے قریب چاقو کا پھل، اور میرا مطلب ہے واقعی چاقو کا پھل گھس گیا تھا، چار برس تک اس کو علم ہی نہیں ہو سکا کہ اس کے گلے میں کچھ ہے اور جرمنی کی ایک عورت تیس پینتیس برس تک اپنے

برین میں آٹھ سینٹی میٹر لمبی پنسل لیے رہی۔ سرجری سے ایسی بہت سی چیزیں نکالی جاتی رہی ہیں مگر ’وہ پھر رکا۔‘ ”یہ ننھی سی کیل تمہاری lobe occipital کے بالکل ساتھ پھنسی ہے۔ چند ملی میٹر بھی آگے پیچھے ہوتی تو تم اندھے ہو جاتے۔ اب اس سرجری کا کم از کم میں رسک نہیں لوں گا‘ اس کی کامیابی کا چانس کم اور تمہارے اندھے ہو کر معذور ہونے کا چانس زیادہ ہے۔“

وہ خاموشی سے عادتاً ”نچلا لب دانت سے دبائے سنے گیا۔ کبھی وہ سوچتا تھا‘ وہ بہت خوش قسمت ہے کہ وہ بغیر کسی مستقل انجری کے جیل سے باہر آگیا اور فوج کے لیے ناکارہ نہیں ہوا۔ مگر وہ غلط تھا۔ جیل افسران نے اس سے پہلے دن کہا تھا کہ کوئی ان کی جیل سے مردہ یا اپاہج ہوئے بغیر نہیں جاتا۔ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ وہ بالکل ٹھیک کہتے تھے۔

”پھر میں کیا کروں؟“ بہت دیر بعد اس نے پوچھا تو ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تم دوسری رائے کے لیے کسی اور کے پاس جا سکتے ہو۔ باہر چلے جاؤ۔ جرمنی بہتر رہے گا۔ یقیناً“ کوئی مجھ سے اچھا سرجن یہ رسک لینے پہ تیار ہو جائے گا۔“

وہ رات بہت تکلیف دہ تھی۔ ایک طرف یہ سر درد اور اب نکسیر پھوٹنا اور دوسری طرف اندھے ہونے کا خدشہ وہ کس کا انتخاب کرے؟ کیا اس کیل کو سر میں پڑا رہنے دے؟ یا پھر نکلوانے کا خطرہ مول لے لے؟ اور اگر وہ اندھا ہو گیا یا اپاہج‘ تو کیا ہو گا؟ کیریئر ختم‘ ملک کی خدمت ختم‘ حکومت کا لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اس کو تربیت دلانا ختم‘ زندگی ختم۔

صبح وہ سیدھا ریسٹورنٹ گیا۔ آج پہلی دفعہ اس کا دل کسی کام کے لیے نہیں چاہ رہا تھا۔ زندگی پہلے بھی بے یقین تھی‘ مگر اب تو مزید بے یقین ہو گئی تھی۔ کیریئر کا ختم ہونا اس کے لیے زندگی کے ختم ہونے کے برابر تھا۔ مگر پھر بھی وہ یہ رسک لے گا۔

خطرہ لیے بغیر بھی کوئی زندگی ہوتی ہے بھلا؟

”جہان بھائی وہ آپ کی دوست آئی تھی رات کو۔“ کاؤنٹر پہ جزوقتی بیٹھنے والے لڑکے نے بتایا تو وہ چونکا۔

”حیا؟ کیا کہہ رہی تھی؟“

”اپنی دوست کے ساتھ آئی تھی‘ آپ کا پوچھا پھر چلی گئی۔ کافی دیر بعد دونوں دوبارہ آئیں‘ ان کے شاید کوئی پیچھے لگا ہوا تھا‘ انہوں نے بیک ڈور کا رستہ مانگا۔ پھر وہ وہیں پینٹری میں بیٹھی رہیں۔ سوا ایک بجے وہ پیچھے سے نکل گئیں۔“

”اور کچھ؟“

”اور پاشا بے بھی آئے تھے۔“ اب کے وہ بری طرح چونکا۔

”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“

”آپ کا انتظار کرتے رہے۔ یہیں دروازے کے پاس کرسی پہ بیٹھے رہے۔ اچھے موڈ میں نہیں تھے۔ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔“

”کیا وہ دونوں لڑکیاں اس کی موجودگی میں آئی تھیں“ بہت دن اپنے مسئلوں میں الجھنے کے بعد آج اسے حیا کی پھر سے فکر ہوئی تھی۔

”جی۔۔۔ وہ دونوں دروازے کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ ساتھ ہی بیٹھے تھے‘ انہوں نے چہرے کے آگے اخبار کر رکھا تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہو گا۔ پھر جب وہ دوسری دفعہ آئیں تب تک وہ جا چکے تھے۔“

”اچھا۔“ وہ مطمئن ہو کر اندر چلا گیا۔ پاشا بے نے حیا کو دیکھ لیا ہو‘ تب بھی وہ ہرگز نہیں جان سکتا تھا کہ وہ جہان کی بیوی ہے۔ اسے جاننا بھی نہیں چاہیے تھا۔ کمزوریوں کو کیسے پکڑا جاتا ہے‘ جہان سے بہتر کون جانتا تھا‘ اس لیے کوئی اس کی اپنی کمزوری پکڑے‘ یہ وہ نہیں چاہتا تھا۔ بس اب وہ جلد از جلد حیا کو یہاں سے بھیج دے گا۔ استنبول غیر محفوظ تھا‘ کم از کم اس کی حیا کے لیے۔

مگر اسے واپس بھیجنے سے قبل ضروری تھا کہ وہ اپنا پزل باکس کھول لے اور لا کر بھی۔ وہاں موجود گارڈ کو اس نے ہدایت دے دی تھیں۔ جب بھی کوئی نمبر کا لاکر کھولنے آئے گا‘ گارڈ اس کے ایک نمبر پہ میسج کر دے گا۔ چند پیسے لے کر گارڈ اس کام کے لیے راضی تھا۔ اور ابھی تک لاکر کھولنے کوئی نہیں آیا تھا۔

جب وہ دوبارہ بیوک ادا گیا تو اس نے اپنی الماری چیک کی۔ پزل باکس وہاں نہیں تھا۔ وہ عائشے نے رکھ لیا یا حیا تک واپس پہنچ گیا؟ یہی پوچھنے کے لیے اس نے بہارے کو بلایا۔

وہ سر جھکائے اوپر آئی اور صاف صاف بتا دیا کہ پزل باکس اس نے حیا کو دے دیا ہے۔ چند لمحے وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ بہارے گل عائشے سے راز نہیں رکھ سکتی تھی۔ یقیناً“ اس نے سب سے پہلے عائشے کو بتایا ہو گا۔

اس نے بہارے پہ غصہ نہیں کیا۔ غصے والی بات ہی نہیں تھی۔ وہ اس کے سامنے ایک پنجے کے بل بیٹھا اور اس سے اپنے راز کے بارے میں پوچھنے لگا۔

”پھر تو مجھے تمہارے دوسرے وعدے کا بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“

اور اب تو اسے اس وعدے کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اس پاک اسپائی کو جنازہ نہیں دے سکا تھا جس کو اس نے لیا کے ساتھ دفنایا تھا‘ مگر شاید بہارے اس کو جنازہ دے سکے۔ یہ الگ بات تھی کہ کور blow ہونے پہ سب لوگ آپ کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ مگر بہارے مصر تھی کہ ایسا نہیں ہو گا۔

”پورا اولا ر‘ بلکہ پورا ترکی تمہیں چھوڑ دے‘ مگر بہارے گل تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گی۔“

مگر بہارے گل کے چہرے پہ شدید غصہ ابھر آیا جب جہان نے اس کی ”نئی دوست“ کا ذکر کیا۔ وہ حیا کو بہت پسند کرتی تھی‘ مگر عبدالرحمٰن اس میں دلچسپی رکھتا ہے‘ یہ بات اس کو پسند نہیں تھی۔

”وہ اپنے کزن کو پسند کرتی ہے اور اس کا کزن بہت ہینڈسم ہے۔“ اس نے اپنے طور پہ عبدالرحمٰن کو [illegible] سے مقابلے کا احساس دلایا۔ بہارے نے حیا کا کزن کہاں دیکھا‘ یہ وہ عائشے سے بعد میں پوچھے گا‘ مگر پہلے اس نے عبدالرحمٰن کے متعلق حیا کی رائے جاننی چاہی تو وہ فوراً بولی۔

”یہ سچ ہے‘ اسے تم بالکل پسند نہیں ہو۔“

تب وہ بہارے کے سامنے سے اٹھ گیا۔ وہ زیادہ دیر رکے گا تو بہارے سمجھے گی عبدالرحمٰن نے اسے معاف کر دیا‘ جبکہ وہ عائشے کی طرح اسے بھی یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ خفگی اتنی جلدی بھلانے والوں میں سے نہیں ہے۔

تب بہارے نے اسے پہیلی لکھنے والے کی بابت پوچھا۔ وہ ذرا چونکا‘ پھر لاعلمی ظاہر کی‘ مگر اس کی اگلی بات نے جہان کو واقعتاً“ چونکا دیا۔ اس نے کیوں نظر انداز کر دیا کہ جو باکس اس نے بہارے کو دیا تھا اور وہ جو حیا کو دیا تھا‘ دونوں کی پہیلیوں کی لکھائی کا انداز ایک سا تھا۔ جبکہ ایک میجر احمد نے دی تھی اور دوسری عبدالرحمٰن نے۔ دونوں کو ایک سا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ حیا نے محسوس کر لیا تو عائشے نے بھی کر لیا ہو گا۔ عبدالرحمٰن کا اصل تعارف ”میجر احمد“ عائشے کو نہیں پتا چلنا چاہیے۔

شام میں وہ عائشے کے پاس بالخصوص اسی مقصد کے لیے آیا‘ مگر حیا نے اس کے سامنے کسی میجر کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ پھر خیال آنے پہ پوچھا۔

”بہارے کہہ رہی تھی۔ حیا کا کزن کافی ہینڈسم ہے۔ تم تو اس دفعہ اسے ساتھ نہیں لائی تھیں جب میں حیا سے ملنے آیا تھا۔ پھر بہارے کو کیسے پتا چلا؟“

عائشے کا چہرہ خفت سے گلابی پڑ گیا۔

”نہیں‘ وہ دراصل حیا نے اس سے کہا تھا کہ اس کی اپنے کزن سے شادی ہو چکی ہے‘ تو بہارے مجھ سے بار بار پوچھتی تھی کہ اس کا کزن کیسا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ بہت اچھا ہے جو سچ تھا وہی کہا۔“ وہ ذرا گڑبڑا کر سر جھکائے لکڑی کو چھیدنے لگی۔

”تھینک یو عائشے! تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ میں کبھی تم سے کوئی اور فیور مانگوں تو کیا تم دو گی؟“ بنا کسی تمہید کے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ عائشے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا‘ چند لمحے دیکھتی رہی‘ پھر گردن

اثبات میں ہلا دی۔
"تم مجھ پہ بھروسا نہیں کرتے، مگر تمہیں کرنا چاہیے۔" پھر جیسے وہ کچھ اور کہتے کہتے رک گئی اور سر جھٹک کر دوبارہ سے کام کرنے لگی۔ وہ یقیناً "موتیوں" کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر کیا فائدہ۔
پھر ایک روز اس نے حیا کو میجر احمد کی طرف سے فون بھی کرلیا۔ اس کی باتوں سے اسے نہیں لگا کہ وہ باکس کے عبدالرحمن کی طرف سے ہونے کے بارے میں جان چکی ہے۔ اس روز وہ ذرا جھنجلائی ہوئی تھی۔
"مجھے لگتا ہے آپ کو اور پاشا کو میرے علاوہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔"
چند روز اسی روٹین میں گزر گئے۔ صبح ہوٹل گرینڈ اور دوپہر کی فیری لے کر استنبول آجانا۔ طیب حبیب واپس استنبول آچکا تھا اور اس نے بار بار مداخلت شروع کردی تھی۔ جو وعدے کیے تھے پورے کرو۔ وہ جواب میں اسے ٹال نہیں رہا تھا، بلکہ صرف تھوڑا سا وقت مزید مانگ رہا تھا۔ اپنی جگہ طیب حبیب بھی ٹھیک تھا۔ اس کی زندگی استنبول میں تنگ ہو چکی تھی۔ اس کے دشمن عبدالرحمن کے دشمنوں سے زیادہ تھے۔ مگر وہ کیا کرتا کہ ہر چیز اس کے ہاتھ میں نہ تھی۔ سارے احکامات پیچھے سے آتے تھے، سو وہ طیب حبیب کو جھڑک کر خاموش کروا دینے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ طیب بکتا جھکتا مگر پھر خاموش بھی ہو جاتا۔ اپنے غصے کا اظہار کردینے کے بعد پسپائی بھی اختیار کرلیا کرتا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی بقا عبدالرحمن کے ساتھ میں ہے۔ اس کی دشمنی میں نہیں۔
چند روز بعد اسے احساس ہوا کہ حیا کو اپنے فون میں اس کے ٹریسر کے بارے میں علم ہو گیا تھا، کیونکہ اس روز جب وہ اچانک ـــ برگر کنگ آئی تو وہ ذرا حیران ہوا۔ وہ چاہتی تھی کہ آج وہ دونوں مل کر استقلال اسٹریٹ کو چلتے چلتے ختم کرلیں۔ وہ کام چھوڑ کر باہر آیا اور ساتھ میں اپنا فون بھی چیک کیا۔ اس کا ریسیور اسے بتا رہا تھا کہ ٹریسر سبانجی میں ہی ہے، جبکہ حیا کا فون اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ اچھا تو اس نے ٹریسر فون سے نکال لیا تھا؟ شاید اسی لیے اس نے صبح میجر احمد کے نمبر پر ٹیکسٹ کیا تھا کہ وہ کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہے۔ جہان نے سوچا تھا، فارغ ہو کر اسے کال کرے گا، مگر فراغت سے قبل ہی وہ خود آگئی تھی۔
وہ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے استقلال اسٹریٹ پر آگے بڑھنے لگے۔ جہان کو یاد تھا، جب حیا کا جنجر بریڈ ہاؤس ٹوٹنے پہ وہ اس کے ڈورم کے باہر کھڑا رہا تھا، تب اس نے اسے ٹائمڈ کال کی تھی۔ شاید اس کی موجودگی میں کال آنے پہ حیا اسے اپنا یہ مسئلہ بتادے۔ اس روز وہ بات ادھر ادھر کرگئی تھی۔ آج اس کے ساتھ جیسکی میں چلتے ہوئے اس نے پھر سے وہی کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیا اب ان دونوں میں اتنا اعتبار قائم ہو چکا تھا کہ حیا اسے سب کچھ بتادے؟
وہ جوس لینے ایک کیفے میں گیا اور کال کا ٹائم سیٹ کرکے جوس لیے باہر آگیا۔ اس نے ریکارڈنگ نہیں لگائی تھی۔ جب حیا کال اٹھائے گی تو رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ وہ سمجھے گی دوسری جانب سے کاٹ دیا گیا ہے۔ وہ سننا چاہتا تھا کہ اس کال کی وہ کیا وضاحت دیتی ہے؟
وہ دونوں اب گلی میں کافی آگے تک بڑھ گئے تھے۔ حیا نے اس سے لندن جانے کا پوچھا ضرور، مگر خود اس کا اپنا ارادہ بیوک ادا میں رہنے کا تھا۔
"میں اپنی دوستوں کے ساتھ بیوک ادا میں رہنا چاہتی ہوں۔" وہ بے نیازی سے شانے اچکا کر کہتی چل رہی تھی۔ اس روز بھی اس نے اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ جو وہ چاہتا تھا وہ اس نے کبھی حیا سے نہیں کہا پھر بھی وہ ہو گیا تھا۔ اس سے آگے وہ کیا چاہتا تھا؟ بس اعتبار کا ایک رشتہ۔ جب وہ پیدا ہو جائے گا تو وہ اسے خود سے بتادے گا کہ وہ ان جنت کے پتوں میں کتنی خوب صورت لگتی ہے۔
ابھی جہان نے اس کو ایک ٹرک دکھا کر اخبار تہہ کر کے پکڑا ہی تھا کہ حیا کا موبائل بج اٹھا۔ حیا نے فون نکال کر دیکھا، پھر کال کاٹ دی۔
"میجر احمد کی کال تھی، کچھ کام تھا ان سے۔" وہ سرسری سے انداز میں بولی اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اس کو کیا کہے۔ وہ اتنی صاف گوئی سے بتادے گی اس نے توقع نہیں کی تھی۔
کے پوچھنے پہ حیا نے بس اتنا بتایا کہ میجر احمد کون ہیں، مگر آگے پیچھے کچھ نہیں۔ سچ بتانے اور اعتبار کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ان کے درمیان سچ بولنے کا تعلق قائم ہو چکا تھا، مگر اعتبار کا شاید نہیں۔ نہ اس نے حیا کو خود سے اپنے بارے میں سب سچ بتایا تھا، نہ ہی حیا نے اسے وہ تمام واقعات بتائے تھے جو اس کے ساتھ پچھلے چند ماہ سے ہو رہے تھے۔
جب وہ واپس چلی گئی تو وہ ریسٹورنٹ آگیا۔ اس کا دل مطمئن تھا بھی اور نہیں بھی۔ حیا نے اس سے جھوٹ نہیں بولا، مگر اس پہ اعتبار بھی نہیں کیا۔ وہ لندن بھی اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ بیوک ادا میں رہے، یہ وہ نہیں چاہتا تھا، مگر جب دونوں کے درمیان اعتبار کا رشتہ تھا ہی نہیں، تو وہ کس مان پہ اس سے کچھ منوا سکتا تھا؟
وہ ترکی صرف جہان کے لیے آئی تھی، وہ جان گیا تھا۔ اب وہ اس کو یہاں سے صرف اپنی وجہ سے ہی بھیج سکتا تھا۔
تب ہی حیا کا فون آنے لگا۔ اس نے کال کاٹ کر خود فون کیا۔ یہ پہلی دفعہ تھی جب حیا نے خود اس سے بات کرنی چاہی تھی۔ زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب وہ اسے بتا رہی تھی کہ اس نے "جہان سے" میجر احمد کا تذکرہ کیا تھا۔
"کیوں؟ آپ نے کیوں بتایا؟" وہ بھی جاننا چاہتا تھا۔
"شوہر کو علم ہونا چاہیے کہ اس کی بیوی کس سے بات کرتی ہے۔" اس کے ختم کرکے کہنے پہ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔
اب وہ اسے وہ باتیں بتا رہی تھی جو اس نے اولارار میں عبدالرحمن اور طیب حبیب کے بارے میں سنی تھیں۔ وہ تحمل سے اس کی سنتا اور پھر اسے سمجھاتا رہا۔ اسے صرف یہ جاننے میں دلچسپی تھی کہ حیا نے یہ ساری باتیں کس سے سنی تھیں۔ کسی بات کے جواب میں وہ "میں نے سنا ہے کہ ـــ" کہہ ہی رہی تھی کہ جہان نے اس کی بات کاٹی۔
"کس سے سنا ہے؟" اتنی تیزی سے پوچھنے پہ وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔
"لیڈی کبریٰ سے۔ ادالار میں۔"
تو یہ لیڈی کبریٰ تھیں۔ عائشے سے ان کی اچھی سلام دعا تھی، اور ان کا بیٹا ہوٹل گرینڈ میں ایک معمولی سی ملازمت کرتا تھا۔ ان خاتون سے تو وہ ذرا واپس جا کر نبٹے گا۔ ابھی اسے حیا کے ذہن سے اس خیال کو نکالنا تھا۔ جو بھی تھا، وہ میجر احمد پہ بھروسا کرتی تھی۔
اس روز پہلی دفعہ اس سے حیا نے پوچھا تھا کہ وہ جنت کے پتے کسے کہتا ہے؟ جواب میں وہ اسے وہ سب بتاتا گیا جو اس نے علی کرامت کی ممی سے بچپن میں سنا تھا۔ وہ ادھوری، پوری باتیں، وہ نرم سا احساس، وہ دل میں اترتے لفظ، وہ ہر چیز دہراتا گیا، یہاں تک کہ وہ کہہ اٹھی۔
"آپ اچھے انسان ہیں، اچھی باتیں کرتے ہیں۔"
آہ کاش، وہ اسے بتا سکتا کہ اس نے اس اچھے انسان کو کب، کب اور کیا کیا اٹھا کر دے مارا ہوا ہے۔

✲ ✲ ✲

بیوک ادا کے ساحل پہ لہریں پتھروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ ان کا شور اس اونچے، سفید قصرِ عثمانی کے اندر تک سنائی دے رہا تھا۔ محل اندھیرے میں ڈوبا تھا، سوائے اس کی اسٹڈی کے جہاں وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ سامنے لیپ ٹاپ کی چمکتی اسکرین پہ وہ پیغام کھلا تھا جو اس کے "اپنوں" کی طرف سے آیا تھا۔ اس کا کام ادالار میں آخری مراحل میں تھا۔ تاش کے پتوں کے گھر کا آخری مرحلہ۔ پھر اسے روپوش ہو جانا تھا۔
کچھ عرصہ روپوش رہ کر وہ دوبارہ استنبول آئے گا، ایک آخری کام نپٹائے گا اور پھر واپسی۔ اپنے ملک واپسی۔

جب سے اس نے میل پڑھی تھی' وہ انگوٹھیاں اور گلاسز خود سے علیحدہ کر کے میز پہ رکھ دی تھیں اور یہ سگریٹ نوشی' اس سے بھی اس کو جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ اب عبدالرحمن پاشا کو چھوڑنے میں کم وقت رہ گیا تھا۔

اس کے سر کا درد ویسا ہی تھا اور بہت سوچنے کے باعث اعصابی دباؤ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ جرمنی میں اس نے پندرہ جون کے بعد کی ایک تاریخ بھی اپنی سرجری کے لیے لے لی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے امید دلائی تھی کہ آپریشن کی کامیابی کا چانس اتنا ہی تھا جتنا ناکامی کا۔ چونکہ وہ بیوک ادا سے بیک اپ کرنے سے قبل آپریشن کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا' اس لیے اس نے تاریخ بعد کی لی تھی۔ یہ اس کے کام کا آخری مرحلہ تھا۔ انڈیا میں آخری مرحلے میں سب کچھ بگڑ گیا تھا' آخری مرحلے پہ اس کے "دوست" نے جس کے پاس وہ مدد کے لیے گیا تھا اس کو پکڑوا دیا تھا۔ سر کا درد ہمیشہ اسے اس دوست کی یاد دلاتا تھا۔ اس نے جہان کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔

لوگ بعض دفعہ آپ کے ساتھ بہت برا کر جاتے ہیں اتنا برا کہ۔

تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر اس نے فون اٹھایا اور ایکسچینج اسٹوڈنٹ کا نمبر نکالا۔

"میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔ اے آر پی۔"

مختصر پیغام لکھ کر اس نے حیا کو بھیج دیا۔ جب وہ جواب دے گی' تو وہ اس کو برگر کنگ پہ بلائے گا۔ وہاں پاشا بے کو بھی وہ بلا لے گا۔ اسے پتا تھا کہ حیا کو وہ منظر کیسے دکھانا ہے۔ جب وہ اپنے شوہر کو اس "گمشدہ شہزادے" کے ساتھ دیکھے گی' تو جہان کا کام آسان ہو جائے گا یا تو وہ جان لے گی کہ وہی عبدالرحمن ہے یا پھر وہ اسے طیب حبیب کا دوست سمجھے گی' دونوں صورتوں میں وہ اس سے دور چلی جائے گی۔ بھلے ترکی سے نہ جائے' بس استنبول سے چلی جائے۔ بعد میں ہمیشہ کی طرح وہ معذرت کرنے اس کے پاس چلا جائے گا اور اسے منا لے گا۔ مگر وہ ویڈیو؟

اس نے گہری سانس لے کر موبائل رکھ دیا۔ ویڈیو ابھی تک لاکر میں تھی۔ اگر وہ جانے سے قبل اسے نہیں نکال پائی تو وہ ویڈیو واپس رکھ لے گا۔

حیا نے اس روز اسے جوابی پیغام نہیں بھیجا۔ وہ انتظار کرتا رہا' مگر وہ اس کے سرپرائز میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ جب دوپہر میں تیرتے وہ فیری کی بالکونی میں کھڑا سمندری بگلوں کے پھڑپھڑاتے غول دیکھ رہا تھا تب بے اختیار اسے یاد آیا کہ حیا کے امتحان شروع ہو چکے تھے۔ آج وہ اگر اسے بلاتا تب بھی وہ نہ آتی۔ اس کے امتحان نو جون کو ختم ہونے تھے۔ اسے یہ سب نو جون سے پندرہ جون تک کے وقت میں سیٹ اپ کرنا ہو گا ابھی نہیں۔

وہ ریسٹورنٹ آیا تو طیب حبیب اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے مطالبے وہی تھے اور جہان کا رویہ بھی ویسا ہی تھا۔

"چند دن انتظار کرلو' میں تمہاری فیملی کو باہر بھجوا دوں گا۔ میں نے بات کی ہے' بہت جلد سب کچھ سیٹل ہو جائے گا۔" وہ بے تاثر لہجے میں کہتے ہوئے رجسٹر چیک کر رہا تھا۔ آج پاشا بے نے جواباً" غصہ نہیں کیا نہ ہی اسے لعن طعن کی بس اتنا کہا۔

"میں امید کرتا ہوں' تم میرا کام جلد از جلد کر دو گے جہان بے! آخر فیملی سب کے لیے اہم ہوتی ہے۔ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔"

اس کے آخری الفاظ پہ جہان نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ پاشا بے نے کوٹ کا کالر درست کیا' اور الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

شاید وہ صرف دھمکی دے رہا تھا۔ وہ اس کی فیملی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ایسے ہی اسے دھمکانا چاہ رہا تھا۔ جہان سر جھٹک کر کام کرنے لگا۔

انسان کا اپنی انفرادی صلاحیتوں پہ حد سے زیادہ انحصار کرنا اسے دوسروں کو انڈر اسٹیمیٹ کرنے پہ مجبور کرتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا' مگر ابھی وہ یہ نہیں جانتا تھا۔

شام میں وہ معمول کے مطابق ریسٹورنٹ کے کچن میں کھڑا گوشت کاٹ رہا تھا' جب اس کا موبائل ہلکے سے بجا۔ وہ ٹون سے سمجھ گیا کہ پیغام کس کی طرف سے تھا۔ مگر اس نے فون جیب سے نہیں نکالا۔ قریب ہی اس کے دو شیف کام کر رہے تھے۔ ایک تو پرانی ورکر تھی' مگر دوسرا ترک لڑکا نیا تھا۔ اس کو جہان نے حال ہی میں رکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ ترک ایجنسی کا ہے اور صرف اس کی جاسوسی کے لیے یہاں کام کر رہا ہے۔ اس کو رکھنے کا فائدہ یہ تھا کہ اب وہ اپنی مرضی کی باتیں ترکوں تک پہنچا سکتا تھا۔ ڈبل ایجنٹ بن کر کام کرنا اس طرح اور بھی آسان تھا۔

اس نے ہاتھ صاف کیے' گوشت رکھا اور خاموشی سے باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ اندر آکر اس نے دروازہ بند کیا اور پیغام کھولا۔ چند لمحوں میں اس نے پیغام ڈی کوڈ کیا اور پھر جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

وہ لڑکا' عمر' وہ نہیں رہا تھا۔ اسے کس نے مارا' کب اور کہاں مارا' کچھ معلوم نہ تھا' وقت جیسے ایک دفعہ پھر برسوں پہلے کے انطاکیہ میں پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مٹی کھود رہا تھا' وہ مٹی جس سے آج بھی خوشبو آتی تھی۔ کیا عمر کو دفن ہونے کے لیے مٹی ملی ہوگی؟ کیا اسے خود کبھی مٹی مل پائے گی؟

اس کے دل میں تکلیف اٹھ رہی تھی' شدید تکلیف۔ اس نے فون جیب میں ڈالا' ٹونٹی کھولی اور سنک پہ جھک کر چہرے پہ پانی کے چھینٹے مارے' پھر سر اٹھا کر آئینے میں خود کو دیکھا۔ شدت ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔

دادا کہتے تھے کہ مومن کے لیے دنیا قید خانہ ہوتی ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اس وقت برگر کنگ ایک قید ہی تھی۔ وہ سارا کام چھوڑ کر کہیں دور جانا چاہتا تھا' وہ باسفورس کے کنارے بیٹھ کر ڈھیر سارا رونا چاہتا تھا۔ اگر دادا ہوتے تو کہتے "فوجی رویا نہیں کرتے۔" کاش وہ ان سے پوچھ سکتا کہ اگر فوجی کا دل درد سے پھٹنے لگے اور جیسے سارے جسم میں ٹوٹے کانچ اترنے لگیں' تو پھر وہ کیا کرے' کیا دنیا میں رونے سے بہتر دوا بھی کوئی ہوتی ہے؟

"سلام۔ جہان کہاں ہے؟" بلند آواز سے اتھل پتھل سانسوں کے درمیان وہ باہر کسی سے پوچھ رہی تھی' جیسے وہ دوڑ کر آئی تھی' جہان نے ہولے سے نفی میں سر جھٹکا' تولیے سے چہرہ خشک کیا اور نم آنکھیں رگڑتا باہر آگیا۔

وہ فریڈم فلوٹیلا کے اسٹریٹ پروٹیسٹ کے لیے آئی تھی اور اب وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے۔ جہان اس سے نظریں ملائے بغیر سر جھکائے گوشت کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔ کن اکھیوں سے وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے نئے شیف کے ڈریسنگ بناتے ہاتھ ذرا سست پڑ گئے تھے۔ بچہ ذرا کچا تھا' مگر اسے کچا کام نہیں کرنا تھا۔ یہاں کہی گئی ایک ایک بات کہیں اور پہنچائی جاتی تھی' اور یہ پاگل لڑکی ترک فوج کے ایک کارندے کے سامنے اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ فلسطینیوں کی حمایت کرے؟

گو کہ تربیت کے مطابق وہ کبھی کسی متنازعہ ہنگامے والی جگہوں پہ نہیں جاتا تھا' کوئی اور موقع ہوتا تو وہ حیا کو دوسرے طریقے سے منع کر دیتا مگر پیچھے کھڑا لڑکا سب سن رہا تھا۔ ترک فوج بے حد سیکولر قسم کی فوج تھی جہاں عبداللہ گل اور طیب اردگان کی حکومت کو "ماڈرن مولویوں" کی حکومت کہا جاتا تھا' وہیں ترک فوج اپنے دین سے بے حد متضاد خیالات رکھتی تھی اور اپنی بیوی کو مطمئن کرنے کے لیے وہ ترکوں کی گڈ بکس سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ نتیجتاً" وہ لڑکا تو پرسکون ہو گیا مگر حیا پچھلی کئی دفعہ کی طرح ایک مرتبہ پھر اس کے ریسٹورنٹ کو جہنم میں بھیج کر غصے سے وہاں سے چلی گئی۔

وہ اس کے پیچھے نہیں گیا۔ اس کا موڈ پہلے ہی بہت خراب تھا' وہ وہیں کھڑا خاموشی سے کام کرتا رہا۔ کام اسے کرنا تھا' کیونکہ حیا کی طرح وہ موڈ خراب ہونے پہ دو چار چیزوں پہ ہاتھ مار کر گراتے ہوئے' ہر کسی کو جہنم میں بھیج کر کہیں دور نہیں جا سکتا تھا۔ یقیناً" وہ کافی

خوش قسمت تھی۔

پوری رات وہ بے حد ڈسٹرب رہا' پھر صبح سب کچھ ذہن سے جھٹک کر وہ گھر سے نکل آیا۔

فیری اس نے کدی کوئے سے پکڑنی تھی۔ کدی کوئے شہر کی ایشین سائیڈ کی بندرگاہ تھی اور سبانجی بھی ایشین سائیڈ پہ واقع تھی۔ سو وہ منہ اندھیرے اس سے ملنے چلا گیا۔

وہ جھیل کے پاس بیٹھی تھی۔ کتابیں سامنے پھیلائے' وہ جیسے کافی دیر رو بھی رہی تھی۔ اسے بے اختیار وہ رات یاد آئی جب جنجر بریڈ ہاؤس ٹوٹا تھا اور وہ تب بھی ایسے ہی رو رہی تھی۔ اسے ایک لمحے کو اس لڑکی پہ بہت ترس آیا جس کی زندگی اس نے اتنی مشکل بنادی تھی۔

اس کے ساتھ چاندی کے پانی جیسی جھیل کے کنارے بیٹھے وہ بہت دیر تک اسے دھیرے دھیرے بہت کچھ سمجھاتا رہا۔ وہ اسے خواب نہیں دکھانا چاہتا تھا' سو حقیقت میں رہ کر مستقبل کے حوالے سے باتیں کر رہا تھا۔ اٹھنے سے قبل اس نے پھر سے "لندن چلنے کا موڈ ہو تو بتانا" کہا تھا۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ وہ ممی کے ساتھ لندن چلی جائے' پھر بعد میں ایک دو روز کے لیے اپنی کلیئرنس کروانے بے شک آجائے۔ مگر اپنا آخری مہینہ وہ اس شہر میں نہ گزارے۔ اس روز اسے لگا تھا' حیا اس کو اس کی غیر متوقع فطرت کے ساتھ قبول کرنے پہ راضی تھی' مگر اعتبار..... وہ ابھی تک ان دونوں کے درمیان نہیں قائم ہوا تھا۔ وہ روٹھنے اور منانے سے آگے نہیں بڑھے تھے۔

جس روز اس کے امتحان ختم ہوئے' اس سے اگلے دن وہ بیوک ادا گئی تھی۔ یہ مانسیے نے اسے بتایا تھا کیونکہ اب اس کا ٹریسر صرف سبانجی میں پڑا رہتا تھا۔ اس نے دوبارہ اس کو ٹریس کرنے کی خود ہی کوشش نہیں کی' یہ اتنا ضروری نہیں تھا۔

گیارہ جون کی رات وہ ممی کے ساتھ ان کی پیکنگ کروانے میں مصروف تھا جب ممی نے حیا کے بارے میں پوچھا۔

"کیا وہ ہمارے ساتھ جائے گی؟"

"پتا نہیں۔ آپ کی بھتیجی کہاں اپنا پروگرام ہمیں بتاتی ہے؟" اس نے شانے اچکا کر لاپروائی سے جواب دیا تھا۔ پھر اس نے سوچا' وہ حیا سے پوچھ ہی لے کہ اس کا کیا پروگرام ہے۔ وہ اپنا آخری مہینہ استنبول میں نہیں تو کدھر گزارے گی؟ یہی سوچ کر اس نے میجر احمد کی طرف سے اسے بس "کیسی ہیں آپ؟" لکھ کر بھیج دیا۔ پتا نہیں وہ کیسی تھی۔ پورے دس دن اس نے حیا کو نہیں دیکھا تھا نہ ہی کوئی بات ہوئی تھی۔

"مجھے جنت کے ان پتوں نے دنیا والوں کے لیے اجنبی بنا دیا ہے' میجر احمد!" اس کے جواب میں بہت ٹوٹا بکھرا ان ساتھا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ سو وہ اس کی عادت کو اتنی اچھی طرح سے جاننے لگا تھا کہ اس کے انداز سے وہ اس کے موڈ کا اندازہ کر لیا کرتا تھا۔

وہ موبائل لے کر کچن میں آگیا اور بہت سوچ کر ایک ایسا جواب لکھا جو اس وقت اسے تسلی دے سکے۔

"یقیناً" اس کے نقاب پہ کسی نے کچھ کہہ دیا ہو گا اور وہ دل چھوڑ کر بیٹھی تھی۔ عین ممکن تھا' وہ کہنے والے کو ہاتھ میں آئی چیز بھی دے مار چکی ہو یا کم از کم اسے جہنم تک پہنچا چکی ہو۔ پتا نہیں اس کی تسلی ہوئی یا نہیں' مگر اس کا مزید کوئی ٹیکسٹ میسج نہیں آیا۔

صبح وہ بیوک ادا نہیں گیا کیونکہ آج ہفتہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حیا کے حوالے سے کچھ طے کر لے مگر تب ہی کام کے دوران اس کو جواہرال کے لاکرز کے گارڈ کا پیغام موصول ہوا۔ ایک لڑکی جو سیاہ عبایا میں تھی' نمبر لاکر سے کچھ لے گئی ہے۔

"گریٹ۔" وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اسے معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ سٹی سے واپس سبانجی جاتی' وہ اسے اور پاشا بے دونوں کو اپنے ریسٹورنٹ پہنچنے کا کہہ چکا تھا۔ پاشا بے کا مسکن قریب ہی تھا' سو وہ حیا سے پہلے پہنچ گیا۔

"کیا میرا کام ہو گیا؟" پینٹری میں جا کر اس نے یہی بات پوچھی تھی۔

"نہیں' اس میں ابھی کچھ وقت ہے' تم تھوڑا صبر نہیں کر سکتے؟" وہ جیسے زچ ہوا تھا۔

"پھر تم کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"ہوٹل گرینڈ کے بارے میں کچھ بات کرنی تھی۔"

اس نے پینٹری کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ اپنے پرانے شیف کو وہ سمجھا چکا تھا کہ اسے کس طرح سے حیا کو پچھلی طرف بھیجنا ہے۔ اب پاشا بے کو ہوٹل کے معاملات کے بارے میں بتاتا وہ کن اکھیوں سے اس روشن دان کو دیکھ رہا تھا جو اس نے کھول رکھا تھا۔ وہ آئے گی تو اسے سامنے شیلف کے چمکتے شیشے میں روشن دان کا عکس نظر آجائے گا۔ تب وہ ان کی باتوں سے جان جائے گی کہ دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا چل رہا ہے۔ حسب توقع پاشا بے جلد ہی ہوٹل گرینڈ کی بات ختم کر کے اپنے کام کی طرف آگیا اور تب ہی وہ اسے روشن دان کے عکس میں نظر آئی۔

وہ جیسے ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ وہ بظاہر کیے اپنے مخصوص انداز میں بات کیے گیا۔ اسے معلوم تھا کہ حیا اندر نہیں آئے گی' اگر اس نے دروازے پہ دستک دی یا گھنٹی بجائی' تب وہ فوراً اسے جانے کا کہہ دے گا۔ وہ زبردستی تو اندر نہیں آنا چاہے گی۔ مگر جو ہوا' وہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

"تمہاری بیوی باہر کھڑی ہے جہان! اسے اندر نہیں بلاؤ گے؟" جیسے ہی پاشا بے کی نظر اس پہ پڑی' وہ مسکرا کر بولا۔

جہان کو لگا' کسی نے پینٹری کا سارا سامان اس پہ الٹ دیا ہو۔ وہ کیسے جانتا تھا حیا کو؟ یہ ناممکن تھا۔ وہ اسے جہان کی دوست کہتا تو وہ اتنا ششدر نہ ہوتا' مگر جہان کی بیوی؟ اسے کیسا پتا چلا؟ اس بات کا ترکی میں تو کوئی ڈاکومنٹ پروف بھی نہیں تھا' پھر؟

وہ اب اسے حیا کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتا رہا تھا' سبانجی ایکسچینج اسٹوڈنٹ' ڈورم نمبر' وہ سب جانتا تھا۔ ان کی ملاقات بھی ہو چکی تھی۔

حیا نے اثبات میں گردن ہلا کر تصدیق کی' مگر وہ ان بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اگر وہ دونوں مل چکے تھے تو پتا نہیں اس نے حیا کو کیا بتایا ہو

گا؟ سب کچھ الٹا ہو گیا تھا۔ اس نے پاشا بے کو واقعی انڈر اسٹیمیٹ کیا تھا۔

اس نے بے اختیار پاشا بے کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اگر وہ اس کی بیوی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے کا سوچے گا بھی تو وہ واقعی اسے جان سے مار دے گا۔

حسب عادت، طیب حبیب پاشا کی مسکراہٹ سمٹی۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اسے اس کی بیوی سے غرض نہ تھی، بس کام سے تھی۔ اس کے جاتے ہی وہ حیا کی طرف پلٹا، مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ دیمت نے ٹھیک کہا تھا، بعض باتیں سیاق و سباق کے بغیر پیش کی جائیں تو ہیرو کو ولن بنا دیتی ہیں۔ وہ اس کا اعتبار کھو چکا تھا۔ حیا نے اس کی کوئی بات نہیں سنی، وہ فوراً" وہ جگہ چھوڑ کر چلی گئی۔

وہ اسے ترکی سے بھیجنا چاہتا تھا مگر اس طرح نہیں۔ خود سے بدظن کر کے نہیں، خود کو بے اعتبار کر کے نہیں۔ سب کچھ الٹ گیا تھا۔ بہت دفعہ منصوبے الٹے پڑ جاتے ہیں۔ کوئی بھی انسان ماسٹر پلانر نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی نہیں تھا۔

دیمت کی بات پوری ہوئی۔ وہ شوہر سے بدظن ہو کر اس سے دور چلی گئی۔ اس نے حیا کو بہت فون کیا، مگر اس نے جہان کی کوئی بات نہیں سنی۔ وہ چلی گئی اور جیسے باسفورس کا پانی خاموش ہو گیا، سرمئی بگلے اڑنا چھوڑ گئے، ٹیولپس مرجھا گئے اور جیسے سارا استنبول اداس ہو گیا۔

وہ چلی گئی اور اپنا ڈریسر سبانجی کے ڈورم میں ہی چھوڑ گئی۔ ایسا اس نے کبھی نہیں چاہا تھا، مگر ایسا ہو گیا تھا۔ دیمت کی بات پوری ہوئی تھی۔

حیا کے جانے کے بعد ممی اور ابا کی روانگی کے انتظامات بھی مکمل تھے۔ ممی مضبوط عورت تھیں۔ وہ اپنے کام اکیلے دیکھ سکتی تھیں۔ ساری زندگی انہوں نے ایسے ہی گزاری تھی، سو وہ استنبول میں اپنا کام مکمل کر کے جرمنی جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ یہ روپوشی کے دن تھے اور ان دنوں میں وہ سرجری کروا لینا چاہتا تھا۔ وہ تین ہفتے بعد اسے پھر سے ترکی جانا پڑ سکتا تھا، شاید ایک آخری کام کے لیے۔ اس کے بعد ترکی کے باب کو اس کی زندگی سے نکل جانا تھا۔

جرمنی آنے سے قبل وہ طیب حبیب پاشا سے آخری دفعہ ملا تھا۔ اس کی تمام چیزیں اس کے حوالے کرنے سے قبل اس نے صرف ایک بات پوچھی تھی۔

"تم میری بیوی کو کیسے جانتے ہو؟ مجھے صرف سچ سننا ہے۔"

اور طیب حبیب نے سچ بتانے سے انکار نہیں کیا۔ وہ اسے کبھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بقول اس رات جب وہ برگر کنگ کے داخلی دروازے کے ساتھ والی میز پہ چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے بیٹھا تھا، تو اس نے ان دو لڑکیوں کی گفتگو سنی تھی جو وہاں کھڑی تھیں۔ سیاہ اسکارف والی لڑکی دوسری لڑکی کو اپنی انگوٹھی دکھاتے ہوئے جہان سکندر سے اپنی منگنی اور شادی کا ذکر کر رہی تھی۔ اس لیے وہ ان کے پیچھے گیا، کافی شاپ تک، مگر وہ ڈر گئیں اور اسٹریٹ میں اس کے آگے بھاگتی واپس برگر کنگ تک آئیں۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اسکوائر تک ضرور آئیں گی، سو وہ وہیں ان کا انتظار کرتا رہا۔ جب رات ڈیڑھ بجے والی بس انہوں نے اسکوائر سے پکڑی تو اس نے ان کا یونیورسٹی کیمپس تک پیچھا کیا اور اگلے روز اس نے ایک جاننے والے سے کہہ کر وہ تمام معلومات نکلوا لیں جو وہ حیا کے متعلق یونیورسٹی سے نکلوا سکتا تھا۔

اس نے طیب کو اس کے ڈاکومنٹس دے دیے، پھر بیوک ادا جا کر آنے کو بالآخر وہ خبر سنا دی جس کا انتظار کرتے انہیں ایک ڈیڑھ برس بیت چکا تھا۔ ان کا بیٹا مل گیا تھا، وہ ایران میں تھا، اور اس کے کچھ دشمن استنبول اس کی واپسی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اتنے عرصے بعد پہلی دفعہ طیب حبیب نے ماں کو فون کیا، آنے خوشی و تشکر سے بے حال تھیں۔ جب طیب حبیب نے چاہا کہ وہ تینوں اب اس کے پاس ایران چلی آئیں تو آنے بخوشی راضی ہو گئیں۔ اب عائشے کی باری تھی۔ آنے نے اپنے طور پہ اور جہان نے اپنے طور پہ اس کو ساتھ جانے کے لیے کہا۔ وہ صبر شکر والی لڑکی تھی، اور وہ جانتا تھا کہ وہ سمجھ چکی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے جب اس مصنوعی رشتے کی ڈور ٹوٹ جائے گی۔ عبدالرحمٰن ان کی زندگیوں سے نکل جائے گا اور وہ ایک دفعہ پھر ایک نارمل فیملی کی طرح رہیں گے۔

عائشے نے صبر کر لیا۔ ساری اذیت دل میں دبا کر وہ روانگی کے لیے پیکنگ کرنے لگی۔

وہ بہارے کے رونے اور عائشے کی چپ سے اندر ہی اندر بہت ڈسٹرب ہوا تھا۔ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کا "کانٹیکٹ" (طیب حبیب) ادھر نہیں رہ سکتا تھا۔ عائشے اور بہارے کو عبدالرحمٰن کو بھلانے کے لیے ایک عرصہ چاہیے گا، اس کے بعد وہ ساری زندگی کسی اجنبی پہ اعتبار نہیں کر سکیں گی۔ وہ اپنے اندر کی بہت ساری تلخی ان کی زندگیوں میں چھوڑ کر جا رہا تھا، مگر وہ کیا کرتا، یہی اس کی جاب تھی۔

ممی کے ابھی ترکی سے جانے میں چند دن تھے، مگر اس کا کام ختم تھا، سو وہ جرمنی چلا آیا۔ جس روز اس کی سرجری متوقع تھی، اس صبح اس نے حیا کو فون کیا۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ بیمار ہے، اس کی سرجری ہے، وہ اس کے لیے دعا کرے، مگر وہ کسی اور موڈ میں تھی۔ اسے زیادہ فکر فلیش ڈرائیو کے پاس ورڈ کی تھی۔

ایک لمحے کو اس کا جی چاہا، وہ اسے بتا دے کہ پاس ورڈ، پاس ورڈ ہی ہے۔ دنیا کا آسان ترین پاس ورڈ۔ وہ ویڈیو کھولتے ہی اسے کال بیک کرے گی۔ وہ آج ہی، آپریشن ٹیبل پہ جانے سے قبل ہی اس کی آواز سن لے گا، مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اتنی کہہ کر اس نے بہت خشک لہجے میں تمام تعلقات منقطع کرنے کا مژدہ سنایا اور فون رکھ دیا۔

بے حد اضطراری کیفیت میں جہان نے پھر سے اس کا نمبر ڈائل کیا، مگر اب وہ فون اٹھانے سے بھی انکاری تھی۔ وہ جہان سے بھی بدظن تھی اور وہ اپنے نمبر سے کال کر کے کسی لمبی چوڑی صفائی کے موڈ میں نہ تھا، سو بد دلی سے اس نے فون ایک طرف ڈال دیا۔

آپریشن سے قبل ڈاکٹر نے آخری دفعہ پوچھا تھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم آپریٹ کروانا چاہتے ہو؟"

وہ اس وقت آپریشن ٹیبل پہ لیٹا تھا، ہسپتال کے سبز گاؤن میں ملبوس، اس کا چہرہ بھی پژمردہ سا لگ رہا تھا۔ ایک آخری دفعہ اس نے آپریشن تھیٹر کی چھت، لائٹس اور تیار ہوتے ڈاکٹرز اور اسٹاف کو دیکھا اور سر ہلا دیا۔ وہ اپنے رسک پہ سرجری کروا رہا تھا، سارے سود و زیاں اس کے کھاتے میں ہی لکھے جانے تھے۔

جب انستھیزیا دینے ایک ڈاکٹر اس کے قریب آیا تو اس کا جی چاہا، وہ انہیں روک دے۔ وہ سرجری نہیں چاہتا تھا۔ وہ اندھا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ معذور نہیں ہونا چاہتا تھا، مگر الفاظ نے جیسے ساتھ چھوڑ دیا۔ چہرے پہ ماسک لگتے وقت اس کا سارا جسم سن پڑ گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ جیسے سیاہ مخمل کا کوئی پردہ ہو۔ جیسے بنا تاروں کے رات کا آسمان ہو۔

کتنے گھنٹے گزرے، کتنے پہر بیتے، وہ نہیں جانتا تھا۔ جب حسیات لوٹیں تو پلکوں سے ڈھیر سارا بوجھ سا اترا۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ وہ ہسپتال کے لباس میں ہی تھا، مگر کمرا مختلف تھا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ دھندلا منظر واضح ہوا۔ وہ اب دیکھ سکتا تھا۔

کیا اس کا آپریشن کامیاب ہوا تھا؟

نرس اسے جاگتے دیکھ کر فوراً" باہر چلی گئی۔ اس کی واپسی اس کے سرجن کے ساتھ ہوئی۔

"ہو گیا؟" اس نے ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے لبوں کو ذرا سی جنبش دی۔

"نہیں۔ ہم نے آپریٹ نہیں کیا۔" ڈاکٹر اس کے قریب آئے، اور بتانے لگے۔ "تم بے ہوشی کے دوران بار بار کہہ رہے تھے کہ ہم تمہیں جانے دیں، تمہاری ماں کو تمہاری ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہم یہ آپریشن نہیں کر سکتا تھا۔ رسک فیکٹر تم جانتے ہو۔"

"اوہ!" ایک تھکی ہوئی سانس لبوں سے خارج کر کے اس نے آنکھیں موند لیں۔

"تم کچھ وقت لے لو' خود کو ذہنی طور پہ تیار کر لو' پھر ہم سرجری کریں گے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہسپتال سے چھٹی ملنے پہ وہ اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ ڈاکٹر ٹھیک کہتا تھا۔ اسے یہ خطرہ مول لینے سے قبل خود کو مکمل طور پہ راضی کرنا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے' اس نے اپنا ترکی والا نمبر آن کیا اور ایک ایک کر کے وائس میسج سننے لگا جو نمبر بند ہونے پہ کالرز نے ریکارڈ کروائے تھے' چوتھا میسج ممی کا تھا۔

"جہان! کیا تم شہر میں ہو؟ تمہارے ابا کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ میں انہیں ہسپتال لے کر جا رہی ہوں۔"

وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا' اور جلدی سے اگلا میسج کھولا۔

"جہان! تمہارے ابا کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" اسے لگا' کسی تیز رفتار ٹرک نے اسے کچل دیا ہے۔ وہ بالکل سن سا رہ گیا۔ ممی کے میسجز یکے بعد دیگرے فون پہ چل رہے تھے۔

"میں باڈی لے کر پاکستان جا رہی ہوں۔"

"تم جہاں بھی ہو' کوشش کرنا کہ جنازے پہ پہنچ جاؤ۔"

الفاظ تھے یا چابک۔ اس کی ماں کو اس کی کتنی ضرورت تھی' وہ کتنی اکیلی ہوں گی' وہ کتنی دکھی ہوں گی سب بے حساب تھا۔ وہ مشکل وقت میں ان کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ وہ مشکل وقت میں کبھی ان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔

ابا چلے گئے اور وہ ان کا آخری چہرہ بھی نہیں دیکھ سکا. زندگی بھی بعض دفعہ ہماری ہمت سے زیادہ قربانیاں مانگ لیتی ہے۔

پاکستان جلد از جلد پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس کی شخصی آزادی کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں تھی۔ اجازت پروٹوکول' احتیاط' ابا کے جنازے کے تیسرے دن اسلام آباد پہنچ سکا۔ اگر وہ ڈی ایکٹیویٹ (غیر فعال) نہ ہوتا تو شاید تب بھی نہ پہنچ سکتا۔ جب حیا کی دوست کی ڈیتھ ہوئی تھی' تب حالات فرق تھے۔ اب حالات دوسرے تھے۔

اس رات جب وہ ایئرپورٹ پہ پہنچا تو سب سے پہلے اس نے حیا کو کال کی۔ وہ اس کے گھر کا راستہ جانتا تھا' مگر اس کو پہلے قبرستان جانا تھا۔ وہ پچھلی تین چار راتوں سے مسلسل حالت سفر میں تھا اور بمشکل سو پایا تھا۔ سر درد بھی ویسا ہی تھا۔ اسے اپنے باپ اور دادا سے ملے بغیر سکون نہیں مل سکتا تھا۔

حیا خاموش خاموش سی تھی۔ اس کی خفگی' گریز' سنجیدگی' وہ سب سمجھ رہا تھا۔ وہ اسے قبرستان لے گئی۔ اپنے باپ اور دادا کی قبروں کے سامنے بنچوں کے پاس بیٹھے' اس نے بہت سے بیتے لمحوں کو یاد کرنا چاہا۔ تلخ باتیں' کڑوے لمحے۔ ادھوری یادیں' ادھورے دکھ۔

وہ گھر آئے تو حیا نے اسے اس کا کمرا دکھایا۔ وہ جوتوں سمیت بستر پہ اس ارادے سے لیٹا کہ ابھی چائے پیے گا' پھر ممی کے اٹھنے کا انتظار کرے گا۔ وہ فجر پہ اٹھیں گی تو وہ ان سے مل لے گا' مگر تھکن اور سر درد کے باعث اس کی وہیں آنکھ لگ گئی۔

جب وہ جاگا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پہ ابھی تک چائے کی پیالی رکھی تھی۔ تو حیا اس کے لیے فوراً" چائے لے آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا' اس کی خفگی اتنی نہیں تھی کہ وہ اسے دور نہ کر سکے۔

وہ فریش ہو کر نیچے آیا تو فرقان ماموں سمیت سب وہاں تھے۔ حیا گھر پہ نہیں تھی۔ وہ اپنی دوست کے ساتھ شاپنگ پہ گئی تھی۔ حیا اور حیا کے شوق!

فرقان ماموں' اور صائمہ ممانی اسے باتوں باتوں میں کافی سنا گئے۔ ان کے نزدیک اس کا رویہ قابل مذمت تھا۔ بیٹا باپ کے جنازے پہ نہ پہنچے' ایسی بھی کیا مصروفیت۔ وہ خاموش رہا۔

رات کھانے پہ فاطمہ مامی نے اس کا پروگرام پوچھا' کر بہت اپنائیت سے کہا تھا۔

"اوہ!" ایک تھکی ہوئی سانس لبوں سے خارج کر کے اس نے آنکھیں موند لیں۔

"تم کچھ وقت لے لو' خود کو ذہنی طور پہ تیار کر لو' پھر ہم سرجری کریں گے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہسپتال سے چھٹی ملنے پہ وہ اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ ڈاکٹر ٹھیک کہتا تھا۔ اسے یہ خطرہ مول لینے سے قبل خود کو مکمل طور پہ راضی کرنا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے' اس نے اپنا ترکی والا نمبر آن کیا اور ایک ایک کر کے وائس میسج سننے لگا جو نمبر بند ہونے پہ کالرز نے ریکارڈ کروائے تھے' چوتھا میسج ممی کا تھا۔

"جہان! کیا تم شہر میں ہو؟ تمہارے ابا کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ میں انہیں ہسپتال لے کر جا رہی ہوں۔"

وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا' اور جلدی سے اگلا میسج کھولا۔

"جہان! تمہارے ابا کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" اسے لگا' کسی تیز رفتار ٹرک نے اسے کچل دیا ہے۔ وہ بالکل سن سا رہ گیا۔ ممی کے میسجز کے بعد دیگرے فون پہ چل رہے تھے۔

"میں باڈی لے کر پاکستان جا رہی ہوں۔"

"تم جہاں بھی ہو کوشش کرنا کہ جنازے پہ پہنچ جاؤ۔"

الفاظ تھے یا چابک۔ اس کی ماں کو اس کی کتنی ضرورت تھی' وہ کتنی اکیلی ہوں گی' وہ کتنی دکھی ہوں گی سب بے حساب تھا۔ وہ مشکل وقت میں ان کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ وہ مشکل وقت میں کبھی ان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔

ابا چلے گئے اور وہ ان کا آخری چہرہ بھی نہیں دیکھ سکا! زندگی کبھی بعض دفعہ ہماری ہمت سے زیادہ قربانیاں مانگ لیتی ہے۔

پاکستان جلد از جلد پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس کی شخصی آزادی کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں تھی۔ اجازت' پروٹوکول' احتیاط' ابا کے جنازے کے تیسرے دن اسلام آباد پہنچ سکا۔ اگر وہ ڈی ایکٹیویٹ (غیر فعال) نہ ہوتا تو شاید تب بھی نہ پہنچ سکتا۔ جب حیا کی دوست کی ڈیتھ ہوئی تھی' تب حالات فرق تھے۔ اب حالات دوسرے تھے۔

اس رات جب وہ ایرپورٹ پہ پہنچا تو سب سے پہلے اس نے حیا کو کال کی۔ وہ اس کے گھر کا راستہ جانتا تھا' مگر اس کو پہلے قبرستان جانا تھا۔ وہ پچھلی تین چار راتوں سے مسلسل حالت سفر میں تھا اور بمشکل سو پایا تھا۔ سر درد بھی ویسا ہی تھا۔ اسے اپنے باپ اور دادا سے ملے بغیر سکون نہیں مل سکتا تھا۔

حیا خاموش خاموش سی تھی۔ اس کی خفگی' گریز' سنجیدگی' وہ سب سمجھ رہا تھا۔ وہ اسے قبرستان لے گئی۔ اپنے باپ اور دادا کی قبروں کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھے' اس نے بہت سے بیتے لمحوں کو یاد کرنا چاہا۔ تلخ باتیں' کڑوے لمحے۔ ادھوری یادیں' ادھورے دکھ۔

وہ گھر آئے تو حیا نے اسے اس کا کمرا دکھایا۔ وہ جوتوں سمیت بستر پہ اس ارادے سے لیٹا کہ ابھی جائے پیے گا' پھر ممی کے اٹھنے کا انتظار کرے گا۔ وہ فجر پہ اٹھیں گی تو وہ ان سے مل لے گا' مگر تھکن اور سر درد کے باعث اس کی وہیں آنکھ لگ گئی۔

جب وہ جاگا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پہ ابھی تک چائے کی پیالی رکھی تھی۔ تو حیا اس کے لیے فوراً" چائے لے آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا' اس کی خفگی اتنی نہیں تھی کہ وہ اسے دور نہ کر سکے۔

وہ فریش ہو کر نیچے آیا تو فرقان ماموں سمیت سب وہاں تھے۔ حیا گھر پہ نہیں تھی۔ وہ اپنی دوست کے ساتھ شاپنگ پہ گئی تھی۔ حیا اور حیا کے شوق!

فرقان ماموں' اور صائمہ ممانی اسے باتوں باتوں میں کافی سنا گئے۔ ان کے نزدیک اس کا رویہ قابل مذمت تھا۔ بیٹا باپ کے جنازے پہ نہ پہنچے' ایسی بھی کیا مصروفیت۔ وہ خاموش رہا۔

رات کھانے پہ فاطمہ مامی نے اس کا پروگرام پوچھ کر بہت اپنائیت سے کہا تھا۔

"الگ اپارٹمنٹ کی کیا ضرورت ہے' یہی گھر ہے بیٹا کا۔"

وہ کتنے ہی دن بعد پہلی دفعہ مسکرایا۔ وقت کیسے بدلتا ہے' لوگ کیسے بدلتے ہیں' رشتے کیسے بدلتے ہیں۔

فاطمہ مامی کی خواہش بھی بجا تھی' مگر اسے لگتا تھا اس کے نصیب میں پاکستان میں رہنا لکھا ہی نہیں ہے۔ ہاں شاید جب وہ ترکی کے لیے ناکارہ ہو جائے تو کچھ عرصہ یہاں رہ جائے۔ مگر اپنے پلانز وہ ان لوگوں سے ابھی شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حیا اس سے ویسی ہی کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ کبھی شاپنگ کے بہانے' کبھی کسی اور کام کے لیے وہ اس کو ساتھ لے جاتا' اس سے ہلکے پھلکے انداز میں بات کرنے کی کوشش کرتا' لیکن وہ ریزرو ہی رہتی۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے' مگر وہ خاموش تھی۔ ہاں جب بھی وہ اسے دیکھ رہا ہوتا' وہ محسوس کر کے چونکتی اور فوراً" اس کی طرف دیکھتی' مگر اس کے چونکنے اور گردن موڑنے تک وہ نگاہوں کا زاویہ بدل چکا ہوتا تھا۔

بالآخر فرقان ماموں کی بیٹی کی منگنی کی رات اس نے حیا سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کافی ہمت کر کے اس کے پاس آیا تو اس نے دیکھا' حیا نے وہی موتیوں والے ایئر رنگز پہن رکھے تھے جن کی وجہ سے عائشے بہت ہرٹ ہوئی تھی۔

وہ دونوں چھت پہ جھولے پہ جا بیٹھے تو اس نے طیب حبیب کا ذکر چھیڑا کہ وہ اس کو کیسے جانتی ہے۔

"عبدالرحمٰن پاشا؟ امت اللہ حبیب پاشا کا بیٹا؟" حیا کی بات پہ وہ چونکا۔

عبدالرحمٰن؟ اوہ۔ وہ غلط سمجھی تھی۔ اس نے طیب حبیب کی تصویروں کو عبدالرحمٰن سمجھا تھا' وہ تو [illegible] وہ [illegible] ہی [illegible] تھا۔ صرف ایک تصویر تھی [illegible] کے پاس اس کی ورنہ گھر میں تو ساری تصاویر طیب حبیب کی تھیں۔

جواب میں وہ اسے پوری روداد سنا گئی۔ وہ بالکل خاموشی سے سنتا گیا۔ وہ سب پہلے سے جانتا تھا' ہوٹیہ تبصرہ کرتا؟ صرف ایک بات نئی تھی۔ حیا نے پاشا بے پہ کافی اسٹڈی کی تھی۔ ویری گڈ! پاشا بے نے یہ بات نہیں بتائی تھی' مگر وہ اپنی بیوی کی ـــــ صلاحیتوں کو کیسے بھول گیا؟

حیا نے ابھی تک وہ یو ایس بی فلیش نہیں کھولی تھی سو وہ چند آدھی سچی' آدھی فرضی وضاحتوں سے اس کو وقتی طور پہ مطمئن کر کے بات ختم کر گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ ان کے درمیان اعتبار کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ حیا نے اپنی طرف کی ساری کہانی سنا ڈالی تھی۔ وہ بھی اپنی کتھا سنا چکا تھا' مگر حیا نے ابھی وہ سنی نہیں تھی۔

سلیمان ماموں کو جانے کس بات سے روحیل پہ شک ہو گیا تھا' انہوں نے اس سے پوچھا مگر وہ دامن بچا گیا۔ اسے اپنی ڈیل نبھانی تھی۔ مگر ماموں کو علم ہو ہی گیا۔ ان کی روحیل سے اچھی خاصی بحث ہوئی' اور پھر وہ ایک دم ڈھے سے گئے۔

فاطمہ ممانی اور حیا پہ وہ دن بہت بھاری تھے۔ وہ دونوں دکھ سے نڈھال تھیں۔ کیا ہوا جو سلیمان ماموں ان کے برے دنوں میں ان کے ساتھ نہیں تھے وہ اور ممی تو ان کا ساتھ دے سکتے تھے نا۔

وہ جانتا تھا جب باپ ناکارہ ہو جاتا ہے تو رشتے دار

بدل جاتے ہیں۔ اس نے حیا کو اپنے رشتے داروں سے ہوشیار رہنے کا کہا اور پھر حالات ایسے بنتے گئے کہ حیا نے اپنے ابا کے آفس جانا شروع کر دیا۔ اس نے جہان سے مدد مانگی مگر وہ فوراً" پیچھے ہٹ گیا۔ اس کو چند دن میں واپس ترکی چلے جانا تھا' اس لیے بہتر تھا' وہ خود کو اپنی بیوی کی مسیحا بھی نہ بنائے۔

آج کل اس نے حیا سے اس کی گاڑی لے رکھی تھی۔ اسے اپنے کاموں کے لیے جانا ہوتا تھا' سو اسے یہ گاڑی ہتھیانی تھی' اور حیا کو تنگ کرنا دنیا کا سب سے آسان کام تھا۔ وہ اس کی ڈکٹیشن سے اتنا تنگ آگئی کہ کار کی چابی از خود اس کے حوالے کر دی۔

اس رات جب وہ گھر واپس پہنچا تو دیکھا' وہ سیڑھیوں پہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ قریب پہنچنے پہ میں اس نے دیکھا' وہ رو رہی تھی۔ وہ ایک دم بہت پریشان ہو گیا۔ شاید اس نے ویڈیو کھول لی ہو اور اب اس سے ناراض ہو۔ وہ کچھ بھی بتائے بنا اندر بھاگ گئی۔ اس نے فوراً" ممی کو جا لیا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ فرقان ماموں نے وہی کیا تھا جو وہ ہمیشہ کرتے تھے۔ اسے بہت دکھ ہوا۔ سوچا' صبح حیا سے بات کرے گا۔ مگر صبح وہ جلدی آفس چلی گئی۔ سو دوپہر میں اس نے حیا کو لنچ پہ بلا لیا۔ اسے اپنی بیوی کو کچھ خاص بتانا تھا۔ جب وہ بتا چکا تو کھانا آگیا۔ وہ نقاب کے اندر سے بہت اعتماد اور سکون سے کھا رہی تھی' پھر ایک دم وہ بولی۔

"تمہیں اچھا لگتا ہے میرا یوں نقاب لینا؟"

وہ بے اختیار چونکا اور پھر اس نے تائید تو کر دی' مگر وہ الجھ گیا تھا۔ کیا وہ نقاب اس کے لیے کرتی تھی؟ وہی پرانی شک کرنے کی عادت۔ وہ واقعتا" قدرے بے یقین ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ جانے سے قبل حیا سے اس بارے میں بات ضرور کرے گا۔

جس دن اس کے نانا کی برسی تھی' اس شام فاطمہ ممانی نے اسے لاؤنج میں روک لیا۔ وہ ذرا جلدی میں تھا' مگر اتنا بھی نہیں کہ ان کی بات نہ سنتا۔ ابھی اس کی فلائٹ میں وقت تھا۔ ممی کو اس نے صبح ہی بتا دیا تھا' اور حیا کو وہ بتا دے گا اگر ملاقات ہوئی۔ نہیں تو ممی بتا دیں گی۔

"کیا تم حیا کو سمجھا نہیں سکتے؟" فاطمہ ممانی بہت مان سے اس سے کہہ رہی تھیں کہ وہ حیا کو سمجھائے تاکہ وہ اپنی ضد چھوڑ دے۔ وہ تحمل سے سنتا گیا۔ حیا آگئی تو ممانی چلی گئیں۔ دونوں کے درمیان ذرا تناؤ تھا۔ ان کے جانے کے بعد کچھ سوچ کر وہ اس کے پاس آیا۔

اس رات باہر بہت زور کی بارش ہو رہی تھی۔ اس برستی بارش کے دوران اس نے حیا سے جاننا چاہا کہ وہ اس کے لیے اپنا نقاب چھوڑ سکتی ہے؟ اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ ایسا چاہتا ہے' بس یہی کہا کہ اگر وہ ایسا کہے؟ مگر چند ہی لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کے لیے یہ سب نہیں کر رہی۔ اسے جہان کی مورل سپورٹ بھی نہیں درکار تھی۔ اس نے خود کو بہت مضبوط کر لیا تھا۔

اب مزید کیا پرکھنا۔ کوئی وضاحت' کوئی امید' کچھ بھی تھمائے بغیر وہ وہاں سے چلا آیا۔ اسے جانا تھا۔ اس کا کام اس کا انتظار کر رہا تھا۔

یہاں سے اسے پہلے استنبول جانا تھا۔ اگر وہاں کچھ کرنے کو نہ رہ گیا تو وہ وہیں چلا جائے گا جہاں کے بارے میں چند روز قبل وہ حیا کو بتا چکا تھا۔ وہ اس پاک اسپائی کی طرح کسی گمنام قبر میں نہیں دفن ہونا چاہتا تھا۔ اگر وہ واپس نہیں آتا تو کم از کم اس کی بیوی کو اتنا تو معلوم ہو کہ اس کی قبر کہاں ڈھونڈنی ہے؟

☆ ☆ ☆

ایک زوردار ٹکر نے اسے سڑک کے ایک جانب لڑھکا دیا۔

ولید کی گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔

حیا اوندھے منہ نیچے گری تھی۔ دایاں گھٹنا' بایاں پاؤں بہت زور سے سیڑھیوں سے ٹکرایا تھا۔ وہ شاید سیڑھیوں پہ گر گئی تھی۔ پورا دماغ جیسے لمحے بھر کو شل سا ہو گیا تھا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ارم طیفور

وہ تیز قدموں سے چلتی یونیورسٹی کے گراؤنڈ تک چلی آئی تھی۔ اپنے ڈپارٹمنٹ سے یہاں تک کا فاصلہ' اس کی نظروں نے عمر وحید کو کھوجتے ہوئے طے کیا تھا اور بالآخر وہ اسے گراؤنڈ میں دوستوں کے درمیان بیٹھا نظر آگیا تھا۔

"بے ہودہ' بد تمیز! ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیروں میں چھالے پڑ گئے اور یہ یہاں بیٹھا دوستوں کے ساتھ عیاشی کر رہا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں عمر وحید کو کوستے ہوئے اس کے ایک ہاتھ میں پکڑے کوک کے ٹن اور دوسرے میں موجود برگر کو "عیاشی" کا خطاب دے ڈالا۔ ایک طائرانہ نگاہ گردوپیش پہ ڈالنے

ناولٹ

کے بعد وہ سج سج چلتی' نظریں جھکائے' عمر وحید اور اس کے دوستوں کے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ اردو ڈپارٹمنٹ کے کوریڈور کی سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ جہاں اس وقت اسٹوڈنٹس کا رش قدرے کم تھا اور پھر صرف پانچ منٹ میں عمر وحید اس کی دائیں جانب آکر بیٹھ چکا تھا۔ علینہ کا اس کے سامنے سے گزر جانا ہی گویا ایک طرح کا سگنل تھا کہ وہ اب اپنی موجودہ مصروفیت ترک کرے اور اس کے پیچھے آنے کی کرے۔

اس کے ہاتھ میں ابھی تک کوک کا ٹن موجود تھا' جبکہ برگر وہ ہڑپ کر چکا تھا۔

"کیا بنا؟" علینہ نے عمر وحید کے ہاتھ سے ٹن اچکتے ہوئے کہا۔

"مقبوب!" عمر نے آنکھیں سکیڑ کر سامنے گراؤنڈ میں نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ تو تمہارا میں یقینا" بناؤں گی' اگر یہی حالات رہے تو۔" علینہ نے عمر کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے جواب دیا اور ٹن منہ سے لگالیا۔ عمر بے بسی سے بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ کچھ پل دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی' پھر علینہ نے خالی ٹن ایک جانب اچھال کر اس خاموشی کو توڑا۔

"تم ابھی تک اپنے گھر بات نہیں کر سکے' جبکہ میں آج یونیورسٹی سے واپسی پر بات کرنے والی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" عمر نے بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ کل میرا جو رشتہ آیا تھا اس کی بابت آج اماں کو میری رائے لینا ہے اور میں صاف انکار کردوں گی۔ پھر جو ہو گا' دیکھا جائے گا کیونکہ تمہیں پتا ہے میں کسی صورت اپنی برادری میں شادی نہیں کرنے والی۔" علینہ نے عمر کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"اور اگر میں بھی تمہاری برادری سے ہوتا تو...؟"

"نہیں ہو تب ہی تمہارے ساتھ بیٹھی ہوں یہاں۔" علینہ کے یوں کہنے پر عمر سٹپٹا گیا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اپنی ذات' برادری سے کس حد تک چڑتی ہوں۔ تم سے میں نے کبھی بھی اس حوالے سے اپنی ناپسندیدگی نہیں چھپائی۔ تم میں انٹرسٹ لینے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ تم مجھ میں انٹرسٹڈ ہو گئے تھے۔ تمہاری طرف قدم بڑھانے کی سب سے بڑی وجہ تمہاری کاسٹ تھی۔ یہ الگ بات کہ اب میرے بھی جذبات تمہارے لیے کم و بیش ویسے ہی ہیں جیسے تمہارے۔ لیکن اب تمہیں اپنے ماں' باپ کے سامنے اسٹینڈ لینا ہو گا۔ بالکل ویسے جیسے میں اپنے گھر میں آج تمہاری خاطر سیاپا ڈالنے والی ہوں۔" علینہ نے سنجیدگی سے عمر کو وارننگ دینے کے انداز میں کہا۔ وہ غور سے علینہ کا چہرہ دیکھنے میں مگن تھا' ایک دم گڑبڑا گیا۔

"تم فکر مت کرو! آج میں بھی ہر حال میں گھر میں کوئی نہ کوئی سیاپا ڈال دوں گا اور ویسے بھی میں اماں کے کانوں میں تو بات ڈال چکا ہوں۔ انہیں راضی کرنا کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ کہتی ہیں کہ اپنے باپ کو خود ہی راضی کرو۔ وہ لڑکی کے غیر ذات اور برادری کی ہونے کا سنتے ہی میرا قیمہ کردیں گے۔ وہ بھی ذات پات کے معاملے میں خاصے پکے ہیں۔"

عمر نے بات روک کر ایک نظر علینہ کو دیکھا۔ وہ بے نیازی سے اپنے بیگ کی زپ کھول اور بند کررہی تھی۔

"کچھ کہو نا۔ سن رہی ہو نا میری بات؟" عمر نے علینہ کو ٹہوکا دیا۔ جواب میں اس نے ایک نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سے اپنے مشغلے میں مشغول ہو گئی۔ تاہم عمر جانتا تھا کہ وہ پورے دھیان سے اس کی بات سن رہی ہے۔

یہ بھی بہت بڑی حقیقت تھی کہ عمر وحید' علینہ بشیر سے بے حد محبت کرتا تھا اور کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تسلی دینے والے انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

"اچھا! تم ٹینشن مت لو۔ اب چاہے اماں اور ابا کو منانے کے لیے مجھے اپنی ٹنڈ بوٹی نہ کروانی پڑے میں کروالوں گا۔" عمر وحید نے سینے پر ہاتھ مار کر علینہ کی سمت فخریہ دیکھا جو ہنوز اسی انداز میں بیٹھی تھی۔ پھر جو اس نے کہا' اس بات نے عمر وحید کے توتے' کبوتر سب اڑا دیے۔

"مجھے کوئی ٹینشن نہیں عمر! ٹینشن تم لو۔ کیونکہ اگر تم اپنے ماں' باپ کو منانے میں ناکام رہے تو وہ تو شاید تمہاری تکہ بوٹی نہ کریں' مگر میں ضرور تمہارا قیمہ کردوں گی اور وہ بھی استرے کے ساتھ' کیونکہ تم جانتے ہو کہ میں نائیوں کی لڑکی ہوں' سمجھے؟" علینہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی عمر وحید بے بسی سے اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔ کیونکہ وہ علینہ بشیر کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھا۔

☆ ☆ ☆

محلہ اسلام آباد کی تنگ گلیوں میں بنے تین مرلہ مکان کی رہائشی علینہ' ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور آج کل ہر دوسری لڑکی کی طرح معاشرے میں پھیلی وبا کے زیر اثر اپنے حالات سے پریشان اور بیزار اور اس سے بھی زیادہ اپنی ذات' برادری سے نالاں تھی۔

نو نفوس پر مشتمل یہ خاندان اس چھوٹے سے گھر میں بس سمایا ہوا تھا۔ کس طرح؟ یہ جانے دیجیے۔ بس یہ ان ہی کا کمال تھا۔ دادی' ابا' اماں اور چھ بچے۔ جن میں چار لڑکیاں اور دو لڑکے۔

سب سے بڑی علینہ تھی۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں تھیں' پھر دونوں بھائی اور پھر سب سے چھوٹی بہن۔ جسے پیار سے سب لاڈو کہتے تھے۔ اتنا لاڈ پیار ملا تھا سب کہ اس لاڈ پیار کے نتیجے میں ہر ایک کے پاس خصوصی پائی جاتی اور پھر ایک کی بات دوسرے کے کان میں لگنے لاڈ سے پہنچائی کہ اس کے نتیجے میں ہر ہفتہ تیسری جنگ عظیم رونما ہوتے ہوتے رہ جاتی۔ لاڈو کی اسی خاصیت کی بنا پر سب سے پہلے دادی نے اسے "لاڈو فتنی" کہنا شروع کیا' پھر پورے محلے میں وہ اسی نام سے جانی جانے لگی۔ علینہ کے باقی بہن بھائی قدرے بے ضرر تھے۔

بھائیوں کو اسکول کے بعد کنچے کھیلنا مرغوب تھا۔ ان کی پینٹ اور شرٹس کی جیبیں کنچوں سے اس طرح لبالب بھری رہتیں کہ اکثر کھانا کھاتے ہوئے دستر خوان پر ذرا سا بھی جھکتے تو کنچے ٹپاٹپ شوربے میں گرتے چھینٹے اڑاتے۔

علینہ سے چھوٹی دونوں بہنیں سفینہ اور سبینہ' بڑی بہن علینہ کی نسبت کم گو واقع ہوئی تھیں۔ دونوں کالج میں پڑھتی تھیں اور دل ہی دل میں بڑی بہن کے نزمودات کو سراہتی تھیں۔ لیکن منہ پر لانے سے ذرا گریز ہی کرتی تھیں۔ جبکہ علینہ کے دردوں ہوتا۔ زبان پہ گئی تھی۔ سو وہ اعلانیہ بلبلاتی سنائی دیتی۔ اسے اپنے گھر کے ماحول سے اور اپنے باپ کے پیشے سے چڑ تھی۔

لوگوں کے بال کاٹنا' شادی بیاہ کے موقع پر دیگیں پکانا' علینہ کے ابا کا پیشہ تھا۔ وہ خاصے چرب زبان مشہور تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ بشیرا نائی قینچی سے لوگوں کے بال کترتا ہے اور اپنی زبان سے لوگوں کے کان۔

بچپن میں کبھی اسکول میں ٹیچرز نے یا کسی کلاس فیلو نے علینہ سے اس کے والد کے کام کاج کی بابت پوچھا ہوتا' جب اس نے یہ کہا کہ "بال کاٹتے ہیں" تو سب نے ایک دم آنکھیں پھاڑ کر یوں دیکھا جیسے علینہ نے کہا ہو کہ "جیب کاٹتے ہیں۔"

دھیرے دھیرے اسے ابا کے استرے' قینچی سے اور پھر اپنی ذات سے سخت بیزاری ہو گئی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ وہ کسی قابل فخر ذات سے تعلق نہیں رکھتی۔ تب ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے مستقبل میں جو واحد تبدیلی لائے گی' وہ کسی غیر ذات میں بیاہ ہو گی۔

بچوں کے بعد اب باری آتی ہے بڑوں کے تعارف کی۔ اس گھر کا سب سے بڑا یعنی بزرگ فرد دادی اماں ہیں۔ جو اب صرف "دادی" پکاری جاتی ہیں۔ وجہ وہی گھر کا مخصوص ماحول۔ اماں تو دادی کو "دادی" نہیں بلکہ ہمیشہ "بربادی" کہتی تھیں۔ وجہ' دادی کا کانوں سے تقریباً" بہرہ ہونا۔ بڑھاپے کی دین تھا یہ مرض۔ وگرنہ اماں میں کیا مجال کہ پر پھڑپھڑائیں۔ دادی میں جب تک دم خم تھا' اماں کے پر کتر کر رکھے اور پھر گزرتے وقت نے جب بے دم کیا تو بقایا رہ جانے والے پیچ و خم اماں نے نکال دیے۔

کانوں سے اونچا سننے والی دادی کی نگاہیں ہمہ وقت جو کس رہتی تھیں اور کچھ فطری چالاکی کے سبب بات کرنے والے کے ہونٹوں کی حرکت سے بات کا مفہوم بوجھ لیتی تھیں۔ جو بات سمجھ میں نہ آتی اسے من مرضی کا مطلب دینے میں کمال حاصل تھا۔ دادی کا سب سے بڑا کمال اماں کی باتوں کو سمجھنا اور پھر آستینیں کس کر میدان میں اترنا تھا۔ کچھ بائیس سالہ ساتھ نے دادی کو اماں کی بولی سمجھنے میں خاصا طاق کردیا تھا۔

اماں۔ اماں کے بارے میں کیا کہیے کہ "کہاں تک سنو گے' کہاں تک سنائیں۔" والا معاملہ تھا۔ ٹھگنے سے قد والی' گول مٹول سی' موٹے موٹے نقوش اور گورے رنگ والی اماں۔ جن کی بات چیت اور لب و لہجے کی نقلیں پورا محلہ اتارتا تھا۔ وجہ۔ اماں کو ناک سے بولنے کی عادت تھی اور سونے پہ سہاگہ ہر حرف کے آگے نون غنہ (ں) کا استعمال۔ اماں کے ہر جملے میں اس کثرت سے نون غنہ پایا جاتا کہ سننے والا غش

کھا جاتا۔ اماں سے نیا ملنے والا ہر شخص بے اختیار اپنی ناک سکیڑنے اور پھیلانے لگتا تھا۔ لطف تو تب آتا جب گنگنانے کی شوقین اماں اپنے پسندیدہ گانے وے اک تیرا پیار مینوں ملیا کو کچن میں کام کرتے ہوئے گنگناتیں تو اپنی مرضی سے اس گانے میں ڈھیر سارے نون غنوں کا تڑکا لگاتی چلی جاتیں۔

باہر صحن میں لیٹے ابا جن کی پہلی محبت نور جہاں تھیں' تڑپ تڑپ جاتے اور عاشقانہ ان کی روح سے معافیاں مانگتے' چپل اڑس کر دکان کی راہ لیتے۔ جہاں ان کے کئی گاہک ان کی راہ تک رہے ہوتے۔ کچھ بھی تھا' پر ابا کے ہاتھ میں ہنر ضرور تھا۔ حجامت ایسی بناتے کہ پہلی بار بنوانے والا ہمیشہ بنواتا' دیگیں ایسی چڑھاتے کہ آج تک محلے کی کوئی شادی ابا کے بنائے کھانوں کے بغیر نہیں سجی تھی کچھ ایسا ہی ہنر ابا کی زبان میں تھا۔ بیٹھے بٹھائے بندہ ٹھگ لیتے تھے۔

ابا کے گاہکوں کی بڑھتی تعداد میں ان کی زبان کا کمال' ہاتھ کے کمال کے ہمیشہ ہمراہ رہا۔ یہ اور بات کہ ان کے کسی کمال سے علینہ کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ کیونکہ ابا جتنے مرضی باکمال ہوتے' رہتے تو ہمیشہ نائی نا! اور علینہ اس حقیقت سے نظریں چراتی تھی کہ وہ کسی بھی دوسری ذات میں بیاہ کر چلی جائے' رہنا تو اسے نائی کی بیٹی ہی تھا نا۔

☼ ☼ ☼

"یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔" علینہ نے للکار کر کہا اور پاس دھرے شاپر میں ہاتھ ڈال کر بھنے ہوئے چنے مٹھی میں بھر کر پھانکے۔

"کیوں۔۔۔ کیوں نہیں ہوں سکتاں؟" اماں نے جواباً اپنی آواز کو ناک میں "اڑس" کر کہا اور ساتھ ہی علینہ کے ہاتھ سے چنوں کا شاپر جھپٹ لیا۔

دادی قریب ہی اپنی چارپائی پہ بیٹھی بڑے غور سے دونوں ماں بیٹی کی گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نظر ان کی بھی چنوں کے شاپر پر تھی۔ جب سے ابا نے انہیں نئی بتیسی لگوا کر دی تھی' وہ شوقیہ ہر سخت سے سخت چیز کھانے کی کوشش میں رہتی تھیں۔

"بتا تو چکی ہوں آپ کو۔" علینہ لاپروائی سے کہتی دادی کی چارپائی پر جا ٹکی۔ "مجھے نائیوں میں شادی نہیں کرنی۔۔۔ بس۔"

اماں علینہ کے دادی کے پاس جا کر بیٹھنے پر خاصی جزبز دکھائی دے رہی تھیں کہ اب دادی ان کی بات قدرے آرام سے سمجھ سکتی تھیں۔ لامحالہ اماں کو بھی پیڑھی کھسکا کر وہیں لانی پڑی۔ پھر علینہ سے بولیں۔

"تاں! مجھیں یہ بتاں کہ تیریں لیئں کہاں سیں غیر ذانت کاں کھوتاں ڈھونڈوں؟" (نا! مجھے یہ بتا کہ تیرے لیے کہاں سے غیر ذات کا کھوتا ڈھونڈوں؟)

"چلو! پہلے تو اس کے لفظوں کے تھال سے نون غنے چنو' پھر دیکھو' بات کیا نکلتا ہے۔" دادی بڑبڑائیں اور علینہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ دادی اور اماں کی نوک جھونک میں وہ عموماً سب کے سب ہنسا ہی کرتے تھے۔

"مجھے نہیں پتا اماں! کھوتا ڈھونڈیں یا خچر۔۔۔ بس ہو وہ غیر برادری کا۔ مجھے کسی نائی شائی سے شادی نہیں کرنی۔"

"اریں کم بخنت! تجھیں پتاں نئیں کہ "ٹینڈی ہیئر شاپ" کے نام سیں کتنیں بڑی دوکان ہے' بشارنت ٹینڈی کی۔" (ارے کم بخت! تمہیں پتا نہیں کہ۔۔۔ "ٹیڈی ہیئر شاپ" کے نام سے کتنی بڑی دکان ہے بشارت ٹیڈی کی۔) اماں کو اب غصہ چڑھنا شروع ہو گیا تھا اور غصے کی حالت میں اماں کا اپنی ناک پر ستم مزید بڑھ جاتا تھا۔

"تاں! کوئی مجھے بھی بتائے گا کہ کون سا فتنہ کھڑا کرنے والی ہو تم دونوں ماں' بیٹیاں۔۔۔؟" دادی سے اب رہا نہیں گیا تو بیچ میں کود ہی پڑیں۔ علینہ کے بولنے سے پہلے اماں نے جواب دیا۔

"اس کاں دماغ خراب ہوں گیاں ہے اماں! کہتی ہے غیر ذانت میں شادیں کریں گی۔۔۔ بے ہوداں۔۔۔ اپنی اور میریں کھال نچوائے گی باپ سیں وہ بھیں استریں کے ساتھ۔" (اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے اماں۔ کہتی ہے غیر ذات میں شادی کرے گی۔۔۔ بے ہودہ۔۔۔ اپنی اور میری کھال نچوائے گی باپ سے۔۔۔ وہ بھی استرے کے ساتھ۔)

"ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے دادی؟" علینہ نے اپنا رخ دادی کی طرف موڑا' جن کا حیرت کے مارے منہ کھلا ہوا تھا۔

"آپ ہی بتائیں۔۔۔ میں ایم اے پاس' کیا کسی نائی سے شادی کرنے جوگی ہی رہ گئی ہوں۔ کل کو میری سہیلیاں مذاق نہ اڑائیں گی میرا؟ آپ تو میری بات سمجھیں نا دادی۔۔۔ آپ ابا کو منائیں میری خاطر پلیز!" علینہ نے التجائیہ دادی کے گھٹنے تھام کر کہا تو دادی تو گویا بدک ہی گئیں۔

"اوئی۔۔۔ ستیاناس جائے تیرا۔" دادی نے علینہ کو پرے دھکا دیا۔

"مرن جوگی! مجھے کہتی ہے ابا کو مناؤں۔ ابا کو میں کیا مناؤں' پہلے میں خود تیرے ٹوٹے کروں گی۔ اس عمر میں کھے ڈلوا رہی ہے میرے سر میں۔ تیری ماں کو بھی جوتے پڑواؤں گی تیرے باپ سے۔ یہ اسی کی ضد تھی' تجھے یونیورسٹی میں پڑھانے کی۔ آلینے دے اپنے باپ کو۔ تیری ماں کو وہ مار کھلواؤں گی کہ ہمیشہ کے لیے ناک بند ہو جائے گی اس کی۔" دادی کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔ ایسے میں ان کا ہدف اماں ہی ہوتی تھیں۔ علینہ نے جھٹ آگے ہو کر دادی کے گلے میں بانہیں ڈالے اور انہیں زور' زور سے جھلانے لگی۔

"پلیز دادی۔۔۔ پلیز! مان جائیں نا۔ سوچیں! اس میں آپ کی بھی ٹور بنے گی۔ ساری دنیا کہے گی کہ کرامت بی بی کی پوتی کتنی خوش نصیب ہے۔۔۔ کیسے پڑھے لکھے اور اونچی ذات کے گھرانے میں گئی ہے۔ سوچیں دادی۔۔۔ سوچیں۔"

"کم بخت! میرا گلا چھوڑے گی تو سوچوں گی نا۔" دادی جھلائیں۔

علینہ نے جوش میں آ کر کچھ زیادہ ہی زور سے دادی کی گردن کو جکڑ لیا تھا۔ شرمندہ سی ہوتی پیچھے ہٹی تو دادی گردن سہلانے لگیں۔ اماں کوفت اور غصے سے اس سارے منظر کو دیکھ رہی تھیں' کیونکہ جانتی تھیں کہ علینہ دادی کو منا کر ہی دم لے گی اور دادی کی ساری پھوں پھاں بس یہیں تک تھی۔ تب ہی دادی کن اکھیوں سے اماں کو دیکھتی علینہ سے بولیں۔

"تو مہارانی۔۔۔ ایسا بانکا رشتہ آئے گا کہاں سے؟ کیا کسی تل سے ٹپکے گا یا گٹر سے ابلے گا؟"

"اف! خدا کا نام لیں دادی۔۔۔ ایک تو بانکا کہہ رہی ہیں اور دوسری طرف اخراج کے لیے کون کون سے ذرائع گنوا دیے۔" علینہ کو سوچ کر ہی گھن سی آئی۔ تصور میں اس نے عمر وحید کو نل میں سے ٹپکتا اور گٹر میں سے ابلتا دیکھا۔ آخ۔

"چپ کر جاں نانجار!" اماں کو خاموش بیٹھنا گوارا نہیں ہو رہا تھا۔ اسی لیے ایک بار پھر ٹانگ اڑائی۔

"شکر ہے۔۔۔ سو رانی کو کوئی تو لفظ ملا جسے ناک سے نکالنے کے لیے زیادہ زور نہیں لگانا پڑا۔" دادی کا اشارہ نانجار کی طرف تھا۔ جواب میں اماں جی بھر کر بڑبڑائیں۔

"تو چھوڑ اپنی اماں کو۔" دادی سے علینہ کی اتری صورت زیادہ دیر برداشت نہیں ہوتی تھی۔ آخر کو بڑی پوتی تھی ان کی۔

"میں منالوں گی تیرے باپ کو۔۔۔ برادری سے بھی ٹکر لے گی کرامت بی بی۔۔۔ پر رشتہ بھی تو کوئی ہو نا۔" دادی اب بالکل رشتہ کے لیے ہو چکی تھیں۔

"رشتے کا کیا ہے دادی! آواز نکالیں گے تو رشتے بھی آجائیں گے۔ پہلے آپ ابا کو راضی کرنے کی مہم تو سر کریں۔" دادی سے کہنے کے بعد علینہ نے شرارتاً اماں کو دیکھا اور بولی۔

"کیوں اماں۔۔۔ ٹھیک کہا نا میں نے۔ ابا راضی تو سب راضی۔۔۔ ہے نا میری پیاری اماں۔" علینہ نے خوشامدی انداز میں اماں کے گلے لگنا چاہا' جب ایک زوردار دھکا اماں کی طرف سے پڑا تھا اور علینہ الٹ کر دادی کی گود میں جا پڑی اور دادی جواب بڑے اطمینان سے دیکے کا پیالہ گود میں دھرے بیٹھی تھیں۔ (اماں نے اس تکرار سے کچھ ہی دیر پہلے لا کر تپائی پر ڈھک کر

رکھا تھا) اور اب بچے بھر کر منہ میں لے جانے ہی والی تھیں کہ اس بھرے پیالے پر علینہ کا سر کسی افتاد کی مانند آن پڑا۔

دادی کی گود اور علینہ کے بال دلیے میں لت پت ہو چکے تھے۔ مگر دونوں کو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا کہ نہ دادی نے علینہ کے سر کو حرکت دینے کی کوشش کی اور نہ علینہ نے خود ہی ایسا کرنے کی غلطی کی۔

اب یہ علینہ اور دادی کا درد سر تھا کہ اس سارے بکھیڑے کو کیسے سمیٹیں۔ پر اماں نے تو ایک جست میں ہی دونوں کو چت کر کے اپنی برتری ثابت کر دی تھی۔ وہ اٹھیں اور گول گول سے دیدے گھماتے ہوئے علینہ سے بولیں۔

"اب یہاں بیٹھیں سر کو نہ نچوڑتی رہ۔ بڑی آئیں غیر ذات کا رشتہ لانے والیں۔" (اب یہاں بیٹھی سر کو نچوڑتی رہ' بڑی آئی غیر ذات کا رشتہ لانے والی۔) اماں ٹھمک کر مڑیں اور باورچی خانے میں گم ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

اور دادی نے ابا کو منا ہی لیا۔ علینہ نے میدان مار لیا اور اماں اکیلی اتنی مضبوط اپوزیشن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ ماں تو تھیں' بیٹی کے اچھے مستقبل کی امید پر راضی ہونے میں کتنی دیر لگتی۔

علینہ نے عمر وحید کو گرین سگنل دے دیا۔ ادھر عمر کم و بیش اپنے ابا کو منانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کی اماں اور بڑی بھابھی نے اس سلسلے میں اس کی کافی مدد کی تھی۔ شروع میں تو ابا' لڑکی کے نائین ہونے پر خاصے جز بز تھے۔ عمر وحید کو دو ہاتھ بھی جڑ چکے تھے کہ عقل کے اندھے! محبت کرنے سے پہلے لڑکی کی ذات نہیں معلوم کی تھی کیا؟ جس پر عمر وحید نے خاصے جذباتی انداز میں جواب دیا۔

"ابا جی! محبت اندھی ہوتی ہے۔" اور اس جواب کے ساتھ ہی ابا جی کا دس نمبر کا چھتر جب سر پر آکر لگا تو عمر وحید کو کچھ دیر کے لیے ساری دنیا نظر آنا بند ہو گئی تھی۔ وہ تو اماں اور بھابھی نے بیچ بچاؤ کروا دیا' ورنہ ابا' عمر وحید کی محبت کو "لولا لنگڑا" بنانے کا پورا ارادہ رکھتے تھے اور پھر ادھر عمر وحید نے علینہ کو ابا کے راضی ہونے کی خبر دی۔ ادھر علینہ بی بی کی شوخیاں آسمان کو چھونے لگیں۔

اور ٹھیک ایک ہفتے بعد عمر وحید کے والدین اور بھائی بھابھی' علینہ کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔

کچن میں چائے کے لوازمات ٹرے میں سجاتی علینہ اور اس کی مدد کرواتی سبینہ اور سفینہ کو شدید بے چینی لاحق تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ اماں' ابا اور دادی کی جگہ علینہ خود ہی بیٹھ کر اپنا رشتہ او کے کر دے۔ اور تو اور آج تو لاڈو کو بھی اندر جانے سے سختی سے منع کر رکھا تھا اماں نے اور یہ بھی دادی نے ہی اماں کے کان میں پھونکا تھا کہ اپنی چھوٹی فتنی کو ڈرائنگ روم میں آنے سے روکے رکھو۔ یہ نہ ہو کہ لڑکے کا باپ اس لاڈو کی طبیعت کا چونچال پن دیکھ کر ہی اس کا قیمہ بنا دے۔ کچھ ایسا ہی کچن میں ان تینوں بہنوں کے سننے میں آ رہا تھا کہ لڑکے کا باپ شکل سے ہی قصائی لگتا ہے اور یہ تو علینہ نے بھی دیکھا کہ ایک دفعہ ابا ڈرائنگ روم سے باہر کسی کام سے آئے تو ان کے دونوں ہاتھ ادبا" بندھے ہوئے تھے' ورنہ خاموش ـــ ابا کم از کم علینہ نے آج تک نہیں دیکھے تھے۔

اماں باہر آئیں تو لڑکیوں نے موقع غنیمت جانا اور انہیں گھیر گھار کر سوال جواب کرنے لگیں۔ مگر یہ کیا! اماں تو یوں لگتا تھا جیسے اندر سے کسی کی مرید ہو کر نکلی ہیں۔ بڑے مؤدب انداز میں انہیں اشارے سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا کہا اور چائے لانے کا کہہ کر غڑاپ سے دوبارہ اندر۔

علینہ کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ایسا کیا ہو رہا تھا اندر۔

جب تمام مہمان چلے گئے تو بلی بھی تھیلے سے باہر آ گئی۔ رشتہ بھی ایک ہی نشست میں پکا ہو گیا اور ساتھ آئی ڈھیروں مٹھائی بھی محلے میں تقسیم کے لیے تیار تھی۔ جاتے جاتے علینہ کی ساس نے اس کے ہاتھ پر

دو ہزار دھرے اور زوردار جپھی ڈال کر گیلے گیلے ہونٹوں سے اس کا منہ بھی چوم ڈالا۔ محترمہ پان کھانے کی شوقین تھیں اور اسی کی پیک ہونٹوں کے کناروں پر جمع ہوئی رہتی تھی۔ بڑی بھابھی نے کھسیا کر آگے بڑھ کر اپنے دوپٹے کے کنارے سے علینہ کے گال پر لگا گال صاف کیا اور گرم جوشی سے گلے ملتی آگے بڑھ گئیں۔

علینہ سے اس کے سسر جب ملے تو ایک لمحے کو اسے خوب جانچتی نظروں سے گھورا اور پھر چہرے پر نرمی چھا گئی اور اسی نرم مسکراہٹ کے ساتھ بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ دھر دیا۔

ایک ٹھنڈی اور سکون آور سانس ارد گرد کھڑے نفوس کے سینوں سے خارج ہوئی تھی۔ عمر وحید کی ماں بھابھی کے چہرے بھی خوشی سے چمک اٹھے تھے۔ کیونکہ "نائیوں کی کڑی" عمر وحید کے ابا جی کو پسند آ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
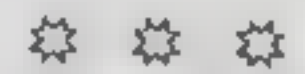
"نا۔ ! میں کہتی ہوں تجھے ذرا بھی عقل تمیز نہیں کہ بچیوں کے رشتے کس طرح طے کیے جاتے ہیں؟" دادی' ابا کو آڑے ہاتھوں لیے بیٹھی تھیں۔ انہیں بڑا قلق تھا کہ ان کے بیٹے نے رشتہ یوں طے کر دیا جیسے لڑکی دروازے سے باہر ہی تو پڑی تھی۔ اب اسی کا غصہ نکل رہا تھا۔

"توبے بے! اور میں کیا کرتا؟ منڈے کا ابا تو چھرے تلے دم بھی نہیں لینے دے رہا تھا۔" ابا سر جھکائے بڑے جوش سے ناخن تراش کے ساتھ پیروں کے ناخن کاٹ رہے تھے۔

"اس کے چھرے کی ایسی کی تیسی۔ کسی کی کیا مجال جو ہمارے بچے۔ ہاتھ دھرے۔ تجھے تھوڑا وقت لینا چاہیے تھا کہ سوچ کر بتائیں گے' مشورہ کریں گے برادری میں پہلے' مگر تو' تو کڑی کو ڈولے میں بٹھانے کو تیار بیٹھا تھا۔" دادی کو غصہ آ گیا تھا اور چونکہ بہرے پن کا عارضہ لاحق تھا۔ لہٰذا طیش میں خوب اونچا بولیں' علینہ اور اماں بھی صحن میں نکل آئیں۔

"حد ہو گئی ہے بے بے!" ابا نے ناخن تراش پٹخا' پھر بولے۔

"پہلے تو میرے گلے۔ ناخن دھرا ہوا تھا کہ برادری سے باہر رشتہ ڈھونڈو۔ کڑی کی مرضی نائیوں میں جانے کی نہیں۔ اب جب آپو آپ رشتہ آ گیا اور کوئی اِل میل بھی نہیں تو میں کیوں انکار کرتا؟ اور پھر ساتھ نذیر ورک والا بھی تو تھا۔ اس نے پوری گارنٹی دی ہے ان لوگوں کی اور آج تک نذیرے کے لگائے رشتے داغی نہیں نکلے۔"

بات ابا کی ٹھیک تھی۔ غیر برادری سے رشتہ آ جانا غنیمت تھا' کیونکہ یہ لوگ برادری سے باہر رشتہ نہ کرنے کے لیے اتنی شہرت رکھتے تھے کہ غیر ذات چاہ رکھتے ہوئے بھی ان کو رشتے کے لیے نہیں پوچھتی تھی۔ سو ایسے میں تیرے میرے کانوں میں بات ڈالے بغیر ہی کام بن گیا تھا' تو پھر چھنا چھانو' اتنا کر کرا والی بات کیوں کرتے۔

دادی بھی بات سمجھ گئی تھیں' اسی لیے کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ اتنے میں اماں کچن سے ٹرے میں شربت کا جگ اور دو گلاس رکھے وہیں آ براجمان ہوئیں اور تب ہی دادی کو اماں سے کچھ پوچھنا یاد آیا۔

"نیں قیصو۔ ! منڈے کا نام کیا ہے؟" گلاس میں شربت انڈیلتی اماں نے ایک نظر دادی کو دیکھا اور بولیں۔

"عنمر وحید۔"

"کیا۔ ؟ کیا بولی؟" دادی کے کچھ پلے نہیں پڑا۔

"اوہوں اماں۔ عنمر وحید۔ عنمر وحید۔"

اب کے اماں جھنجھلا گئیں۔ جبکہ دادی کے چہرے پر ابھی بھی ناسمجھی کے تاثرات تھے۔ تب ہی اماں کے ہاتھ سے گلاس پکڑتے ہوئے ابا نے دادی کو ٹوکا۔

"تو بے بے! کس سے سر پھوڑ رہی ہے۔ اس کی ناک کی نوک سے نکلنے والے نوکیلے نکینے کسی کو بھی ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔"

ایک زوردار قہقہہ کچن کے دروازے کے پاس

کڑی علینہ کے منہ سے برآمد ہوا تھا۔ جس نے بے اختیار ابا کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سو اپنے ایسے شان دار "حق" سے مزین فقرے پر اماں اور دادی کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

دادی کا پہلے ہی آج کچھ موڈ اچھا نہیں تھا اور اب کے ابا نے پھر غصہ دلا دیا۔

"در فٹے منہ!" دادی پھنکاریں اور اماں کو دیکھ کر بولیں۔ "پھڑ! قیصو! ذرا جوتی۔۔۔ آج میں سب کی ناکیں چیس دوں گی۔ ساری عمر اس ناک نے میری ناک میں دم کیے رکھا اور اب تیری محبت نے تیرے خصم کی ناک میں بل دے دیا ہے۔" دادی اور غصے میں اماں کو نہ لپیٹیں۔ یہ غضب دادی نے کبھی نہیں کیا تھا۔ ابا نے حالات بگڑتے دیکھے تو فوراً دادی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ٹھنڈے شربت کا گلاس پکڑایا اور بولے۔

"بے بے! چل جانے دے۔ تھوک دے غصہ۔ زیادہ دماغ گرم کرنے سے اس کی گرمی کانوں تک پہنچتی ہے اور ابھی تو "تو" تھوڑا بہت سن لیتی ہے ناکہ تیری بہو تجھے کیا کیا بولتی ہے۔۔۔ اگر بالکل بہری ہو گئی تو اپنے ارد گرد ہونے والی سازشوں کو کیسے سن پائے گی۔" ابا نے چاپلوسی سے کام لیا اور دادی کو بھی اس خوشامد سے زیادہ دوسری بات دل کو لگی تھی۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھیں، ماسوائے گھر کے معاملات سے لاتعلقی۔

"اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔ صحیح کہتا ہے تو۔ چل اب بتا کہ منڈے کا نام کیا ہے؟ اور کرتا کیا ہے؟ اس وقت تو مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں لگا۔ بس منڈے کے ابے کی دہشت ہی کچھ ایسی تھی۔" دادی نے کانوں میں انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"عمر وحید نام ہے بے بے! اور منڈے کا اپنا کلم کلج ہے بڑا ووڈا۔ اوپر سے سولہ پڑھا ہوا ہے۔" ابا نے مدد بنتے ہوئے تفصیل سے جواب دیا۔

"ہوں۔" جوابًا دادی بھی متانت سے ہنکاریں۔

"پھر دہائے کون سے مانگے ہیں؟ تیاری کے لیے کتنے دن ملیں گے ہمیں؟" دادی کے اس سوال پر اماں بھی چوکس ہو گئیں۔ آخر کو ہتھیلی ان ہی کی گرم ہونا تھی۔

"بس بے بے! یہی کوئی حج والی عید (عیدالاضحیٰ) سے ہفتے پہلے کی تاریخ دی ہے وحید الرحمان صاحب نے۔"

"کون بدزبان؟" دادی کے کان پھر جواب دے رہے تھے اور اب ابا کے گلے کا پرزور امتحان تھا۔ انہوں نے گلا کھنکارا اور قدرے اونچا بولے۔

"وحید الرحمان بے بے! وحید الرحمان۔ اور اس کے سامنے کہیں غلطی سے بھی اسے بدزبان نہ کہہ دینا' ورنہ ہم سب کی زبانیں کاٹ دے گا۔"

"اچھا' اچھا! پاگل نہیں ہوں جو ایسی بات اس کے منہ پر کہوں گی۔ ہاں پیچھے سے تو صاف کہوں گی کہ شکل سے ہی قصائی کی اولاد دکھتا ہے۔ بگاڑ لے کیا بگاڑے گا؟" دادی سینہ تانے ابا کو گھورتے ہوئے بولیں۔

ابا نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھٹک کر اماں کی طرف متوجہ ہوئے' جو کسی گہری سوچ میں غرق تھیں۔ ابا کی نظروں کے تعاقب میں دادی نے بھی اماں کو دیکھا تو دل دکھ گیا بولیں۔

"دیکھا بشیر۔۔۔ چاہے ماں شکل سے کتنی ہی ہونق کیوں نہ لگتی ہو۔ چاہے ووٹے سارے سر میں رائی دانے برابر بھی عقل نہ ہو۔ چاہے۔۔۔"

"او بے بے! جانے دے آگے بھی تو نکل لو۔" ابا زچ ہو گئے تھے۔ ابھی بھی نہ ٹوکتے تو دادی کو اماں کی خامیوں کی فہرست طویل کر دینی تھی۔

"او کھا کلیجے کو ہوتا ہے۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ آج میری اس جھلی نوں کو بھی بیٹی کی جدائی نے دکھی کر ہی دیا۔ دیکھ تو۔۔۔ کب سے چپ بیٹھی ہے۔ ورنہ قیصو بی بی جہاں بیٹھی ہوں' وہاں لفظوں کی بمباری سے ٹپاٹپ لون غنہ نہ گریں۔ یہ کبھی ہوا تو نہیں۔ کیوں قیصو؟" بات مکمل کرکے دادی نے اماں کا گھٹنا ہلایا تھا۔ اماں نے چونک کر دیکھا تو دادی نے ہمدردی سے پوچھا۔

"کیا سوچ رہی ہو قیصو! دکھ نہ کر۔ یہ دن تو سب ہی کو دیکھنا ہے۔ جس کو بھی رب نے بیٹی دی ہے۔ اللہ بھلا کرے گا۔ ویسے۔۔۔ کیا سوچ رہی ہے؟"

ابا بھی اماں کی طرف متوجہ ہو گئے' جو اب حیران نظروں سے دادی اور ابا کو تک رہی تھیں۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد بڑی ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"حق ہاں۔۔۔ مجھے کیاں سوچنا ہے اماں۔۔۔ بس یہیں سوچ رہی تھیں کہ علینہ کی برات والیں دن کس رنگ کی ساڑھیں پہنوں اور کیاں سوچنا ہے مجھ غریب کو۔" (حق ہا! مجھے کیا سوچنا ہے اماں۔۔۔ بس یہی سوچ رہی تھی کہ علینہ کی بارات والے دن کس رنگ کی ساڑھی پہنوں اور کیا سوچنا ہے مجھ غریب کو۔)

اماں تو کہہ کر اٹھیں اور چپل گھسیٹتی کچن کی طرف ہو لیں۔ ابا ہنسی دباتے دکان جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے کہ دادی کو اب سارا زلزلہ ابا پر گرانا تھا اور دادی کینہ توز نظروں سے کچن کے جالی والے دروازے کو دیکھتی بڑبڑاتی ہوئی لیٹ گئیں۔

☼ ☼ ☼

اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا جس دن کے لیے عمر وحید اور علینہ بشیر نے منتیں مانی تھیں۔ عمر وحید سہرا باندھے علینہ کو بیاہنے چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ عمر ہال کی۔ عمر وحید کے دوستوں اور کزنز نے ہال سے باہر سڑک پر خوب ہنگامہ کیا تھا۔ عمر کی ماں' بھابھی اور ابا' سب ہی کے چہرے خوشی سے کھلے پڑ رہے تھے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال لڑکی والوں کی طرف بھی تھی۔

شان دار استقبال کے بعد باراتی خواتین اپنی نشستوں کی طرف چلیں تو بارات کے ہمراہ آنے والی ایک خاصی معمر خاتون سب سے آگے تھیں۔ خاصی عمر کی تھیں' مگر بے حد چست و ہوشیار۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ عمر وحید کی دادی ہیں۔

"لو جی! منڈے کی دادی ابھی جیوندی (زندہ) ہے۔" علینہ کی دادی نے سنا تو انہیں قدرے اچنبھا ہوا۔ پاس ہی اماں کھڑی تھیں۔ آواز نیچی کرکے بولیں۔

"جنس اماں! یہ جو پرانی مائیاں ہوتیں ہیں نا بڑیں پکی ہڈیں کی ہوتیں ہیں۔ جنہیں مجھ جیسوں کوں سہنا پڑتا ہے۔۔۔ بے چاریں عنمر کی اماں۔" (بس اماں! یہ جو پرانی مائیاں ہوتی ہیں نا' بڑی پکی ہڈی کی ہوتی ہیں۔ جنہیں مجھ جیسوں کو سہنا پڑتا ہے۔ بے چاری عمر کی اماں۔)

اتنا کہہ کر اماں اپنی سمدھن کے پاس ہنستی مسکراتی چلی گئیں اور دادی کو ان کے جانے کے بعد سمجھ میں آیا کہ اماں نے اصل میں ان ہی کی چٹکی لی ہے۔ لیکن اس وقت ضبط کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا ایک کڑوی نظر اماں کے گول مٹول سراپے پر ڈال کر رہ گئیں۔ انہوں نے بیٹی کی شادی میں پہننے کے لیے خاص تیکھے نارنجی رنگ کی ساڑھی بنوائی تھی۔ حالانکہ ساری بیٹیوں نے منع بھی کیا۔ خود علینہ نے سوبر رہنے کی تاکید کی تھی۔ مگر وہ اماں ہی کیا جو من مرضی نہ کریں۔ سو اب سب کی ہنستی نظروں کا مرکز بنی اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔

دادی نے خون کے گھونٹ پیے اور عمر کی دادی کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

"اور بہین جی! کیسے مزاج کیسے ہیں؟ مجھے تو آج ہی پتا چلا کہ عمر کی دادی بھی ہیں۔ آپ رشتہ طے کرتے وقت نہیں آئی تھیں۔۔۔ تو ہم نے سوچا عمر کی دادی یقیناً "اللہ بخشے" ہو چکی ہوں گی۔" دادی نے اپنی طرف سے ٹھٹھا لگایا تھا' مگر الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔

"نا آپا جی۔۔۔ وہ کیوں بھلا! جب آپ اتنی وڈیری (بوڑھی) ہو کر ہٹی کٹی زمین کی کنڈ (کمر) توڑ رہی ہیں تو میں نے تو ابھی دس برساتیں آپ سے کم ہی دیکھی ہوں گی۔"

دادی تو بری طرح سٹپٹائیں۔ مقابل ان کی ٹکر کا تھا۔ ادھار رکھنے کی قائل تو نہ تھیں' پر جواب پھر بھی پر چھوڑ کر پچھلی رو میں بیٹھی علینہ کی چند دوسری سسرالی عورتوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"اے پتر! ذرا گل سننا۔" دادی نے انہیں مخاطب

کر کے عمر کی دادی کی طرف اشارہ کیا اور بولیں۔
"یہ جو کہتی (انتا کا) ہی مائی لے کر آئے ہو ساتھ۔ ذرا اس کا نام تو بتانا۔"
"جمیل بیگم۔" ان میں سے ایک عورت نے جواب دیا۔
"لے دس۔" دادی دل ہی دل میں بڑبڑائیں۔
"ماں پیو نے نام ہی کو میوں والا رکھ دیا ہے۔ مائی کو مو مار تو بنتا ہی تھا۔ قصائن نہ ہو تو... ہونہہ۔"
دوسرے رخ پر بیٹھی عمر کی دادی بھی کسی خاتون کے کان میں کھسی کچھ ملتا جلتا ہی بیان جاری کر رہی تھیں۔
"کڑی کی دادی خاصی چلتر ہے۔ نائی ہیں نا۔ پر ہم کون سا کم ہیں' زبان وڈ کے ہاتھ میں پکڑاتے ہیں۔ ایک تو شکل سے ہی خرانٹ اوپر سے نام بھی گھونہ زنانہ نہ مردانہ۔ کرامت بی بی... لے دس! ہونہہ۔"
دونوں پارٹیوں کے ظاہری حالات اور رہن سہن ایک دوسرے سے خوب میل کھاتے دکھ رہے تھے۔ کچھ کھٹے کچھ میٹھے سے یہ رشتے جہاں ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں وہیں ان کا وجود سدا ایک پل کا سا کام ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

رخصتی کا شور اٹھا تو اماں کی ڈھنڈیا مچ گئی۔ اسٹیج سے اماں کے نام کی آوازیں مسلسل سنائی دینے لگیں۔ مگر اماں وہاں ہوتیں تو سامنے آبھی جاتیں۔ وہ بے چاری کوئی آدھ گھنٹہ پہلے واش روم گئی تھیں۔ زندگی میں پہلی دفعہ ساڑھی باندھی' بلکہ بندھوائی تھی' سو فال کھول بیٹھیں۔ بیڑہ غرق... اب کیا کریں' کچھ سمجھ میں نہ آیا۔
کچھ دیر خود ہی فال بنانے کی کوشش میں نڈھال رہیں۔ ناکامی پر ساڑھی کو گول گول کس کر لپیٹا اور اس لباس پر دو حرف بھیجتی پھنسے پھنسے قدموں سے ہال کا رخ کیا۔ اسٹیج تک پہنچنے میں ہی بری طرح نڈھال ہو چکی تھیں کیونکہ بغیر فال کے دھوتی کی مانند کس کر لپٹی ساڑھی میں چھوٹے چھوٹے اور پھنسے پھنسے قدم اٹھانا کس قدر مشکل ہے۔ یہ تو وہی جان سکتا ہے جسے کبھی ایسی صورت حال سے واسطہ پڑا ہو۔ جب اسٹیج کے قریب پہنچیں تو سیڑھیوں کے پاس ہی رک گئیں۔ اماں نے اسٹیج کے اوپر چڑھنے سے انکار کر دیا کہ وہ جانتی تھیں کہ قدم سے قدم جدا کرنا عذاب بنا ہوا تھا' کجا کہ پیر اونچا کر کے سیڑھی پر رکھنا۔
انہیں یہی بہتر لگا کہ وہیں کھڑی رخصتی کا شور ڈال دیں۔ ویسے بھی ان کے کان بہت سی ہنسی کی آوازیں سن رہے تھے۔ جو یقیناً" ان ہی کو دیکھ کر نکل رہی تھیں۔
"اٹھوں اٹھوں جی! جلدیں کرو۔ کڑی کی رخصتی میں دیر نہیں کرتے۔ ہال والوں کل ٹائم ختم ہونے والاں ہے۔ دیر کیں تواں ٹھڈیں ماریں گے۔ اٹھوں۔ عمر بیٹاں۔ اٹھیں بھائیں صاحب!" (او اٹھو اٹھو جی! جلدی کرو۔ کڑی کی رخصتی میں دیر نہیں کرتے۔ ہال والوں کا ٹائم ختم ہونے والا ہے۔ دیر کی تو ٹھڈے ماریں گے اٹھو عمر بیٹا اٹھو بھائی صاحب!)
سب ہکا بکا سے جلدی جلدی سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر سب کا دھیان اس طرف جو ہوا تو اماں کی جانب سے توجہ ہٹ گئی۔ اماں سکون کا سانس لیتی ایک طرف کو ہو گئیں تو ان کے عین پیچھے کرسی پر براجمان دادی نے انہیں ساڑھی کم دھوتی سے پکڑ کر کھینچا اور سرگوشیانہ انداز میں مخاطب ہوئیں۔
"کہا تھا تجھے کہ "املاس بولی" بن کر بیٹیوں کی باراتیں نہیں بھگتاتے۔ پر تجھے تو شوق چڑھا تھا کڑی بن کر پھرنے کا۔ دیکھ لیا' سب ہنس رہے ہیں تیری دھوتی دیکھ کر۔ گھر چل تو دکھنا ذرا بشیرے سے تیرے سارے چاہ (شوق) نکلواتی ہوں۔" اماں جو پہلے ہی روہانسی ہو رہی تھیں' دادی کے یوں آڑے ہاتھوں لیے جانے پر چھم چھم نیر بہانے لگیں۔ عورتیں اماں کے پاس آ آ کر دلاسے دینے لگیں کہ ان کے رونے کو سب ہی بیٹی کی جدائی کا دکھ سمجھ رہے تھے اور ایک دم اماں کو بھی جیسے اسی لمحے احساس جاگا تھا کہ واقعی ان کی بیٹی' ان کے جگر کا ٹکڑا آج ہمیشہ کے لیے پرایا ہونے جارہا ہے اور اس دکھ میں انہیں رونا ہے۔ پھر اماں' دادی کے گلے لگ کر اس شدت سے روئیں کہ دادی تو دادی' خود عمر کی ماں' بھابھی بھی پاس آکر آنسو بہانے لگیں اور اسی رونے دھونے میں علینہ کی رخصتی انجام پائی۔
البتہ علینہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر مزے سے براجمان عمر کی دادی' اپنے پوتے کی دلہن بیاہ لے جانے کی خوشی میں اپنی پاٹ دار آواز میں مسلسل ہنستی ہنساتی رہیں اور یوں یہ قافلہ دلہن لے کر گھر کو روانہ ہوا۔

☼ ☼ ☼
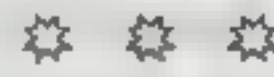
شادی کے ٹھیک ایک ہفتے بعد بقر عید تھی اور علینہ کی چونکہ پہلی عید تھی اور وہ بھی شادی کے فوراً" بعد' سو جوش و خروش خوب تھا۔ نئی نئی شادی کا خمار اور من چاہے ساتھی کی محبت نے مل کر خوب روپ چڑھایا تھا۔ گھر والے خوب لاڈ اٹھا رہے تھے۔ عمر کے ابا بھی آتے جاتے پیار دیتے۔ عمر کی دادی بھی خاصی ہنسوڑ طبیعت کی تھیں۔ جو بھی مارتیں تو ہنسی میں پیٹ کر جو بھی تھا سب بہت خوب صورت تھا۔ ان ہی خوب صورتیوں کو سوچتی اور محسوس کرتی علینہ دل سے تیار ہونے میں مگن تھی۔ باہر قربانی کے جانوروں کے شور کی تیز ہوتی آوازیں ثابت کرتی تھیں کہ قصائی آچکا ہے۔
عمر واش روم سے نہا کر نکلا تو جھٹ علینہ نے بیڈ پر سلیقے سے پھیلا کر رکھی کلف لگی شلوار قمیص اس کی طرف بڑھائی' جبکہ عمر مکمل ٹراؤزر بنیان پہنے متذبذب سا اس سوٹ کو تک رہا تھا۔
"وہ... علینہ... یہ... اصل میں آج..." اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے۔ تھوک نگل کر حلق تر کیا اور آنکھوں میں الجھن لیے کھڑی علینہ کو سلیقے سے سمجھانے کے طریقے پر ابھی غور کر ہی رہا تھا کہ دھاڑ سے دروازہ کھلا اور عمر کی دادی اندر چلی آئیں۔ یہ ان کا چھاپہ مارنے کا مخصوص طریقہ تھا۔
"وے... عمرا وے اور کتنا ٹیم لینا ہے تو نے۔ تیرا باپ باہر کب سے چھری لیے لگی کے تیرا انتظار کر رہا ہے۔ اسے پھر ایک آدھ اور جگہوں پر بھی پھیرا مارنا ہے۔ چھیتی کر' بیوی کو بعد میں چھری پھیر لئیں۔ پہلے باہر آکر جانوروں کو پھیر چھیتی کر۔"
دادی ہنستے ہنستے واقعی علینہ کو حلال کر گئی تھیں۔ اس کا چہرہ اس وقت بالکل ایسا ہی ہو رہا تھا' جیسے اسی کی قربانی کی جارہی ہو۔ عمر کا رنگ بھی بالکل فق تھا۔ جو بات اسے بڑے بھاؤ اور طریقے سے علینہ کے گوش گزار کرنی تھی۔ وہ بڑے بے ڈھنگے پن سے اس کے سامنے کھلی تھی۔
"یہ... یہ دادی کیا کہہ رہی ہیں عمر! ابا کو کدھر جانا ہے؟ وہ کیا کام کرتے ہیں؟ تم کیا کام کرتے ہو؟ بتاؤ مجھے۔ بولو!" علینہ ایک ہی سانس میں بولتی عجیب ہونق لگ رہی تھی۔ عمر کو ہنسی آئی مگر وہ دبا گیا۔
"ہم قصائی ہیں۔"
"کیا...!" ایک تیز چیخ کی مانند یہ لفظ علینہ کے منہ سے برآمد ہوا تھا اور صدمے سے وہ وہیں صوفے پر ڈھے گئی۔
"تم نے... تم نے عمر! اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔ مجھے دھوکے میں رکھا اور میں بے وقوف... تم سے کبھی پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی... اف! تم قصائی ہو۔" علینہ نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔
عمر فی الوقت اس کے قریب نہیں پھٹکا' کیونکہ علینہ کے بالکل بائیں طرف کارنس پر پڑے ڈیکوریشن پیسز اس کی پہنچ سے بے حد قریب تھے اور پھر وہ اس وقت شدید غصے اور صدمے کی حالت میں بھی تھی۔ چند لمحوں بعد علینہ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور چیخ کر بولی۔
"اور... اور وہ جو تمہیں یونیورسٹی میں سب بٹ صاحب' بٹ صاحب کہتے تھے وہ کیا ڈراما تھا۔"
"وہ..." ایک بے ساختہ قہقہہ عمر کے حلق سے

بلند ہوا تھا۔ وہ اب علینہ کے تھوڑا قریب آکھڑا ہوا۔
"یہ تو میرے دودھ ملائی جیسے گورے چٹے رنگ کی وجہ سے سب مجھے بٹ صاحب بلاتے تھے۔ آخر کو وجاہت تو میرا پلس پوائنٹ ہے نا۔؟"
عمر نے فخر سے گردن اکڑائی۔ علینہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔ بات تو اس کی واقعی صحیح تھی۔ یونیورسٹی کے چند بہت خوب صورت لڑکوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ تب ہی تو اسے گمان بھی نہ گزرا کہ۔
اف! کتنی پاگل تھی وہ۔ اپنی ذات اور برادری سے باہر شادی کرنے سے آخر فرق کیا پڑا تھا۔؟
بس اتنا کہ وہ "تائیوں" سے "قصائیوں" میں آگئی تھی۔
اتنی دفعہ گھر میں ابا اور دادی نے عمر کے والد کی "ہڈی بری" کا ذکر کیا۔ کتنی بار ان کے منہ سے قصائی' ٹوکے اور چھریوں کے لفظ سنے۔ مگر عمر سے رشتہ طے ہونے کی خوشی ہی اس قدر تھی کہ کسی دوسری بات کی جانب توجہ ہی نہ دی۔ اور اب تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ "قصائیوں" کی بہو بن چکی تھی۔ اور اگر اس بارے میں حرف شکایت بھی اماں کے سامنے نکالتو وہ شاید نہیں یقیناً "اس کا سر مونڈ دیں گی۔
"یا اللہ۔!" وہ کراہی۔ عمر قدرے چونک کر اور پھر ناگواری سے اس کی جانب دیکھتا آگے بڑھا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔
"علینہ!" اب کے اس کی آواز میں شوخی مفقود تھی۔ "کیا واقعی تمہیں اپنی ذات سے اتنی نفرت ہے۔؟ میں حیران ہوں علینہ! واقعی حیران۔۔۔ کہ جس ذات میں تم پیدا ہوئیں' جس پیشے نے تمہیں پروان چڑھایا' جنہوں نے تمہیں محبت دی' مان اور بھروسا دیا۔ ان ہی سے تمہیں اتنی نفرت ہے۔ کیوں؟"
اب کے علینہ حیران نظروں سے عمر کو تکا۔
اس "کیوں" کا جواب کیا تھا بھلا؟
"اور پھر تمہارے جیسی پڑھی لکھی لڑکی جس نے نفسیات میں ماسٹرز کی ڈگری لی ہو۔ اس کی خود کی "حساسیت" پر مجھے حیرت ہے۔ اور جو تم نے مجھ سے محبت کے دعوے کیے ہیں' ساتھ جینے مرنے کی اس ایک ہفتے میں ایک ہزار ایک قسمیں کھائی ہیں وہ سب کی سب میری کاسٹ کے بارے میں پتا لگنے کے بعد "اگل" بھی دیں۔ کیا بات ہے بھئی۔! بڑی "سیاسی محبت" ہے تمہاری۔"
علینہ آخری بات پر صحیح معنوں میں شرمندہ ہوگئی۔ واقعی! اتنا سطحی رد عمل تھا اس کا۔
"اور پھر علینہ بی بی! میں نے تمہارے "تائی" ہونے کا سن کر اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ حالانکہ تمہاری ذات برادری کا پتا مجھے بہت بعد میں چلا تھا۔" ایک اور طنز۔ ان باتوں کے بارے میں علینہ نے واقعی کبھی نہیں سوچا۔
"کوئی بھی اپنی مرضی سے کسی ذات میں پیدا نہیں ہوتا ڈیر! کسی کو یہ اختیار نہیں دیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں بھی "سادات" میں پیدا ہونا پسند کرتا۔ جو سب سے اعلا و ارفع ذات مبارک ہے۔ باقی سب تو تمہارے میرے بنائے خانے ہیں' جن میں ہم انسانوں کو فٹ کرتے ہیں اور پھر اچھے برے کا ٹیگ لگا دیتے ہیں۔" عمر جانے کیا تھا اس نے سر صوفے پر پھینک کر آنکھیں بند کرلیں۔ اسے واقعی بہت دکھ پہنچا تھا۔ اس نے علینہ کو اتنا سطحی نہیں جانا تھا۔ وہ اپنی کاسٹ کے حوالے سے اس کے تحفظات کو بچکانہ اور وقتی سمجھتا تھا۔ اب خود عمر کی ذات کے حوالے سے اس کا اتنا شدید رد عمل اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ جو بھی تھا' وہ اپنی کاسٹ پر کبھی بھی شرمندہ نہیں رہا۔ وہ محنت کرتے تھے اور حلال کھاتے تھے۔
"تم نے تو ایک دفعہ مجھے کہا تھا کہ تمہاری ایچ ایم سی کے نام سے کوئی کمپنی ہے' جسے اب تم بھی رن کرتے ہو؟" کافی دیر خاموشی کے بعد علینہ کی آواز ابھری تھی' کچھ کچھ شرمندہ سی۔ اتنے تناؤ والے ماحول میں بھی عمر کو اس بات پر ہنسی آگئی اور وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ علینہ کو پھر سے غصہ آنے لگا۔ تب ہی شکایتی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سیدھا ہو بیٹھا۔
"پتا ہے کیا۔ مجھے کوئی کمپلیکس نہیں اپنی کاسٹ

مگر جب مجھے تمہارے خیالات پتا لگے تو صرف محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے تمہیں اپنے پیشے کا مخفف بتایا تھا۔ ایچ ایم سی یعنی حلال میٹ اینڈ چکن۔ ہاہاہا۔!" عمر کو پھر سے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا اور اس دفعہ تو علینہ بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔
"واہ! ایچ ایم سی یعنی حلال میٹ اینڈ چکن!"
"دیکھو علینہ! اللہ کی اب ہم پر اتنی رحمت ہے کہ واقعی۔ ہمارا اب کمپنی سیٹ اپ ہے۔ ہم خود تو چھریاں نہیں پھیرتے اور نہ کھالیں اتارتے ہیں' مگر اس مقصد کے لیے رکھے گئے کارندوں کی مکمل نگرانی کی جاتی ہے۔ ایک منظم اور وسیع پیمانے پر ہمارا کام ہے۔ ہاں! یہ ابا کی اور بڑے بھائی کا معمول ہے کہ آج بھی وہ اپنے گھر کے جانور خود ہی ذبح کرتے ہیں اور ساتھ مجھے بھی لازمی گھسیٹتے ہیں۔ اور تو اور ابھی ہمارا ٹولا تمہارا لوگوں کی طرف بھی جائے گا' پھوپھو کی طرف اور سب مل ملا کر قربانی کے جانور ذبح کریں گے۔ آخر کو قصائی جو ٹھہرے۔!" عمر نے شرارت سے کہتے اس کے کندھے سے کندھا مارا تو وہ کراہ کے رہ گئی۔
"قصائی نہ ہو تو۔"
"شکر کرو! قصائی ہوں "ہرجائی" نہیں۔ جو کہا' وہ کر کے دکھایا۔" عمر نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔
"سو تو تم ہو۔" علینہ اترائی۔
"وہ کیسے۔؟ میں کیسے ہرجائی ٹھہرا بھلا۔؟"
"وہ ایسے کہ تم پر سجتا ہے "ہرجائی قصائی"۔"
دونوں سر سے سر جوڑ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
"شاباش اے شوخیا۔ باہر ابا تیرا ہلکان ہو رہا ہے اور تو ادھر بیوی کے سر سے سر جوڑ کر جوئیں ڈلوا۔ اور اگر تیرے سر میں جوئیں پڑیں نا تو سیدھا تجھے اس کے باپ کے پاس بھیجوں گی کہ تیرے بال ہی صاف کر دے سمجھا۔؟ اب چل آ باہر۔"
دادی تیز گام کی مانند آئیں اور چلی گئیں۔ علینہ اور عمر نے ٹھنڈی سانس بھر کے ایک دوسرے کو دیکھا اور دوبارہ ہنس دیے کہ ایسی عزت افزائیاں بڑوں کے ہاتھوں بچوں کا معمول ہوتی ہیں۔
"سوری فار ایوری تھنگ۔" علینہ دھیمے سے بولی۔
"اٹس اوکے!" عمر نے اس کا سر تھپتھپایا۔ "اب اپنے ذہن کو وسیع کرو اور اپنی کاسٹ کے حوالے سے دل میں موجود تمام شرمندگی نوچ پھینکو۔ دوبارہ اگر میں نے تمہارے اندر اس حوالے سے کوئی شرمندگی دیکھی تو میں ثابت کر دوں گا کہ میں وہ ہوں۔"
"کیا۔؟" علینہ نے بھنویں اچکائیں۔
"ہرجائی قصائی۔" عمر نے کہا اور دونوں پھر سے ہنسنے لگے۔
"عمر جا بے بے۔ او ٹھہر۔ میں جاتا ہوں۔ اسے میرے دس نمبر کے چھتری کی ضرورت ہے۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں آتا باہر۔"
یہ اباجی کی آواز تھی اور اب انہیں یقیناً "اندر ہی آنا تھا اور چھترول بھی کردینی تھی۔ اسی لیے ان کے آنے سے پہلے ہی عمر زور سے علینہ کی ناک موڑتا جھٹ باہر نکل گیا۔
علینہ ناک سہلاتی نم آنکھوں سے اپنی سابقہ سوچوں پر نفرین بھیجتی واپس ڈریسنگ ٹیبل کی طرف مڑ گئی۔ ایک دفعہ پھر اسے دل سے اپنی بقایا تیاری مکمل کرنا تھی کہ آج اس کے دل پر کسی "ذات" کا بوجھ نہیں تھا۔

ہر ملاقات مختصر ٹھہری
کب محبت بھی عمر بھر ٹھہری

دائروں میں ہی گھومتے جائیں
اب یہی صورتِ سفر ٹھہری

وہ پلٹ کر ادھر نہیں آیا
ہر دعا اب کے بے اثر ٹھہری

جاتے جاتے رُکی یہ شب کیسے؟
آتے آتے کہاں سحر ٹھہری؟

بول اب کس کا اعتبار کریں
جب محبت نہ معتبر ٹھہری

ساری بستی ہے منتظر امجد
راستے میں کہاں، خبر ٹھہری

امجد اسلام امجد

محبتوں کی تتلیاں، عداوتیں نگل گئیں
بسے بسائے شہر کو بغاوتیں نگل گئیں

قریب سنگِ میل کے ابھی تک نہ آسکے
ہماری منزلوں کو یہ مسافتیں نگل گئیں

یہ خواہشوں کے نخل جو نہ برگ و بار لاسکے
کہ آرزو کی فصل کو ضرورتیں نگل گئیں

یہ رنگ و روپ دھوپ میں کھڑے کھڑے جُھلس گیا
گلوں کے خدوخال کو تمازتیں نگل گئیں

نہ سیر ہوسکا خوشی سے دل کسی بھی موڑ پر
مسرتوں کی ساعتوں کو وحشتیں نگل گئیں

جو لطفِ اختصار تھا وہ آب و تاب کھو گیا
نزاکتِ کلام کو وضاحتیں نگل گئیں

کچھ ایسی قربتیں، جنہیں وصال راس آگیا
کچھ ایسی چاہتیں، جنہیں رفاقتیں نگل گئیں

شمیم فاطمہ

ایک شخص جزیرہ رازوں کا اور ہم سب اس میں رہتے ہیں
ایک گھر ہے تنہا یادوں کا اور ہم سب اس میں رہتے ہیں

اک موسم ہرے پرندوں کا وہ سرد ہوا کا رزق ہوا
اک گلشن خالی پیڑوں کا اور ہم سب اس میں رہتے ہیں

ایک آنکھ ہے دریا آنکھوں کا ہر منظر اس میں ڈوب گیا
ایک چہرہ صحرا چہروں کا اور ہم سب اس میں رہتے ہیں

ایک خواب خزانہ نیندوں کا وہ ہم سب نے برباد کیا
ایک نیند خرابہ خوابوں کا اور ہم سب اس میں رہتے ہیں

ایک لمحہ لاکھ زمانوں کا وہ مسکن ہے ویرانوں کا
ایک عہد بکھرتے لمحوں کا اور ہم سب اس میں رہتے ہیں

اک رستہ اس کے شہروں کا ہم اس کی دھول میں دھول ہوئے
اک شہر اس کی امیدوں کا اور ہم سب اس میں رہتے ہیں

محمد اجمل نیازی

اُداس لوگوں سے پیار کرنا کوئی تو سیکھے
سفید لمحوں میں رنگ بھرنا کوئی تو سیکھے

کوئی تو آئے خزاں میں پتے اُگانے والا
گلوں کی خوشبو کو قید کرنا کوئی تو سیکھے

کوئی دکھائے محبتوں کے سراب مجھ کو
میری نگاہوں سے بات کرنا کوئی تو سیکھے

کوئی تو آئے نئی رُتوں کا پیام لے کر
اندھیری راتوں میں چاند بننا کوئی تو سیکھے

کوئی پیمبر، کوئی امامِ زماں ہی آئے
اسیر ذہنوں میں سوچ بھرنا کوئی تو سیکھے

نیلما سرور

صبا سحر

برخوردار

کراچی میں ایک خاتون کو بیٹے کا فون موصول ہوا۔
"ہیلو امی! میں لاہور سے بول رہا ہوں اور آپ کو ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔"
"کیسی خوش خبری میرے بیٹے؟"
"میں نے شادی کرلی ہے۔"
"شادی کرلی ہے، مجھے بتائے بغیر؟ چلو کوئی بات نہیں میں نے تمہیں معاف کیا۔ اللہ تم میاں بیوی کو خوش و خرم رکھے۔"
"مگر امی! تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میری بیوی یہودی ہے۔"
"کیا کہا۔ یہودی ہے؟ غضب خدا کا یہ تم نے کیا کیا بیٹے! قبر میں تمہارے باپ کی روح تڑپ اٹھی ہوگی۔ کیا مسلمان لڑکیوں کا کال پڑ گیا تھا۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ اللہ تمہارا گھر آباد رکھے۔"
"ایک بات اور ہے امی! آپ کی بہو فلموں میں کام کرتی تھی۔"
"اف میرے بیٹے! تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے ناچنے گانے والی سے شادی کر کے اپنے خاندان والوں کی عزت و آبرو خاک میں ملادی۔ ویسے سنا ہے 'آج کل شریف خاندان کی لڑکیاں بھی فلموں میں کام کرتی ہیں۔ اللہ تمہیں چاند سا بیٹا دے۔"
"شکریہ امی! لیکن میری بیوی پہلے ہی چار بچوں کی ماں ہے۔"
"آہ بیٹے! تم نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ پھر بھی تم میرے جگر پارے ہو۔ میں تمہارے لیے دعا کرتی ہوں۔"
"امی!"
"کیا ہے میرے لال؟"
"لاہور کے لوگ ہم دونوں سے ناراض ہیں اس لیے ہم کراچی آرہے ہیں مگر میرے پاس اتنی رقم نہیں کہ کسی ہوٹل میں ٹھہر سکیں یا کوئی فلیٹ کرائے پر لے سکیں۔"
"پروا مت کرو بیٹے! میرے دو کمروں کے فلیٹ میں تم اور تمہارے بیوی بچے آرام سے رہ سکتے ہیں۔"
"مگر آپ کہاں جائیں گی امی!"
"تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں بیٹے! فون رکھتے ہی میں فرش پر گروں گی اور ختم ہو جاؤں گی۔"

(شبنم شمشاد۔ یزمان)

باعث حیرت

کراچی کی ایک سڑک پر ایک صاحب بے ہوش پڑے تھے۔ ایک ٹریفک کانسٹیبل ان کی طرف اشارہ کر کے کار سوار سے کہہ رہا تھا۔
"مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے اسے اپنی کار سے ٹکر مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔"
"آپ قسم لے لیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ صاحب گھبرا کر بولے۔
"میں نے ان صاحب کو سڑک پار کرتے دیکھ کر احتراماً گاڑی روک لی تھی۔ اس پر یہ صاحب حیرت سے بے ہوش ہو گئے۔"

(فرح بابر۔ کراچی)

مار

بھول نہ پائے گا چپل کی مار کبھی
ایسا چرچا نہ ہوا تھا سر بازار کبھی
لاکھ حجاموں سے بال بنوائے مگر
ہوا نہ سر ایسا ہموار کبھی

تازہ

ایک سبزی فروش کے گھر بچہ پیدا ہوا۔ ایک عورت نے بچے کو دیکھا تو بولی۔
"کتنا پیارا بچہ ہے۔"
سبزی فروش عادت کے مطابق بول پڑا۔
"اور ہے بھی بالکل تازہ۔"

(ثمرین صفدر۔ کراچی)

آج

منیجر۔ "تم اس مہینے چار چھٹیاں لے چکے ہو۔ ایک مرتبہ تم اپنی بیوی کو ٹرین میں سوار کرانے گئے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی ساس کے جنازے میں گئے تھے۔ ایک مرتبہ تمہاری بیٹی کی سالگرہ تھی اور ایک مرتبہ تمہارا لڑکا بیمار ہو گیا تھا۔ آج پھر چھٹی کی درخواست لے کر آئے ہو۔ یہ کل ہے کس لیے ہے؟"
ملازم۔ "جناب! آج میری شادی ہے۔"

(کوثر شاہد۔ میٹرول)

شکر

نئے قیدی نے پرانے قیدی سے پوچھا۔
"کیا بات ہے تمہارا کوئی بھی رشتے دار جیل میں تم سے ملاقات کرنے نہیں آتا؟"
پرانا قیدی اطمینان سے بولا۔ "اللہ کا شکر ہے میرے سارے رشتے دار یہیں پر ہیں۔"

(رابعہ اینڈ ایمان۔ فاروق آباد)

خیال

جج (ملزم سے) "تمہیں چوری کرتے ہوئے اپنے بیوی بچوں کا خیال نہ آیا۔"
چور۔ "جناب! خیال تو آیا تھا مگر دوکان میں صرف مردانہ کپڑے ہی تھے۔"

(جویریہ عدنان۔ ملیر)

وجہ

"کیا تم رات کو سوتے ہوئے دعا مانگتے ہو؟" پادری نے بچے سے پوچھا۔
بچہ۔ "جی جناب! میں ہمیشہ رات کو سونے سے پہلے دعا مانگتا ہوں۔"
پادری۔ "کیا صبح اٹھ کر بھی دعا مانگتے ہو؟"
"جی نہیں! مجھے دن میں ڈر نہیں لگتا۔" بچے نے شرما کر توجیہہ پیش کی۔

(بنت فیض۔ سلطان)

ضد

جیل میں ایک قیدی نے دوسرے سے پوچھا۔
"تمہیں کس جرم میں سزا ہوئی ہے؟"
دوسرا قیدی بولا۔ "حکومت سے میری ضد چل رہی ہے۔"
پہلا قیدی (حیران ہو کر) "کیا تم کوئی سیاستدان ہو؟"
دوسرا قیدی۔ "نہیں، بات یہ ہے کہ حکومت کو یہ پسند نہیں تھا کہ میں بھی اس کی طرح نوٹ چھاپوں۔"

(زینت ایاز۔ سپوش)

کامیابی

انسپکٹر نے اپنے دو ماتحتوں سے پوچھا۔ "میں نے تمہیں جس ڈاکو کی تلاش پر لگایا تھا، وہ ملا یا نہیں؟"
"سر جی! ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔" ایک ماتحت نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ہم اسے پکڑنے میں تو کامیاب نہیں ہوئے لیکن سر جی! اس پر ہماری دہشت اتنی بیٹھ گئی ہے کہ جب ہم گشت پر ہوتے ہیں تو وہ بالکل سامنے نہیں آتا۔ یہ بھی کچھ کم کامیابی نہیں ہے سر جی۔"

(نادیہ نجم۔ اورنگی ٹاؤن)

وکیل

سڑک پر دو کاریں آپس میں ٹکرا گئیں۔ لوگ مدد کو دوڑے۔ پولیس کانسٹیبل نے کار سے زخمی کو نکالتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو زیادہ سنگین چوٹیں تو نہیں آئیں؟"

"مجھے کیا معلوم؟" زخمی کراہا۔ "میں فوجداری وکیل نہیں دیوانی وکیل ہوں۔"

(مہک اسلم۔ ٹھٹھہ)

پناہ

ایک آدمی گھبرایا ہوا پولیس اسٹیشن آیا۔ "انسپکٹر صاحب! مجھے گرفتار کر لیجیے میں نے اپنی بیوی کے سر پر لاٹھی ماری ہے۔"

انسپکٹر۔ "کیا وہ مر گئی؟"

آدمی۔ "نہیں، بلکہ وہی لاٹھی لیے وہ میرے پیچھے آ رہی ہے۔"

(یاسمین نوید۔ کلفٹن)

وعظ

رات گئے ایک شخص کو سڑک سے گزرتے دیکھ کر گشت پر مامور کانسٹیبل نے پوچھا۔ "اتنی رات کو کہاں جا رہے ہو؟"

"وعظ سننے جا رہا ہوں۔"

"وعظ کہاں ہو رہا ہے؟"

"میرے گھر پر۔"

"کس کا وعظ ہو گا؟"

"میری بیوی کا۔"

(تبسم زاہد۔ ملیر کراچی)

کامیابی

"یہ ریوالور کی نال جو تمہاری پسلیوں میں چبھ رہی ہے کیا تم اس کا مطلب سمجھتی ہو؟" ڈاکو نے غرا کر ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اوہ میرے خدا۔۔!" ڈاکا زنی کی شکار عورت خوشی سے چلا اٹھی۔

"اس کا مطلب ہے میں اپنا وزن کم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔"

(الماس تنویر۔ ہزارہ)

بے یقینی

احمد۔ "میں ایک ایسے مصور کو جانتا ہوں جس نے مکڑی کا جالا اس خوب صورتی سے بنایا کہ نوکرانی کئی گھنٹے تک چھت سے صاف کرنے کی کوشش کرتا رہا۔"

محمود۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔"

احمد۔ "کیوں نہیں دنیا میں اکثر ایسے مصور گزرے ہیں۔"

محمود۔ "یقیناً" ایسے مصور گزرے ہوں گے لیکن ایسے نوکر کہاں ہیں؟"

(رشیدہ بتول۔ بلدیہ)

صحیح طریقہ

شوہر (بیوی سے) "تم نے بے بی کو بتا دیا نا کہ اگر اس نے ہماری منشا کے خلاف شادی کی تو اس کو جائیداد سے عاق کر دیا جائے گا۔"

بیوی۔ "بے بی کو بتانے کی کیا ضرورت تھی میں نے لڑکے کو ہی بتا دیا ہے۔ اس کے بعد اس نے بے بی کا نام نہیں لیا۔"

(حنا شاہد۔ کورنگی)

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگوں میں ہمیشہ فضول سوالات اور چوں و چرا کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ احمقانہ سوال بھی کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مخلوق کو پیدا کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس کو اس سے سابقہ پڑے وہ یہ کہہ کر بات ختم کر دے کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر میرا ایمان ہے۔"

(بخاری و مسلم)

گستاخ بیٹا،

امام قرطبی نے اسناد کے ساتھ حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک نوجوان حضور رحمت دو عالم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میرے باپ نے میرا مال لے لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے والد کو بلا لاؤ۔ نوجوان اپنے باپ کو بلانے گیا تو اس دوران حضرت جبریلؑ امین جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"جب اس لڑکے کا باپ آ جائے تو آپؐ اس سے دریافت فرمائیں کہ وہ کلمات کیا ہیں جو تم نے اپنے دل میں کہے ہیں، اور ابھی تک تمہارے کانوں نے انہیں نہیں سنا۔"

جب وہ نوجوان اپنے والد کو لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے والد سے پوچھا۔

"اصل معاملہ کیا ہے؟ تمہارا بیٹا تمہاری شکایت لے کر میرے پاس آیا ہے کہ تم نے اس کا مال چھین لیا ہے۔"

اس کے والد نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان! آپ اس سے یہ سوال فرمائیں کہ میں اس کی پھوپھی اور خالہ اور اپنی ذات کے سوا اور کہاں اس کا مال خرچ کرتا ہوں؟"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "بس حقیقت معلوم ہو گئی اب کچھ اور سننے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد اس کے والد سے دریافت فرمایا کہ وہ کلمات کیا ہیں، جن کو ابھی تک خود تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا؟"

اس شخص نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارا ایمان و یقین بڑھا دیتے ہیں۔ جو بات کسی نے نہیں سنی اس کی بھی آپ کو اطلاع ہو گئی۔ اور یہ ایک معجزہ ہے۔"

پھر اس نے عرض کیا۔ "میں نے اپنے دل میں چند اشعار کہے تھے۔ ابھی ان کو میرے کانوں نے بھی نہیں سنا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ ہمیں سناؤ۔"

اس وقت اس شخص نے یہ اشعار سنائے۔

ترجمہ:۔

میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی۔ تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا۔

جب کسی رات تمہیں کوئی بیماری پیش آئی تو میں نے تمام رات بیداری اور بے قراری میں گزار دی۔

گویا تمہاری بیماری تمہیں نہیں، بلکہ مجھے لگی ہے اور اس وجہ سے میں تمام رات روتا رہا۔

میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا، حالانکہ میں جانتا تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے اور وہ آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔

پھر جب تم اس عمر اور حد تک پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا اور جس کی سب خواہش کرتا ہے کہ ایسی، تم

سے دیکھوں۔
توتم نے مجھے سختی اور سخت کلامی سے بدلہ دیا، گویا تم مجھ پر یہ احسان و انعام کر رہے ہو۔
اگر تم باپ کا حق ادا نہ کر سکتے تھے تو کم از کم اتنا ہی کرتے جو ایک شریف پڑوسی کیا کرتا ہے۔
تم نے مجھے کم از کم پڑوسی کا حق تو دیا ہوتا اور میرے ہی مال میں میرے حق میں بخل سے کام نہ لیا ہوتا۔
جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اشعار سننے کے بعد نوجوان سے فرمایا۔
"جا، تو بھی اور تیرا مال بھی سب تیرے باپ کا ہے۔"
(نوائے وقت۔ 25 جون 1987)
نمرہ، اقرا۔ کراچی

ناپ تول میں کمی اور بھتہ خوری کا انجام،

مدین کے لوگ کافر تھے۔ رہزنی کرتے، مسافروں میں دہشت پھیلاتے اور ایکہ کو پوجتے تھے۔ یہ ایک قسم کا درخت تھا جس کے ارد گرد درختوں کا جھنڈ تھا۔ ان لوگوں کا لین دین کا معاملہ بہت برا تھا۔ ناپ تول میں کمی کرتے تھے۔ لیتے وقت بڑے پیمانے سے ماپتے تھے۔ اور بڑے باٹوں سے تولتے اور دیتے وقت چھوٹے پیمانے اور کم وزن کے باٹ استعمال کرتے۔ صحابہ کرام نے ایک قرآنی آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ راستے سے گزرنے والے لوگوں کے مالوں میں سے دسواں حصہ وصول کر لیا کرتے تھے۔
شعیب علیہ السلام نے انہیں روکا مگر وہ باز نہ آئے تو ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ یعنی زمین لرزنے لگی جس کی وجہ سے ان کے جسموں سے روحیں پرواز کر گئیں۔ ان کے بے جان لاشے بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ ان میں جان رہی نہ حرکت۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کئی طرح کی سزائیں دیں اور کئی طرح کے عذاب نازل کیے کیونکہ بری عادتوں میں مبتلا تھے۔
مفسرین فرماتے ہیں ان پر سخت گرمی مسلط ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے سات دن ہوا روک لی۔ گرمی کی شدت پانی سے کم ہوتی نہ سائے سے اور نہ تہہ خانوں میں داخل ہو جانے سے۔ چنانچہ وہ گھروں سے میدان میں نکل گئے۔ اچانک ان پر ایک بادل آیا تو وہ سب اس کے نیچے جمع ہو گئے تاکہ گرمی سے تسکین حاصل ہو۔ جب وہ سب کے سب جمع ہو گئے تو اس میں سے چنگاریاں اور شعلے برسنے لگے۔ زمین زلزلے سے لرزنے لگی اور آسمان سے انتہائی شدید آواز گونجی جس سے وہ تباہ و برباد ہو گئے۔

سنہری باتیں،

- جو شے رونے سے واپس نہیں ہو سکتی اس پر رونا کیا اور رونا تو ہوتا ہی اس شے پر ہے جو رونے سے بھی واپس نہ آئے۔
(واصف علی واصف)
- محبت کو نہ تو دلائل سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی فراموش کیا جا سکتا ہے۔
(ملتن)
صبا طارق۔ گوجرانوالہ

عمل،

کسی نے حضرت لقمان سے کہا۔
"آپ فلاں خاندان کے غلام رہے تھے؟" آپ نے فرمایا۔
"ہاں تھا۔" پھر لوگوں نے پوچھا۔
"کس چیز نے آپ کو اس مرتبہ تک پہنچایا؟"
فرمایا۔ "راست گوئی، امانت میں خیانت نہ کرنے سے، ایسی گفتگو اور ایسے عمل کے ترک سے جس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا اور جن چیزوں کو اللہ نے مجھ پر حرام کر دیا ہے ان کی طرف آنکھ بند کر لینے سے اور لغو باتوں سے اپنی زبان کو روک لینے سے اور حلال روزی کمانے سے اس درجے تک پہنچا ہوں لہٰذا جو شخص ان باتوں پر مجھ سے زیادہ عمل کرے گا، مجھ سے زیادہ مرتبے تک پہنچے گا اور جو شخص میرے ہی جتنا عمل کرے گا وہ مجھ جیسا ہو گا۔"
عائشہ تحریم۔ کراچی

گوہر نایاب،

- تنگ تو چیز ہی ایسی ہے کہ روشنی بھی موجائے تو اسے ڈھانپ کر اندھیرے میں بدل دیتا ہے۔
- جلدی کھایا ہوا کھانا اور جلدی ملا ہوا فائدہ کبھی ہضم نہیں ہوتا۔
- صبر کا مقام اس وقت آتا ہے، جب انسان کو یہ یقین آ جائے کہ اس کی زندگی میں اس کے عمل اور اس کے ارادے کے ساتھ ساتھ کسی اور کا عمل اور کسی اور کا ارادہ بھی شامل ہے۔
حنا سلیم اعوان۔ آخون باندی

اقوال حضرت علی المرتضیٰ،

- جس نے لالچ کو شعار بنایا، اس نے اپنے آپ کو حقیر کر دیا اور جس نے اپنی بدحالی کا پردہ کھولا وہ اپنی خوشی سے ذلیل ہوا۔ اور جس نے زبان کو اپنا فرماں روا بنایا اس نے حکومت کو کمزور کر دیا۔
- بخل عار ہے اور بزدلی عیب ہے — ناداری ذہین آدمی کو ایسا گونگا بنا دیتی ہے کہ وہ اپنی حجت پیش نہیں کر سکتا — مفلس آدمی اپنے شہر میں بھی پردیسی ہوتا ہے — بے چارگی ایک آفت ہے — صبر شجاعت ہے۔ زہد دولت ہے اور پرہیزگاری ڈھال ہے۔
- کوئی دولت عقل سے زیادہ منافع بخش نہیں اور کوئی تنہائی خود پسندی سے بڑھ کر وحشت ناک نہیں۔ تدبیر جیسی کوئی عقل نہیں اور پرہیزگاری جیسی کوئی شرافت نہیں۔ حسن خلق جیسا کوئی ہم نشین نہیں اور ادب جیسی کوئی میراث نہیں۔
- یہ دونوں عمل ایک دوسرے سے کتنے دور ہیں۔ ایک وہ عمل جس کی لذت (اگر) چلی جائے مگر اس کا وبال باقی رہ جائے۔ دوسرا وہ عمل جس کی مشقت یاد بھی نہ رہے مگر اس کا اجر باقی رہے۔
صومیہ نذیر، شمائلہ نذیر۔ ہری پور

موتی،

- زیادہ سونا اور زیادہ کھانا میرے نزدیک نحوست اور بدتوفیقی کی علامتیں ہیں۔ یہ حرکتیں صرف مریضوں اور لیڈروں کے لیے روا رکھی جا سکتی ہیں۔
- گفتگو کرنا ایک سفر کی مانند ہے، جس میں مختلف مناظر، مختلف اشخاص اور مختلف حالات و حوادث سے سابقہ ہوتا ہے۔ اچھا آدمی ہم سفروں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور ان کے رنج و راحت کو اپنے رنج و راحت پر ترجیح دیتا ہے۔
- مرشد کا مقولہ ہے اور میرا اپنا تجربہ کہ اگر انسان کو بدترین دشمن کی تلاش ہو تو اس کو اپنے عزیزوں میں مل جائیں گے اور بہترین دوست کی ضرورت ہو تو غیروں کا جائزہ لینا چاہیے۔
(رشید احمد صدیقی)

اقبال کے والد کی شخصیت،

ایک دفعہ کوئی سائل بھیک مانگتا ہوا والد کے گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا اور باوجود یہ کہ اسے کئی بار جانے کے لیے کہا گیا۔ وہ اڑیل فقیر ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اقبال ابھی عنفوان شباب میں تھے۔ اس کے بار بار صدا لگانے پر انہیں جوش آ گیا اور اسے دو تین تھپڑ دے مارے۔ جس کی وجہ سے جو کچھ اس کی جھولی میں تھا، زمین پر گر کر منتشر ہو گیا۔ والد ان کی اس حرکت پر بے حد آزردہ ہوئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فرمایا۔
"قیامت کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد غازیان اسلام، حکما، شہدا، زہاد، صوفیہ، علماء اور عاصیان شرمسار جمع ہوں گے تو اس مجمع میں اس مظلوم گدا کی فریاد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک کو اپنی طرف مرکوز کرے گی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے پوچھیں گے کہ تیرے سپرد ایک مسلم نوجوان کیا گیا تھا تاکہ تو اس کی تربیت ہمارے وضع کردہ اصولوں کے مطابق کرے لیکن یہ آسان کام بھی تجھ سے نہ ہو سکا کہ اس خاک کے تودے کو انسان بنا دیتا۔ تو تب میں اپنے آقا و مولا کو کیا جواب دوں گا؟ بیٹا! اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید داڑھی دیکھ۔ دیکھ! میں خوف اور امید سے کس طرح کانپ رہا ہوں۔ باپ پر اتنا ظلم نہ کر اور مدینہ والے کے سامنے مجھے یوں ذلیل نہ کر۔"
(۔۔۔ اقبال)

تبسیر نشاط

خوشی

آپ نے وہ مثل تو سنی ہی ہوگی کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" تو جناب! یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے کہ جاوید شیخ کے ہونہار بروا شہزاد شیخ کو دیکھ کر یہی خیال آتا ہے۔ شہزاد شیخ کو اداکاری ورثے میں ملی ہے۔ ان کے صرف والد ہی نہیں، بلکہ والدہ زینت منگھی بھی اداکارہ و ماڈل رہی ہیں۔ اور تو اور اب تو ان کی بہن مومل شیخ بھی اداکاری میں قدم رکھ چکی ہیں ___ اور خود شہزاد شیخ نے تو اداکاری میں گویا دھرنا ہی دے ڈالا ہے کہ آج کل کئی ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھا رہے ہیں اور نوجوان نسل، خاص طور پر صنف نازک میں بے حد مقبول ہیں۔

سال 2012ء اس فنکار گھرانے کے لیے بے حد یادگار رہا کہ اس سال کے آغاز میں جاوید شیخ کی بیٹی مومل شیخ اپنے پیا سنگ سدھاری تھیں اور جاتے جاتے یہ سال شہزاد شیخ کو حنا میر کی سنگت دے گیا ہے۔ دسمبر کی آخری ساعتوں میں شہزاد اور حنا کی شادی خانہ آبادی دھوم دھام سے انجام پائی۔ (اور کئی نازک دلوں کی خانہ بربادی) شہزاد کی شادی کی خبر اچانک ہونے والے کسی دھماکے سے کم نہیں۔ کیونکہ کچھ عرصے سے سننے میں آرہا تھا کہ جاوید شیخ اپنے بیٹے کو فلمی دنیا میں متعارف کرانے کے لیے ایک فلم بنا رہے ہیں۔ اس کے لیے وہ گزشتہ ایک سال سے شہزاد کی فلمی ہیروئین تلاش کر رہے تھے مگر ان کی نگاہ میں کوئی لڑکی جچی ہی نہیں۔ انہیں شہزاد کی فلمی ہیروئین تو نہ ملی۔ البتہ ان کی اصلی ہیروئین مل گئی۔ شہزاد نے بھی مشرقی لڑکوں کی طرح والدین کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ یوں جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے تمام مرحلے بخیر و خوبی انجام پا گئے۔

شہزاد شیخ کو باپ کی طرف سے اداکاری تو ورثے میں مل ہی گئی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ انہوں نے ہرجائی مزاج اور شادیاں کرنے کا شوق ورثے میں نہ پایا ہو۔ (حنا میر کے گھر والے بھی یہی دعا کرتے ہوں گے۔)

مبارک باد

ترقی کے اس دور میں خبروں کی ترسیل محض لمحہ بھر میں ممکن ہے۔ اِدھر کچھ ہوا، اُدھر خبر نشر۔ سب سے پہلے خبر نشر کرنے کی دوڑ میں اکثر چینلز کوئی خبر نشر کرنے کے بعد اس کی تردید بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ دوسروں پر سبقت حاصل کرنے کی خواہش میں خبریں بلا تحقیق آگے بڑھا دی جاتی ہیں۔

مگر جناب! ایک خبر ایسی بھی ہے کہ جس کی تحقیق کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی کہ "ثبوت" ابھی چلتا پھرتا تو نہیں ہے۔ تاہم جیتا جاگتا ضرور ہے۔ اور اس خبر کو دیر سے نشر کرنے کی ذمہ دار نازک سی ممن موہنی سی عائشہ بخش ہیں۔ جو ہمیشہ دنیا بھر کی خبریں سناتی ہیں اور عائشہ بخش کا صرف کھنکتا لہجہ ہی نہیں، بلکہ شخصیت کا سحر بھی ٹی وی کے سامنے جم کر بیٹھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

"چلیے! اہم خبر سنانے میں دیر نہیں کرتے۔ آپ کو بتا ہی دیتے ہیں کہ اپنی عائشہ بخش خیر سے والدہ محترمہ کے رتبے پر فائز ہو گئی ہیں۔ تاہم اس خبر کا توجہ طلب پہلو یہ ہے دوسروں کی خبریں فوری طور پر پہنچانے والی عائشہ بخش نے خود اپنے بیٹے کی دنیا میں آمد کی خبر تقریباً "ایک مہینے بعد اپنے ٹویٹر اور فیس بک اکاؤنٹ پر جاری کی۔

عائشہ بخش نے ابھی بیٹے کی پیدائش کی صرف اطلاع ہی دی ہے۔ کوئی تصویر جاری نہیں کی۔ (عائشہ نے شاید پڑوسیوں (ایشوریہ) کا اثر قبول کیا ہو۔ جنہوں نے اپنی بچی کو تقریباً "سال بھر تک لوگوں کی نظر سے چھپائے رکھا۔ عام طور پر دواؤں پر لکھا ہوتا ہے کہ "بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔" تاہم ان لوگوں نے خود "بچوں" کی خبر کو "لوگوں" کی پہنچ سے دور رکھا۔ خیر! اس کی وجہ تو عائشہ خود جانیں۔ ہماری طرف سے تو انہیں دلی مبارک باد اور نومولود کے لیے ڈھیروں دعائیں۔)

دھوکا

ویسے تو پڑوسی ملک میں تاکا جھانکی ہماری عادت نہیں۔ تاہم اگر پڑوس میں ہونے والے جھگڑوں کی آوازیں خود ہی ہم تک پہنچ جائیں تو پھر کان بند بھی تو نہیں کیے جا سکتے ناں! پڑوس سے ایک دلچسپ جھگڑے کی خبر آئی ہے کہ سابق حسینہ عالم ایشوریہ رائے جن کے حسن کے جلووں سے جہاں اکثر مردانہ نگاہیں خیرہ ہوتی ہیں تو وہیں اکثر زنانہ دل جل جل کر کباب بھی ہو جاتے ہیں۔ ایسی دل جلی خواتین کے لیے یہ جھگڑا خاصا اطمینان بخش ہے۔

ایک بھارتی میگزین میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں ایشوریہ پر خاصی تنقید کی گئی ہے اور ان

کے ملکوتی حسن کا راز بھی طشت از بام کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق ایشوریہ جھلسی ہوئی سیاہ رنگت کی مالک ہیں۔ مگر وہ عام طور پر حسین اور خاص طور پر رنگ گورا کرنے والی کریموں کے اشتہارات میں گوری چٹی نظر آنے کے لیے جدید تکنیک کا سہارا لیتی ہیں۔ یعنی ان اشتہارات میں ڈیجیٹل فوٹو گرافی اور فوٹو شاپ کے ذریعے انہیں بے تحاشا گورا دکھایا جاتا ہے۔ یوں معصوم اور سادہ لوح خواتین ایشوریہ جیسی رنگت حاصل کرنے کے لیے اپنے گھریلو بجٹ کا بیشتر حصہ ان کریموں پر صرف کر بیٹھتی ہیں۔ تاہم اس کے باوجود بھی ویسی کی ویسی ہی رہتی ہیں۔ گویا ایشوریہ اور کاسمیٹکس تیار کرنے والے ادارے ان سادہ لوح خواتین کے ساتھ دھوکا دہی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

ایشوریہ تک یہ خبر پہنچی کہ ان کے حسن کا "راز" اب راز نہیں رہا اور وہ راز جس سے ابھی تک محض ابھیشک بچن ہی واقف تھے "سب کو پتا چل گیا ہے تو وہ بوکھلا گئیں اور اسی بوکھلاہٹ میں انہوں نے میگزین پر مقدمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیوں جناب! ہے نا یہ جھگڑا باعث اطمینان؟

(تو اے میرے دیس کی پیاری لڑکیو! ظاہری حسن کو سنوارنے کے لیے مصنوعی اجزاء پر مشتمل کریمیں اور دیگر چیزیں استعمال کرنے کے بجائے نیک سیرتی اور حسن اخلاق کے جوہر سے اپنے کردار کے "حسن کو سنوارنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ اصل حسن تو یہ ہی ہے باقی سب تو فانی ہے۔)

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ امیتابھ بچن نے 23 سالہ بھارتی لڑکی کے ریپ کے بعد اس کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی روح ہمارے دلوں کو جھنجوڑتی رہے گی۔" یہ شخص جس کا نام امیتابھ بچن ہے۔ جب بھارتی گجرات کے وزیر اعلا نریندر مودی کے حکم سے گجراتی مسلمان خواتین اور بھارتی پارلیمنٹ کے سابق مسلمان رکن اقبال احسان جعفری کی بیٹیوں پر ظلم و زیادتی کے پہاڑ توڑے گئے تو "جناب امیتابھ بچن نے اس ظلم عظیم پر احتجاج کرنے یا ہمدردی کے چند الفاظ بولنے کی بھی زحمت نہ کی۔

(تعاقب تنویر قیصر شاہد)

☆ کراچی میں جاری بدامنی اور بڑھتے ہوئے جرائم کی شرح کے باعث گزشتہ تین سال کے دوران تیس ہزار سے زیادہ تاجروں نے لاہور کو مرکز بنا لیا۔ لاہور میں جائیدادیں مہنگی، کراچی کی بے مول ہو گئیں لاہور ملک کا نیا تجارتی حب بن جائے گا۔

(چیئرمین تاجر اتحاد عتیق میر)

☆ میاں نواز شریف کہتے ہیں جو ریاست بچانے آئے تھے "وہ بمشکل عزت بچا کر نکلے۔ ہمارے ایک دوست جو میاں نواز شریف کی ہر بات پر اعتراض کرتے ہیں۔ اس پر بھی برس پڑے کہ میاں صاحب وہ چیز بچائی جاتی ہے "جو موجود ہو۔

(علی خان۔ حالات غیر حاضرہ)

☆ متحدہ مجلس عمل نے انتخابات میں بے مثل کامیابی حاصل کی لیکن پرویز مشرف اس اتحاد کو توڑنے کی کوششوں میں مصروف رہتا تھا۔ بظاہر تو کچھ یاران نکتہ داں ایم ایم اے کو ملا ملٹری الائنس قرار دیتے تھے لیکن مولانا شاہ احمد نورانی مجھے بتایا کرتے تھے کہ مشرف اس اتحاد کے خلاف کیا کیا سازشیں کرتا تھا۔

(حامد میر۔ قلم کمان)

☆ آصف زرداری نے تقریباً "پانچ سال تک ایم کیو ایم اور اے این پی کی مرضی کے مطابق ہی اقدامات کیے ہیں۔ چاہے اس دوران کراچی کے لوگوں نے کتنی ہی بڑی جانی اور مالی قربانی کیوں نہ دی ہو۔

(رؤف کلاسرا۔ راز و نیاز)

ثمن آفتاب ــــــ لاہور

طے کیا ہے تو کر ہی جانا ہے
دل نے حد سے گزر ہی جانا ہے
ایسا کرتے ہیں تم پہ مرتے ہیں
ہم نے یوں بھی تو مر ہی جانا ہے

شمائلہ ــــــ الہ آباد

ہر بات پہ وضاحت طلب نہ کیا کرلے ناداں دل
محبت میں کچھ سوالوں کے جواب نہیں ہوتے

نائلہ ــــــ الہ آباد

درختوں کی رہ گزر میں چمک چھوڑ جاؤں گی
پہچان اپنی دور تلک چھوڑ جاؤں گی
خاموشیوں کی موت گوارا نہیں مجھے
شیشہ ہوں ٹوٹ کر بھی کھنک چھوڑ جاؤں گی

عطیہ افضل ــــــ جہلم

وہ خواب تھا بکھر گیا، خیال تھا ملا نہیں
مگر دل کو کیا ہوا، یہ کیوں بجھا، پتا نہیں
ہر اک دن اداس دن، تمام شب اداسیاں
کسی سے کیا بچھڑ گئے، جیسے کچھ بچا نہیں

ثمرہ، اقرا ــــــ کراچی

وہ بلائیں تو کیا تماشا ہو
ہم نہ جائیں تو کیا تماشا ہو
وقت کی چند ساعتیں ساغر
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو

شہناز گل، ثمینہ احمد ــــــ نزالی والا

جو بے سبب ہی منہ موڑ کر گیا وہی مجھ سے
اسی کو جا کے منانا میری سرشت نہیں
میں ساری عمر جسے پوجتا رہا ہوں وہی
اسے نظر سے گرانا میری سرشت نہیں

سمیرا اقبال ــــــ کراچی

نہ جاؤ اس کی گم صم سادگی پر
سمندر ہے تو وہ گہرا بھی ہوگا
گھرا رہتا ہے اب جو دوستوں میں
کبھی میری طرح تنہا بھی ہوگا

ندا، فضہ ــــــ فیصل آباد

وہ جذبوں کی تجارت تھی، یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
اسے ہنسنے کی عادت تھی، یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
مجھے اس نے کہا آؤ نئی دنیا بسا لیتے ہیں
اسے سوجھی شرارت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا

صدف عمران ــــــ کے ڈی اے

آسان تو نہیں اپنی ہستی سے گزر جانا
اترا جو سمندر میں دریا تو بہت رویا
جو شخص نہ رویا تھا کبھی پا بجولاں میں
دلدار کے سائے میں بیٹھا تو بہت رویا

عائشہ، تحریم ــــــ فیصل آباد

ابھی تو خشک ہے موسم، بارش ہو تو سوچیں گے
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

عظمیٰ نبیل ــــــ کراچی

وہ سامنے تھا مگر اس کو نگاہ چھو نہ سکی
یہ احترام کی حد تھی یا حوصلے کم تھے

شفق راجپوت ــــــ گوجرہ

زندگی نے میری مفہوم جہاں سے پایا
مجھ کو اچھا نہیں لگتا اسے مقتل کہنا
پیار کے پیچھے مراسم کا پتا دیتا ہے
خط کے القاب میں مجھے اس کا پاگل کہنا

امتہ الصبور

ہیلن آف ٹرائے

ہیلن' دیوی تو نہیں تھی۔ لیکن یونانی دیو مالا اس کے تذکروں اور داستانوں سے بھری پڑی ہے کیونکہ اس عورت کو اساطیری کہانیوں میں نہ صرف دنیا کی خوب صورت ترین عورت قرار دیا گیا ہے' بلکہ اپنی اسی خوب صورتی کی بنا پر یہ دیوتاؤں کی دس سالہ طویل جنگ' ہزاروں ہلاکتوں اور ایک شہر کی مکمل تباہی و بربادی کا سبب بنی۔ جسے دیو مالا کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی تسلیم کرتی ہے۔

عام طور پر اس خوب صورت ناگن کو ہیلن آف ٹرائے کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے جو جنگ لڑی گئی اسے جنگ ٹروجن کا نام دیا جاتا ہے اور جو شہر تباہ ہوا وہ اناطولیہ (موجودہ ترکی) کا قدیم شہر ٹرائے تھا۔

ہیلن خوب صورت تو بچپن سے ہی تھی۔ لیکن جب وہ جوان ہوئی تو حسن جیسے اس پر ٹوٹ کر برسا۔ اس کے جسم کا کوئی انگ ایسا نہ تھا جسے غیر ضروری یا بھدا قرار دیا جا سکتا۔ اس کے حسن کی شہرت اسپارٹا کے محل سے نکل کر پہلے یونان اور پھر پوری دنیا میں پھیلنا شروع ہو گئی۔ اس کی یہ مقبولیت اس کے باپ کے لیے سوہان روح بن گئی۔ کیونکہ اسے یہ خدشہ نظر آنے لگا تھا کہ کہیں ہیلن یونان میں فساد کا باعث نہ بن جائے۔

جب ہیلن کی شادی کا وقت آیا تو یہ خطرہ زیادہ شدت سے سامنے آگیا۔ کئی یونانی بادشاہوں اور شہزادوں نے براہ راست اس کا ہاتھ مانگا' جبکہ بعض نے اس مقصد کے لیے خصوصی سفارتی مشن اسپارٹا بھجوائے۔

یوں تو آنے والے تمام لوگ ہی بے شمار اور بیش قیمت تحائف اور نذرانے اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن اوڈیسی اوس (اوڈے سس) کے تحائف کی بات ہی نرالی تھی۔ وہ سب سے مہنگے اور نایاب تحفے تھے۔

لیکن ٹینڈریوس یعنی ہیلن کا باپ ان تحائف سے بے حد خوف زدہ ہوا۔ اس نے نہ تو کسی کا تحفہ قبول کیا اور نہ ہی کسی امیدوار کو واپس جانے دیا۔ اسے خدشہ تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد ہیلن کے دعوے دار آپس میں الجھ پڑیں گے اور ان کے یہ اختلافات ملک گیر جنگ کا پیش خیمہ بن جائیں گے۔ اس موقع پر اوڈے سس نے ٹینڈریوس کو تجویز پیش کی کہ اگر وہ کیری اوس کی بیٹی پینی لوپ سے شادی کے سلسلے میں اس کی حمایت کرے تو وہ اس گمبھیر مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔

ٹینڈریوس کو اور کیا چاہیے تھا۔ اس نے اپنی فوری رضامندی ظاہر کر دی۔ چنانچہ اوڈے سس نے تجویز دی کہ ہیلن کے شوہر کا فیصلہ کرنے سے قبل یہاں موجود تمام بادشاہوں' شہزادوں اور شہ زوروں سے حلف لیا جائے کہ اگر کسی نے ہیلن کے منتخب شوہر سے مقابلے کی کوشش کی تو باقی تمام لوگ مل کر منتخب ہونے والے کا ساتھ دیں گے۔

یہ حکمت عملی کامیاب رہی اور وہاں موجود افراد نے ٹینڈریوس کا حلف قبول کر لیا۔ ہیلن کے شوہر کے طور پر مینی لیوس کا انتخاب کیا گیا اور دونوں کی شادی کر دی گئی۔ ہیلن کے باپ یعنی ٹینڈریوس کے انتقال کے بعد مینی لیوس اسپارٹا کا بادشاہ بن گیا۔

چند برس مینی لیوس اور ہیلن نے امن و آشتی کے ساتھ گزارے۔ لیکن پھر ان کی خوش گوار زندگی میں ایک عفریت گھس آیا جس کا نام پیرس تھا۔

پیرس' ٹرائے کے بادشاہ پریام کا بیٹا تھا' جبکہ اسے شہزادہ الیگزینڈر بھی کہا جاتا تھا۔ اس کا تذکرہ یونانی دیو مالا کی بہت سی کہانیوں میں موجود ہے' لیکن ان میں سب سے زیادہ شہرت اس داستان کو ملی جس میں پیرس' اسپارٹا کی ملکہ ہیلن کو اغوا کرتا ہے یا اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اسے اس کے شوہر سے چھین لیتا ہے۔ بعد میں یہ واقعہ جنگ ٹروجن کا باعث بنتا ہے۔

کہانیوں میں ہے کہ جب یہ پیدا ہوا تو مستقبل شناسوں نے دعویٰ کیا کہ نومولود ٹرائے کے زوال کا باعث بنے گا۔ چنانچہ اس کے والدین نے اپنے بعض قابل اعتماد افراد کے ہمراہ اسے ماؤنٹ ایڈا کے علاقے میں بھجوا دیا۔ تاکہ مشکلات سے محفوظ رہ سکے۔ لیکن جب شہزادہ جوان ہو گیا تو اسے واپس بلا لیا گیا۔

اسی دور میں پیلیوس اور تھیٹس کی شادی انجام پائی۔ یہی بعد ازاں اچیلیس کے والدین بنے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ زبردستی کی شادی تھی۔ لیکن اس شادی میں ہیرا دیوی' ایتھینا دیوی اور ایفروڈائٹ سمیت ماؤنٹ اولمپس کی تمام دیوی دیوتاؤں کو مدعو کیا گیا تھا۔ لیکن ایرس (شر کی دیوی) کو اس کی حرکات کے باعث اس شادی میں نہیں بلایا گیا۔ ایرس ایسے میں بھلا کس طرح خاموش رہ سکتی تھی۔ اس نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اس کا بدلہ یوں لیا کہ ایک سنہرا سیب اس محفل میں پھینک دیا جہاں ہیرا' ایتھینا اور ایفروڈائٹ بیٹھی تھیں۔ اس سیب پر "کے لسٹی" یعنی "سب سے خوب صورت کے لیے" کے الفاظ کندہ تھے۔

دیویوں نے یہ سیب حاصل کرنے کے لیے آپس میں جھگڑنا شروع کر دیا۔ بعض روایات کے مطابق زیوس دیوتا نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس نے پیرس کو اس جھگڑے کا فیصلہ کرنے یعنی بہ الفاظ دیگر خوب صورت ترین دیوی کا انتخاب کرنے کے لیے...

جب دیویوں کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے اپنے طور پر شہزادہ پیرس کو رشوت کی پیشکش کی۔

ہیرا دیوی نے اسے سیاسی قوت اور ایشیا پر کنٹرول کا لالچ دیا۔

ایتھینا نے اس سے کہا کہ وہ عظیم جنگجوؤں کی تمام خصوصیات' صلاحیتیں اور دانش مندی اسے بخش دے گی۔

جبکہ ایفروڈائٹ نے پیشکش کی کہ اگر وہ اس کے حق میں فیصلہ دے دے تو دنیا کی خوب صورت ترین عورت یعنی مینی لیوس آف اسپارٹا کی بیوی ہیلن اسے بخش دی جائے گی۔

پیرس چونکہ پہلے ہی ہیلن کا نادیدہ پرستار اور اس کے حسن پر فریفتہ تھا۔ چنانچہ اس نے سیب ایفروڈائٹ کے حوالے کر دیا۔

ادھر ایفروڈائٹ نے وعدے کے مطابق اسے ہیلن سے شادی کی اجازت دے دی جو پہلے سے شادی شدہ تھی۔

پیرس' اسپارٹا پہنچا اور ہیلن کو اغوا کر کے ایک کشتی پر لے آیا جسے فیری کلس نے اس کے لیے تیار کیا تھا۔ تاہم بعض روایات میں ہے کہ پیرس کو دیکھ کر ہیلن خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس سے محبت کرنے لگی۔ ان کے مطابق پیرس نے اسے اغوا نہیں کیا۔ بلکہ ہیلن خود اس کے عشق میں گرفتار ہو کر اپنے شوہر اور نو سالہ بیٹی ہارمیون کو چھوڑ کر اپنی مرضی سے اس کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔

جب مینی لیوس کو علم ہوا کہ اس کی بیوی غائب ہے تو اس نے ان تمام لوگوں سے رابطہ کیا۔ جنہوں نے ہیلن اور اس کے شوہر کی حفاظت کا حلف اٹھایا تھا۔ انہیں علم ہو گیا کہ پیرس اپنی محبوبہ کو ٹرائے لے گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ ٹرائے پر حملہ بول دیا اور یوں دس سالہ طویل جنگ ٹروجن کی ابتدا ہوئی۔ یہ جنگ اس لحاظ سے منفرد تھی کہ اس میں پورے یونان نے حصہ لیا۔ پورا یونان ٹرائے پر حملہ کر رہا تھا تو باقی اس کا دفاع۔

ایلاڈ کے مطابق جنگ کے دوران مینی لیوس بہت بہادری سے لڑا۔ جنگ ٹروجن کے آخر میں پریس، فیلو اسٹیٹس کے ہاتھوں مارا گیا، تاہم ہومر نے اس واقعہ کا تذکرہ نہیں کیا۔

کہا جاتا ہے کہ پریس کے مرنے کے بعد اس کے بھائی ڈیفو لیس نے ہیلن سے شادی کرلی۔ تاہم بعد میں وہ مینی لیوس کے ہاتھوں مارا گیا۔

روایات میں ہے کہ ایئون جو پریس کی پہلی بیوی تھی۔ ایک سمندری شہزادی تھی اور اس کا تعلق فریگیا (اناطولیہ) موجودہ ترکی میں واقع ماؤنٹ ایڈا کے علاقے سے تھا۔ اس کا باپ سبرین، دریاؤں کا دیوتا تھا۔ جب ہیلن کے لیے پریس نے ایئون کو چھوڑا تو اس نے اس کوشش کے بدترین نتائج کی پیش گوئی کی تھی جن میں جنگ ٹروجن اور پریس کی ہلاکت جیسے واقعات شامل تھے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جب جنگ کے دوران پریس زخمی ہوگیا تو اس نے ایئون سے اپنے علاج کی درخواست کی۔ کیونکہ ایئون کے ہاتھ میں ایک طرح کی شفا یا جادو تھا۔ لیکن پریس کے سابقہ رویے سے وہ اس قدر دل برداشتہ تھی کہ اس نے اپنے شوہر کے زخموں کے علاج سے انکار کردیا اور وہ ان زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہوگیا۔

جب یونانیوں نے ٹروجن کی جنگ میں فتح حاصل کرلی تو مینی لیوس اپنی بیوی یعنی ہیلن کو لے کر واپس وطن روانہ ہوا

جہاں تک ہیلن اور پریس کے باہم تعلق کا سوال ہے تو اس سلسلے میں کہانی نویسوں نے اپنی مرضی کی ہے۔ کچھ کے مطابق وہ پریس سے بے تحاشا محبت کرتی تھی اور شاید اس کی وجہ ایفروڈائٹ ہو کیونکہ اسی نے پریس سے وعدہ کیا تھا کہ ہیلن اسے ملے گی اور اس مقصد کے لیے دیوی نے ہیلن کے دل میں پریس کی محبت پیدا کردی ہو۔ دیگر کہانیوں میں ہے کہ ہیلن ایک ظالم اور خودغرض عورت تھی جو ہر اس شے کی تباہی کا باعث بن گئی جو اس کے قریب آئی یا وہ جس کے قریب گئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہیلن پریس سے نفرت کرتی تھی محبت نہیں۔

بعض کہانیوں میں ہے کہ مینی لیوس نے ہیلن کے تیسرے شوہر یعنی پریس کے بھائی ڈیفوکس کو ٹرائے کی تباہی کے انتقام کے طور پر قتل کیا تھا۔ درحقیقت مینی لیوس اپنی دغاباز اور بے وفا بیوی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہیلن کو مارنے کے لیے اپنی تلوار اٹھائی۔ لیکن جب اس کے چہرے کی جانب نگاہ کی تو وہ اس کے حسن سے اس قدر مسحور ہوا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ چنانچہ وہ اسے قتل کرنے کے بجائے بحفاظت یونانی جہازوں پر لے آیا۔ اس طرح ہیلن واپس اسپارٹا پہنچ گئی۔ جب مینی لیوس کا انتقال ہوگیا تو ان کے بیٹے میگاپن تھس نے اپنی ماں کو جلاوطن کردیا۔

ہیلن نے رہوڈز میں اپنی ایک پرانی دوست پولیکسو کے پاس پناہ لے لی۔ یہ لیپولیمس کی بیوہ تھی۔ لیپولیمس کی وجۂ شہرت یہ تھی کہ جنگ ٹروجن میں فریقین کی جانب سے ہلاک ہونے والا وہ سب سے پہلا شخص تھا۔

لیکن ہیلن کو یہ فیصلہ بے حد مہنگا پڑا۔

جنگ ٹروجن چونکہ ہیلن کے حصول کے لیے لڑی گئی تھی۔ اس لیے پولیکسو اسے اپنے شوہر کی موت کا ذمہ دار سمجھتی تھی۔ اس نے ہیلن سے انتقام لینے کی ٹھانی اور اپنی کنیزوں کو تیار کیا کہ وہ جنگ ٹروجن میں مارے جانے والے افراد کی بدروحوں اور بھوتوں کا روپ دھار لیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ ہیلن نے درخت سے پھندا لگا کر خودکشی کرلی۔

موت کے بعد ہیلن کو دیوی کا رتبہ دے دیا گیا۔

بعض محققین نے ہیلن کی داستان سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یونان میں وراثت بیٹی کا حصہ ہوتی ہے۔ اس کے ثبوت کے طور پر وہ اسپارٹا کے تخت پر مینی لیوس کا بیٹھنا قرار دیتے ہیں کیونکہ ہیلن سے شادی کے باعث ہی وہ اس کے باپ یعنی اپنے سسر کا جانشین بنا۔ تخت کا حصول ہی اصل وجہ تھی کہ خوب صورت ہیلن یونان کی سب سے طویل اور تباہ کن جنگ کی بنیاد بنی۔ اسی لیے اسے "منحوس دیوی" بھی کہا جاتا ہے۔

زندگی اداس ہے

ام ثمامہ

کیلنڈر کے سیاہ اور سفید خانوں میں وقت چاہے سال بہ سال آگے بڑھ رہا ہو۔ مگر مجھے لگتا ہے وقت ٹھہر گیا ہے۔ وقت ہمیشہ کے لیے میرے بابل کے اس آنگن کے سردبر آمدے میں آکر رک گیا ہے۔ جہاں چارپائی پر رضائی اوڑھے، محبتیں لٹاتا، فرض نبھاتا میرا عزیز از جان بھائی ابدی نیند سو رہا ہے۔

رات باقی تھی جب وہ بچھڑا تھا
عمر گزری ہے رات باقی ہے

چودہ فروری کو محبت کے عالمی دن مجھے وہ شخص چھوڑ گیا۔ جس سے میں عشق کرتی ہوں۔ ہر بندہ بشر میں ذاتی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔ مگر بھائی جان نے جس طرح رشتوں کو نبھایا، چھوٹی سی عمر میں دنیا کی ہر برائی اور ستم کو اپنی ذات پر سہہ کر ہمیں پالا تو آج میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ دنیا میں "میرے بھائی سے اچھا کوئی اور بھائی نہیں ہوگا۔"

ان کے پاس جب جتنا جیسا ہوا انہوں نے دوسروں کی مدد کی۔ وہ بھی اس طرح کہ دوسرے ہاتھ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کے جنازے میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ ہر آنکھ پُرنم تھی اور رونے والے ایسے لوگ بھی تھے جنہیں ہم جانتے تک نہ تھے۔ وہ دوست دشمن ہر ایک کے لیے پُرخلوص تھا۔

آفتاب لودھی مرحوم ہم تین بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ صرف اڑتیس سال کی عمر میں موٹر سائیکل ایکسیڈنٹ میں جائے وقوع پر ہی ان کی وفات ہوگئی۔ انہوں نے ہمیں دعا مانگنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ آج سے بائیس سال پہلے جب والد صاحب کا بلڈ کینسر کی وجہ سے انتقال ہوا تھا تو بھائی نے یتیمی کا دکھ صرف اٹھارہ سال کی عمر میں سہا اور آج اپنے بیٹوں آیان لودھی اور ارسلان لودھی کو جن کی عمریں بالترتیب بارہ، نو سال ہیں۔ یہ دکھ دے گئے ہیں۔ انتقال سے تھوڑے دن پہلے صائمہ بھابھی سے

"میرے والد صاحب نے بچوں کی کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ میں اپنے آیان کی شادی سولہ سال کی عمر میں ہی کرواؤں گا۔ پھر وہ کہتا رہے۔ مگر۔"

میرے ساتھ تم بھی دعا کرو یوں کسی کے حق میں برا نہ ہو
کہیں اور ہو نہ یہ حادثہ کوئی راستے میں جدا نہ ہو

آیان، ارسلان پر جان نچھاور کرتا بابا، اپنی ماں کی بیوگی کی چادر میں چمکنے والا روشن ستارہ جس کی روشنی میں وہ اپنے سب غم بھلا بیٹھی تھی۔ اک سہاگن کا پہلا پیار۔ رنگ، روشنی اور محبتوں کا انمول ساتھی۔ سفیان، قاران، مہاش، میرب اور ثمامہ کا اکلوتا اور لاڈلا ماموں جان اور ہم بہنوں کا اک مان، اک بھروسا کہ وقت کیسا بھی کڑا ہو بھائی جان ہے نا۔

اب تو زندگی زندگی نہیں لگتی۔ ہم سب نے ایک ساتھ بہت اچھا وقت گزارا۔ ہمارے درمیان ایسی بے مثال محبت تھی کہ لوگ رشک کرتے تھے۔ مگر اب صرف تنہائی ہے، اداسی ہے، انتظار ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ ساتھ چند زندہ لوگوں کی دوری، ذات سے روگ کی مانند چمٹ گئی ہے۔ ان تمام دوریوں اور مجبوریوں کے باوجود میں ان سے رابطے میں ہوں۔

جن سے زندگی کی آخری سانسوں تک کے رشتے ہیں۔ جن کی یادوں سے دلوں کا اک اک گوشہ مہکتا ہے۔ جن کے لیے مانگی گئی دعاؤں کے پھولوں سے ہتھیلیاں بھری رہتی ہیں۔ مگر جن کو دیکھنے کے لیے آنکھیں بے تاب ترستی ہیں۔

اور تو کچھ نہیں چاہیے تجھ سے اے زندگی مجھے
بس اب وہ شخص لوٹا دے جو مجھے تجھ سے بھی پیارا ہے

شاعری سچ بولتی ہے

سمیعہ لیاقت علی سندھو

کٹ گئی جو زبان تو ہونٹ ہلاتے رہنا
اپنے ہونے کا تو احساس دلاتے رہنا
یہ نہ ہو کہ شہر میں تنہائی کے مجرم ٹھہرو
دل ملیں نہ ملیں ہاتھ ملاتے رہنا

بلاشبہ شاعری احساسات و جذبات کے اظہار کا سب سے بہترین ذریعہ ہے اور امجد اسلام امجد میرے موسٹ فیورٹ شاعر آگہی کا سفر طے کرنے اور کرانے میں بے مثال۔ ان کی ایک اچھوتی کاوش "عمر کی سیڑھیاں"

ہاں! سنو دوستو!
جو بھی دنیا کہے
اس کو پرکھے بنا، مان لینا نہیں
ساری دنیا یہ کہتی ہے
پربت پہ چڑھنے کی نسبت اترنا سہل ہے
کس طرح مان لیں
تم نے دیکھا نہیں!
سرفرازی کی دھن میں کوئی آدمی
جب بلندی کے رستے پہ چلتا ہے تو
سانس تک ٹھیک کرنے کو رکتا نہیں
اور اسی شخص کا، عمر کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے
پاؤں اٹھتا نہیں
اس لیے دوستو! جو بھی دنیا کہے
اس کو پرکھے بنا، مان لینا نہیں

فرحت عباس شاہ ایک ایسا شاعر جس کی دسترس میں پہنچ کر لفظ تصویر بن جاتے ہیں "بول" اٹھتے ہیں۔ کہیں اداسی کے روپ میں شام سے لپٹ کر زار و زار رو اٹھتے ہیں۔ درد کے موضوع پر ایک طویل غزل کے کچھ اشعار۔

اسی سے ہوتا ہے ظاہر، جو حال درد کا ہے
سبھی کو کوئی نہ کوئی وبال درد کا ہے

اب اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں رکھنا
یہ بات طے ہے، لیکن سوال درد کا ہے

دلوں پہ زندہ تھا دل ہی نہیں رہے یہاں
اب ایسے شہر میں جینا محال درد کا ہے

کسی نے پوچھا فرحت بہت حسین ہو تم
تو مسکرا کے کہا سب جمال درد کا ہے

نوجوان شاعر حامد یزدانی اپنے مجموعہ کلام "گہری شام کی بیلیں" میں ایک بہت بامعنی غزل کہتے ہوئے۔

ذرا سے پر نکلتے ہیں پرندے بھول جاتے ہیں
انہیں کس ماں نے پالا تھا، بچے بھول جاتے ہیں

فقط یوں ہی ہوا کو یاد رکھنے کی ہے عادت سی
یہاں سے کون گزرا تھا، یہ رستے بھول جاتے ہیں

یہ چہرے ہیں کہ کچے سبق پہلی جماعت کے
ذرا سی دیر میں سارے کے سارے بھول جاتے ہیں

نہ گزرے گا کوئی بھی قافلہ اس دشت سے
دیا سا دل کے کونے میں جلا کے بھول جاتے ہیں

یہاں پھر کون کس کو یاد رکھتا ہے سدا حامد
جدا ہوتے ہی لہروں کو کنارے بھول جاتے ہیں

الفاظ کا چناؤ اور انہیں استعمال کرنے کا سلیقہ بہت کم شاعروں میں ہوتا ہے لیکن سیف الدین سیف کی اس منفرد سی غزل کو پڑھ کر بندہ عش عش کر اٹھتا ہے۔

مری داستانِ حسرت وہ سنا سنا کے روئے
مرے آزمانے والے، مجھے آزما کے روئے

کوئی ایسا اہلِ دل ہو کہ فسانۂ محبت
میں اسے سنا کے روؤں، وہ مجھے سنا کے روئے

مری آرزو کی دنیا، دلِ ناتواں کی حسرت
جسے کھو کے شادماں تھے، اسے آج پا کے روئے

تری بے وفائیوں پر، تری کج ادائیوں پر
کبھی سر جھکا کے روئے، کبھی منہ چھپا کے روئے

جو سنائی انجمن میں شبِ غم کی آپ بیتی
کئی رو کے مسکرائے، کئی مسکرا کے روئے

ہمارے آج کے اس نفسا نفسی کے دور میں ہر شخص اپنے چہرے پر کئی کئی چہرے سجائے پھرتا ہے۔ اس منافقت بھرے معاشرے کی دوغلی پالیسیوں کو نیلما سرور اس طرح اجاگر کرتے ہوئے۔

ہر شخص کی زباں ہے نیزے لیے ہوئے
کہنے کو رشتے داروں میں ہوں دوستوں میں ہوں

بے وزن لوگ سر پہ ہیں قرآن لیے ہوئے
ثابت یہ کر رہے ہیں کہ میں کاذبوں میں ہوں

حق بات کر سکا نہ میں حاکم کے سامنے
ڈرتا ہوں میں بھی انہی ظالموں میں ہوں

احمد فراز ایک عہد ساز شاعر جن کی شاعری کی خوبصورتی اور احساسات و جذبات کے بارے میں دو رائے ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کی شاعری بے شک ہمیشہ سچ بولتی ہے۔

تشنگی آنکھوں میں اور دریا خیالوں میں رہے
ہم نوا گر خوش رہے جیسے بھی حالوں میں رہے

اس قدر دنیا کے دکھ اے خوبصورت زندگی
جس طرح تتلی کوئی مکڑی کے جالوں میں رہے

دیکھنا اے رہ نوردِ شوق! کوئے یار تک
کچھ نہ کچھ حنا پاؤں کے چھالوں میں رہے

ہم سے کیوں مانگے حساب جاں کوئی عمر بھر
کون ہیں، کیا ہیں، کہاں ہیں؟ ان سوالوں میں رہے

بدظنی ایسی کہ غیروں کی وفا بھی کھوٹ تھی
سوئے ظن ایسا کہ ہم اپنوں کی چالوں میں رہے

اک دنیا کو مری دیوانگی خوش کر گئی
یار مکتب کی کتابوں کے حوالوں میں رہے

عشق میں دنیا گنوائی ہے نہ جاں دی ہے فراز
پھر بھی ہم اہلِ محبت کی مثالوں میں رہے

جاتے جاتے رسم تعارف بھی نبھاتے چلیں۔ نام ہے سمیعہ لیاقت علی سندھو۔ رہتے ہیں بلھے شاہ کی نگری قصور میں۔ پڑھائی کو ایک عرصہ پہلے خیرباد کہہ چکے ہیں۔ بقول امی اور بہن اب رسائل و ڈائجسٹ بلکہ ہر قسم کی پڑھنے کی چیزیں ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔

اور اب آخر میں پروین شاکر کے اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

شدید دکھ تھا اگرچہ تیری جدائی کا
سوا ہے رنج ہمیں تیری بے وفائی کا
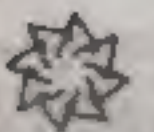
آتی جاتی رتیں، بدلتے موسم انسانی احساسات پر یقیناً "اثر انداز ہوتے ہیں مگر حساس دل اور ذہن رکھنے والوں کا المیہ تو یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے موسموں کے زیر اثر ہی جیتے ہیں۔ باہر کا موسم کیسا ہی پربہار کیوں نہ ہو من کی نگری سونی ہی رہتی ہے۔ ہاں! کبھی کبھی قدرت مہربان ہوتی ہے اور ساون رت کی پھوار کے ساتھ دل و ذہن میں بھی رنگوں کی قوس قزح سج جاتی ہے۔ ہر سو خوشبو اور ہریالی کا راج ہوتا ہے۔

شعاع کے سلسلوں کی خوب صورتی ہماری قارئین کے ہی حسن انتخاب کی مرہون منت ہے۔ ہماری بہت سی قارئین ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے شعاع کے سلسلوں میں شرکت کرتی ہیں۔ اپنی قارئین کے تعارف کے لیے ہم نے سالگرہ نمبر میں ایک سروے ترتیب دیا ہے۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1 ۔ شعاع سے وابستگی کو کتنا عرصہ گزرا۔ اس حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ پیش آیا ہو تو لکھیں۔

2 ۔ دن کے آغاز سے رات ہونے تک کتنے کام نمٹاتی ہیں۔ اس مصروفیات میں شعاع کے مطالعے کے لیے وقت کیسے نکالتی ہیں؟

3۔

افسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا
دل اور بھی الجھے گا، پڑھیے نہ کتابوں کو

شعاع کی وہ کون سی تحریریں ہیں جو ایک خوب صورت یاد بن کر دل پر نقش ہیں اور وہ تحریریں جنہیں پڑھ کر دل الجھا؟ کیا کسی کردار میں اپنی شخصیت کی جھلک نظر آئی؟

4 ۔ اپنی ذات کی خوبیاں، خامیاں، وہ تعریفی جملہ جسے سن کر خوشی محسوس ہوئی۔

پھر ساون رُت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی، تم یاد آئے

ساون کے حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ، کوئی خوب صورت بات۔

6 ۔ اپنا پسندیدہ لطیفہ، شعر، اقتباس، کتاب لکھیے۔

آیئے دیکھتے ہیں، ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

شعاع کے ساتھ

ادارہ

ام کلثوم رائے ۔۔۔ اختر آباد اوکاڑہ

1۔ بے شمار باتوں کی تلخیوں سے بہتر ہے
ایک ہی شکایت ہو
بے شمار راتوں کی بے کلی سے بہتر ہے
ایک ہی اذیت ہو
بے شمار ذلتوں کی کج روی سے بہتر ہے
ایک ہی محبت ہو

شعاع اور اپنی دوستی کے بارے میں یہی کہوں گی میں اسے تب سے پڑھتی ہوں جب اردو پڑھنی سیکھی تھی، پہلے پہل میں مسکراہٹیں چھپ چھپا کر پڑھ لیا کرتی تھی آپی شعاع کی قاری تھیں آپی کو اس کا چسکا کہاں سے لگا ہم ناواقف ہیں۔ البتہ ہم نے اسے جب بھی قریب پایا سب کچھ بھلا دیا (جی)

2 تھوڑا مشکل ہے سوال تو چلو خیر ۔۔۔ صبح ہی صبح اٹھتی ہوں، سب سے پہلے نماز فجر ادا کرتی ہوں پھر قرآن پاک پڑھتی ہوں پھر جلدی سے صحن میں چھڑکاؤ کر کے جھاڑو لگاتی ہوں (گرمی ہے نا) ٹائم ہو تو کمروں اور برآمدے میں جھاڑو لگاتی ہوں پھر بھاگم بھاگ اسکول ۔۔۔ اسکول میں سو بکھیڑے۔

کسی قسط وار کہانی کی جلدی ہو تو کتاب میں رکھ کر پڑھ ڈالتی ہوں پھر اسکول سے واپسی کے بعد ظہر کی نماز پڑھ کر کچھ دیر لیٹ جاتی ہوں۔ (کوئی نہ کوئی رسالہ ہاتھ میں لیے) پھر مغرب کی نماز کے بعد آٹا گوندھنا اور برتن صاف کرنا میرے ذمے ہے عشاء کے بعد رات کے برتن صاف کرتی ہوں اور پھر رات ہماری ہوتی ہے دل چاہے تو دو ہی دنوں میں پڑھ ڈالتی ہوں ویسے میں دیر نہیں لگاتی۔ میں نے پیر کامل تین دن میں پڑھ ڈالی تھی سارے امور سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ ۔۔۔

3 سچ ہے آپ کی بات لیکن کسی حد تک "سرسوں کے پھول" پڑھ کے مجھے لگا بیک وقت یمنیٰ اور آمنہ مجھ میں موجود ہیں ہاں یمنیٰ غالب رہتی ہے "آج کل دیوار شب کا معاذ مجھے اپنا پرتو لگتا ہے۔

4 ہر عام انسان کی طرح مجھ میں بھی خوبیاں اور خامیاں ہیں سب سے پہلے امی سے پوچھا انہوں نے کہا آج تک کوئی چیز اگر کہتا امی، (بہتی جی نہیں ہو گئی۔ خیر)

نمو کہتی ہے میں حساس ہوں، زیادہ فرینڈز یہی کہتی ہیں اقراء تبسم کہتی ہے مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے سمیعہ کہتی ہے میں افسانوی زندگی سے نکل آؤں، پنجابی گروپ کو میرا کمپیوٹنگ اسٹائل اور ٹھہر ٹھہر کر اردو بولنا پسند ہے، خامی یہ ہے کہ ایموشنل ہو جاتی ہوں۔ جھوٹ اور جھوٹے سے نفرت ہے (خوبی ہے یہ) غصہ بہت آتا ہے۔ انا پرست ہوں کسی حد تک ۔۔۔ قدامت پسند نہیں ۔ قدامت پرست ہوں، موڈی ہوں، بہت بامروت ہوں (خوبی اور خامی بھی) تعریفی جملہ، آپ کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں بہت سوں نے کہا۔

5 بارش کا موسم قطعی پسند نہیں ہے، بارش کے بعد چلنے والی ہوا اور خاص کر سردیوں کی راتوں میں بارش سے پہلے اور بارش کے بعد کا موسم بہت پسند ہے بارش سے متعلق ایک واقعہ ۔۔۔ ہے تو سہی ۔۔۔ لیکن ۔

6 میری پسندیدہ کتاب "اتنی پڑھی ہی کب ہیں" پیر کامل ۔۔۔ میری ذات ذرہ بے نشاں ۔ زندگی اک روشنی ۔ زرد موسم ۔۔۔ جتنے بھی ناول پڑھے ہیں پسند ہیں لیکن قراقرم کا تاج محل فیورٹ کہہ سکتے ہیں۔ میں افق کے ساتھ قدم قدم راکاپوشی پر چلی ہوں، مجھے مغرور لڑکے بہت پسند ہیں ۔ مجھے بہت سے کریکٹرز ہیں جو نہیں بھولتے ۔ مجھے بدر غازان نہیں بھولتا، مجھے عارفین عباس نہیں بھولتا، مجھے "بسلا دل بھی عجیب شے ہے" کی زینی نہیں بھولتی، مجھے جو نہیں بھولتا فائزہ کا ورم ۔۔۔ میں سعدیہ حمید کو اور اس کے کسی کردار کو بھول نہیں پائی ۔ یہ یاد کا اور الفاظ کا رشتہ ہی تو ہمیں باندھے ہوئے ہے آپ سے۔

7 پسندیدہ شعر تو ہزاروں ہیں لیکن یہاں اپنا ایک شعر لکھوں گی جو آج کل زبان پر رہتا ہے۔

آج پھر وہ بڑی شدت سے یاد آیا محسن
تو دل نے کہا بے نام ہی سہی، وہ تعلق یونہی نہ تھا

پسندیدہ اقتباس تو بہت ہیں لیکن یہاں اپنی فیورٹ رائٹر عمیرہ احمد کے پیر کامل سے لکھ رہی ہوں۔

"زندگی میں ہم کبھی نہ کبھی اس مقام پر آجاتے ہیں۔ جہاں سارے رشتے ختم ہو جاتے ہیں ۔ وہاں صرف ہم ہوتے ہیں اور اللہ ہوتا ہے، کوئی ماں باپ، کوئی بہن بھائی کوئی دوست نہیں ہوتا پھر ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے پیروں کے نیچے زمین ہے کہ ہمارے سر کے اوپر آسمان بس صرف ایک اللہ ہے جو ہمیں اس خلا میں بھی تھامے ہوئے ہے۔"

آخر میں صرف اتنا کہوں گی۔

محبت کتنا میٹھا اور پاکیزہ لفظ ہے اس کی حرمت کا ہمیشہ خیال رکھیے گا۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

شکر قندی کی کھیر

اجزا :

شکر قندی	آدھا کلو
دودھ	دو کلو
چینی	ایک پاؤ
بادام پستے	حسب پسند
چھوٹی الائچی	آٹھ عدد

ترکیب :

شکر قندی کو ابال کر چھیل لیں اور مسل کر اس کے دھاگے الگ کرلیں۔ پکے ہوئے دودھ میں ڈال کر چولہے پر ہلکی آنچ پر چڑھا دیں۔ تھوڑی دیر بعد چینی اور الائچی کے دانے نکال کر ڈال دیں۔ چمچہ ہلاتے رہیں۔ گاڑھی ہونے لگے تو کٹا ہوا میوہ ڈال کر مزید پانچ منٹ پکائیں، پھر اتار لیں۔ ڈش میں نکال کر فریج میں رکھ دیں۔ مزے دار شکر قندی کی کھیر تیار ہے۔

گاجر کا جھٹ پٹ اچار

اجزا :

گاجر	ایک پاؤ
املی	آدھی چھٹانک
پسی سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
کلونجی	ایک چٹکی
زیرہ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	ایک چٹکی
تیل	چار، چھ کھانے کے چمچے

ترکیب :

گاجر کو چھیل کر اس کی لمبی لمبی قاشیں بنالیں اور درمیانی حصہ نکال دیں۔ املی بھگو دیں۔ فرائنگ پین تیل گرم کرکے زیرہ اور کلونجی کڑکڑائیں، پھر سرخ مرچ ڈال کر ہلکا سا بھونیں۔ گاجر ڈال کر مکس کریں اور ہلکی آنچ پر پانچ منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ املی کو مسل کر اس کی گٹھلیاں نکال دیں اور شفاف سا گاڑھا پیسٹ بنالیں۔ گاجر میں ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں اور نہایت دھیمی آنچ پر گاجر نرم ہونے تک پکائیں۔ تیل اوپر آجائے تو اتار لیں۔ کم وقت میں تیار ہونے والا مزے دار اچار حاضر ہے۔

خشخاش گوشت

اجزا :

گوشت	ایک کلو
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
پیاز	تین عدد
دہی	آدھا کپ
پسی سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
خشخاش	آدھا کپ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسی مونگ پھلی	ایک کھانے کا چمچہ
کچری پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

کسی بڑے برتن میں گوشت کے ساتھ لہسن، ادرک پیسٹ، دہی، سرخ مرچ، نمک اور کچری پاؤڈر ملا کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ پیاز باریک کاٹ کر براؤن کریں۔ پھر گوشت ڈال کر درمیانی آنچ پر گلنے تک پکائیں۔ پسی ہوئی خشخاش میں مونگ پھلی پاؤڈر، گرم مسالا اور زیرہ کوٹ کر ملائیں اور گوشت میں ڈال دیں۔ گوشت گل جائے تو بھونیں اور روغن چھوڑنے پر حسب مرضی شوربے کے لیے پانی ڈال کر پانچ منٹ تک دھیمی آنچ پر چھوڑ دیں پھر چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

مٹر پلاؤ

اجزا :

مٹر	آدھا کلو
چاول	ایک کلو
لہسن	آدھی پوتھی
سفید زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
چھوٹی الائچی	چار عدد
چکن کیوب	ایک عدد
ہری مرچ	چھ عدد
گاجر	دو عدد
پیاز	ایک بڑی
بادیان کا پھول	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ہری مرچ، لہسن، چھوٹی الائچی، بادیان کا پھول باریک پیس لیں۔ تیل میں پیاز لال کرکے نکال لیں۔ تھوڑا سا سفید زیرہ تیل میں کڑکڑائیں۔ اب اس میں مٹر، نمک اور پسا مسالا ڈال دیں۔ کیوب ڈالنے کے بعد اس میں اتنا پانی ڈالیں کہ چاول کے لیے یخنی بن جائے۔ مٹر گل جائیں تو چاول ڈال کر پکائیں، جب چاول دم پر آجائیں تو گاجر باریک کتر کے چاولوں پر پھیلا دیں۔ تھوڑا ایک جانے پر ایک دفعہ چاول اوپر نیچے کرکے زردے کا رنگ اور تلی ہوئی پیاز بچھا دیں۔ مزے دار پلاؤ تیار ہے۔

(مرسلہ: صدف آصف)

اداره

خوبصورت بنیے

اگر آپ زندگی کو ہمیشہ تروتازہ شگفتہ اور جوان رکھنے کے متمنی ہیں تو ورزش کے لیے تھوڑا سا وقت نکالیں۔ ذیل میں جسم کو متناسب رکھنے کے لیے چند ورزشیں بتائی جارہی ہیں۔ ان پر عمل کر کے آپ اپنی عمر کو دس سال بڑھنے سے روک سکتی ہیں۔

☆ فرش پر پیٹ کے بل لیٹ جائیں۔ پیشانی کو فرش پر ٹکالیں اور ہاتھوں کو رانوں کے ساتھ لگادیں۔ اب آہستہ آہستہ سر کو اوپر کی طرف اٹھاتی جائیں' کمر پر زور دے کر سر اور گردن کو جتنا اوپر لے جاسکتی ہیں لے جائیں۔ یہ خیال رہے کہ ہاتھوں پر ذرا بوجھ نہ پڑے۔ ایک منٹ تک اسی حالت میں رہیں۔ پھر سابقہ حالت میں واپس آجائیں۔

☆ کمر کے بالائی حصے پر سے چربی کم کرنے کے لیے فرش پر پیٹ کے بل لیٹ جائیں۔ دونوں ہاتھوں کو سامنے کی طرف لے جاکر فرش پر اس طرح سے رکھیں کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے کے سامنے ہوں۔ دونوں ہاتھوں کے درمیان چار انچ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ اب ہاتھوں پر زور دے کر سر کو آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اٹھائیں۔ ورزش کے دوران ریڑھ کی ہڈی پر بوجھ پڑنا چاہیے۔ سر کو پیچھے کی طرف لے جائیں۔ سینہ باہر کی طرف نکالیں۔ کمر اور کولہوں کی شکل کمان جیسی ہونی چاہیے۔ ایک منٹ کے بعد یہ عمل دہرائیں۔

کمر کو متناسب بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ کمر کے دونوں پہلوؤں کی ورزش کریں۔

اس کے لیے دونوں پاؤں ایک سیدھ میں کر کے کھڑی ہو جائیں۔ کمر پر دونوں ہاتھ جما کر بائیں جانب جھکنے کی کوشش کریں۔ پھر اصلی حالت میں لوٹ آیئے' اس کے بعد دائیں جانب جھکنے کی کوشش کیجیے۔ پھر اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیئے۔ اس طرح یہ عمل آٹھ بار کیجیے۔

☆ کولہوں پر ہاتھ رکھ کر سیدھی کھڑی ہوں پھر کولہے اور گھٹنوں کے بل پر نیچے جھکیں' اس طرح کہ ایڑی فرش کے اوپر ہی رہے۔ اب اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیئے اس ورزش کو آٹھ بار کریں۔

☆ پاؤں ملا کر کھڑی ہو جائیں' ایک ہاتھ دیوار یا کرسی پر سہارے کے لیے رکھ لیجیے' بایاں پاؤں آگے اور پیچھے پھینکیے۔ جب آپ پاؤں کو پیچھے کی طرف پھینکیں گی اس وقت اپنے دھڑ کو سیدھا رکھیے۔ پیٹ کو اوپر تان کر رکھیے اور سینے کو آگے کی طرف تانیے۔ گھٹنے سیدھے ہوں اور پاؤں گھڑی کے پنڈولم کی مانند آگے پیچھے ڈول رہے ہوں۔ ہر ایک پاؤں کو دس سے بیس مرتبہ تک اسی طرح آگے پیچھے پھینکتے رہیں۔ یہ عمل پیٹ کی چربی کم کرنے کے لیے مفید ہے۔

☆ پیٹ گھٹانے کے لیے ایک اور مفید عمل فرش پر گدا بچھا کر اس پر پیٹ کے بل لیٹ جائیں اور پھر دونوں پاؤں اوپر کی جانب اٹھالیں۔ اس کے بعد جس طرح سائیکل چلاتے وقت پاؤں حرکت کرتے ہیں اسی طرح آپ الٹا لیٹ کر یہ تصور کریں کہ آپ سائیکل چلا رہی ہیں۔ چند ہی دنوں میں آپ نمایاں فرق محسوس کریں گی۔

اس کے علاوہ آپ رسی کودنے کو اپنا معمول بنالیں۔ پیٹ کم کرنے کی یہ سب سے آسان اور فوری نتیجہ دینے والی ورزش ہے۔ اس سے بہت جلد نہ صرف آپ کا پیٹ بلکہ سارا جسم سڈول اور دلکش ہو جائے گا۔ ☆